شامِ شہرِ یاراں

اورنگ زیب قاسمی
سبجیکٹ سپشلسٹ
گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول قاسمی مردان

قائداعظم فوجداری عدالت میں

بحیثیت وکیلِ صفائی

(پسِ "زرگزشت" کا ایک بابِ خواب تمثال)

(۱)

میرے والد نے جے پور کے جس اسکول اور کالج سے میٹرک اور بی۔ اے پاس کیا، اُسی اسکول اور کالج سے دادا نے میٹرک اور اَدھورا انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ اُسی اسکول اور کالج سے میٹرک اور بی۔ اے میں نے بھی کیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مہاراجہ ہائی اسکول کے کورٹ یارڈ کی دیوار پر سنگِ مرمر کی ایک تختی نصب تھی جس پر والد کا نام بہت نمایاں تھا، اس لیے کہ وہ پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۴ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا کہ میں سارے راجستھان، اجمیر، میرواڑہ، سنٹرل انڈیا اور یوپی (باستثنائے الہ باد، بنارس، لکھنؤ اور علی گڑھ) میں پہلا طالب علم تھا جس نے راجستھان سے آگرہ یونیورسٹی کے بی۔ اے کے امتحان ۱۹۴۲ء میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور اِنگلش لٹریچر اور فلاسفی میں نیا ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن سنگِ مرمر کی تختی کو چھوڑیے، کسی کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ آبائی اسکول کی باہری دیوار پر کوئلے ہی سے میرا نام لکھ دیتا۔ نہ کسی جوہر شناس نے کالج کے ٹائلٹ کی اندرونی دیوار پر حسرت بھری graffiti اور پنسل سے بنائی ہوئی لڑکیوں کی تصویروں کی پائینتی ہی میرا نام سرخ پنسل سے "ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما" کرنے کی زحمت گوارا کی!

ہندوستان ٹائمز کا وہ شمارہ جس میں یہ رزلٹ شائع ہوا تھا آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میرا یہ یادگاری سنگِ مرمر اب اتنا پیلا، بُھربُھرا اور پڑا گیا ہے کہ صفحہ پلٹیں یا نام پر انگلی بھی رکھ دیں تو قرطاسِ اعزاز ریزہ ریزہ ہو کر کراچی کی بھوری اور بُھربُھری مٹی میں رَل مِل جائے۔

دادا جان بھی اپنی اوّلیت اور فوقیت کے ثبوت میں بارہا جتلا چکے تھے کہ میں نیلا تہمد باندھے مئی جون میں ننگے پیر اسی اسکول میں جاتا تھا۔ یہ سنتے سنتے میرے تو کان پک گئے اور اپنا پاجامہ

اور جوتے بالکل غیر ضروری بلکہ کُھلی عیّاشی معلوم ہونے لگے! بالخصوص پاجامہ تو نچلے دھڑ پر سُنّتِ آبا کے خلاف دوشاخہ لٹکواں عَلَمِ بغاوت محسوس ہونے لگا۔ وہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ جب وائسرائے ہند دورے پر جے پور آیا تو اس نے اسکول کے تقسیمِ انعامات کے جلسے میں انہیں دستِ خاص سے Dictionary of Greek Mythology دی تھی۔ اس دعوے کی حرف بحرف تصدیق اسی ڈکشنری سے ہوتی تھی جو ساتویں جماعت کے ششماہی امتحان میں ارتھمیٹک میں فیل ہونے پر ____ جی ہاں، فیل ہونے پر ____ انہوں نے بطور اسپیشل پرائز اور بطریق بزرگانہ شاباشی مجھے بخش دی! اُن کے خیال میں ساتویں جماعت کے حساب میں فیل ہونے کے لیے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے علاوہ اُتنی ہی غیر معمولی اخلاقی جرأت بھی درکار تھی! مجھے بھی اس طرزِ سرزنش پر بے تحاشا بچکانہ پیار آیا۔ ڈکشنری کیا تھی، یونانیوں کی الف لیلہ تھی! اس کے مطالعے سے کسی طرح جی نہیں بھرتا تھا۔ ملال یہ تھا کہ اس سے بہت پہلے کیوں نہ فیل ہوا! اصل دلکشی یہ تھی کہ یونانیوں کے سبھی دیوی دیوتاؤں اور خداؤں میں مسلمانوں کی ساری خرابیاں پائی جاتی تھیں! اب اس خیال سے گُدگُدی ہوتی ہے کہ اگر ہم لوگ اُن زمانوں میں یونان میں ہوتے تو نصیبوں مارے یونانی سنگِ مرمر کے بتوں کو پُوجنے کے بجائے ہم زندوں کی پرستش کرتے! ہمارے پاؤں دھو دھو کے پیتے!

میری تحریروں اور گفتگو میں یونانی دیومالا کے جو دور از کار حوالے اور نامانوس تلمیحات جہاں تہاں نظر آتی ہیں جن کے کارن مجھے لاکھوں کے بول سننے اور سہنے پڑتے ہیں، وہ دراصل اسی ڈکشنری کا فیضان ہے! دادا مجھے بڑے شوق اور پیار سے انگریزی پڑھاتے اور خوش خطی کی مشق کراتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بدخط سدا کے بدنصیب، سہل انگار، خودرائے، خودسر اور ڈاکٹر ہوتے ہیں! مرزا اُلٹی بشارت دیتے ہیں کہ ''بدخط لوگوں کو جہنم میں فرشتوں کے لکھے اعمالنامے نقل کرنے پڑیں گے۔ وہ انہیں سامنے رکھ کر ابدالآباد تک خوش خطی کی مشق کرتے رہیں گے۔ اپنے ہی بہتر اور خوبصورت خط میں رقم ہونے کے بعد خود ان کو اپنے کرتوت اور زیادہ مذموم و قبیح اور بد سے بدتر نظر آئیں گے!''

وائسرائے کے دستِ خاص سے انعام پانے پر ہمیں واقعی رشک آتا تھا۔ یوں آنے کو تو ہمارے زمانے میں بھی ایک وائسرائے (ماؤنٹ بیٹن) آیا۔ اُس نے ہندوستان کو آزادی کا تحفہ پیش کیا۔ لیکن ہماری قدر افزائی اور اشک شوئی کی توفیق نہ ہوئی۔ کرنا خُدا کا ایسا ہوا کہ یہی وائسرائے جموارام گڑھ (جے پور) جہاں میں ڈپٹی کلکٹری کی ٹریننگ لے رہا تھا، شیر کا شکار کرنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ آیا۔ اس شیر افگن نے بہت اونچے اور پختہ مچان میں دبک کر ایک شیر نر مار گرایا۔ اُدھر اُڑتی سی یہ خبر طیور کی زبانی سنی کہ اُس کی مرد افگن بیوی ایڈوینا نے پنڈت نہرو کو اُن کے

بلند و بالا پنج شلا pedestal سے کھینچ کر بسترِ ندامت پہ لاگرایا اور باہمی و دائمی رسوائی اور دنگی کا سامان ہم جیسے قلم کشوں کو مہیا کیا۔ اب یہ حکایت عام ہوئی، سنتی جا شرماتی جا!

دادا کا انگریزی خط بہت دیدہ زیب تھا۔ وہ بڑی منتوں، مرادوں اور گنڈے تعویذوں کے بعد ایک مجذوب اور مست ملنگ کی دعاؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے نام ملنگ خاں کی وجہ تسمیہ یہی تھی۔ اُس مجذوب نے ان کے والد یعنی میرے پردادا حیدر خاں سے کہا کہ میں اپنا یہ لنگوٹ ★[1] اتار کے تیرے کو دیتا ہوں۔ اسے رام نِواس باغ کے کنویں کے پانی سے بھری پیتل کی بالٹی میں دن بھر بھگوئے رکھنا۔ پھر جیسے ہی چراغ جلے پہلا گیدڑ بولے اس پانی سے غسل کر لینا۔ گود بھر جائے گی۔ جا اپنی لُگائی کو مُبارکی دے۔

حیدر خاں نے دست بستہ عرض کیا ''سرکار، جس محلّے میں میں رہتا ہوں وہاں گیدڑ نہیں بولتا۔''

''ابے، تو کیا تُو مرگیا ہے؟ اپنے ہی گلے سے تین دفعہ نپوتے ★[2] گیدڑ کی آواز نکال کے انگول ★[3] کر لیجیو۔''

سنگِ مرمر کی تختی سے قطع نظر، شہر میں میری غیر معمولی کامیابی کا چرچا تھا۔ دو اسکولوں میں مجھے بطور رول ماڈل پیش کیا گیا۔ مِڈل اسکول میں میں نے منہ اندھیرے اٹھنے اور اخبار بینی کے فوائد پر تقریر کی۔ میں نے اپنے لیکچر میں کہا کہ جو قومیں سائنس سے غفلت برتتی ہیں وہ قعرِ مذلّت میں اوندھے منہ جا گرتی ہیں۔ (جب کہ خود میں نے تیسری جماعت سے بی۔ اے تک کبھی سائنس نہیں لی تھی!)

سوالات کے دوران ایک ذہین لڑکے نے پوچھا کہ یہ قعرِ مذلّت کہاں واقع ہے؟ اور قومیں اس میں اوندھے منہ گرنے کے لیے کاہے کو جاتی ہیں؟ جغرافیہ کے ٹیچر نے اُسے ڈانٹ کر بٹھا دیا۔ پرائمری اسکول میں میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا کہ راجستھان پسماندہ علاقہ ہے لوگ ایروپلین کو چیل گاڑی کہتے ہیں! وعدہ کریں، آپ یہ گنوارُو لفظ کبھی استعمال نہیں کریں گے۔

اِس پر ایک چار پانچ سالہ نونہال نے ننھا سا ہاتھ اٹھا کر پوچھا ''کیا ایلوپلین اَپن کی چیل گالی

★[1] لنگوٹ: ''وہ کم عرض کپڑے کی پٹی جو پہلوان، سادھو یا فقیر لوگ اپنی شرمگاہ کو چھپانے کے لیے باندھتے ہیں۔ کاچھا۔ ایسا لباس جو صرف شرمگاہ کو چھپاتا ہو۔'' اُردو لغت۔ اس طول طویل تشریح کے بجائے صرف یہ تشریح کردی جاتی کہ یہ دو ہندی لفظوں سے بنا ہے تو معنی اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتے: لِنگ + اوٹ۔

★[2] نپوتے: بے اولادے۔ جس کا کوئی پُوت نہ ہو۔

★[3] انگول: (ہندی) وہ غُسل جس میں سر پر پانی نہ ڈالا جائے۔

اور چیل کے بلابل اونچا اُل سکتا ہے؟'' (کیا ایروپلین اپنی چیل گاڑی اور چیل کے برابر اونچا اُڑ سکتا ہے؟)

میری حیثیت ڈھائی دن کے اچنبھے کی سی تھی۔ میرے لیے سب سے بڑا اعزاز اور حسین ترین تقریب بہر ملاقات یہ نکلی کہ مسٹر مُکر جی نے جو جے پور کے قدیم اور مشہور اسکول آف آرٹس کے پرنسپل تھے، مجھے اپنی صاحبزادی نیبھا سے ملوانے اپنے گھر چائے پر بلایا۔ نیبھا نے بھی اسی سال پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے بی۔ اے کیا تھا۔ میرے کشمیری پنڈت دوست کلدیپ نرائن ٹِکو کی اس سے تین چار دُوبدُو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے اتنے قریب سے اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے اس سے پہلے اتنے قریب سے کوئی بدصورت عورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک دن کہنے لگا کہ وہ ہنستی ہے تو دائیں گال میں ڈمپل پڑتا ہے۔

میں نے جل کر کہا ''وہ تو کبھی کبھی میرے دائیں میں بھی پڑ جاتا ہے۔''

بولا ''ہاں دیکھا ہے۔ وہ ڈمپل نہیں، ڈینٹ دکھلائی پڑتا ہے! جب تم روہانسے ہوتے ہو، جو کہ اکثر ہوتے ہو، تو صاف نظر آتا ہے۔ نیبھا بہت ہی حسین ہے۔ ذرا plump side پر ہے۔ ''buxom beauty'' اسی کو کہتے ہیں۔ غضب کی ڈانسر ہے۔ جب راجستھانی کتھا کلی آئٹم پیش کرتی ہے تو ٹھاٹھ، تتکار اور توڑے میں بنگالی ڈانسرز کی نفاست، رچاؤ اور شائستگی نظر آتی ہے۔ ٹھکا ہو یا ٹھیکا، چکّر کے دوران چال کا بہاؤ یا نرت بھاؤ، مجال ہے کہ نرتکی کے سینے کی تھرکن نظر آئے! نیبھا کا سینہ نہیں ہلتا، مگر رشفتالو جیسے گال ہلتے ہیں!''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، جی؟'' میں نے پھر جل کر کہا۔ میں یہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا کہ اُس نے نیبھا کو اتنے قریب سے دیکھا ہے۔ ''گال کیوں ہلتے ہیں؟'' میں نے سوال دہرایا۔

''اس لیے ہلتے ہیں کہ گالوں کو تو انگیا کُرتی نہیں پہنائی جا سکتی۔ کیا سمجھے؟'' اُس نے سمجھایا بھی اور سُجھایا بھی۔

اسی زمانے میں یہ سننے میں آیا کہ مہاراجہ جے پور بھی اس پری چہرہ پر فریفتہ ہے! جب یہ سنا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بیتاب ہے تو میں اس سے کہیں زیادہ بیتاب ہو گیا! ہاتھ پاؤں پھول گئے جس کے نتیجے میں اُن کی شاندار کوٹھی پر مقررہ وقت سے آدھے گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ مُکر جی بہت شفقت سے پیش آئے۔ نیبھا نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اُس کا ہاتھ گرم ہے اور میری ہتھیلی بھیگی بھیگی سی ہے۔ اس نے اپنی خوبصورت آٹوگراف بُک میں دستخط کرائے تو میرے دستخط پسرتے چلے گئے اور آٹوگراف بُک کو اُلانگ گئے! میں کہ، بقول مرزا، اندرون سانگا نیری

گیٹ، محلہ شِکاریان، کوٹ تلے (قدیم خستہ فصیل کے زیرِ سایہ) کا blind-folded رہائش ٹھہرا، سو میں نے اِس سے پہلے کسی جوان بھری پُری لڑکی کو ایسی اوسان خطا کر دینے اور جوان خون اونٹا دینے والی نزدیکی سے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دوست احسان الحق راسخ حیدرآبادی تو ایسی صورتِ حال کو ''غُربتِ خریبہ'' (قربتِ قریبہ) کہتے ہیں جو دل پہ ہزار خرابی لاتی ہے۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوا۔ وہ اس طرح کہ چائے سے پہلے میں نے سموسہ اٹھانے کی بجائے بے دھیانی میں اپنی انگلیاں دہی بڑوں کے پیالے میں ڈبو دیں۔ وجہ ظاہر ہے: تمامتر توجہ اور نظر تو ماتھے کی بندیا، زلفِ بنگال، سڈول ایڑی، خونِ تمنّا سے بھی زیادہ سرخ ناخنوں اور نروس آدمی کی طرح لرزتے آویزوں پر مرکوز تھی۔ بلکہ وہیں چپک کے رہ گئی تھی! تصور کہاں تھا، اس کا حال کیا بتائیں۔ عالمِ تصور کی خودساختہ لذتوں کے بارے میں اس مصرعہ کا مطلب اب کہیں جا کے سمجھ میں آیا:

ع ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے!

کہاں کہاں کے بجائے جہاں تہاں پڑھا جائے تو مصرعہ کچھ اور ہی مزہ دے گا۔

عاجز نے جو کچھ دیکھا وہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ مرزا ایک دن مائل بہ اصلاح ہوئے تو کہنے لگے ''حسینوں کے بالکل irrelevant (غیر متعلق) حاشیاتی اور آرائشی اوصاف کا جتنی باریک بینی اور دیدہ ریزی سے تم مطالعہ کرتے ہو اُس کی مثال نہ ادب کی تاریخ میں ملتی ہے، نہ پریشاں نظری کی داستانوں میں! تم کتابِ حُسن کے متن سے کہیں زیادہ اُس کے فُٹ نوٹ، اوروں کی خط کشیدہ عبارت اور حاشیوں میں پنسل سے لکھے تعریفی یا طنزیہ فقروں اور دوسروں کے موڑے ہوئے صفحات کے dog-eared کونوں کو سیدھا کرنے میں بلا کی دلچسپی رکھتے ہو! دیدنی کو دیکھنے کی طرح دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔''

''نیچی اور پہلی نظر میں جو نظر آ جائے تو اُس پر اکتفا کرتا ہوں۔ مجھے واصلِ جہنم کرنے کے لیے وہی کافی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

فرمایا ''سمجھ دار آدمی کو جو کچھ دیکھنا ہو اور نظارگی کی جتنی ہَوس اور حوصلہ ہو، اُس کی گنجائش پہلی ہی نظر کے الاسٹک دورانیے میں نکال لیتا ہے۔ دوسری تیسری یا پِلی نظر تو اناڑی ڈالتے ہیں یا ناقابل اصلاح نظر باز۔ یا پھر نمبر سے اتری ہوئی عینک لگانے والے بڈّھے ٹھرکی۔''

مُکر جی نے تواضع میں، محاورتاً نہیں بلکہ سچ مچ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ کون سی چیز تھی جو میز پر نہیں تھی ___ رَس گُلے، کاجو کی برفی، چھولے، امرتیاں، گھر میں 'بیک' کیا ہوا کیک، دال موٹھ، تازہ گھان کے گرم پکوڑے۔ میں نے ہر چیز چکھی، سوائے پکوڑوں کے۔ وجہ اس کی یہ کہ

رمضان کے بعد بقرعید تک مجھے گرم پکوڑوں کی بھبک اور لپٹ برابر آتی رہتی ہے۔ پھر اس کی جگہ بوک ★[1] بکروں کی تیز بکراہند لے لیتی ہے۔

کچھ دیر بعد ان کے باوردی ملازم نے چاندی کی ٹرے میں چار خوبصورت فنجان پیش کیے۔ میں نے جھٹ ایک فنجان اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں ڈکوس لیا۔ ایک ہی گھونٹ میں اس لیے کہ اس میں بس اتنا ہی پانی تھا۔ وہ بھی نیم گرم۔ پانی کی کنکناہٹ کو میں نے اُس زُہرہ جبیں کی گُنگُناہٹ و رسمساہٹ ★[2] اور گرمیٔ صُحبت کا کرشمہ جانا۔ چند لمحوں بعد یہ دیکھ کر پانی پانی ہو گیا کہ نیبھا اور اُس کے والدین نے ان خوبصورت فنجانوں میں اپنی انگلیاں ڈبو ڈبو کر صاف کیں! میں نے اس سے پہلے finger bowls نہیں دیکھے تھے۔ انگلش لٹریچر اور فلاسفی کی ٹیکسٹ بکس میں کہیں بھی ان کا ذکر نہیں تھا۔ وہ بھلے مانس یہ دیکھ کر نہ مسکرائے، نہ منہ پھیر کر ہنسے۔

مسٹر اور مسز مُکر جی بہت خوش اخلاق تھے۔ نیبھا اتنی اچھی، سلیقہ شعار اور خوبصورت نکلی کہ اسے وہیں مسلمان کرنے کو جی چاہا ____ والدین سمیت!

مرزا کہتے ہیں ''یہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں ادیب کوثر و تسنیم میں دُھلی زبان میں لکھتا ہے۔ فلاں آبِ گنگ و جمن میں قلم ڈبو کے شعر کہتا تھا یا اپنے فیض صاحب:

؎ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

لیکن تمہارا کیس مختلف ہے۔ تمہاری تحریروں میں جو ایک نیم گرم اور گدلی سی مگر زور آور زیریں لہر ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اُسی فِنگر بول میں پانچوں انگلیاں ڈبو کر لکھتے ہو!

اپنی اس سُبکی اور خِفّت کا ذمہ دار میں نے رجواڑے اور ریاست کے سَرِیل ماحول، ماڈرن etiquette اور ادب آداب سے ناواقفیت کو ٹھہرایا۔ اس سے میرا یہ خیال، یقینِ واثق میں تبدیل ہو گیا کہ مجھے تنگنائے جے پور سے نکل کر سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخلہ لینا چاہیے۔ بقول مرزا، میری ناقص عقل جو فیصلہ کرنے میں ہچر مچر کر رہی تھی، وہ فنگر بول کے ایک گھونٹ نے پلک جھپکتے میں کر دیا! یوں تو کہنے کو مہاراجہ کالج میں بھی رُبع صدی سے ایم۔ اے کی کلاس تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے

★[1] بوک: جوان اور مست بکرا جس کے فرنچ کٹ چگی ڈاڑھی ہوتی ہے۔ زندہ اور مردہ، دونوں حالتوں میں، بدبو دار ہوتا ہے۔ بکریوں میں مقبولیت کی بنا پر نسل کشی کے کام آتا ہے۔ گوشت، بقول معتبر لُغت نویس Platts، لجلجا ہوتا ہے۔

★[2] گُنگُناہٹ و رسمساہٹ: یہ لفظ میں نے تازہ تازہ سیکھے تھے اور انہیں موقع بے موقع استعمال کرنے کے لیے بیتاب تھا۔ فراق گورکھپوری کی رباعیات میں پہلے پہل دیکھ کر چکرایا۔ پھر لغت دیکھ کر مسکرایا اور ان کھُلجڑیوں سے اپنے ہی جیسے کسی نابلد کو خیرہ کرنے کی غرض سے گھات لگا کے بیٹھ گیا۔

کہ رُبع صدی سے سب لڑکے بڑی مستقل مزاجی سے تھرڈ ڈویژن لیتے رہے تھے۔ جو دلیل اُن سب دلیلوں پر بھاری ثابت ہوئی جن سے میں والد کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا، وہ یہ تھی کہ سینٹ جانس کالج میں ایک انتہائی قابل انگریز خاتون مِس مارجری بالڈ انگلش لٹریچر پڑھانے کے علاوہ دیسی تلفظ اور بابو انگلش کی اصلاح بھی کر دے گی جس سے انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کے مقابلے کے امتحان میں اچھی پوزیشن لانے میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ یوپی میں دو سال گزارنے کے بعد میں اہلِ زبان سے بھی بہتر اردو بولنے اور لکھنے لگوں گا۔ لیکن ایک بُرہانِ قاطع اور قاطعِ بُرہان جس کا ذکر قبلہ والد صاحب سے کرنا قرینِ مصلحت نہ جانا وہ یہ تھی کہ معتبر اطلاعات کے مطابق سینٹ جانس کالج میں ڈیڑھ سو لڑکے اور ساڑھے تین سو چُلبلی لڑکیاں بتائی جاتی تھیں۔ جب کہ مہاراجہ کالج جے پور میں چار سو لڑکے اور تین nuns صفت لڑکیاں تھیں۔ اِن دُکھیاریوں کی پاکدامنی لڑکوں کو زہر لگتی تھی!

آگرے کے بارے میں میری معلومات نظیر اکبرآبادی، مخمور اکبرآبادی، غالب کی جائے پیدائش، تاج محل، آفتابِ موسیقی استاد فیاض خاں، جُفت سازی، (کچھ عرصے بعد فلم برسات کی ایکٹرس نمّی) سینٹ جانس کالج میں لڑکیوں کی اُمید افزا تعداد، پیٹھے کی مٹھائی اور دال موٹھ تک محدود تھیں اور وہ بھی اس حد تک زبانی کلامی تھیں کہ تاج محل یا نمّی کو بچشم خود دیکھنا تو بہت دور کی بات ہے میں نے تو آگرے کی چٹ پٹی دال موٹھ تک نہیں چکھی تھی!

(۲)

آگرے میں روزِ اوّل سے مسرور حسن خاں نے جو میرے کلاس فیلو اور ڈے اسکالر تھے، مجھے اپنی تحویل اور سرپرستی بلکہ پَر پرستی میں اس طرح لیا جیسے مُرغی تڑخے ہوئے انڈے سے تازہ تازہ برآمد ہونے والے بے بال و پر چوزے کو اپنے پھولے ہوئے پروں تلے دبوچ کر گرم پوٹے سے چمٹائے رکھتی ہے۔

پہلی ملاقات سے اپنی وفات تک، جس کی مدت کم و بیش ساٹھ سال بنتی ہے، مسرور حسن خان مجھے ''سیّد صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ جیسے ہی یوپی کے ماحول اور نستعلیق طور طریق سے میری چُندھیاہٹ کم ہوئی اور تازہ سیکھے ہوئے محاورے کے مطابق ہیاؤ کُھلا تو میں نے پوچھا ''حضرت، آپ مجھے سیّد صاحب کیوں کہتے ہیں؟''

بولے ''معاف کیجیے، میں نے آپ کو طنزاً قریشی یا انصاری تو نہیں کہا جس سے آپ offend ہوں! سیدھے سُبھاؤ سیّد صاحب کہتا ہوں۔ آپ نے اچھا کیا کہ پوچھ لیا۔ بات یہ ہے کہ میں آپ

کی عزّت کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کا کوئی real یا فرضی جواز بھی تو ہونا چاہیئے۔''

اس وضاحت کے بعد میں انہیں آپ کے بجائے تم کہنے لگا جو لہجے اور نیّت کے لحاظ سے ''تُو'' سے بھی آگے کی چیز تھی۔ وہ حسبِ عادت مجھے سیّد صاحب اور آپ کہتے رہے۔ طرفین نے اپنا اپنا طرزِ تخاطب آخری دم تک نباہا۔

مجھ کو ریاستی ''پینیڈو''، پڑھاکو اور نو وارد جان کر انہوں نے میری مکمل ''بریفنگ'' کا ذمہ از خود لے لیا۔ انہوں نے پہلی ''وارننگ'' دیتے ہوئے کہا کہ انگلش ڈبیٹر کی حیثیت سے آپ کی بڑی دُھوم اور دھاک ہے۔ اس لیے قوی اندیشہ ہے کہ کالج کی ۲۱ لڑکیاں آپ پر باجماعت عاشق ہو جائیں گی!

''۲۱ ہی کیوں؟'' مجھ سے نہ رہا گیا۔

''کیا کریں، کالج میں بدصورت لڑکیوں کی تعداد بس اتنی ہی ہے۔ سیّد صاحب، آپ پر قناعت و توکّل لازم ہے۔ if and when یہ سانحہ درپیش ہو تو اوّلین flirtation پر مجھے SOS کیجیے گا۔ میں ان چُڑیلوں کی آرتی[1] ★ اُتارتا رہوں گا۔ meanwhile آپ آگرے کی مشہور دال موٹھ اور پیٹھے کی مٹھائی سے دل بہلاتے رہیئے گا۔ ایک پاؤ پیٹھے میں ایک سیر شکر سمو دیتے ہیں۔ بالکل شفاف بلّور کی قاش لگتی ہے۔''

دوسری ''وارننگ'' یہ کہ کالج میں ایک خوبصورت لڑکی ایسی ہے جو آپ کو ڈبیٹ میں اوّل نہیں آنے دے گی۔ porcelain beauty ہے۔ آپ کی نیبھا مُکر جی پُھکر جی اس کے آگے پانی بھرتی ہے۔ ہے وہ بھی بنگالن۔ نام بسنتی باگچی۔ سفید ساری پر سیاہ بلاؤز پہن کر تقریر کرتی ہے تو اچھے اچھوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ جس ڈبیٹر نے بھی نگاہ بھر کے دیکھا، وہ ہکلانے لگا! سیّد صاحب، شیروانی پہن کر انگریزی میں ہکلانا، اردو میں ہکلانے سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز ہوتا ہے!

تیسری وارننگ: ''سینٹ جانس کالج میں کوئی لڑکا شیروانی نہیں پہنتا۔ اور وہ بھی کھدر کی! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے، آج کل برٹش گورنمنٹ کے خلاف Quit India Movement زوروں پر ہے۔ آپ فقط اس خَلجَلی سی شیروانی کی بدولت پہلے ہی جھپٹے میں لاَبِن دھر لیے جائیں گے۔ جیل میں آپ سے ملنے نہ کانگریسی آئیں گے، نہ مسلم لیگی۔ اور نہ وہ مسخرہ ٹیلر ماسٹر! آپ C کلاس کی سلاخوں کے پیچھے اکیلے ٹُروں ٹُوں اکڑوں بیٹھے رہ جائیں گے۔ نیبھا مکر جی کو یاد کر کے اتنا روئیں

---

[1] ★ آرتی: دیوتا، دولہا، محبوب یا کسی مقدس ہستی کی پُوجا کا ایک طریقہ ''جس کی صورت یہ ہے کہ پجاری مندروں میں پیتل کے پنج شاخے (پانچ بتیوں والا چراغ) کی ساری بتیاں روشن کر کے دیوتا کی مُورت کے سر کے گرد پھراتا ہے۔ باجے اور گھڑیال کی گونج میں پُجاری اور حاضرین بھجن گاتے جاتے ہیں۔''

گے، اتنا روئیں گے کہ دونوں کے فنگر بول لبالب بھر جائیں گے! آپ سے بعید نہیں کہ اُنہیں بھی ایک ہی سانس میں سُڑک جائیں!''

چوتھی وارننگ یہ کہ آگرہ یونیورسٹی میں ہر سال کوئی نہ کوئی پڑھاکو لونڈا فرسٹ کلاس فرسٹ آجاتا ہے۔ آخر کسی کو تو آنا ہی پڑتا ہے۔

ظاہر ہے اس وارننگ کا مقصد میرا پانی اُتارنا تھا۔ کچھ دن بعد پانچویں وارننگ: ''آپ نے ابھی فورتھ ایئر کی دیپالی تعلقدار کا بھارت نٹیم ڈانس نہیں دیکھا۔ تاج محل کے بعد یہ 8th.wonder ہے! اِس کے آگے آپ کی غیبھا شیبھا پانی بھرتی ہے۔''

انہوں نے میری چڑ بنالی تھی۔ میں نے پلٹ کے وار کیا ''تم نے اُس کو یہ خدمت دوسری دفعہ تفویض کی ہے۔ آخر اُس دُکھیا سے اپنے پری خانے میں کتنی دفعہ پانی بھرواؤ گے؟''

مسرور حسن خاں بہت مخلص، جذباتی حد تک محبتی، اپنائیت و مساوات پسند دوست ثابت ہوئے۔ مطلب یہ کہ جو غلطی خود کرتے، وہ ہم سے بھی اپنی نگرانی میں کرواتے تھے۔ مرزا کہتے ہیں کہ نامعقول حرکت سے پہلے اور بعد میں ''مورل سپورٹ'' کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کالج کے سب سے سینئر اور ''پاپولر'' طالب علم تھے۔ اُس زمانے میں خود اُن سے پوچھنے کی ہمت تو نہ ہوئی، لیکن اُن کے مقرّبین نے بتایا کہ دو مختلف مضامین میں ایم۔اے۔Prev کر چکے ہیں۔ اب انگلش میں تیسرا پریویس کر رہے ہیں۔ فائنل میں جانے سے خود کو اس لیے باز رکھتے ہیں کہ خدانخواستہ پاس ہو گئے تو کالج چھوڑنا پڑے گا۔ گرلز ہاسٹل میں کُہرام مچ جائے گا، جو اُن سے دیکھا نہ جائے گا۔ حسینوں کے مرمریں بازوؤں پر کالی سیاہ ماتمی پٹی کے تصور ہی سے اُن کا کلیجا منہ کو آتا تھا! یہ عالم ''سوگ'' کا دیکھا نہ جائے۔

مرزا اکثر کہتے ہیں کہ ''مسرور حسن خاں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ کس واسطے کہ آخر آخر میں اپنی بیوی کا رنڈاپا نہیں دیکھ سکتے تھے!''

انہوں نے مجھے دیارِ غیر میں تنہائی اور اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مجھے زیادہ افسردہ یا فکر مند دیکھتے تو، وجہ دریافت کیے بغیر، اس کا علاج غذا سے کرتے تھے۔ فوراً گھر لے جاتے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اُداسی اور غمگینی کا علاج چار غ (غین) ہیں: غِنا، غُنودگی اور غزالی آنکھ۔ مگر خالی پیٹ نہیں۔ پہلے غذا! خیر مجھے تو اپنی chronic (دائمی۔ مزمن) اُداسی کے طفیل اُن کے گھر کے کھانوں کی چاٹ لگ گئی تھی، لیکن اکثر یوں بھی ہوا کہ خود ان کا جی کڑھائی سے اُترتے پکوڑے یا شامی کباب کھانے کو چاہا تو (اہلِ زبان بڑی بوڑھیوں کے بقول) اُلٹا مجھ پر چُھدّا (احسان) رکھتے کہ ''سیّد صاحب آج آپ معمولِ مبارک سے کچھ زیادہ ہی افسردہ اور مُشوّش نظر آرہے ہیں۔ سائیکل نکالیے۔ گھر

چلتے ہیں۔''

لفظ مُشوَّش انہوں نے مجھی سے سیکھا تھا۔ ایک دفعہ دوران گفتگو اسے استعمال کر کے میں ساٹھ سال تک برابر پچھتاتا رہا۔ انہوں نے جھٹ ٹانک لیا۔ جب بھی، جہاں، بھی ملتے مجھے چڑانے کے لیے یہ لفظ ضرور استعمال کرتے، مگر اس تصرفِ ظریفانہ کے ساتھ کہ م پر پیش کے بجائے زبر لگاتے اور واؤ کی تشدید کو حذف کر دیتے۔ یعنی مَشوش بروزن مَسوس، جس سے اس لفظ کی صوتی نحوست اور لُغوی لَغویت دونوں میں دوچند اضافہ ہو جاتا۔

انتقال سے کچھ دن پیشتر آخری ملاقات ہوئی۔ چار پانچ گھنٹے تکلیف دہ dialysis کرا کے آئے تھے۔ دونوں گُردے فَیل ہو گئے تھے۔ پانی سے سخت پرہیز تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ ہاتھ میں تھام کر تشفی دی تو آخری بار اس لفظ کی مار دیتے ہوئے کہنے لگے'' آپ مشوش نہ ہوں۔''

انہوں نے پہلی مرتبہ مجھے سیّد صاحب نہیں کہا!

میں نے اُن کا جی بہلانے کے لیے کہا'' حضرت، میری گرانیٔ طبع اور پریشانی کے باقاعدہ درجات ہیں:

مُتحیّر، مبہوت، مکدّر، مُنغّص، مُنقبض، مُتردّد، مُشوّش، مُتوحّش، مضطرب، محزوں، متالّم۔ بالآخر مُتحجّر یعنی پتھر کا ہو گیا۔ اب جو کرنا ہے کر لو۔''

ہلکی سی مسکراہٹ مہینوں سے پانی کو ترسے ہوئے ہونٹوں پر آئی۔ اشارہ کیا کہ اپنے کان میرے قریب لاؤ۔

پھر کہنے لگے'' سیّد صاحب، آپ آسان اردو میں پریشان نہیں ہو سکتے؟''

سُناری مہارت اور ٹُھک ٹُھک سے گھڑ گھڑایا اور کسی کُوڑھ مغز لڑکے کی طرح رٹا رٹایا یہ لڑی بند جملہ میں نے یہ اُمید دادِ تفنن مرزا کو سنایا تو ارشاد ہوا'' اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے، تم پر کبھی کوئی اُفتاد پڑی تو اظہارِ ہمدردی سے پہلے بائیس جلدوں والا'' اردو لغت'' دیکھنا پڑے گا کہ مُتحیّر سے لے کر مُتحجّر یعنی پتھر ہونے تک حضور والا خبط اللغات اور نفخِ فرہنگ ★ کے کس درجۂ خاص میں مبتلا ہیں!''

دیکھیے، میں رواداری بلکہ بے راہ روی میں ایک ہی قلم جست میں ساٹھ سال اُلانگ گیا۔ سچ تو یہ کہ بعضے بعضے الفاظ چھلاوے ہوتے ہیں۔ اس غضب کی چھب اور چھل بل دکھلاتے ہیں کہ اچھے اچھے سیانے بھٹک کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ جب کہ کوئی کوئی چکا چوندھ کے باعث وہیں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے جیسا کہ ابھی میرے ساتھ ہوا۔ اس خیرگی سے پہلے میں یہ کہنے جا رہا

★ نفخِ فرہنگ: ڈکشنری یعنی ثقیل الفاظ کا اپھارا۔ ثقیل غذا کے باعث مویشیوں کی جگالی بند ہو جاتی ہے اور پیٹ پھول جاتا ہے۔ بیشتر اس کی تاب نہ لا کر مر جاتے ہیں۔ لیکن نفخِ فرہنگ میں مبتلا قاموسیے خود نہیں مرتے۔ اوروں کو مار رکھتے ہیں!

تھا کہ مسرور حسن خان مجھے اپنے گھر لے جاتے تھے۔ اس خوبصورت گھر کا محل وقوع ایک محفل میں بیان کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ان کا بنگلہ ایک چھوٹے سے، لیکن اونچے ٹیلے پر واقع ہے، جس کے نیچے BB&CI ریلوے کی ٹرین اتنے قریب سے گزرتی ہے کہ اگر ہم بنگلے کی چھت پر سے چھلانگ لگائیں تو پٹری پر جا گریں اور انجن سے کٹ کر دو ٹکڑے ہو جائیں۔

اس پر مرزا بولے کہ "صاحب، آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ دو دفعہ فوت ہونا چاہتے ہیں؟ ایسی صورت میں پوسٹ مارٹم کے بغیر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ گر کر مرے یا مکمل طور پر مرنے سے پہلے ہی انجن کے نیچے آ کر دو ٹوک فوت ہوئے۔ مطلب یہ کہ مر کے کٹے یا کٹ کے مرے؟"

اپنے گھر لے جا کر جو کباب اور حلوے وہ کھلاتے تھے، انہوں نے، انگریزی محاورے کے مطابق، اخلاص و یگانگت کو محکم و مضبوط بنانے میں سیمنٹ کا کام کیا۔ اسی گھر میں ریڈیو پر پہلے پہل فیض صاحب کو "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" پڑھتے سنا۔ تین چار دن سرشاری کے عالم میں گنگنانے کے بعد ہم پر منکشف ہوا کہ یہاں تو "پہلی سی" ہی نہیں، اگلی پچھلی، آئندہ و موجودہ محبت کا خانہ بھی خالی اور اُجاڑ پڑا ہے! اب جو اپنے ماضی کا بیدردانہ تجزیہ کیا تو کھلا کہ ماضی کی جتنی بھی مُستند، مُسلّمہ اور منحوس اقسام کتابوں میں گنوائی گئی ہیں۔ یعنی ماضی استمراری، ماضی احتمالی، ماضی بعید، ماضی قریب، ماضی شکیہ، ماضی مطلق، ماضی ناتمام، ماضی شرطی، ماضی معطوفہ، ماضی ناگفتنی ___ ان میں سے کسی کا بھی اطلاق ہماری مختصر سی بے صرفہ جوانی پر نہیں ہوتا! اُٹھتی جوانی میں آدمی آپی آپ یعنی بے وجہ رومینٹک ہو جاتا ہے اور بے وجہ رومینٹک رویّہ کا خاصہ اور خمیازہ بے وجہ اُداسی اور مایوسی ہیں! رونا اِس پر آتا ہے کہ اگلا اسے بھی "انجوائے" کرتا ہے! چناں چہ اُس زمانے میں ہم بھی شدّت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ ہمارے حصّے میں تو بس ماضی تمنائی★[1] بہ افراط آیا ہے جو سیم، کلّر اور تھور کی مانند حال اور مستقبل کو کھاتا چلا جاتا ہے۔

جب کسی بندۂ خدا کو اپنی محرومی، نامرادی اور مظلومیت میں میرؔ کی طرح مزہ، بلکہ ان پر پیار آنے لگے تو جان لو کہ اُس کا مرنا جینا اِسی خودساختہ و خود کار و خود آرا بہشتِ بریں میں ہوگا!

(۳)

جو پنچھی پہلی بار گھونسلا چھوڑتا ہے وہ ایک عجیب سے ناسٹلجیا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُسے چھوڑا ہوا گھونسلا یاد تو بہت آتا ہے، مگر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ گھونسلا اب نئی زمین، نئی فضاؤں

★[1] ماضی تمنائی: "وہ ماضی جس کے اظہار میں تمنا کا کلمہ ہو۔ جیسے کاش وہ آتا۔"

اور نئی ہواؤں میں اُسی درخت کی اُسی شاخ پر ٹنگا ہو! ہاں چوگا اور چہچہے نئے ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مسرور حسن خاں کو ذرا بھی شک گزرتا کہ میں اداس یا ''ہوم سِک'' ہوں تو وہ کسی تازہ اسکنڈل، لطیفے یا اچھی خبر سے اس طرح حوصلہ دلاتے جیسے لڑکے اپنی ہارتی ہوئی فٹ بال ٹیم کو ''buck up'' کرتے ہیں! پہلے ہی دن پہلا مُژدۂ جانفزا یہ سنایا کہ ''ایک فوجداری مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں قائداعظم ہر پیشی پر آگرے تشریف لاتے ہیں۔ ہماری تو عید ہو جاتی ہے۔ میں تو ہر پیشی پر مُلزم سے بھی پہلے پہنچ جاتا ہوں۔ اگلی پیشی پر آپ بھی ساتھ چلیں گے۔ مگر سیّد صاحب، کھدّر کی شیروانی اتار کے!''

اُسی دن دوسری خوش خبری یہ کہ ''رومینٹک پوئٹری مِس مارجری بالڈ پڑھائے گی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں لیکچرر تھی۔ Shelley پر اتھارٹی ہے۔ ہندوستان سیاحت کی غرض سے اور آگرہ تاج محل دیکھنے آئی تھی اور یہیں پڑ رہی۔ اس لیے کہ جنگ (World War II) چھڑ گئی اور واپسی کی سب راہیں مسدود ہو گئیں۔ کتابی تنقید سے احتراز کرتی ہے۔ ہر تبصرہ اوریجنل ہوتا ہے۔ کبھی کسی نقاد کو ''کوٹ'' نہیں کرتی۔ جس زمانے میں ہمارے آپ کے nappy بندھی اور منہ میں چُسنی ہوگی، یہ خاتون جوان اور حسین رہی ہوگی۔ بالوں میں ہمیشہ سرخ ربن باندھتی ہے۔ کبھی اس کو ٹاپس، ہار یا انگوٹھی پہنے نہیں دیکھا۔''

تین چار ماہ بعد میں نے دیکھا کہ ہمارے ایک نہایت ذہین کلاس فیلو اور مشترک دوست کو مِس بالڈ نے اپنی ایک کتاب پڑھنے کو دی جس پر اُس کے دستخط کے نیچے ۱۹۲۲ء کی تاریخ درج تھی۔ وہ بار بار اُس کے دستخط اور سنہ پر اُنگلی پھیرتے رہے! کہنے لگے ''مِس بالڈ نے یہ دستخط بھری جوانی میں کیے تھے۔'' ہم دونوں کو بالاصرار دعوت دی کہ آپ بھی اس پر ایک بار اُنگلی پھیر کر دیکھیں تو سہی!

مسرور حسن خاں نے بریفنگ جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ تیورس کے سال مس بالڈ ورڈز ورتھ کی ایک نظم پڑھاتے پڑھاتے کہنے لگی کہ ''کلاس روم میں ورڈز ورتھ کی نظم پڑھنی اور پڑھانی ورڈز ورتھ اور نیچر دونوں کے ساتھ صریحاً زیادتی ہوگی۔ کل ہم سب Baker پارک چلیں گے۔ وہاں گھنے درختوں کے سائے، پھولوں کی خوشبوؤں میں رچی بسی اور تتلیوں سے سجی فضا میں یہ نظم پڑھیں گے تو لطف و معنی کی نئی تہیں کھلتی چلی جائیں گی۔'' لہٰذا سب طُلّاب (جی ہاں مسرور نے طلبہ کی جگہ یہی قصّاب لفظ استعمال کیا تھا) وقت سے دو گھنٹے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ مِس بالڈ نے سارے باغ کا معائنہ کرنے کے بعد ایک ہرا بھرا کُنج منتخب کیا۔ ابھی سب گھاس پر بیٹھنے بھی نہ

پائے تھے کہ شہد کی مکھیوں نے یلغار کر دی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے شرارتاً چھتے کو چھیڑا ہے۔ کچھ لڑکے اُس نامعلوم شرارتی کو اور بیشتر، مکھیوں کو ماں بہن کی گالیاں دیتے بھاگے۔ دو لڑکیاں ساری میں تھیں۔ وہ ایسے زِگ زیگ بھاگیں جیسے کوئی خونی عمر قیدی ڈنڈا بیڑی پہنے فرار ہو رہا ہو! مِس بالڈ نہ جانے کیوں باوقار پوز بنائے وہیں کھڑی رہی! مکھیوں کے ڈنک سے چہرہ چُنری ہو گیا۔ چار دن اسپتال میں رہی۔ مزید تین دن کی رخصت کے بعد آئی تو ورڈز ورتھ کی نظم پڑھانے کی بجائے شیلے پر لیکچر دیا۔

ہائی جمپ میں اوّل آنے والا ایک لڑکا مکھیوں سے بچنے کی غرض سے ایک درخت پر بلند ترین گُدے تک چڑھ گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ ایک فٹ بھر لمبا گرگٹ دو فٹ لمبی زبان لَپ لَپا رہا ہے۔ دہشت زدہ ہو کر درخت کے گُدے اور گرگٹ سمیت زمین پر دھم سے آن گرا جہاں مکھیوں نے آلیا۔

کچھ عرصے بعد جموا گڑھ میں ایک قصّہ گو اور زیٹیے★ شکاری سے اسی سے ملتا جلتا قصّہ سنا۔ وہ کچھ یوں تھا کہ بندروں کے ایک غول نے شیر کی بُو پائی تو دُم دبا کے بھاگ لیے۔ ایک بندر نے جو کچھ زیادہ ہی سیانا تھا، بھاگنے سے بھی زیادہ محفوظ طریقہ اختیار کیا۔ وہ ایک اونچے درخت کے سب سے اونچے گُدے پر چڑھ گیا۔ شومیٔ قسمت کہ شیر اُسی طرف آیا۔ جیسے ہی وہ اس درخت کے نیچے پہنچ کر ڈکارا، بندر خوف و دہشت سے بے ہوش ہو کر بھداک سے شیر کی کمر پہ آن گرا۔ شیر اس آسمانی دھماکے سے ڈھینکلی کھا کے دھاڑا۔ پھر اُٹھ کے زِپاٹے بھرتا تراٹ ہو گیا۔ رستے میں ہرنوں کی ڈار ملی، پر نظر بھر کے نہیں دیکھا۔ درخت کا بھی ایسا ہول بیٹھا کہ کہیں دم لینے کے لیے سائے میں نہیں رکا۔

کچھ دن بعد یہ خوش خبری دی کہ میں آپ کو سیسل (Cecil) ہوٹل کا وہ کمرہ دکھانا چاہتا ہوں جہاں قائداعظم قیام کرتے ہیں۔ اس کمرے کے شایانِ شان تو سال میں دو تین ہی بڑے لوگ آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے انتظار میں سال بھر اپنے ڈبل بیڈ پر پلنگ پوش ڈالے اُجاڑ پڑا رہتا ہے۔

مسرور حسن خاں سے روایت ہے کہ قائداعظم پہلی دفعہ سیسل ہوٹل میں چیک اِن ہوئے تو اینگلو انڈین منیجر نے انہیں یہ وی آئی پی suite دکھایا جو اُنہیں پسند آیا۔ منیجر نے اتراتے ہوئے کہا:

"His Highness the Nawab of Rampur stayed in this room."

قائداعظم نے ایک لمحہ تامّل کیے بغیر اپنے کرارے کڑکیلے لہجے میں فرمایا:

★ زیٹیے: بے سروپا باتیں کرنے والا۔ یاوہ گو۔ گپّی

"When the Nawab of Rampur comes again, would you mind telling him that Mr. Jinnah stayed in this room?"

پھر ایک اتوار کو لنچ کے بعد مسرور حسن خاں ہیلی بری ہاسٹل آئے۔ اتنے اوتاؤلے کہ سلام دعا کے بغیر کہنے لگے، جلدی سے اپنی رولس رائس (سائیکل) نکالیے۔ جوش ملیح آبادی صمد ہوٹل میں براجمان ہیں۔ ان سے ملنے چلتے ہیں۔ ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ جوش صاحب گزشتہ شب مشاعرہ پڑھنے گئے تھے۔ ابھی تک نہیں لوٹے! البتہ صبح گیارہ بجے ایک مدّاح کے ہاتھ اپنی بیاض بحفاظت تمام واپس بھیج دی اور اس کے بدلے میں اسکاچ وہسکی کی بڑی بوتل منگوائی!

بیرے نے بتایا کہ ''جوش صاحب مشاعرے میں جانے لگے تو کنڈے سے تالا نکال کے زمین پہ دے مارا۔ بولے، یہ بہت چھوٹا ہے۔ بالغ تالا لاؤ۔ پھر بڑا تالا لگا کے چابی مجھے سونپ دی!'' کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہم نے جھانک کر اندر کا نقشہ دیکھا۔ پانی کی صُراحی کی گردن میں موتیا کا ہار کمہلا رہا تھا۔ ڈبل بیڈ کی بائیں جانب عُجلت میں اتارے ہوئے پائجامے کی اِمرتی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں سُرخ ریشمی غلافوں میں ملفوف و مستور دو بوتلیں رکھی تھیں۔ غلافوں پر زردوزی کا کام تھا۔ بیرے نے بتایا کہ یہ وی۔ آئی۔ پی خُفیہ روم ہے۔ اس میں خاص لوگ ہی رین بکھیرا کرتے ہیں۔ یہ دو بوتلیں اُن کا ایک فدائی لایا تھا۔ غلاف بے شک ہوٹل چڑھاتا ہے۔

''غلاف ہر بوتل پر فٹ آجاتے ہیں؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''سید صاحب، آپ جوش کی قدم بوسی کے لیے آئے ہیں یا بوتل سے بغل گیر ہونے؟ واللہ، آپ غلافوں پر اتنے ہی لہلوٹ ہیں تو ایک اتار کے لے جائیے۔ اینو فروٹ سالٹ کی بوتل پر چڑھا لیجئے گا۔ دست آور تاثیر دُگنی بلکہ سہ آتشہ ہو جائے گی۔''

''میں نے ٹونک میں اپنے بچپن میں لوگوں کو رنگین غلافوں میں قارُورے سرِ بازار لے جاتے دیکھا ہے۔ ننگی بوتل میں قارورہ لے جانا خلافِ تہذیب تصور کیا جاتا تھا اور ہاں، کیا ان بوتلوں کے غلافوں پر زردوزی کا کام بھی آگرے ہی میں ہوتا ہے؟'' میں اپنی curiosity (اچنبھے۔ تجسس) پر قابو نہ پاسکا۔

''جی ہاں، یہیں ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے ان کے contents وہ نہیں ہوتے جو آپ کے مولد مبارک ٹونک شریف میں ہوا کرتے تھے۔''

میں یادوں کے پلٹتے سیلاب میں بہا چلا جا رہا تھا۔ طنز و تضحیک کا نوٹس لیے بغیر میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''میں ایک منظر کبھی نہیں بھولوں گا۔ ہماری (کرائے کی) حویلی متصل ''بڑا کنواں'' کے سامنے سے ہفتے میں کم از کم ایک دو بار ایک مفلوک الحال نوابزادہ اپنے کسی جگری دوست کے

لیے ایک چھوٹے سے پیالے میں جس پر دادا پردادا کے زمانے کا چاندی کا سرپوش رکھا ہوتا تھا، گھر میں پکی کسی پسندیدہ ''ڈش'' کا نمونہ سرِ بازار لے جاتا تھا۔ نمونہ میں نے اس لیے کہا کہ یہ پیالہ کثرتِ خلوص سے ایسا مُنہا منہ بھرا ہوتا کہ مشکل سے ڈیڑھ بوٹی قورے یا آدھی چھٹانک فیرنی کی گنجائش رہتی! وہ بندۂ خدا کسی لذیذ کھانے کا لقمہ اپنے یار کو چکھائے بغیر حلق سے نہیں اُتار سکتا تھا۔ اگر مجھے کوئی ایسا دوست مل جائے تو میں ساری عمر اُس کا غلام بن کر رہنا پسند کروں گا۔''

''سید صاحب، اگر آپ اپنے چٹور پن کی خاطر غلام بننے کے لیے اتنے ہی بیتاب ہیں تو بندہ آپ کو ہر جمعرات ★[1] کو اپنی سائیکل کے ڈنڈے پہ بٹھال کے نمک منڈی، شاہ گنج اور طوائفوں اور تماش بینوں کی رہ گزار بلکہ شب گزار سے ہوتا ہوا غریب خانے ڈھو کے لے جائے گا۔ ڈیڑھ بوٹی قورمے اور دو تولہ فیرنی سے تواضع کر کے آپ کی حسرتِ غلامی کی ہفتہ وار تسکین کا خوردنی سامان بہم پہنچاتا رہے گا۔''

(۴)

بالآخر وہ دن آگیا جب مسرور حسن خاں نے وہ خوش خبری سُنائی جس کا بے چینی سے انتظار تھا:

''قائداعظم پانچ دن بعد آگرے میں ہوں گے!''

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ عدالت لے جائیں گے۔ داخلے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، اس لیے کہ ان کے ماموں خان بہادر اختر عادل گورنمنٹ یعنی پراسیکیوشن کی نمائندگی کر رہے تھے۔ بالفاظ دیگر، قائداعظم کے مخالف ایڈووکیٹ تھے۔

داخلے کی دشواری کا حل تو انہوں نے نکال لیا، لیکن اس سے بھی بڑی ایک اڑچن کھڑی کردی۔ انہوں نے مُہماتی مزاج پایا تھا۔ نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ معمولی کام اور بات میں جب تک اپنے طریقِ کار سے گنجلک اور کھکھیڑ پیدا نہ کرلیں، اُنہیں مزہ نہیں آتا تھا۔ دُسراتھ اور مصاحبت کے اتنے قائل اور عادی کہ کہتے تھے، میں دوزخ میں بھی تمہارے بغیر اکیلے اکیلے جا کے کیا کروں گا! انہوں نے عدالت میں اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے ایک شرط لگا دی۔ کہنے لگے ''سید صاحب، شرط یہ ہے کہ مظفر برنی اور آپ کو پرسوں میرے ساتھ تاج محل کے گنبد تک climb کرنا ہوگا اور اُس کے کلس کی نوک کو چُھو کر آنا ہوگا۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند'' ★[2] انہوں نے اپنے

★[1] جمعرات: اس زمانے میں جمعرات کو فقیروں، یتیموں اور مساکین کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ خیرات اور لنگر بانٹا جاتا تھا۔ اُس دن کسی کو کھانے پر مدعو کرنا بدمذاقی تصور کی جاتی تھی۔

★[2] ''کیا کہنے! یہ کام تم ہی سے ہوسکتا ہے۔ مرد ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔''

ایم۔اے۔Prev کی فارسی مجھ نابلد پر داغ دی۔

اُس زمانے میں تاج محل کے چاروں طرف scaffolding ★[1] تھی۔ معلوم نہیں یہ مرمت یا صفائی اور پالش کی غرض سے باندھی گئی تھی یا عالمی جنگ میں بمباری سے محفوظ رکھنے کے لیے کیموفلاز کا حصہ تھی۔ ان دنوں فوجی بلکہ بیشتر سِول گاڑیوں پر بھی لہریے کی شکل میں پیلی مٹی تھوپ کر انہیں مشینی زیبرا بنا دیا گیا تھا۔

مسرور حسن خاں نے اخلاقاً اسے شرط کہا، جب کہ درحقیقت یہ حکم اور فرمان کا درجہ تھا اور اُن کو یہ زیب بھی دیتا تھا کہ اُن میں لیڈرشِپ کے اوصاف اور ہم میں تابعداری کی فطری صلاحیت تھی۔ کالج اور گرلز ہاسٹل کے درمیان بس ایک سڑک تھی جسے حائل نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ وہ ملاقات پر مائل کرنے میں مددگار تھی۔ شام کو لڑکے اور لڑکیاں اس سڑک پر چہل قدمی کے بہانے ہم قدمی کرتے تھے۔ مسرور حسن خاں نے تاکیداً کہا تھا کہ جب میں ان کی اردلی میں چلوں تو اُن کو تم کے بجائے آپ کہوں، جب کہ مجھے وہ آپ کے بجائے تم کہیں گے! اپنی تنزلیٔ مراتب اور اُن کی ترقیٔ درجات کی وجہ تو سمجھ میں آگئی۔ تاہم میں نے پوچھا ''کیا وہ اس نازک سے فرق کو دور سے سن اور سمجھ پائیں گی؟''

فرمایا ''صنفِ نازک سے کچھ بعید نہیں۔ وہ کہے سنے بغیر بھی سمجھ جاتی ہیں!''

اسی سڑک پر ہمارے ایک مشترک دوست بھی دیکھے جاتے تھے جو اپنے قد سے غیر مطمئن تھے۔ حالاں کہ سچ پوچھیے تو قد پر فخر صرف احمق، اونٹ، زراف، والی بال کے کھلاڑی، رنگروٹ اور کٹی پتنگ لُوٹنے والے ہی کو ہوسکتا ہے۔ موصوف گرلز ہاسٹل کے سامنے ٹہلتے تو غالب جیسی بہت اونچی باڑھ کی قراقلی ٹوپی اوڑھ کر نکلتے تھے جس سے ان کا قد ایک فٹ بڑھ جاتا تھا۔ یار لوگوں نے اڑا دی تھی کہ ایک اتوار کی سہ پہر کو یہ گرلز ہاسٹل کے سامنے سے سر اُٹھائے جا رہے تھے کہ ایک چیل نے جھپٹا مار کے ٹوپی اُچک لی۔ مگر وہ اس کی چونچ سے چھوٹ کر ہاسٹل کے کورٹ یارڈ میں جا گری۔ لڑکیوں نے اسے قد آور مچھردانی کے بانس پر ٹانگ کر پھاٹک پر اس پرچی کے ساتھ استادہ کر دیا: whomsoever it fits۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ موصوف نے اپنے دوست سری واستو سے کہا کہ تم ٹوپی اتار لاؤ۔ اُس نے فوراً معذرت کر لی کہ میں بے شک تمہارا دوست ہوں۔ مگر تمہاری مُغلئی ٹوپی کی ٹرانسپورٹ، لانا، لے جانا دراصل چیل کا کام ہے۔ جس کا کام اُسی کو ساجے۔

★[1] scaffolding: سیڑھیاں یا پاڑ جو کسی دیوار یا عمارت کی تعمیر، مرمت یا رنگ روغن کے لیے بلّیوں، تختوں اور پائپ کو باندھ کر بنائی جاتی ہیں۔

مسرور حسن خاں کا پیار کا نام نپولین تھا۔ کبھی کہتے تھے کہ ان کا قد نپولین کے برابر ہے اور ناک بھی اسی سے مشابہت رکھتی ہے۔ نپولین کی ایک تصویر بھی ان کے کمرے میں آویزاں تھی۔ اُس میں اُس کی ناک اتنی مُنّی سی تھی کہ اُسے کسی بھی چیز کے مشابہ قرار دیا جاسکتا تھا۔ تصویر میں نپولین sideways یعنی سامنے کی طرف سے رُخ پھیر کر آڑا کھڑا تھا۔ وہ بھی ہمیشہ اسی پوز میں کھڑے ہوتے تھے۔ بی۔ اے کے کنووکیشن میں گاؤن پہن کر اسی بانکے اور آڑے ترچھے پوز میں یادگار فوٹو بنوایا تھا۔

سچ جھوٹ کا حال خدا جانے، ان کے بچپن کے دوست وہاب الدین شاہ بیان کرتے تھے کہ انہوں نے بھائی مسرور کو اسی نپولینی یعنی آڑے پوز میں فٹ بال میچ میں گول کیپری کرتے اور عید کی نماز پڑھتے دیکھا ہے!

جہاں تک نپولین کے پستہ قد ہونے اور مسرور حسن خاں کے دعویٔ ہم قامتی کا تعلق ہے تو ہمارا خیال ہے کہ ہمارا قد تو نپولین کے قد سے دو تین انچ کم ہی ہوگا۔ لیکن ہم نے اس مماثلت کی کبھی تشہیر نہیں کی، مبادا حاسدین اسے تکبّر اور مشیخت پر محمول کریں۔

قائداعظم کو عدالت میں بحث و جرح کرتے دیکھنے کا شوق اتنی شدّت اختیار کر چکا تھا کہ ہم ہر شرط ماننے کو تیار تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ قائداعظم کو مسلم لیگ کے عام جلسوں میں تو لاکھوں بلکہ کروڑوں شیدائیوں نے دیکھا اور سنا ہوگا۔ ہم ان معدودے چند لوگوں میں اپنا شمار کروانا چاہتے تھے جنہوں نے قائد کو پروفیشنل رول میں بالکل قریب سے دیکھا اور آج جب پورے ٦٦ برس بعد میں یادوں کو سمیٹنے بیٹھا ہوں تو باخبر حضرات نے مجھے باور کرایا ہے کہ زندوں میں اب میں واحد شخص ہوں جسے یہ شرف حاصل ہوا۔ شوق دیدار و سماعت اتنا شدید تھا کہ تاج محل کیا چیز ہے ہم قطب مینار اور آئفل ٹاور پر بغیر لفٹ کے یعنی پیر پیدل سو دفعہ چڑھ سکتے تھے! (اتنی ہی دفعہ اترنے کا ذکر بہ نظرِ اختصار و بخوف طوالت ولاف رُستمی نہیں کیا۔)

فوجداری مقدمے میں گہری دلچسپی اور شغف کا یہ پہلا اور آخری کیس ثابت ہوا۔ اس لیے کہ چند سال بعد ایک زنا بالجبر کے کیس میں استغاثے اور ملزم کا تو کچھ نہیں بگڑا، میں خواہ مخواہ رُسوا ہوا! اس اجمالِ پُرملال کی تفصیلات بتانے سے خود کو باز رکھنا اِس وقت نہ صرف مشکل ہے بلکہ اخفائے بُزدلانہ کے ذیل میں آسکتا ہے۔

یہ ١٩٤٨ء کا ذکر ہے جب میں جھنجھنوں (ضلع شیخاواٹی، جے پور) میں ناظم (ڈپٹی کمشنر) اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ تعینات ہوا تھا۔ میرے فرائض و اختیارات میں مرجوعہ اور چالان/ دائر شدہ فوجداری مقدمات کو مقامی مجسٹریٹوں کی عدالت میں منتقل کرنا بھی شامل تھا۔ اسی زمانے میں ایک

rape کیس (اس کا اردو متبادل اور زیادہ گھنونا لگتا ہے) کا چالان پیش ہوا۔ اس کیس کو میں نے اپنی ہی عدالت میں ٹرائل اور سماعت کے لیے فوراً لپک لیا! ایسا کیوں کیا؟ تاویلاً صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ مجھے یونیورسٹی چھوڑے ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے اور اپنی curiosity (تجسس۔ٹوہ) کو چھپانے کا ہُنر ابھی نہیں آیا تھا۔ ملزم ایک کمزور، سُوکھا چھوارا، روگی اور مریل سا بیس اِکیس سالہ شخص تھا، جب کہ شکایت کنندہ پینتیس سالہ جاٹ عورت لمبی تڑنگی، دھاکڑ اور مضبوط کاٹھی کی تھی، جس کے ساتھ ملزم کا جبر اور زور زبردستی کرنا قرینِ قیاس نہ تھا۔ مگر ملزم کا وکیل نالائق نکلا۔ وہ ڈھنگ سے سوال اور جرح بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عُریاں سوالات کر کے وقت اور موقع ضائع کر رہا تھا۔ قوی امکان تھا کہ اگر وہ اسی طرح کیس بگاڑتا رہا تو ملزم کو ناحق سزا ہو جائے گی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے صوابدیدی اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے اُس چلتر باز عورت سے ڈپٹ کر عدالتی سوال کیا کہ وہ شخص 'موٹیار' (تندرست و توانا مرد) اور تگڑا لگتا تھا یا کمزور، روگی، مریل چھوکرا؟ رات کے اندھیرے میں تجھے کیسا لگا؟

کہنے لگی ''موٹیار کونی۔ تھارے ناؤں لاگے چھے۔''

(مرد نہیں لگتا تھا۔ تیرے جیسا ہے)

تاج پیاؤں کی ٹیم کے لیڈر اور گائیڈ وہی تھے۔ میری حیثیت اور مقام سر ایڈمنڈ ہلیری کے باربردار ہاتُو شرپا تین سنگھ سے اگر بہتر نہیں تو کمتر بھی نہ تھا۔ ایک دن پہلے انھوں نے تنبیہ کی ''آپ گنبد پر پہنچ کر ممتاز محل کے مزار کے عین اوپر سگرٹ ہرگز ہرگز نہیں پئیں گے۔ جتنے بدبودار دھوئیں کی آپ کو ہر دس منٹ بعد حاجت ہوتی ہے، اُسے اپنے کمرے ہی میں اپنے سسٹم میں داخل و خارج کر کے تشریف لائیے گا۔ ایک دانا نے مجھے بتایا ہے کہ حکیم جالینوس دو ہزار برس قبل لکھ گیا ہے کہ اگر تین مضرات سے پرہیز کیا جائے تو ہر فرد بشر ایک ہزار برس تک زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ تین مُہلک زہر ہیں شور، دُھواں اور بدبُو۔ آپ کی سگرٹ نوشی دھوئیں اور بدبُو کا عطرِ عُفونت ہے! رہا شور، تو وہ آپ خود مچاتے پھرتے ہیں۔ آپ اپنے ملک الموت خود ہیں!''

عرض کیا ''ارے صاحب، کون مسخرہ ایک ہزار برس جینا اور رِنجھ رِنجھ کے مرنا چاہتا ہے۔ اگر آدمی کی اوسط عمر ۷۰ برس فرض کر لی جائے تو جور رنج و مِحَن، مصائب و مظالم اور ذلت و خواری وہ ستّر برس تک بھوگتا اور بھگتتا ہے وہ چودہ گُنا ہو جائے گی۔ آدمی رگڑ رگڑا رگڑ رگڑا کے مرنے کی دعائیں مانگے گا، مگر موت ہے کہ آکے نہیں دے گی۔ اِنتہا یہ کہ ہمارا فیورٹ بسنتی رنگ جھلس اور جھُلس جھُلسا کے جھُلبھلائے بینگن کا بُھرتا نظر آنے لگے گا! ناں بابا، ناں۔ درگزرے ایسی زندگی سے۔ اللہ ہر شریف آدمی کو ایسے جالینوسی جہنم سے محفوظ رکھے۔''

ہدایت نامۂ تاج climbing کی دوسری وارننگ یہ کہ ''سیّد صاحب، آپ شیروانی زیبِ تن کر کے تاج محل فتح کرنے کا خیال دل میں نہ لائیے گا۔ ورنہ آپ تو بلّیوں میں اُلجھتے، تڑپتے، سر سے سَر یا توڑنے کی کوشش کرتے، قلابازیاں کھاتے، دارِ فانی سے چند سیکنڈ میں کوچ فرما جائیں گے۔ ہم ناحق کورٹ کچہری میں مُچلکے دیتے اور ضمانتیں کراتے پھریں گے۔ آپ کا تو پھر کچھ نہیں بگڑے گا۔''

وقتِ مقررہ پر مسرور حسن خاں، مظفر برنی اور راقم الحروف تاج محل پہنچ گئے۔ یہ مظفر برنی وہی ہیں جو بھارت میں اڑیسہ اور ہریانہ کے گورنر اور اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں سیکریٹری اطلاعات رہ چکے ہیں۔ صاحبِ طرز ادیب بھی ہیں۔ ہم تینوں نے scaffolding کی بلّیوں، بانسوں، تختوں اور شہتیروں کی چرچراتی، ڈگمگ ڈگمگ کرتی سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں۔ مسرور حسن خاں نے کہا کہ آپ جس جبلّی پھرتی اور لپک جھپک سے چڑھ رہے ہیں اُس پر لنگور بھی رشک کر سکتے ہیں۔

''لنگور ہی کیوں؟ بندر کیوں نہیں؟'' میرے لہجے میں شاید تھوڑی سی دُرشتی تھی۔

''واللہ، میں نے رنگ کی مماثلت کے باعث نہیں کہا۔ دراصل لنگور کی دُم بندر کی دُم سے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ وہ درخت کی شاخوں میں دُم کی گرہ لگا کر جُھول سکتا ہے اور ایک ڈال سے دوسری ڈال تک میوے اور مادہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ بندر کے بارے میں مثل ہے کہ ڈال کا چُوکا بندر اور بانس کا چُوکا نٹ نہیں سنبھلتا۔''

ہم تینوں بلّیوں کی بھول بھلیّوں سے گزرتے، بانس کی نسینیاں★ اُلانگتے پھلانگتے، ہانپتے کانپتے، دس بار غلط قدم اٹھاتے، مگر ایک دوسرے کو ہر قدم سے پہلے دس بار سوچنے کی ہدایت کرتے بالآخر کلس تک جا پہنچے۔ اس بلندی سے میلوں دور کا منظر نظر آ رہا تھا۔ لیکن ہم یہ منظر و نظر دیکھنے تھوڑا

★ نسینی: ''سیڑھی۔ چڑھنے اترنے اور معمولی خانگی ضرورت کا چوبی بانس کا بنا ہوا اٹھاؤ، لکڑی کی سیڑھی، زینہ۔''
اس کے معنی ''اردو لغت'' مرتبہ اردو لغت بورڈ سے نقل کرنے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ افتخار عارف جیسے جید زباں دان اور پارکھ نے ۱۹۸۰ء میں یہ لفظ ''خاکم بدہن'' میں دیکھا تو کہنے لگے کہ میں نے یہ لفظ نہ کبھی سنا نہ پڑھا!
میں نے چڑاونے لہجے میں جواب دیا ''مگر یہ انگز کھنگز دیکھا ضرور ہوگا۔ اب کہہ دیجیے کہ یہ لفظ بھی نہ سنا نہ پڑھا!''
میں نے آج ۲۹ برس بعد یونہی شک رفع کرنے کی غرض سے یہی لغت دیکھی تو کھسیانا ہو کے رہ گیا۔ سند میں میرے ہی دو جملے (بقیہ تاریخ و محلِ استعمال (۵۰ آب گم ۱۹۸۹ء، ۳۶: خاکم بدہن ۱۹۶۲ء) نقل کیے گئے ہیں۔
لیکن یہ ''چوبی بانس'' والی بات پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تو کیا بانس آہنی اور تانبے پیتل کے بھی ہوتے ہیں؟
لگے ہاتھوں 'بانس' کے معنی دیکھے تو اپنے اعتراض کی تصدیق ہوگئی! لیکن یہ بظاہر بے صرفہ محنت اس وقت سوارتھ ہوئی جب یہ تشریحی جملہ پڑھا:

''لاہور سے سری نگر تک ۹۷ کروہ ۷ بانس کا فاصلہ ہے۔'' (تاریخ ہندوستان ۵۔۳۳۴)

کاش کوئی یہ بھی بتلائے کہ ایوانِ صدر، اسلام آباد سے Pentagon کا زمینی و سمندری فاصلہ کتنے بانس کا ہے۔ اور یہ روزانہ ٹیلی فونک رابطے کو ناپنے کے لیے کتنے بانس درکار ہیں؟

ہی اس سنگِ مرمر کی سُولی پر چڑھے تھے۔ نیچے زمین پر کھڑے ہوں تو کلس چار پانچ فٹ لمبا نظر آتا ہے۔ قریب پہنچے تو ایسا لگا کہ یہ تو نپولین بونا پارٹ اور ہمارے قد سے تگنا ضرور ہوگا! میں نے کہا کہ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو شے یا شخص دوری یا ناواقفیت کے باعث چھوٹا نظر آتا ہے، اُس کا احترام کرو۔ اُس سے ڈرو۔ پاس جاؤ گے تو بچُو وہ تم سے کئی گنا بڑا نکلے گا!

مسرور حسن خاں بولے ''آپ اس بلندی پر تاج کا کلس چھونے تشریف لائے ہیں یا تلقین فرمانے اور تلفسُف بگھارنے؟

میں نے ٹوکا ''تلفسُف نہیں۔ صحیح تلفظ تفلسُف ہے۔ یار، تم تو گالی بھی ڈھنگ سے نہیں دے سکتے! گالی میں غلط تلفظ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔''

یہاں مرزا نے دخل در نا معقولات کیا۔ ''جو شخص اس منحوس لفظ تفلسف اور اس کے سوتیلے بھائی تقشف کو ایک سانس میں دس بار صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر لے وہ ضرور خونی بواسیر، تشنج اور زبان کی مروڑ میں مبتلا ہو کے دمِ آخر تفلّق فقلّش، تفلّق فقلّش کا وِرد کرتا مرے گا۔''

میں نے دونوں دوستوں کی توجہ اس plaque کی طرف مبذول کرائی جس پر اس برٹش انجینئرنگ کمپنی کا نام اور پتہ کندہ تھا جس نے کسی زمانے میں کلس کی معمولی مرمت اور ویلڈنگ کی تھی، جب کہ تاج محل بنانے والے شاہجہاں کا نام وہاں کہیں نظر نہ آیا۔ کلس پر نمایاں جگہ جلی حروف میں صرف اللہ لکھا تھا۔

مسرور حسن خاں کہنے لگے کہ سوائے scaffolders کے، اب تک کوئی مائی کا لال کلس تک نہیں پہنچا ہوگا۔ اب یہ confession بھی ہو جائے کہ اس بلندی پر پہنچ کر ہم نے اللہ کے علاوہ کس کس اللہ کی بندی کو یاد کیا، مگر زہر کے سے گھونٹ، بلکہ فنگر بول کے گھونٹ پی کے چپ رہے۔ سیّد صاحب، آپ اپنا کیمرہ نہیں لائے، ورنہ یادگار تصویر ہوتی۔

''اور'' میں نے لُقمہ دیا ''گنیز بُک'' میں چھپ جاتی۔ اسے دیکھ کر سکھ ہمیں اپنے گولڈن ٹمپل کے اصلی سونے کے کلس ملاحظہ کرنے کے لیے بلاتے۔ جب ہم انہیں ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھنے کے بعد نیچے اترتے تو ایک سردار جی ہمارے انڈرویئر تک اتروا کر جامہ تلاشی لیتے!''

(۵)

دو دن بعد اس مقدمے کی پیشی تھی جس کا ملزم کو انتظار ہو یا نہ ہو، ہم گھڑیاں گن رہے تھے۔ مسرور حسن خاں نے مختصراً مقدمے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ آگرے کی نواح میں موضع کھیریا میں انگریزوں کا ایک اہم فوجی اڈّا تھا۔ شہر میں جگہ جگہ فوجی نظر آتے تھے جو عرفِ عام میں ٹامی کہلاتے تھے۔ جس سڑک کا کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا اُس پر بھی شام کو

گورے اینگلو انڈین لڑکیوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے نشے کے عالم میں گھومتے تھے۔ سارے ہندوستان کی کھلاڑ اور زود یاب اینگلو انڈین لڑکیوں کی آگرے میں ریل پیل تھی۔ ہم بھی اسی سڑک پر جو ہاسٹل کے سامنے تھی، اپنا جی جلانے اور برٹش راج کے خلاف خون کھولانے جاتے تھے۔ ہمیں ان ٹامیوں سے للّہی بیر تھا۔ زہر لگتے تھے۔ حالاں کہ وہ نہ ہوتے تب بھی ان حسیناؤں کی کمر اور ہمارے ہاتھ کے درمیان اتنا ہی ناقابلِ عبور فاصلہ رہتا۔

اور اب صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ یہ تو میں نے عِفّت نگاہ، پاکیزگیٔ بیاں اور ڈر کے مارے انگریزوں ہی کے روایتی understatement (کسر بیانی) اور پاسِ نزاکت سے کام لیا ورنہ امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ بے حیا اور بے صبرے ٹامی اُن عفیفاؤں کی عنایاتِ فراواں اور مرحمتِ شبانہ سے دن دہاڑے برسرِ عام بہرہ مند ہونے کی کامیاب کوشش کرتے تھے۔

مرزا کہتے ہیں کہ ٹامیوں کی مخرّبِ اخلاق حرکتوں کی مذمت کے دوران تمہارے لہجے میں جو واعظانہ دُرشتی، مُحتسبانہ سختی۔ مُصلحانہ تلمِلاہٹ، اخلاقی جرأت، اعلا ترین اقدار کی پاسداری اور ذاتی جَل ککڑا پن در آتا ہے، وہ اس ہُوک اور حسرت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ ساری حرکتیں ان بدمعاشوں ہی کے حصّے میں کیوں آگئیں؟

گوروں کے ذکر پر ہم پٹری سے پوری طرح اترے تو نہیں، دوسری پٹری پر چل نکلے۔ بات کھیریا کے فوجی اڈّے سے شروع ہوئی تھی۔ اسے فوجی خیموں کی ضرورت تھی۔ آگرے کے سیٹھ کیسری چند نے خیموں کا آرڈر لینے کی غرض سے Capt. Foster کو مُبیّنہ طور پر بھاری رشوت دینا چاہی جس کی پیشگی اطلاع ملٹری اِنٹیلی جینس کو مل گئی۔ لہٰذا سیٹھ کیسری چند کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے ایک جال بچھایا گیا۔ رضی الحسن چشتی، مجسٹریٹ نے سیٹھ کیسری چند کو معیّنہ وقت و موقع پر مطلوبہ رقم دیتے ہوئے گرفتار کرلیا۔ چشتی بہت لائق، ایماندار اور سخت مجسٹریٹ تھے۔ مسلمانوں کے محلّے شاہ گنج میں رہتے تھے۔ لُو چل رہی ہو یا جھڑ لگا ہو، کورٹ پیدل آتے تھے، حالاں کہ تانگے کا کرایہ ان دنوں ہمارے پانچ سستے سگرٹوں کے برابر تھا جو ہم دو گھنٹوں میں پھونک ڈالتے تھے۔

فوجداری مقدمہ احمد حسین مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ وہ بھی ایک بااصول، نڈر اور بارعب PCS (پراوِنشل سول سروس) افسر تھے اور Convicting Magistrate (ادبدا کے سزا ٹھونکنے والا) کی شہرت رکھتے تھے۔ کیسری چند کے والد نے سر تیج بہادر سَپرُو سے درخواست کی کہ وہ اُس کے بیٹے کا دفاع بحیثیت وکیلِ صفائی کریں۔ مگر انہوں نے جتنی فیس کا عندیہ دیا وہ کیسری چند کی بساط سے باہر تھی۔ اُس کے والد اسمبلی کے ممبر تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں سے اچھی رسم و راہ تھی۔ لہٰذا اُن سے درخواست کی کہ وہ قائدِاعظم کو وکیل صفائی کی حیثیت سے مقدمے کی پیروی پر آمادہ

کریں۔ قائداعظم بوجوہ یہ کیس نہیں لینا چاہتے تھے۔ اُس نے لیاقت علی خاں کی بہت منت سماجت کی۔ دیرینہ تعلقات اور اسمبلی کی ممبری کا واسطہ دیا۔ اس کی عزت اور ساکھ خطرے میں تھی۔ جان پر بنی تھی۔ لیاقت علی خاں ویسے بھی اس کا لحاظ کرتے تھے۔ لیکن قائداعظم کسی طور رضامند نہ ہوئے۔ کافی غور و تامل اور ردّ وقدح کے بعد یہ حل نکالا گیا کہ تمام فیس جو بشرح پانچ ہزار روپے یومیہ مقرر کی گئی تھی براہ راست مسلم لیگ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے گی اور حرف بحرف، پیشی بہ پیشی ایسا ہی ہوا۔ مجموعی طور پر قائداعظم نے ۳۱ دن اس مقدمے کی پیروی کی جوان کے لیے یقیناً باعثِ زحمت و خسارہ رہی ہوگی، اس لیے کہ ان کی سیاسی مصروفیات اور ذمہ داریاں بے پناہ تھیں۔ انہیں ہر پیشی پر بمبئی سے بذریعہ ٹرین آگرے آنا پڑتا تھا، جس میں سخت بے آرامی کے علاوہ ان کے قیمتی وقت کا بے اندازہ ضیاع بھی تھا۔ تاہم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی ہنگامی مصروفیت یا ناسازیٔ طبیعت کے باعث پیشی پر حاضر نہ ہو سکے ہوں۔

(٦)

پیشی کے دن مسرور حسن خاں اور میں عدالت کے مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ گئے۔ دیکھا کہ قائداعظم ہم سے بھی پہلے آچکے ہیں اور عدالت کے باہر آہستہ آہستہ محوِ خرام ہیں کہ دروازہ کُھلے تو اندر جائیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گہری سوچ میں گُم ہیں۔ انہوں نے آنکھ اٹھا کر لوگوں کی طرف نہیں دیکھا اور نہ کوئی شخص ان کے قریب گیا۔ ان کے ہونٹوں میں ایک بے جلا سگرٹ دبا تھا۔ دو تین چکّروں کے بعد ان کے سیکریٹری نے جو غالباً سندھی ہندو تھا آگے بڑھ کے ماچس سے سگرٹ سلگایا۔ لیکن میں نے قائد کو کش لیتے یا راکھ جھاڑتے نہیں دیکھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، انہوں نے ہلکے کریم رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ''آپ نے پتلون کی razor sharp کریز دیکھی؟'' مسرور حسن خاں نے پوچھا۔ میں نے کریز واقعی نہیں دیکھی تھی۔ ارے صاحب، چہرہ دیکھنے سے فرصت ملے تو کچھ اور دیکھوں۔ ایک عجیب دبدبے اور رعب کا احساس ہوتا تھا جسے تمکنت، طنطنہ یا رعونت ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں برلا ہاؤس واقع پلانی، جے پور میں پریسیڈنٹ راجندر پرشاد اور مردِ آہن ولبھ بھائی پٹیل سے بھی ملا ہوں اور بھولا بھائی ڈیسائی کو قریب سے دیکھا اور سنا ہے۔ لیاقت علی خاں سے دلّی میں ان کی کوٹھی پر ایک غرض مند کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔ انہیں ہمدرد و شفیق پایا۔ جن کے نامِ نامی سے آئی۔ آئی چندریگر روڈ منسوب ہے، انہوں نے بھی بار ہا شرفِ ملاقات بخشا۔ سہروردی صاحب سے ایک مختصر لیکن دلچسپ و سبق آموز ملاقات ہوئی۔ نواب بہادر یار جنگ کی مسحور کن خطابت کا

اعجاز بھی دیکھا۔ ان اکابرین و عظام کی بڑائی اور مکارم اپنی جگہ، لیکن قائداعظم کے چہرے پر جو عزم صمیم، ناشکستنی اعتماد اور لہجے میں جو جلالی تیقن اور گھن گرج دیکھی وہ اس حدِ کمال تک کہیں اور نظر نہ آئی۔ شخصیت کے جو اوصاف اور چہرے کا جو ایکسپریشن میں اپنے پڑھنے والوں کو دکھانا چاہتا ہوں، اُس کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ جی چاہتا ہے بس تصویر دِکھا دوں۔ سنسکرت میں ان اوصاف کے لیے ایک کُھردرا، کھڑکھڑاتا، دھدھکتا، بنکارتا، ڈکارتا لیکن جامع و ہمہ صفت موصوف لفظ ہے: دِرڑھ اور دِرڑھتا۔ جہاں تک اس کے لغوی معانی و مفاہیم کا تعلق ہے تو ذرا دیکھیے کہ John T. Platts نے اپنی ڈکشنری میں اس کے معنی کیسے مزے لے لے کے، پلٹ پلٹ اور جُھوم جُھوم کے بیان کیے ہیں۔ معنی کیا بیان کیے ہیں، دھنک اور شبد ساگر کے سارے رنگوں سے بھری پچکاری سے ہولی کھیلی ہے۔ اس لفظ کے صوتی ٹھناکے اور رَڑک سے بھی معنی کے تیور اور تیہا بول اٹھتے ہیں:

> **دِرڑھتا، دِرڑھ**: (Sanskrit).... strong, tough, coarse, powerful, firmly; strongly; ascetic; orthodox; firm-bodied, strong, stalwart; a diamond; strong in battle; a hero; faithful, devoted; firm or resolute of mind, staunch minded; to remain or stand firm to maintain (one's) ground; to hold out, insist, persist; firm in friendship, constant; resolute, determined, persevering; having a fixed determination; certain, confirmed, corroborated, undoubted.

اسے کہتے ہیں باغِ معنی کی بہار دکھلانا۔ لفظ کھینچے لیے جاتا ہے، چلا جاتا ہوں۔ اب خود ہی انصاف سے کہیے کہ مجھ جیسا تہی دامن ایسا مترادف یا متبادل کہاں سے لائے جسے اِس جیسا کہیں۔ بالفرضِ محال، بالفرض محال لے بھی آئے تو اس پر سر دُھننے کے لیے Platts کو کہاں سے لائے گا۔

آئی۔ آئی چُندریگر صاحب کا ذکر آ ہی گیا تو یہ بتاتا چلوں کہ مسلم کمرشل بینک کے ایک مقدمے کے سلسلے میں اُن سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ مجھے ان کی اس ادائے خاص سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ وہ گفتگو کرتے کرتے ہر بیس پچیس منٹ بعد اپنے ہی جملے کے بیچوں بیچ اُسے اُدھورا اور مجھے ادھ موا سا چھوڑ کر اندر تشریف لے جاتے اور چار پانچ منٹ بعد واپس آجاتے۔ گمان ہوتا تھا کہ اس کی وجہ سلسلِ بول ہے۔ لیکن ایک دن وہ خود ہی موج میں آئے تو کہنے لگے ’’Sorry for repeated interruptions‘‘ بات یہ ہے کہ قائداعظم نے مجھے نصیحت کی تھی کہ عمر ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو تو

تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ کھاتے رہو۔ چنانچہ میں ہر آدھ گھنٹے بعد اندر جا کے آدھا گلاس دودھ پی لیتا ہوں، جس کی وجہ سے ہر گھنٹے بعد واش روم بھی جانا پڑتا ہے۔ Diabelic بھی تو ہوں۔

میں نے تبرک جان کر ایک محفل میں حاضرین کو قائداعظم کی یہ نصیحت سنائی تو ایک وکیل جو چُندریگر صاحب سے ذاتی پرخاش رکھتا تھا اور اپنی ہرزہ سرائی کے لیے بدنام تھا، کہنے لگا کہ "آپ کے چُندریگر صاحب نے زندگی میں قائداعظم کی صرف اِسی نصیحت پر عمل کیا!"

یہ رُوداد رقم کرنے سے پہلے یادداشتوں کو تازہ کرنے کی غرض سے یارِ طرحدار و داستاں طراز مسرور حسن خاں سے بار بار رجوع کیا کہ وہ خود بھی یکے از عجائبات آگرہ تھے۔ اُن کا حافظہ بھی اُنہی کی طرح تھا ___ کبھی دغا نہیں دی۔ اُس میں کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر، دونوں کی خصوصیات یکجا ہو گئی تھیں۔ بس ذرا سی خرابی یہ تھی کہ بعض اوقات وہ اپنے ہر دو آلات کو سوئچ آف کرنا بھول جاتے تھے!

زیادہ عرصہ نہیں ہوا! میں نے یہ فقرہ، بصیغہء حال، بھری محفل میں، جس میں وہ مہمانِ خصوصی تھے، کسا تو لوگ مسکرا دیے۔

وہ تیر کھا کے تالی بجانے والوں میں سے نہیں تھے۔ کہنے لگے "میرے ہر دو آلات میں یہ خرابی سیّد صاحب کے قلم کی صحبتِ بد سے پیدا ہوئی ہے۔" اس پر ایسے قہقہے لگے کہ میرا معصوم و بے زبان سا فقرہ منہ بسور کے رہ گیا۔

اس مقدمے میں ان کی دلچسپی اور شغف کا یہ عالم تھا کہ جتنی تاریخوں پر ملزم کو مُچلکے اور ضمانت کی رُو سے اصالتاً حاضر ہونا پڑتا تھا، وہ تمام پیشیاں انہوں نے بطور تماشائی بھگتائیں۔ بالعموم وہ ملزم اور مجسٹریٹ سے بہت پہلے پہنچ جاتے۔ ایک پیشی پر نہ جا سکے تو مجسٹریٹ نے اپنے پیش کار سے پوچھا کہ خان بہادر صاحب کا بھانجا آج کیوں غیر حاضر ہے؟

مسرور حسن خاں بیان کرتے تھے کہ ایک دن جب قائد صبح نو بجے کورٹ پہنچے تو دیوار پر آویزاں کلاک تین بجا رہا تھا۔ قائد نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجسٹریٹ سے کہا:

"Your Honour, does it mean we'll have no lunch loday?"

دوسرے دن دیوار پر نئی گھڑی لگا دی گئی۔

اس واقعہ کے راوی بھی وہی ہیں کہ ایک دفعہ مقامی اسکولوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا وفد قائداعظم سے ملاقات کے لیے صبح آٹھ بجے سیسل ہوٹل پہنچا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ اپنے کمرے سے نکلے تو طلبہ کا نعرہ زن ہجوم دیکھ کر اپنے سیکریٹری سے دریافت کیا کہ یہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اُس نے اجتماع کی غرض و غایت بیان کی تو قائداعظم

نے طلبہ سے فرمایا:

"What are you doing here at this time of the day? You should be in your classes. You shouldn't waste your time in this manner."

طلبہ نے عرض کیا کہ ہم آپ کے دیدار اور پند و نصائح سے مستفیض ہونے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔

جواب قابل غور ہے:

"You can come in the afternoon when your classes are over. You shouldn't play truant."

(۷)

آمدم برسر مطلب و مقدمہ۔ گورنمنٹ نے پراسیکوشن کی کمک پر لکھنؤ سے ایک نہایت لائق و فائق وکیل جے کرم ناتھ مسرا کو بلایا تھا۔ مقدمے کی کارروائی ٹھیک نو بجے شروع ہوئی۔ کورٹ میں حاضرین کی تعداد بمشکل بیس ہوگی۔ میں نے دیکھا کہ قائداعظم بالکل خاموش بیٹھے کارروائی دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ خیالات میں گم، کہیں اور ہیں۔ مگر چند لمحوں بعد یہ بھی دیکھا کہ یکا یک چمک کر برمحل اعتراض جڑ دیا یا کوئی کٹیلا فقرہ کس دیا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ایک ایک لفظ غور سے سن رہے ہیں۔

کیا بتاؤں ان کے monocle نے مجھے کتنا fascinate کیا۔ ہفتوں سرگرداں و حیران رکھا۔ ان کے چہرے پر وہ سجتا تھا۔ اور وہ اس کا بہت برمحل، قدرے ڈرامائی اور مخالف کو ہچکا دینے اور چُپکا کر دینے والا استعمال کرتے تھے۔ کھڑے ہو کر اعتراض کرنے سے پہلے وہ اسے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے اس طرح چھوتے گویا زاویہ درست کر رہے ہیں جب کہ وہ پہلے ہی بالکل ٹھیک تھا۔ اچانک کاری وار کرنے اور حریف کو بھونچکا اور لاجواب کر دینے کے بعد وہ اسے ایک ادائے خاص سے اس طرح اتارتے جیسے شمشیرِ بُرّاں و برہنہ کو نیام کر رہے ہوں۔ حریف کو قائل، لاجواب یا پسپا کرنے کے بعد بُشرے سے فتحمندی یا برتری کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ چہرے کے ایکسپریشن میں قطعاً کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا کہ کوہِ وقار جہاں تھا اب بھی وہیں ہے اور ویسا ہی ہے۔

مونوکل اب مجھے زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اور کامیابی کی ضمانت محسوس ہونے لگا۔ لہٰذا چند روز بعد جے پور گیا تو ایک اینگلو انڈین optician سے جس نے حال ہی میں شاندار دکان

کھولی تھی، مونوکل بنانے کے لیے کہا۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ منہ سے کچھ کہنا بالکل غیر ضروری ہو گیا۔ بہر حال، چند لمحوں بعد اُس نے وضاحت کی کہ ''ینگ مین، یہ contraption تو وہ لوگ use کرتے ہیں جن کی ایک آنکھ نارمل ہو اور دوسری میں 'بین یائی' کم ہو۔ exceptional cases میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آنکھ weak ہے اور دوسری میں 'بینائی' بالکل نہیں ہے تو مونوکل لگانا مانگتا۔ آپ کی تو دونوں آنکھوں میں روشنائی ہے۔''

اُس دن مجھے اپنی ایک آنکھ پر بڑا غصہ آیا جس میں ہنوز بینائی باقی تھی! لیکن جی کڑا کرنے کے باوجود یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کس آنکھ کی بینائی سے محروم ہونا پسند کروں گا۔ دائیں یا بائیں؟ بائیں یا دائیں؟

معاً خیال آیا کہ بندۂ خدا، تیری اور کون سی حسرتیں اور آرزوئیں پوری ہوئی ہیں جو یہ نیا رانڈ رونا لے کے بیٹھ گیا؟

خود کو اس طرح قائل کرنے کے بعد میں نے اپنی عینک ایک فاتحانہ اندازِ پسپائی کے ساتھ اتار کے میز پہ رکھ دی اور فی الحال بدرجۂ مجبوری دونوں آنکھوں کی ''بینیائی'' کو برداشت کرنے کا فیصلہ کرنا مانگتا!

خان بہادر اختر عادل، جن کی زندگی ہی میں آگرے کی ایک بڑی سڑک ان کے نامِ نامی سے موسوم کر دی گئی تھی۔ پراسیکیوشن (استغاثہ) کے سربراہ کی حیثیت سے ہر پیشی پر موجود ہوتے۔ بہت خوش خُو، خوش خلق، خوش لباس، خوش خوراک، شریف النفس اور بہت موٹے تھے۔ خود سے بھی زیادہ موٹے تین بیٹوں کے باپ تھے۔ ایک دن لنچ کے بعد مقدمے کی سماعت دوبارہ شروع ہوئی تو خان بہادر صاحب کی آنکھ غلبۂ بریانی سے ایسی جھپکی کہ دیر تک نہ کھلی۔ اُن کی دہری ٹھوڑی جسے عربی میں بجا طور پر بَغبَغا کہتے ہیں لٹک اور ڈھلک کر سیاہ ٹائی کی گرہ پر جا ٹکی جو پہلے ہی بغبغے کی مستقل رگڑ اور میل سے چمکنے لگی تھی۔ قائداعظم نے عدالت کی توجہ گورنمنٹ ایڈووکیٹ کی حالتِ نوم کی جانب منعطف کراتے ہوئے فرمایا:

> "Khan Bahadur Akhtar Adil is having his siesta. Court proceedings may disturb him."

قہقہوں سے خان بہادر صاحب ہڑبڑا کے جاگ گئے اور اپنے جُونیر سے پوچھنے لگے ''کیا ہوا؟ یہ کورٹ میں ہُلڑ کاہے کو مچا رہے ہیں؟''

قائداعظم کا سوال، جرح اور نکتۂ اعتراض سب بہت اچانک، برمحل و برجستہ تھے۔ مخالف وکلا اور خود مجسٹریٹ بھی ہمیں تو سہمے سہمے، چپکے چپکے سے لگے۔ یہ بات ہم تحقیراً نہیں کہہ رہے،

اس لیے کہ خود ہم، بقول مرزا ''مبہوت'' اور گھگھیائے گھگھیائے سے بیٹھے تھے۔ ''اگر فقط ملزمانہ demeanour (حلیہ۔ قیافہ) کی بناء پر شناخت پریڈ میں ملزم کی شناخت کرائی جاتی تو ہر پھر کے ہر گواہ کی انگشتِ شہادت تمہاری ہی جانب اٹھتی۔'' انہوں نے کہا۔

میجر مارٹن کلیدی گواہ استغاثہ تھا۔ اس سے کئی دن تک جرح ہوتی رہی۔ جس دن میں کورٹ میں موجود تھا، لنچ کے بعد قائداعظم نے ایک ٹیکنیکل اعتراض کیا، جس پر وکیل سرکار ہسرا بولا "It doesn't matter" مجسٹریٹ احمد حسین نے بھی اس کی تائید میں وہی فقرہ دُہرایا:

It doesn't matter.

جب قائد کے دوسرے اور تیسرے اعتراض پر بھی مجسٹریٹ نے وہی فقرہ It doesn't matter دہرا کر اعتراض تحکمانہ انداز سے رد کر دیا تو وہ ڈٹ کر کھڑے رہے۔ مونوکل کے بالکل درست فوکس کو مزید درست کرنے کے بعد کہا:

"Your Honour, it seems that nothing matters in this court!"

یہ کہا اور ایک شانِ استغنا کے ساتھ مونوکل اتار کے بیٹھ گئے۔

سنا ہے اس کے بعد صرف اس عدالت ہی میں نہیں، آگرے کی کسی بھی عدالت میں "It doesn't matter" سننے میں نہیں آیا۔

میں تو اس زمانے میں قانونی مُوشگافیوں سے ناآشنا تھا اور آج بھی بحمداللہ ان سے ماہرانہ واقفیت کمائی یا رسوائی کا ذریعہ نہیں۔ رہی ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری تو اسے ''ڈبل کورس'' یعنی ایم۔ اے کی رُونگن ★ کہنا چاہیئے۔ کورٹ ہی میں ایک سینئر وکیل نے بتایا کہ قائداعظم کو Evidence Act پر حیرت انگیز عبور حاصل ہے اور وہ استغاثے پر حاوی اور بھاری ہیں۔ کچھ عرصے بعد علی گڑھ میں LLB کے امتحان کے لیے مجھے یہ ایکٹ حفظ کرنا پڑا۔ حفظ اس لیے کرنا پڑا کہ جو سمجھ میں آتا وہ یاد نہیں رہتا تھا اور جو یاد رہتا وہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پروفیسر تک کہتے تھے کہ اس سے زیادہ terse and tough جامع اور مشکل کوئی ایکٹ نہیں۔ یعنی مجمل، ادق، پرمغز اور مغلق۔ مُوڈ خراب ہو تو جھنجھلاتے ہوئے گنجلک بھی کہہ سکتے ہیں۔ تین سال بعد جب مجھے سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے فرائض انجام دینے پڑے تو اس کی ''ادقیت'' اور دِقت آفرینی کا قائل ہی نہیں، گھائل بھی ہونا پڑا۔

مسرور حسن خاں نے روزِ اوّل سے انفصالِ مقدمہ تک ہر پیشی پر حاضری دی۔ وہ بیان کرتے تھے کہ ''ایک دفعہ دورانِ سماعت قائداعظم کو ایک دن کے لیے جالندھر جانا پڑا۔ واپسی میں کسی

★ رونگن: ''گھاتا۔ رُونگا۔ وہ تھوڑی چیز جو خریدار کو بلا قیمت ملتی ہے۔'' پنجابی میں اسے جھونگا کہتے ہیں۔

ناگزیر وجہ سے ٹرین کی بجائے کار سے آنا پڑا۔ لیکن کار آدھے راستے میں خراب ہو گئی۔ ایک ملٹری convoy نے لِفٹ دی۔ سخت سردی تھی۔ انہیں شدید زکام ہو گیا۔ دوسرے دن وہ کورٹ پہنچے تو سب نے دیکھا کہ ان کی کرسی کے پیچھے ان کا ملازم کھڑا ہے جو وقفے وقفے سے انہیں نیا رومال دے رہا ہے۔ ان کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ریزش، اپنے اور دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ حد تک شدید اور مسلسل۔ وہ بار بار منہ پر رومال رکھ کر آچ چھیں آچ چھیں اور پُرشور کھانسی کو اُلٹی کھانسی سے دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُلٹی کھانسی سے ایسی کھانسی مراد ہے جس کی کھوں کھوں، کُھر کُھر، کُھس کُھس، ٹھسکا اور بلغم باہر کی بجائے الٹا اندر جائے۔ وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے adjournment (اِلتوا۔ دوسری تاریخ) لے سکتے تھے۔ لیکن انہیں یہ کسی طور گوارا نہ تھا۔ حسبِ معمول پوری تیاری، توجہ اور حاضر دماغی و جوابی سے کیس کی پیروی کی۔ جو سخت کوشی اور ڈِسپلن ان کی ذاتی زندگی میں تھا، ویسا ہی اور اتنا ہی ان کی پروفیشنل اور سیاسی زندگی میں عیاں تھا۔"

عدالت ہی سے متعلق ایک اور واقعہ اُنہی کی زبانی سنیے۔ عالمی جنگ اپنے آخری جان لیوا مرحلے سے گزر رہی تھی۔ دن میں دو تین دفعہ سائرن ضرور بجتا تھا۔ جیسے ہی وہ بجتا سارا ٹریفک جہاں کا تہاں کھڑا رہ جاتا۔ لوگ دوڑ کر نزدیک ترین محفوظ جگہ پناہ لیتے۔ جب تک آل کلیئر کا سائرن نہ بجے کوئی شخص یا سواری سڑک پر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک دن عدالت میں لنچ انٹرول ہوا اور قائداعظم ہوٹل روانہ ہونے سے پہلے اپنے کاغذات اور کتابیں سمیٹ رہے تھے کہ یکا یک سائرن بجا۔ انہوں نے کاغذات اور کتابیں واپس میز پر رکھ دیں اور اپنی نشست پر خاموش بیٹھے رہے۔ مجسٹریٹ نے یہ دیکھا تو ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ "آپ تردّد نہ کیجیے۔ آپ حسب معمول کار سے لنچ کے لیے ہوٹل جا سکتے ہیں۔"

"I'll give you a permit as a special case."

اب ذرا قائداعظم کا جواب ملاحظہ کیجیے:

"Thanks. I wouldn't like to be seen as a special case on the roads of Agra."

وہ دن انہوں نے لنچ کے بغیر گزارا۔

لنچ کے ذکر پر مجھے ناشتے سے متعلق ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ وکٹوریہ روڈ کے دوسرے نکڑ پر ایک بہت عمدہ ریسٹورنٹ Cafe Grand تھا جہاں اتوار کو بڑی رونق ہوتی تھی۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک میں بھی جانکلتا تھا۔ مگر گنڈے دار۔ بہترین کیک پیسٹری اور وہ بھی اتنے مناسب داموں

میں کہ گھریلو بجٹ میں ڈینٹ★[1] نہ پڑے۔ اس کے منیجر نے ہمیں بتایا کہ گورنر ہاؤس کو confectionery کیفے گرینڈ ہی سے سپلائی ہوتی تھی۔ اس کا ثبوت ''By Appointment'' والی تختی بھی تھی جو باہری دیوار پر نمایاں جگہ نصب تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد گورنر جنرل ہاؤس کو بھی ڈبل روٹی وغیرہ کیفے گرینڈ ہی سپلائی کرتا تھا۔ ایک دن مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کا فون آیا کہ جو فٹ بھر لمبی ڈبل روٹی آپ روزانہ بھیجتے ہیں وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس لیے کہ ناشتے پر صرف ہم دو ہوتے ہیں۔ آپ چھوٹی ڈبل روٹی بھیجا کریں جو بس ہم دونوں کے لیے کافی ہو۔

منیجر نے جواب دیا ''میڈم، ہمارے ہاں تو برس ہا برس سے اسی اسٹینڈرڈ سائز کی ڈبل روٹی بیک کرنے کا ایک ہی سانچا استعمال ہوتا ہے۔''

''تو آج ہی چھوٹا سانچا بنوالو۔ ?You see my point''

منیجر نے وہ چھوٹا سانچا ہمیں دکھایا جس میں صرف ایک مُنّی سی ڈبل روٹی بنتی تھی۔

قائدِاعظم کی رحلت کے بعد روزانہ ایک دین میں اثاث بھری ''کنفکشنری'' حسبِ دستورِ قدیم بھیجی جانے لگی۔

اس ریسٹورنٹ کا سائن بورڈ آج بھی نظر آتا ہے۔ گو کہ موسم زدگی اور زبوں حالی کے آثار سائن بورڈ تک سے ہویدا ہیں جواب میرا ہم عمر لگتا ہے!

میں ادب اور پوری سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کرنا چاہوں گا کہ حکومت اس تاریخی اور متبرک سانچے کو حاصل کر کے میوزیم میں تبرّکاً و تیمّناً سجائے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ تھا ہمارا قائد اور ایسی تھی اُس کی زیرک اور سلیقہ شعار بہن۔

مقدمے کی سماعت کے دوران بعض حلقوں میں مسلسل سرگوشیاں اور چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ سیٹھ کیسری چند نے قائدِاعظم کو صرف اسی لیے وکیل کیا ہے کہ مجسٹریٹ مسلمان ہے۔ اُس کی ترازوئے عدل کا جھکاؤ لازماً انہیں کی طرف ہوگا۔ کیسری چند کا باعزت بری ہونا یقینی ہے۔ جب کہ امرِ واقعہ یہ تھا کہ قائدِاعظم نے خاصے تامل کے بعد صرف اور صرف تالیفِ قلوب کے لیے یہ کیس لیا تھا۔ یہ ان کے لیے سراسر مالی خسارے، ذاتی زحمت اور سیاسی مصروفیات میں وقت بے وقت خلل کا باعث تھا۔ لیکن زبانِ خلق کو کس نے لگام دی ہے۔ کہنے والے اسے نقارۂ خدا بھی تو کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب موقع پا کر اس نقارے کو شیطان دمادم بجانے لگتا ہے تو پھر کوئی اور آواز

★[1] ڈینٹ: اردو میں اس کا متبادل نُغارا ہے۔ اس کے مقابلے میں ڈینٹ کیا بُرا ہے۔
راجستھان میں ڈینٹ کو ''نچان'' بھی کہتے ہیں۔ اس سے برتن میں ڈینٹ پڑنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

سنائی نہیں دیتی۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ سُوئے ظن، بدگمانی، خُبث اور تعصب پر مبنی چہ میگوئیاں اُس وقت ختم ہوئیں جب مسلمان مجسٹریٹ احمد حسین نے قائداعظم کے مضبوط دفاع، بہترین دلائل اور استغاثے کی خامیوں اور قانونی اسقام کے باوجود، سیٹھ کیسری چند کو سزائے بامشقت سنادی!

اب یہ کہا جانے لگا کہ مسلمان مجسٹریٹ نے اپنی نوکری پکی کرنے اور محض یہ ثابت کرنے کی غرض سے کہ وہ غیر جانبدار ہے اور مسلمان ہونے کے ناتے قائداعظم کا لحاظ یا طرفداری نہیں کرنا چاہتا، کیسری چند کو دھر رگڑا اور سزا ٹھونک دی۔ نقارے پر ایک ضرب اور پڑی۔ ڈھن ڈھن بجتا یہ نقارہ کبھی کبھی کثرتِ ضربات کے باعث کسی ڈھپالی کی اوس کھائی ڈفلی کی مانند ڈھپ ڈھپ دَھب دَھب کرنے لگتا ہے۔

آگرے سے روانہ ہونے سے قبل قائداعظم نے کیسری چند کے وکیلوں کو grounds of appeal ڈکٹیٹ کرائے۔ بالکل انہی خطوط اور نہج پر اپیل دائر کی گئی، جس کا فیصلہ بالآخر کیسری چند کے حق میں ہوا اور وہ بری کر دیا گیا۔

یہ بابِ خواب تمثال ادھورا رہے گا اگر یہ نہ بتاؤں کہ جس دن کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا احوال بیان کیا ہے، اسی دن شام کو مسلم لیگ نے بیکر پارک میں ایک شاندار جلسۂ عام کا اہتمام کیا تھا۔ مسرور حسن خان وہاں بھی بصد شوق ساتھ لے گئے۔ نو دس ہزار کا مجمع ہوگا۔ قائداعظم ٹھیک وقت پر تشریف لائے۔ دیر تک نعرے لگتے رہے۔ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مسرور حسن خاں بولے ''آپ نے دیکھا؟ شیروانی اور چوڑی دار میں ہیں۔''

میں چہرہ دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ کسی اور طرف نظر نہیں گئی تھی۔ بعد میں ان کی تقریر علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے ''چہرہ ہی چہرہ پاؤں سے سر تک'' اور چہرہ بھی وہ جو غیر متزلزل عزم و استقامت کی تصویر ہو۔

اندازاً ۴۵ منٹ انگریزی میں تقریر کی۔ محسوس ہوتا تھا انہیں اپنی بات کی سچائی اور موقف پر کامل و محکم یقین ہے۔ نیز جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ بے محابا اور برملا کہنے کی جرأت اور خداداد ملکہ رکھتے ہیں۔ نو دس ہزار کے مجمع میں بمشکل چار پانچ سو ایسے سامعین ہوں گے جو انگریزی سمجھتے ہوں یا انگریزی میں شُد بُد رکھتے ہوں۔ لیکن سب انتہائی خاموشی سے ہمہ تن گوش تقریر سنتے رہے۔ اس تقریر کا ایک جملہ ابھی تک کانوں میں گونج رہا ہے:

"You were a crowd, I made you a nation."

اخیر میں انہوں نے نو دس منٹ ٹوٹی پھوٹی لیکن دل میں اُتر جانے والی اردو میں تقریر کی۔ وہ سادہ اور تھوڑے لفظوں میں بڑی بات کہہ جاتے تھے۔ جہاں لفظ خاموش ہو جاتا وہاں لہجہ بولتا تھا! آج بھی ۶۷ برس بعد یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہزاروں کے مجمع نے ان کی انگریزی تقریر کیسی توجہ، عقیدت اور احترام سے سنی۔ مانا کہ سننے والے انگریزی نہیں جانتے تھے، تاہم اتنا ضرور جانتے تھے کہ ان کا قائد اپنے موقف اور مطالبے پر ڈٹا رہے گا۔ اس کے جانثاروں کو یقینِ کامل تھا کہ اُن کا سردار و سالار جب، جہاں، جیسے اور جس زبان میں بھی بولے گا سچ بولے گا۔ بے خوف و بے درنگ بولے گا۔ ان کے دل کی بات کہے گا۔ ان کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرے گا۔ ایسی ترجمانی جو کسی ترجمے اور مترجم کی محتاج نہیں۔

یہ اس عالی ہمت اور بلند نظر قائد اور اُس کی ٹوٹی پھوٹی اردو کا اعجاز تھا کہ درہ خیبر سے راس کماری اور چمن سے چٹاگانگ تک ساری قوم ایک مرکز، ایک قائد اور ایک پرچم تلے ہم طریق وہم آواز ہو کر جمع ہوگئی۔ اُس کی شخصیت و قیادت کو ہ ندا کی مانند تھی جس کی جانب لوگ کشاں کشاں کھنچے چلے جاتے تھے۔ اُس کی صدائے سدید و مُبرم نے اس خطۂ ارض کی تاریخ اور جغرافیہ کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔

چلے چلتے تھے رہرو ایک آواز اُٹھی پر
جُنوں تھا یا فُسوں تھا، کچھ تو تھا جو ہو رہا تھا

جو ہو رہا تھا، ہونا تھا اور ہو کے رہا وہ یہ تھا کہ نسلوں کے دکھ درد کا درماں اور صدیوں کی زبوں حالی کا مداوا مل گیا۔ ملّتِ اسلامیہ کا ایک نیا، آزاد اور طاقتور ملک معرضِ وجود میں آ رہا تھا۔ ایک ایسا ملک جو قائم رہنے کے لیے بنا اور بفضلِ خداوندی قائم و پائندہ و تابندہ رہے گا۔ جن آنکھوں نے تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت، برٹش امپائر کا، جس میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، یونین جیک فلیگ اسٹاف سے سامراج کے جُھٹپٹے میں اُترتے دیکھا اور اس کی جگہ سبز ہلالی پرچم بلند ہوتے اور لہراتے دیکھا، وہ اِس منظر اور ساعتِ مسعود کو کبھی نہ بُھلا سکیں گی۔ ان آنکھوں نے پاکستان بننے کا جواز اور اس کے وجود کی غایت اور تاریخی جدّ وجہد دیکھی۔ کئی قرنوں، کئی نسلوں کی واماندگی اور مظلومیت کو مُطالبہ، مُطالبے کو منشور اور منشور کو دستورِ پاکستان بنتے دیکھا۔

کیا بیسویں صدی میں، کسی بھی ملک یا قوم میں ایسا عظیم و جری لیڈر گزرا ہے جس نے اپنی قوم سے پانچ گنا عددی اکثریت کی شدید اور مدتِ مدید تک مخالفت کے باوجود ایک وسیع و عریض نظریاتی ملک کی بنیاد ڈالی اور ایک خواب کو حقیقت کر دکھایا؟ اور دوسرا کون ہے جسے اپنی قوم کا

اعتبار و اعتماد و اتباع درجۂ اعتقاد و کمال تک حاصل رہا ہو؟

اُس کی قوم سدا اُس سے راضی رہی اور وہ اپنی قوم سے راضی رخصت ہوا۔ اُس کا رب اُس سے راضی ہو۔ آمین۔

يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَٱدْخُلِى فِى عِبَٰدِى ۝ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ۝ (الفجر ۸۹، آیت ۲۷۔۲۸)

کیس ہسٹری

تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ جنوری کا آخری یا فروری کا پہلا ہفتہ ہوگا۔ کراچی میں وہ موسم ہوگا جسے بھلے دنوں میں گلابی جاڑا کہتے تھے۔ اور لندن میں (جہاں میں ہوں) موسم سرما کا شباب یعنی بادل، بجلی، بارش، برفباری اور وہ کڑاکے کی سردی جو محاورتاً رُوئی دُوئی★[1] سے جاتی ہے۔ مگر انگریز روئی کی جگہ گرم پانی کی بوتل استعمال کرتے ہیں۔ ہنگیرین مزاح نگار جارج مکیش کچھ اور ہی تاویل کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ انگریز مزاجاً، بالخصوص جنسی اعتبار سے بالکل غیر جذباتی اور ٹھنڈا برف ہوتے ہیں۔ سیکس کی بجائے ہاٹ واٹر باٹل پر گزارہ کرتے ہیں! مکیش ۱۹۳۸ء سے انگلستان میں سکونت پذیر ہے اور لہو گرم کرنے کے اینگلوسیکسن طریقے اور رازِ درونِ لحاف سے ضرور واقف ہوگا۔ دیکھیے، ذکر موسم کا ہو رہا تھا، گرم بوتل بیچ میں حائل ہو گئی۔ یہ کہنا کہ لندن میں سورج ساڑھے تین بجے ہی غروب ہو جاتا ہے، غلط بیانی ہو گی۔ اس لیے کہ غروب تو اُس صورت میں ہو گا، جب کبھی طلوع ہوا ہو! دوپہر کو کبھی نکلتا ہے تو چراغِ نیم شب معلوم ہوتا ہے! سورج کا کام گھڑی سے لیا جاتا ہے۔ یعنی گھڑی دیکھ کر صبح، دوپہر اور شام فرض کر لیتے ہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے ظہر، ساڑھے تین بجے مغرب اور ساڑھے پانچ بجے عشاء ہو جاتی ہے! میں نے کراچی میں ایک نمازی دوست سے پوچھا، کیا میں سات بجے تہجد پڑھ کے، کمرہ اوڑھ کے سو سکتا ہوں؟ صاف کنّی کاٹتے ہوئے فرمایا، کمرہ اوڑھ کر سونے سے کیا مراد ہے؟ عرض کیا، لندن میں کمرے قبر کا نقشہ سامنے رکھ کر بنائے جاتے ہیں! مطلب یہ کہ ایک عام کمرے کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی بلکہ نیچائی اتنی ہوتی ہے کہ لحاف کی گنجائش نہیں رہتی! دن کے بارہ بجے اگر دفتر کی بتیاں بجھا دی جائیں تو ہاتھ کو قلم سجھائی نہ

★[1] رُوئی دُوئی: مطلب یہ کہ سردی یا تو روئی کی گرمی سے جاتی ہے یا جوڑے کے ساتھ لیٹنے کی گُداز گرمائی سے۔ ناقابلِ برداشت کڑاکے کی سردی میں اگر رُوئی اور دُوئی یکجا ہو جائیں تو پھر بے تحاشا جی چاہے گا کہ الٰہی یہ کافر موسم بارہ ماسی ہو جائے! (بارہ ماسی: بارہ مہینے رہنے والا)

نوٹ: (یہ مضمون نما تقریر یا تقریر نما مضمون پاکستان سوسائٹی آف فزیشنز کے سالانہ ڈنر میں بحیثیت مہمانِ خصوصی ۴ مارچ ۱۹۸۸ء کو پڑھا گیا)

دے۔ غالباً اسی لیے انگریز دوپہر کے کھانے کو ڈنر کہتے ہیں! ایسے میں بس یہی جی چاہتا ہے کہ

اس طرح صبح نہ ہو، شام نہ ہو، رات نہ ہو
جس طرح صبح ہوئی، شام ہوئی، رات ہوئی

تو ایسی ہی رُت اور کڑکڑاتے اندھیر گھپ جاڑے کا سماں تھا، مگر گھڑی دن کے بارہ بجا رہی تھی کہ کراچی سے ایک کرم فرمانے فون پر مطلع کیا کہ طے پایا ہے کہ آپ کو ۳ مارچ کو پاکستان فزیشنز اینڈ سرجنز کے سالانہ ڈنر میں شرکت کرنی اور کلیدی خطبہ بھی پڑھنا ہے، اس لیے کہ آپ مہمانِ خصوصی ہوں گے۔ دعوتِ طعام اپنی جگہ، لیکن یہ مہمانِ خصوصی والی بات تو یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ڈیڑھ دو سو ممتاز و معزز نشتر زن سرجنوں کے اجتماع میں جو ڈنر کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہوں، اگر ایک دائم المرض کو پند و نصیحت یا وصیّت کرنے کے لیے کھڑا کر دیا جائے تو اُس دُکھیارے کی خصوصی حیثیت میں تو کوئی کلام نہیں، البتہ اُس کی دماغی صحت کو قابلِ رشک نہیں کہا جاسکتا۔ oesophagitis ،polyps، اسپاڈولائٹس، سوزشِ چشم، دل کی شریانوں میں رکاوٹ......

میں تمام درد ہی درد ہوں، کہوں کیا کہ درد کہاں اٹھا

وقت کی تنگی کے باعث مکمل فہرست پیش نہیں کرسکتا۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ ہر درد اور تکلیف کا ذاتی تجربہ ہے، سوائے زچگی کے! وہ میری شرعی مجبوری بھی ہے۔ ہارلے اسٹریٹ کے اسپیشلسٹ ایسے جامع الامراض مریض کو للچائی نظروں سے دیکھتے اور ایک دوسرے کے پاس فٹ بال کے ''پاس'' کی طرح بھیجتے رہتے ہیں! ان حالات میں ڈاکٹروں کے اس صحت بخش اجتماع میں اس اکلوتے مریض کو مہمانِ خصوصی کے بجائے بیمارِ خصوصی کہا جائے تو عزت افزائی کے علاوہ قرینِ حقیقت بھی ہوگا۔

میں نے اس شاندار تقریب کو نامور سرجنوں کا اجتماع کہا ہے، مسیحاؤں کا اجتماع کہنے سے محض ٹیکنیکل وجوہ کی بناء پر احتراز کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ تو فقط قُم باذنِ اللہ کہہ کر مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ نشتر، لیزر، چاقو، scalpel اور دھار دار آلات استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

پرانی مثل ہے کہ اوّل طعام، بعدہٗ کلام۔ منتظمین نے شاید یہ ترتیب مصلحتاً بدل دی ہے۔ انہیں غالباً یہ اندیشہ تھا کہ عمدہ ڈنر کے بعد تقریر سن کر کوئی بھی منہ کا مزہ خراب کرنا نہیں چاہے گا۔ میں خود بھی اپنا شمار زمرۂ مقررین میں نہیں کرتا۔ اس لیے کہ میرا اصل اور دیرینہ تعلق تو اُس بے زبان اور مظلوم طبقے سے ہے جسے معزز سامعین کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔ پھر کرسی پر جکڑ کے بٹھا دیا جاتا ہے۔ بے حس و حرکت۔ صرف ہاتھ استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ بھی صرف

پے در پے جماہیوں کو روکنے اور تالی بجانے کے لیے! اکثر ڈاکٹر صاحبان تاکید کرتے ہیں کہ کھانے کے بعد کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس سے دماغ پر زور پڑے۔ البتہ تقریر کرنے اور تالی بجانے میں کوئی ہرج نہیں کیوں کہ تقریر کا شمار خواب آور چیزوں میں ہوتا ہے، جب کہ ایک آدھ جھپکی لینے والے سامعین تالی سے ہڑبڑا کے جاگ اٹھتے ہیں۔ ہر دو عمل سے تحلیل غذا میں مدد ملتی ہے۔ اگر تقریر، سامعین کا پیمانۂ صبر و ساعت لبریز ہونے کے بعد بھی جاری رہے تو مرد حضرات نیند میں ڈوبی نشیلی آنکھوں سے مقرر کو تکنے لگتے ہیں اور خواتین بار بار اپنی چوڑیاں زور زور سے چھنکا کے گھڑی دیکھتی ہیں۔ بعض خواتین تو گھڑی کو جھنجھنے کی طرح ہلا ہلا کر دیکھتی ہیں کہ منحوس چل بھی رہی ہے یا بند ہوگئی۔ جو مقرر ان تمام باتوں کا نوٹس نہ لے اور تقریر جاری رکھے اُس سے ڈرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ وہ یقیناً کوئی وزیر کبیر ہوگا یا اس سے بھی آگے کی شئے!

دیکھیے، اپنا ہی قطع کلام ہوتا ہے۔ روا روی میں میرے قلم سے بھی ''مرد حضرات'' نکل گیا۔ نہ جانے کس ظالم نے یہ کُڈھب ترکیب وضع کی ہے جو آج کل ہر تقریب میں سننے میں آتی ہے۔ حضرات کہنا کافی نہیں سمجھا جاتا۔ حضرات کے ساتھ مرد کی پخ لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو مردوں کے زُمرے سے خارج ہیں۔ یا پھر کچھ خواتین ایسی ہیں جو واقعی حضرت ہیں!

کچھ دوائیں کھانے سے پہلے اور کچھ کھانے کے بعد کھائی جاتی ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو تقریر نہ قبل از غذا اچھی نہ بعد از غذا۔ خلوئے معدہ تو گانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ گانا ہی نہیں، خالی پیٹ تو حکومت کے خلاف ڈھنگ سے نعرہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ ایسے ویسے خواب تک آنے بند ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خالی پیٹ صرف خون ٹیسٹ کرایا اور آپ سے آپریشن کرایا جاسکتا ہے۔ ایک دفعہ ہمیں خواتین کے ایک بڑے اجتماع سے عشائیے سے پہلے خطاب کرنے کا اتفاق ہوا۔ جس ہال میں ہمیں تقریر کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا اس سے متصل ہال میں کھانے کا اہتمام تھا۔ چار پانچ منٹ تو اندھا دُھند جوشِ خطابت میں گزر گئے۔ اس کے بعد ہمیں ایسی خوشبوئیں آنے لگیں جن سے ہماری توجہ، تقریر کے تسلسل اور تلفظ میں فتور آنے لگا۔ خیر، شاہی ٹکڑوں اور زعفرانی قورمے کی مہک تو ہم برداشت کر گئے، لیکن سیخ کباب کے دھواں آلود باربی کیو جھونکے نے ہمیں کچھ اس لیے بھی نڈھال کر دیا کہ ہم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر جب ہماری فیورٹ ڈش یعنی پلاؤ کی لپٹ آئی تو ہمارے salivary glands یعنی رال بنانے کے غدودوں کا فعل اتنا تیز ہوگیا کہ الفاظ لذّتِ تصور میں لتھڑ کر زبان سے لپٹ گئے۔ سامعین کا حال ہمیں معلوم نہیں تھا، خود ہمارا جی بولنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نے پانی کا گھونٹ پیتے ہوئے سیکریٹری صاحبہ سے کہا کہ ''بی بی، ان خوشبوؤں

کی مجھ میں تاب نہیں۔ میں اس طرح تقریر نہیں کر سکتا۔'' وہ کچھ اور سمجھیں! انگریزی میں کہنے لگیں ''آپ ذرا ضبط سے کام لیجیے۔ میں نوجوان خواتین کو seductive perfumes لگانے سے بھلا کیسے روک سکتی ہوں؟''

اشتہا انگیز خوشبوؤں سے ہماری حالت کچھ اس لیے بھی غیر ہوئی کہ جن چار مختلف کھانوں کے نام ابھی گنوائے ہیں وہ چار مختلف بیماریوں اور شکایتوں کی وجہ سے ہم پر حرام کر دیئے گئے ہیں۔ ہمیں کسی ڈاکٹر سے کوئی ذاتی شکایت نہیں۔ لیکن صاحبو، حقیقت یہ ہے کہ بقول مرزا، دنیا میں جتنی بھی لذیذ چیزیں ہیں، اُن میں سے آدھی تو مولوی صاحبان نے حرام کر دی ہیں اور بقیہ آدھی ڈاکٹر صاحبان نے!

خدا جانے یہ قول مرزا عبدالودود بیگ کا اپنا ہے یا تحریف شدہ۔ کہتے ہیں کہ اب تم جن نظروں سے مسلّم مرغی کو دیکھنے لگے ہو، ویسی نظروں کے لیے تمہاری بیوی برسوں سے ترس رہی ہے!

میں اکثر کہتا ہوں کہ کسی عمر و امراض رسیدہ شخص یعنی میرے ہم عمر سے کبھی اس کی طبیعت کا مفصل حال نہیں پوچھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ اگر اُس نے اپنے جملہ امراض و عوارض گنوانے شروع کر دیئے تو ایک گھنٹے میں بھی فہرست ختم نہیں ہوگی۔ دل میں جمع شدہ غُبار بھی جیسا نکلنا چاہیئے ویسا نہیں نکل پائے گا۔ مختصر پُرسشِ حال پر اگر وہ ''الحمدللہ'' کہہ دے تو اسے اظہارِ عقیدہ سمجھنا چاہیئے۔ کیفیتِ مزاج و احوال ہرگز نہیں۔ دائی سے پیٹ چھپانے کی تو محاورۃً اور واقعتاً ایک سے زیادہ معقول یا نامعقول وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں سے کوئی پردہ نہیں۔ میں نے بھی تمام عمر ڈاکٹروں سے اپنے امراض کی کیفیت بلا کم و کاست بیان کی ہے، لیکن کپڑے اتارے بغیر ڈاکٹروں سے گفتگو کرنے کا یہ پہلا موقع ہے!

میں نے ڈاکٹر نقوی سے دریافت کیا ''مجھے کس موضوع پر بولنا ہے؟'' فرمایا ''ڈاکٹر دن بھر سمپوزیم میں سنجیدہ بحث مباحثے سے اُکتا جائیں گے۔ آپ کا جی چاہے جس موضوع پر بولیں۔ جتنی دیر چاہیں بولیں۔ بس سنجیدہ اور گمبھیر گفتگو سے پرہیز لازم ہے!'' صاحبو، مزاح نگار کی مصیبت یہ ہے کہ کوئی بھی اس سے سنجیدہ، بات سننے کا روادار نہیں۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ مزاح نگار سے زیادہ سنجیدہ اور حاضر دماغ ناظر مشکل سے ملے گا۔ جو شوریدہ سر مزاح نگار ہنسی ہنسی میں کام کی اور دانائی کی بات نہ کر سکے اس کا خندۂ دنداں نما ابھی خام اور فن ہنوز ناپختہ ہے۔ روک ہونٹوں پہ اِسے اور ذرا تھام ابھی۔

میں نے بہت سوچا، دن بھر کے تھکے ہارے ڈاکٹروں سے کس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ رہی امراض اور میڈیکل سائنس سے میری واقفیت تو وہ بس اتنی اور ایسی ہی ہے جیسے

کوئی رات کے اندھیرے میں شیر سے ناگہانی مڈبھیڑ کے بعد اُس سے واقفیت کا دعویٰ کرے! مطلب یہ کہ مبلغ علم ان امراض تک محدود ہے جن میں مبتلا ہونے کا ذاتی تجربہ ہے جو میرا دل دہلانے کے لیے کافی ہے۔ میں اس تجربے میں اضافے اور ترقی کی دعا نہیں مانگوں گا۔

پرانا مقدمہ باز آدھا وکیل ہوتا ہے اور دائم المرض آدمی پورا عطائی![1]★ بیالوجی بھی کبھی میرا مضمون نہیں رہا۔ میرا تعلق تو اس بھولی بھالی نسل سے رہا ہے جو خلوص دل سے سمجھتی ہے کہ بچے بزرگوں کی دعا سے پیدا ہوتے ہیں! یہ نسل اپنے کرتوت کو بزرگوں کی کرامت سمجھتی ہے اور کثرتِ آبادی سے پیدا شدہ مسائل کو، نعوذ باللہ، فضلِ الٰہی سے منسوب کرتی ہے۔ اُس زمانے میں فلموں تک میں یہ حال تھا کہ اول تو بوس و کنار کی نوبت ہی نہیں آتی تھی، لیکن اگر پبلک کے تقاضے سے کوئی نازک مقام آ ہی جائے تو وہیں سین کاٹ کر اسکرین پر سفید کبوتروں کا ایک جوڑا دکھایا جاتا تھا جو ایک دوسرے کی چونچ سے چونچ ملائے بیٹھا ہوتا! یقین جانیے، ہماری ساری نسل ان دو کبوتروں کے سائے میں پل کر جوان ہوئی! لندن میں جہاں ہم دس برس سے مقیم ہیں، فلم یا ٹی وی پر رات گئے کوئی ایسا ویسا سین دکھاتے ہیں تو ہمیں بہت غصہ آتا ہے کہ یہ ہمارے زمانے میں کیوں نہ دکھایا گیا! ایسے موقع پر اپنی طرف کے بھولے کبوتر بُری طرح یاد آتے ہیں۔ اِن انگریزوں کو تو ڈھنگ سے محبت کرنا بھی نہیں آتا۔ پیار اور فرسٹ ایڈ میں تمیز نہیں کر سکتے! ایسا لگتا ہے جیسے mouth to mouth resuscitation[2]★ دے رہے ہوں! ہمارے ہاں تو اس طرح صرف تخمی آم چُوسے جاتے ہیں! ہماری فلموں میں آج بھی اگر غلطی سے ہیرو کا کُرتا بھی ہیروئن کی انگلی کو چھو جائے تو وہ گز بھر اونچی چھلانگ لگا کے چیختی ہے "جان کدھ لئی بے ایمانا" اور نزدیک ترین درخت کے تنے سے بغل گیر ہو جاتی ہے۔ پھر ہیرو انگلی پکڑتے پکڑتے انگوٹھی پہنا دیتا ہے۔ اس کے بعد انگریزی محاورے کے مطابق: they lived happily ever after۔ لیکن اسپین کی پریوں کی کہانیوں میں اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ پھر وہ دونوں پُرمسرّت زندگی گزارنے اور روزانہ تیتر کھانے لگے۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ میں نے سائنس نہیں پڑھی۔ اُس زمانے میں اس کا فیشن بھی نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ جو کور ذوق لڑکے ادب اور شعر و شاعری سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ سائنس لے لیتے ہیں! بایولاجی اور اناٹومی کی جو تھوڑی بہت معلومات ہم بچپن میں رکھتے تھے وہ تمام تر محلّے کے بزرگوں کی گالیوں سے کشید کی گئی تھیں! گالیاں کیا تھیں بس سلیس اردو میں ڈاکٹروں کی ٹیکسٹ بک

★[1] عطائی: صحیح املا اتائی ہے تو ہوا کرے! مجھے تو عطائی میں زیادہ عطار پن، ڈھونگ اور ڈھٹائی نظر آتی ہے!

★[2] mouth to mouth resuscitation: "منہ سے منہ سانس پھونک کر ظاہری موت یا سکتے کی حالت سے نکالنا"

Gray's Anatomy کا نقشہ سا کھینچ دیتے تھے! ان کے سامنے انگریزوں کی گالیاں دودھ پیتے بچوں کی غاؤں غاؤں اور کبوتروں کی غٹر غوں معلوم ہوتی ہے۔ کسی دانا کا قول ہے جو تھوڑی بہت ملاوٹ کے بعد مرزا نے ہم تک پہنچایا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کیسا ہی ہفت زبان ہو، گالی، گانے اور گنتی کے لیے اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ماہرینِ اقتصادیات اپنی رپورٹیں، مضامین اور خطبات انگریزی میں رقم فرماتے ہیں۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی تنخواہ کے نوٹ مادری زبان ہی میں گنتے ہوں گے۔

ایسے موقعوں پر حالاتِ حاضرہ پر رواں، تُند اور تیزابی تبصرے سے منمناتی ممیاتی تقریر میں جان سی پڑ جاتی ہے اور ایک دو دفعہ تالیاں بجنے کے امکانات اتنے تاریک نظر نہیں آتے۔ مگر یہ نہ میرا کوچہ ہے، نہ انگ۔

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

صحرا کی جگہ صفحہ پڑھیں تو مطلب واضح ہو جائے گا۔

میں سیاسی مسائل پر نہ گہری نظر رکھتا ہوں نہ نظریہ۔ لیکن حالاتِ حاضرہ کو آرام کرسی پر بیٹھا کن انکھیوں سے ضرور دیکھتا رہتا ہوں۔ سچ بولنے کو نصف ایمان سمجھتا ہوں۔ نصف اس لیے کہا کہ جیل میں رہائش اختیار کرنے سے کبھی کوئی رغبت نہیں رہی۔ اخبار پڑھ کر جیسے اور جی جلاتے ہیں میں بھی روزانہ بڑی پابندی سے اپنا جی جلا لیتا ہوں۔ پڑھنے کا ذکر آیا تو اتنا عرض کرتا چلوں کہ جب سے لندن آیا ہوں، یعنی دس سال سے، آنکھوں میں سوزش رہنے لگی ہے۔ شروع میں تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ شاید یورپ کی عریانی اور کم لباسی پہلے پہل دیکھنے سے فقیر کی آنکھوں پر strain پڑا ہے جو کثرتِ نظارہ سے انشاء اللہ العزیز بہت جلد دور ہو جائے گا۔ لیکن جب تکلیف اتنی بڑھی کہ ٹی وی پر ملکہ معظمہ کی صورت دیکھ کر بھی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں تو ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے کہا کہ تمہارے tear glands (غدودِ گریہ) بالکل خشک ہو گئے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ یہ تکلیف تمہارے ذہنی squint یعنی کج نظری اور آشفتہ بیانی کا شاخسانہ اور سزا ہے۔ اُنھیں کا قول ہے کہ سمجھدار آدمی نظر ہمیشہ نیچی اور نیت خراب رکھتا ہے! وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے! خیر اس کا تو ذاتی تجربہ جب ہو گا تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال artificial tears یعنی اشک آور قطرے آنکھوں میں ڈالنے پڑتے ہیں۔ یہ دوا بچھڑے کے خون سے بنتی ہے۔ اب کہیں جا کے سمجھ میں آیا کہ ہماری شاعری میں جو خونابہ اور خون کے آنسو رونے کا اتنا ذکر ہے تو اس کا کیا جواز ہے۔ ہماری آنکھ سے ہر چار گھنٹے بعد بچھڑے کے خون کے آنسو ٹپکتے ہیں! لیکن جیسے ہی پاکستان آ کر حالاتِ حاضرہ اور اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں تو ٹیئر گلینڈز

بغیر دوا کے آپ ہی آپ بڑی تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں!

میں غور کر ہی رہا تھا کہ کس موضوع پر گفتگو کی جائے کہ دفعتاً ایک شعر یاد آ گیا:

انیسؔ جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ دے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

خیال آیا کیوں نہ اپنی علالت، اپنے معالجوں کی حذاقت اور باہمی تعلقات و تجربات کے بارے میں بے تکلف باتیں کی جائیں۔ اگر بے دھیانی یا روا روی میں کہیں سنجیدہ ہو جاؤں تو بندہ بشر ہوں، معاف کر دیجئے گا۔ اسے میری کیس ہسٹری تصور کیجئے کہ یہی اس کا عنوان بھی ہے۔ ویسے مجھے اس کا احساس ہے کہ جس مریض کو اپنے مرض کے ذکر میں مزہ آنے لگے اُسے hypochondriac کہتے ہیں۔ افراد ہی نہیں، کبھی کبھی تو میں بھی hypochondriac ہو جاتی ہیں۔ انہیں علاج سے زیادہ اپنی بیماریوں کے مبالغہ آمیز بیان میں مزہ آنے لگتا ہے!

فقیر کی یہ ناقابلِ رشک صحت کوئی نئی بات نہیں۔ حضرت حفیظ جالندھری کی شاعری کی طرح

یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

الحمدُ لِلّٰہِ، بھری جوانی میں بھی ہمارا حال اور حلیہ ایسا نہیں رہا کہ کسی خاتون کے ایمان میں خلل واقع ہو! اتنا ضرور ہے کہ شادی ہم نے اپنی بیوی کی پسند کی کی۔ مگر اُس زمانے میں ان کی نظر ۶۔ تھی اور وہ ضد میں عینک نہیں لگاتی تھیں۔ اس واقعے یعنی نکاح کے فوراً بعد عینک لگانے لگیں! اس پر ایک اور واقعہ یاد آیا۔ یہ ۲۵ برس قبل کا قصہ ہے۔ افسوس کہ آتشؔ پچیس برس قبل بھی جوان نہ تھا۔ جب عمر ۲۸۔۲۷ کی تھی تو یہ عالم تھا کہ اگر کوئی یوں ہی کہہ دیتا کہ آپ تو ۲۶۔۲۵ کے لگتے ہیں تو خوشی سے اپنی کھدر کی شیروانی میں پھولے نہیں سماتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ جب تک کوئی ۲۵۔۲۰ برس کی ڈنڈی نہ مارے، ذرا خوشی نہیں ہوتی! بہر حال ایسے ہی ایاّمِ کسر عمری کا ذکر ہے، ایک دن میں اپنے دائیں ہاتھ کو ۲ کے ہندسے کی مانند استادہ کیے، ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے، کچھ دل گرفتہ سا، کچھ سوچ میں گم اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ دیرینہ دوست اور رفیقِ کار بینکاری عالم حسین صاحب آ نکلے۔ وہ بہت خاموش، منکسر المزاج، کم گو اور غیر جذباتی آدمی ہیں۔ عید پر بھی نئے کپڑے نہیں پہنتے۔ کہتے ہیں ''گھریلو بجٹ غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ تہواری جوش و جذبے کا اظہار صرف نئے پاجامے اور ریشمی ازار بندہی کے ذریعے کیا جائے!'' سب نے دیکھا کہ اپنی شادی کے دن بھی بینک میں بیٹھے لیجرز چیک کرتے رہے۔ کسی نے تعجب کا اظہار کیا تو کہنے لگے کہ خواہ مخواہ جذباتی ہونے سے فائدہ؟ جو ہونا ہے سو ہو جائے گا۔

ہمیں فکر مند و مغموم دیکھا تو بولے ''آج آپ کچھ زیادہ ہی اداس نظر آتے ہیں!'' کچھ زیادہ

کی قید اس لیے بھی ضروری تھی کہ خود کو اداس رکھنے کے لیے ہم کسی سنگین ٹریجیڈی یا معقول وجہ کا انتظار نہیں کرتے۔ بس ہیں تو ہیں۔

میں نے کہا ''عالم صاحب، میرے سر میں جو بال کالے ہیں وہ تیزی سے گر رہے ہیں اور جو مضبوط ہیں وہ سفید ہو رہے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے اور سر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ منہ دھوتے وقت سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ اگر اسی رفتار سے بال گرتے رہے تو......؟ بس یہی سوچ سوچ کے ڈپریشن ہو رہا ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر اپنی ہتھیلی کا ہمارے سر سے موازنہ کرتے ہوئے بالکل میٹر آف فیکٹ لہجے میں بولے ''یوسفی صاحب، جب آپ کا سر fully thatched تھا یعنی سارا سر بالوں سے ڈھکا تھا تو کیا کبھی ان سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچا؟''

وہ دن ہے اور آج کا دن، ہم نے اپنے آپ سے صلح کر لی اور جا کے نہ آنے والی چیز کا غم کرنا چھوڑ دیا۔

ایک چینی کہاوت ہے کہ زندگی میں اداسیاں تمہارے سر پر منڈلاتی رہیں گی۔ ان کو اپنے بالوں میں گھونسلا نہ بنانے دو۔

آپ کو مشکل سے کوئی ایسا شخص ملے گا جسے بچپن میں ڈاکٹر بننے اور دکھی انسانیت کی مفت خدمت کرنے کی تمنا نہ رہی ہو۔ یوں تو میں اسٹیم سے چلنے اور دھواں چھوڑنے والی ریل گاڑی کا انجن ڈرائیور بننا چاہتا تھا، لیکن چھوٹی بہن کی دو rag dolls (کپڑے کی گڑیاں جن کے اندر روئی ٹھونسی گئی تھی) کے قلم تراش چاقو سے ایمرجنسی آپریشن کر کے رسولی نکال چکا تھا۔ میں اس تقریب میں شرکت کے لیے لندن سے روانہ ہو رہا تھا تو جنگ لندن میں ایک نامور پاکستانی موسیقار کا انٹرویو نظر سے گزرا، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ان کا قوال بننے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو ڈاکٹر بننا چاہتے تھے۔ مگر خدا نے ان پر فضل کیا۔ جیسے ہی انہوں نے سترہویں برس میں قدم رکھا اور نیک و بد کی تمیز پیدا ہوئی تو انہیں ہر شب ایک سچا خواب آنے لگا جس میں انہیں ڈاکٹری سے باز رہنے اور قوالی کو بطور فن و پیشہ اختیار کرنے کی ہدایت و بشارت ہوئی۔ ہم یہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے کہ ڈاکٹری پیشے کے بارے میں ہم تو حتمی فیصلہ آسمانی مداخلت کے بغیر ہی کر چکے تھے! اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں کو ڈاکٹر نہ بنا کر اللہ نے ہم پر بڑا فضل کیا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اوروں پر بھی بڑا فضل کیا۔ انٹرویو میں موصوف نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر وہ خدانخواستہ ڈاکٹر بن جاتے تو چند سال قبل ان کی جو تاجپوشی ہوئی تھی وہ کیسے ہوتی؟ ڈاکٹروں میں تاجپوشی تو درکنار، دستار بندی کی بھی رسم نہیں۔ ڈاکٹر تو بالعموم پبلسٹی اور نام و نمود سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بلکہ سرجن تو

منہ پر ڈھاٹا باندھ کے آپریشن کرتے ہیں تاکہ مریض اور اُس کے پسماندگان پہچان نہ پائیں! آج کل امن و امان کی صورت ایسی بگڑی ہے کہ اگر کوئی سرجن اس حُلیے میں کسی بینک میں پہنچ جائے تو کیشیرز دیوار کی طرف منہ کر کے ''ہینڈز اپ'' کھڑے ہو جائیں گے اور سپردم بتو سرمایہ خویش کہہ کر دوسروں کا مال تیسرے کے سپرد کر دیں گے! بینکنگ کا آج کل یہی مطلب و طریقہ کار سمجھا جاتا ہے! ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکو حضرات ــــــ حضرات ہم نے اخلاقاً نہیں، بحالتِ خوف لکھا ہے ــــ جیپ، کلاشنکوف، ٹی ٹی پستول، بلاکلیوا، ڈھاٹے وغیرہ کی جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں۔ سیدھے سیدھے انوسٹ منٹ کمپنی کیوں نہیں قائم کر لیتے؟

ایک تنہا تاجدارِ موسیقی اور اس کی تاجپوشی پر موقوف نہیں، جیسا کہ میں ایک اور موقع پر عرض کر چکا ہوں، ہمارے ہاں زندگی کے سبھی شعبوں اور پیشوں، بالخصوص موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں بادشاہت کا دور دورہ رہا ہے۔ میرؔ تقی میرؔ خدائے سخن اور غالبؔ خسروِ اقلیمِ شاعری تو سدا سے تھے۔ حسرتؔ موہانی رئیس المتغزلین ٹھہرے۔ کلام الملوک، ملوک الکلام قرار پایا۔

اور تو اور، ایک مزاح نگار کو (نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہو گا) ایک ادبی جلسے میں ''شہنشاہِ طنز و مزاح'' کے بے جوڑ لقب سے نوازا گیا! مداحین و محبانِ مزاح نگار یہ بھول گئے کہ مزاح نگار بے مثل Falstaff تو ہو سکتا ہے مگر ہم اُس کے سر پر گھنٹیوں والی fool's-cap کے بجائے King Henry IV کا تاجِ شہی نہیں رکھ سکتے!

ادھر دنیائے موسیقی میں ہم کسی کو شہنشاہِ غزل کا خطاب دیتے ہیں اور کسی کو ملکہ موسیقی کا! ایک سنگیت سامراٹ یعنی گائیکوں کے گائیکواڑ، مہاراجوں کے مہاراج دِھراج بھی ہو گزرے ہیں۔ نظر بد دور، ہم ایک رعایا پرور ملکہ غزل بھی رکھتے ہیں اور اللہ سدا بہار ملکۂ ترنم کے سائے کو ہم بزرگوں کے سر پر ان کی رہتی جوانی تک قائم رکھے کہ وہ ہر سال دُکھی انسانیت کے لیے ایک اسپتال قائم کرنے کا اعلان کر کے ہم جیسے دُکھیاروں کی خواہشِ علالت کو مزید ایک سال تک مشتعل رکھتی ہیں (تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ایک پری چہرہ اور شوخ مغنیہ ''میلوڈی کوین'' قرار دی گئی ہیں۔ ان کے باکمال ہونے میں کلام نہیں کہ ان کے تھرکتے سنگیت میں لَےَ اور میلوڈی دست و گریباں بلکہ زیرِ گریباں صاف نظر آتی ہیں!) عمرِ یاس و بے سِپاس کو پہنچی ہوئی ایک اداکارہ جن کے پاس، ہماری ہی طرح، سوائے جذبات کے اب اور کوئی ظاہری خوبی باقی نہیں رہی، ملکۂ جذبات کہلاتی ہیں! موسیقی اور اداکاری پر ہی منحصر نہیں، شاعر بھی اپنے محبوب کو شاہِ خوباں، بادشاہِ حُسن، شاہِ شمشاد قداں، خسروِ شیریں دہناں کہتے آتے ہیں۔ ہماری صدیوں پرانی شاہ پسندی اور روشِ بندگی کی تان سنتری بادشاہ اور ''بادشاہو'' پہ آن کے ٹوٹتی ہے! اصل بات یہ ہے کہ جب تک

ہم اپنے ممدوح کے سر پر تاجِ شاہانہ نہ رکھ دیں اور اُس کے ہاتھ پر بیعتِ محکومانہ نہ کرلیں، ہمارے جذبۂ عقیدت و ارادت مندی کی تسکین نہیں ہوتی۔

یادش بخیر، یہ ۶۴۔۱۹۶۳ء کی بات ہے، جب فیلڈ مارشل ایوب خان ملک کے سیاہ و سفید اور خاکی کے بلاشرکتِ غیرے مالک تھے۔ ہمارے دوست ابنِ انشا اور طفیل احمد جمالی نے ایک شاعرہ مِس بلبل کی شاندار تاج پوشی کا، بحیثیت ملکہ تغزل، تھیوسوفیکل ہال میں اہتمام کیا۔ تاج اصلی امپورٹڈ ٹین کا assembled in Pakistan تھا۔ معظمہ کا ذاتی حسن ان کے کلام کی خامیوں پر نظر ڈالنے میں حائل و مانع تھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اُن کے آفتابِ حُسن کو ٹکٹکی باندھ کر دیر تک دیکھا جاسکتا تھا۔ مطلب یہ کہ گہن میں آچکا تھا۔ جس طرح بعض لوگ جوشِ شباب میں دیواریں اور قانونی حدود پھلانگنے کے بعد آرتھوپیڈک کیس بن جاتے ہیں، اسی طرح موصوفہ وزن، بحر، قافیے اور عروض کی قیود اور رکاوٹیں پھاند کر اپنے کلام اور خود کو لہولہان کر چکی تھیں۔ افسوس، اس ملکہ تغزل کی سلطنت کو ایوب خان کی سرکار کے ساتھ ہی زوال آگیا۔ اس لیے کہ دونوں کے نورتنوں میں سبھی ملا دوپیازہ اور لطیفہ باز بیربل نکلے، ابوالفضل، فیضی اور ٹوڈرمل کوئی نہ تھا۔

متذکرہ بالا باکمال گلوکار کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے قوالی کے ذریعے وہ تبلیغی کارنامہ انجام دیا ہے جو بڑے بڑے لوگ قوانین کے ذریعے نہ کر سکے۔

اتنے عمدہ ڈنر کے بعد بحث و تمحیص نہ صرف بے محل بلکہ مضرِ صحت بھی ہوگی۔ لیکن مختصراً اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کسی اور وسیلے سے پھیلا یا نہ پھیلا ہو، طبلے، سارنگی اور باجماعت تالیوں سے ہرگز نہیں پھیلا۔ البتہ دعوے کے دوسرے حصّے یعنی ہمارے قوانین کی بے اثری سے ایک حد تک مجھے بھی اتفاق ہے۔ Draconian laws اپنی آہنی سختی، غیر جانبداری اور دُرشتی کے لیے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ Draco اپنے قوانین خون سے رقم کرتا تھا، جب کہ ہم اپنے قواعد و قوانین مگرمچھ کے آنسوؤں سے لکھتے ہیں! میں یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ خدانخواستہ ہم بے ضمیر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ضمیر تو ہم ضرورت سے کہیں زیادہ بڑا رکھتے ہیں، لیکن اس سے ہمہ وقت نورا کُشتی ★ لڑتے رہتے ہیں۔ بہرحال قوالوں کی ایک طبّی خدمت کا ڈاکٹر صاحبان کو بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ آپ کے علم میں ہے کہ ملیریا، مچھڑوں، مخالفوں اور مولویوں کے خلاف جو زوردار مہم حکومت نے چلائی وہ کامیاب ہوئی۔ البتہ مچھڑوں سے حکومت کو شکست اور شرمندگی اٹھانی پڑی! ملیریا آج صبح آپ کے سمپوزیم میں موضوعِ گفتگو بھی رہا ہے۔ مچھڑ اب اتنے

★ نورا کُشتی "ملی بھگت کی کُشتی۔ وہ کُشتی جو آپس میں ساز باز کر کے دکھاوے کے لیے لڑی جائے۔" مثال: جیسے کوئی بڑا لیڈر حکومت کے ساتھ خفیہ ڈیل کے بعد اپنا بھرم قائم رکھنے کی غرض سے حکومت کے خلاف سخت تقریریں کرے اور بندر بھبکیاں دیتا پھرے۔

سخت جان اور immune ہو گئے ہیں کہ کسی بھی کیڑے مار اسپرے سے نہیں مرتے۔ مچھروں کی تادم تقریر جتنی بھی ناگہانی اموات ہوئی ہیں وہ صرف قوالوں کی تالیوں سے ہوئی ہیں!

(قوال خدانخواستہ ڈاکٹر بن جاتے تو اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ قوال حضرات کو کھلی چھوٹ ہے کہ امیر خسرو کے کلام میں داغ دہلوی کے شعر کا پیوند اس طرح لگائیں کہ امیر خسرو اور داغ دہلوی دونوں چھپ جائیں۔ صرف میرا بائی کا دوہا اور قوال زندہ و پائندہ و گوئندہ رہیں! غالب کے شعر میں اگر سکتہ پڑ جائے تو اسے اجی ہاں، اللہ! یا برمحل کھانسی اور بے محل واہ سے اس طرح دور کر دیں کہ شاعر کی روح دیکھتی رہ جائے! ڈاکٹر بچارے کو تو ہر وقت فکر لاحق رہتی ہے کہ مریض مر نہ جائے۔ قوال حضرات اس کا التزام کرتے ہیں کہ کوئی شاعر زندہ نہ بچے! عام قوال کو سات شاعروں کے خون معاف ہیں۔

یہاں ایک تازہ بتازہ واقعہ بیان ہونے کے لیے کلبلا رہا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک بے سُرا گلوکار بڑی اچھی غزلوں کی ریڑھ مار رہا تھا اور جیسا کہ آج کل فیشن سا بن گیا ہے بیچ بیچ میں اپنی گائیکی کی فرضی خوبیوں اور نزاکتوں پر اپنا ہی سر دُھنتا اور تبصرہ کرتا جاتا تھا۔ اس ظالم نے گانے کی ایسی انوکھی طرز ایجاد کی تھی کہ بڑے سے بڑے شاعر کا اچھے سے اچھا شعر بالکل لغو اور پوچ معلوم ہونے لگتا! اس محفل میں احمد فراز صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا ''فراز صاحب، اب میں آپ کی غزل گاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ اب میں صرف زندہ شاعروں کا کلام گاتا ہوں۔''

''جی ہاں، مردوں کو کیا مارنا!'' فراز صاحب نے فرمایا۔

ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے جو بہت پرانا ہونے کے باوجود ذہن میں بالکل تازہ ہے ۱۹۵۳-۵۴ء کا ذکر ہے۔ میں پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک بے آب و گٹر دو کمروں والے مکان میں رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے السر تشخیص کیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، مہینے کی آخری تاریخوں میں کچھ زیادہ ہی ستاتا تھا۔ بس درد کا ایک صبر آزما دائرہ تھا:

؎ وہ صبح سے تا شام تشنج کی شکایت
اور شام سے تا صبح وہ تبخیر کا عالم

بعض دوائیں جو میں نے استعمال کیں انہوں نے مرض کے جراثیم کے حق میں آبِ حیات کا کام کیا۔ میرے خسر صاحب قبلہ نے جو نہایت ثقہ، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، مجھ سے ازراہِ شفقت کہا ''میں تمہیں ایک حکیم صاحب کو دکھانا چاہتا ہوں۔ مسجد میں بعد نماز اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ اللہ نے ہاتھ میں شفابخشی ہے۔ یونانی طریقۂ علاج آزمانے میں کوئی ہرج نہیں۔'' میں

نے اپنے طور پر حکیم صاحب کے بارے میں معلومات کیں تو بہت اچھی رپورٹیں ملیں۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ ''وہ مریض کا حال بالکل نہیں سنتے۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مرض کی ساری کیفیت اور مریض کے تمام کرتوت بیان کردیتے ہیں! میری نبض پر ہاتھ رکھتے ہی کہہ دیا کہ ران پر ایک داد ہے۔ ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہے۔ تین دن کا قبض لیے پھر رہے ہو۔'' ہمیں تو ان کی طبابت میں صریحاً علم غیب کی ملاوٹ نظر آئی۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ نبض سے پہلے قارورہ دیکھتے ہیں اور قارورے پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہی مریض کی تنخواہ اور بچوں کی تعداد کا بالکل صحیح اندازہ کر لیتے ہیں۔ تیسرے شخص نے جو میرا ہی ہم عمر تھا متنبّہ کیا کہ حکیم صاحب اپنے دونوں ہاتھوں سے مریض کے دونوں ہاتھوں کی نبض بیک وقت دیکھتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کی نبض سے اعضائے رئیسہ کے ناقص فعل کا حال بتاتے ہیں اور بائیں ہاتھ کی نبض سے چال چلن کی چارج شیٹ!

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ اعلیٰ واسفل، رئیسہ وغیر رئیسہ کی تخصیص وتفریق طب میں بھی در آئی۔ کچھ اعضا، اعضائے رئیسہ کہلاتے ہیں۔ ہمیں تو بظاہر اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ بگڑے رئیسوں کی طرح سارے نظام میں بگاڑ انہی کے سبب واقع ہوتا ہے!

میں جس وقت قبلہ کے ہمراہ مطب پہنچا تو حکیم صاحب سبز جافری والے برآمدے میں حقّے کی نبض یعنی نے پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ ہمیں آتے دیکھا تو حقہ گُڑگُڑانے لگے۔ یہ حقّے کی مستقل صحبت ہی کا اثر ہوگا کہ خود بولتے تو اس طرح گُڑگُڑانے لگتے کہ پہلی ملاقات میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ حقہ بول رہا ہے یا وہ خود! اسے (حقّے کی نے کے آگے لگی) چاندی کی مہنال کو ہمہ وقت منہ میں دبائے رکھنے کا نتیجہ ہی کہنا چاہیئے کہ اب اگر حقہ ہٹا دیا جاتا اور منہ بند ہوتب بھی دونوں ہونٹوں کے درمیان ایک دائمی گول سوراخ یا کھانچا سا نظر آتا تھا جسے اب صرف اس طرح بند یا پُر کیا جاسکتا تھا کہ وہی مُہنال اپنے پیدا کردہ سوراخ میں فِٹ کر دی جائے۔ ان کی عینک کے فریم میں بلّور کے دو پیپر ویٹ جڑے تھے، جن کے باعث ان کی سُرخ ڈوروں والی آنکھیں تگنی بڑی اور اتنی ہی غصیلی نظر آتی تھیں۔ وہ خاصے بد دماغ بتائے جاتے تھے۔ انہوں نے قارورہ دیکھا اور بڑے معنی خیز انداز میں ''ہوں!'' کہا۔ پھر نبض دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دایاں ہاتھ پیش کیا اور بائیں کو ڈر کے مارے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ دایاں ہاتھ چھوڑ کر کہنے لگے، بایاں نکالو!

نبض پر ہاتھ رکھتے ہی اس طرح اُچھل پڑے جیسے ہمارا ہاتھ شاک مار رہا ہو۔ پھر اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ قبلہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں صاحبزادے کے ساتھ تخلیہ چاہتا ہوں! آپ دوسرے کمرے میں انتظار فرمائیے۔ یہ سنتے ہی میرے بزرگوار کا چہرہ سرخ اور میرا زرد ہوگیا۔ وہ انتظار کرنے کے بجائے تیز تیز قدموں سے گھر واپس چلے گئے۔ حکیم صاحب نے دوبارہ نبض

دیکھی۔ پھر کلائی پکڑ کے مجھے کھینچا اور میرا کان اپنے منہ کے اتنے قریب لے آئے کہ حقّے کی نے میرے نتھنے میں داخل ہوا چاہتی تھی۔ انتہائی رازدارانہ سرگوشی کے انداز میں فرمایا ''جگر کا فعل خراب ہے۔''

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جگر کی مبیّنہ خوش فعلی اس طرح باعثِ روسیاہی بنے گی۔ میں حکیم صاحب سے الجھنے لگا کہ جناب والا! مجھے معدے کی تکلیف ہے۔ endoscopy کرا چکا ہوں۔

فرمایا ''بائیسکوپی اپنی جگہ مگر قارورہ کچھ اور کہتا ہے۔''

انہوں نے نسخہ لکھ کر میرے ایک ہاتھ میں قارورہ اور دوسرے میں اُسی کے ہم رنگ عرقِ بادیان کی بوتل تھما دی تو میں نے تقریباً روہانسو ہو کر کہا کہ اگر میرا صرف جگر ہی خراب تھا تو آپ نے میرے خُسر کو کیوں علیحدہ کمرے میں بیٹھنے کو کہا؟ آپ کا میرے حال پر بڑا کرم ہوگا اگر آپ اُن کو کم از کم یہ بتا دیں کہ میرا صرف جگر خراب ہے۔

وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ عینک اُتارتے ہوئے کہنے لگے، ''برخوردار، میں نسخے لکھتا ہوں۔ چال چلن کے سرٹیفکیٹ نہیں دیتا۔''

وہ دن ہے اور آج کا دن، مجھے کسی حکیم سے رجوع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مخدومی و مکرمی حکیم سعید صاحب سے میرا قدیم رشتۂ عقیدت و نیاز مندی ہے۔ اُن کی حذاقت کا قائل اور وضعداری کا مدتوں سے گرویدہ ہوں۔ کئی دفعہ اُن سے علاج کرانے کو جی چاہا۔ مگر معتبر مریضوں سے معلوم ہوا کہ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے دونوں نبضیں دیکھتے ہیں!

مسلسل چھ سال تک گردن اور تیسری اور چوتھی ورٹیبرا (ریڑھ کی ہڈی) کی فزیوتھراپی کرانے کے بعد مجھے چند لوگوں نے مشورہ دیا کہ جب روپیہ اور ڈاکٹر دونوں جواب دے دیں تو ہومیوپیتھی سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ میں ہومیوپیتھی کے خلاف نہیں۔ حق میں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جو امراض بغیر دوا کے بھی دور ہو جاتے ہیں، اُن کا ہومیوپیتھی سے بہتر کوئی علاج نہیں! یہاں کافی حضرات ایسے ہوں گے جو نیاز صاحب مرحوم سے واقف ہوں گے۔ نیاز صاحب جو شعیب مرحوم، وزیرِ خزانہ، کے بھائی تھے بہت سینیئر بیوروکریٹ تھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اُن دنوں وہ حیدرآباد میں کمشنر تھے۔ فرصت کے اوقات میں ہومیوپیتھی کی پریکٹس کرتے تھے۔ فیس کچھ نہیں لیتے تھے، بلکہ دوا بھی مفت دیتے تھے۔ کوٹھی کے سامنے کیو لگا رہتا تھا۔ خال خال سہی، مریضوں میں وہ اہلِ غرض بھی شامل ہوتے تھے جو محض رسائی اور راہ و رسم بڑھانے کی غرض سے کسی فرضی بیماری کا علاج کرانے آتے تھے۔

؎ بدل کر مریضوں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ مطب دیکھتے ہیں

ایک دفعہ نیاز صاحب تین چار دن کے لیے دورے پر نکلے۔ واپسی پر شام کو اپنے مطب میں بیٹھے۔ دواؤں کا بکس کھولا تو سب شیشیاں خالی نکلیں۔ پتہ چلا کہ اُن کی غیر موجودگی میں ایک تین سالہ بچّہ ساری گولیاں کھا گیا۔ نیاز صاحب خود کہتے تھے کہ میں اُسی دن اور اُسی لمحے ہومیوپیتھی سے تائب ہو گیا کہ جس نظامِ طب کی دوائیں ایسی ہوں کہ پورا بکس کھا جانے کے بعد بھی تین سالہ بچّے کو کچھ نہ ہو، اُس کی پریکٹس کر کے میں دنیا اور عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا۔

حاشا وکلّا، میرا مقصد ہومیوپیتھی کا مذاق اڑانا نہیں، بلکہ میں انتہائی سنجیدگی سے یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ہومیوپیتھی کی دوائیں بالکل بے ضرر ہوتی ہیں، بشرطیکہ آپ کی عمر تین سال سے زیادہ نہ ہو! واقعہ یہ ہے کہ اپریل میں تیسری بار انجیو گرافی کرانے سے پہلے مجھے لندن میں ایک معروف ہومیو پیتھ سے رجوع کرنا ہے۔ وہ صاحب ایشین ہیں انگریزوں کا جغرافیہ بھی عجیب ہے۔ وہ عرب کو عرب، جاپانی کو جاپانی، ایرانی کو ایرانی، افغانی کو افغانی کہتے ہیں۔ فقط برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں کو Asian کہتے ہیں! گویا عرب، جاپان، ایران یا افغانستان دراصل ایشیا میں نہیں ہیں! یا ان ملکوں کی طرح پاکستان اپنا علاحدہ وجود نہیں رکھتا! صاحبو، جب دل، نظر اور ظرف تنگ ہو جائیں تو جغرافیہ بھی سمٹ جاتا ہے۔ ملک اور مملکتیں سکڑ کر نفرت اور حقارت کے بے نام ڈُبکوں ڈُبکوں جزیرے دکھلائی دیتے ہیں!

وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر مسلسل تیس سال سے افسانے لکھ رہے ہیں اور مسلسل خراب لکھ رہے ہیں۔ غنیمت ہے کہ نامطبوع ہونے کے علاوہ غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ جن صاحب کے توسط سے ان تک رسائی کی صورت پیدا ہوئی، اُن کی زبانی انہوں نے اس خواہش کا اظہار بلکہ ہٹ لگا دی کہ مجھے ان کے (ناقابلِ اصلاح) افسانوں پر نظرِ ثانی اور اصلاح کے علاوہ مقدمہ بھی لکھنا ہوگا۔ میں نے کہلا بھیجا کہ مقدمہ تو کسی پروفیسر یا نقاد سے لکھوایئے۔ البتہ نظرِ ثانی اور اصلاح اس شرط پر ممکن ہے کہ کسی کو بتایا نہ جائے کہ میں نے اصلاح کی ہے۔ موصوف بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ جواباً کہلا بھیجا کہ مجھے یہ منظور ہے۔ مگر اس شرط پر کہ یوسفی صاحب بھی ابھی یا آئندہ کسی کو یہ نہ بتلائیں کہ وہ میرے زیرِ علاج رہے ہیں۔ وہ ٹھہرے لاعلاج۔ ناحق کو میری بدنامی ہوگی۔

ہمارے ملک میں بے شمار مسائل ہیں۔ لیکن ہم کچھ اتنے مجبور اور بے وسائل بھی نہیں۔ مسئلے کے صحیح definition (بیان و توضیح) میں ہی اُس کے حل کے واضح اشارے مل جاتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے اس پہلو پر بھی ذرا غور کیجئے کہ ہر انسان کی طرح ہر قوم کو بھی اس کے حوصلے اور سہار

کے بقدر ہی آزمائش سے گزارا جاتا ہے۔ ہر مسئلہ ہمارے لیے ایک ذاتی اور اجتماعی چیلنج ہے۔ انسان کا ہر دُکھ ہمیں اس کے مداوا اور حسنِ سلوک کا موقع فراہم کرتا ہے۔ کسی ملک کی معیشت کے استحکام، پھیلاؤ اور توانائی کا اندازہ اس سے نہیں لگایا جاسکتا کہ اس کے امیر کتنے امیر ہیں، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ غریب کتنے غریب ہیں۔ کسی معاشرے کے مہذب اور فلاح یافتہ ہونے کو پرکھنے کی محک اور کسوٹی یہ ہے کہ وہ اپنے کمزور، پیچھے رہ جانے والے، دکھی اور خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ جب تک ہماری قوم کا یہ بچھڑا اور پچھڑا ہوا طبقہ آگے نہیں بڑھتا، ہمارا معاشرہ آنکھوں پر بے حسی کے کھوپے★ چڑھائے خودساختہ اندھیروں میں بھٹکتا اور دوسروں کو بھٹکاتا پھرے گا۔ ایک افریقی مثل ہے کہ جنگل میں ہاتھیوں کے جُھنڈ کی رفتار کا تعیّن سب سے تیز دوڑنے والا ہاتھی نہیں کرتا، بلکہ سب سے سست قدم اور لدھڑ ہاتھی کرتا ہے!

ابھی چند ماہ پیشتر کا واقعہ ہے۔ میں نے لندن کے اخباروں میں پڑھا کہ برطانیہ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک غریب اور بے روزگار آدمی کا بچہ لاپتہ ہوگیا۔ دو دن تک اُس قصبے کے تمام چھوٹے بڑے سارا کام کاج چھوڑ کر صبح سے شام تک بچّے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ مقامی پولیس کے علاوہ دوسرے ضلعوں کی پولیس بھی، سینکڑوں کی تعداد میں، تفتیش و تلاش میں شریک ہو گئی۔ دو دن تک ایک سرکاری ہیلی کاپٹر سارے علاقے کے اوپر چکّر لگاتا رہا۔ تین دن تک قومی اخباروں میں اور ریڈیو اور ٹی وی پر ایک غریب آدمی کے بچّے کی گمشدگی کو پرائم ٹائم میں مفصّل کوریج دی گئی۔ اسی طرح پچھلے دنوں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں نرسوں کی کمی کے باعث ایک عام شہری کی تین چار ماہ کی بچّی کے دل کا آپریشن کئی ہفتوں تک ملتوی ہوتا رہا۔ اس پر اخبارات اور بی بی سی نے جو حکومت کا اپنا ادارہ ہے، وہائٹ ہال کو پرائم منسٹر مسز تھیچر سمیت سر پر اٹھا لیا۔ عدالت میں مقدمہ دائر ہوا۔ پارلیمنٹ میں بحث ہوئی۔ پبلک دباؤ اتنا بڑھا کہ دو دن بعد اس بچّی کا آپریشن کرنا پڑا۔ مذکورہ بالا دونوں سانحوں میں پوری قوم ایک غریب آدمی کے دکھ درد میں شریک اور مضطرب رہی۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ انگلش بولتا ہے یا اسکاٹش یا ویلش۔ رومن کیتھلک ہے یا پروٹسٹنٹ۔ لیبر پارٹی سے تعلق ہے یا کنزرویٹوز کا حامی ہے۔ کہیں آئرش تو نہیں؟ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی سماجی یا معاشی حیثیت اس کے بنیادی استحقاق میں حارج نہیں ہوئی۔ اب ایک ہی لمحے کے لیے اس کا موازنہ وطنِ عزیز کے حالات سے کیجئے۔ یہاں ہم روزانہ لسانی، گروہی اور صوبائی چپقلش اور تصادم کی خبریں، حادثات اور قابلِ علاج بیماریوں میں انسانی جانوں کے اتلاف

★ کھوپے: (پنجابی) اندھیری۔ چمڑے یا کپڑے کا وہ پردہ جو بیل یا شریر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھتے ہیں۔ blinkers

کی رپورٹیں پڑھتے ہیں۔ پڑھتے ہیں اور اسے مقدرات کا حصّہ اور روزمرہ کا معمول سمجھ کر اخبار اور اپنے ذہن کا ورق پلٹ کر اسپورٹس اور اسٹاک مارکیٹ کی خبریں پڑھنے لگتے ہیں۔ ہم بہت مصروف ہیں۔ ہمارے پاس اداس رہنے اور سوگ منانے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ تیرا لُٹگ یا شہر بھنبور سسّیے بے خبرے!

ایک زندہ، ذمہ دار اور مہذّب معاشرے کی یہ پہچان ہے کہ اگر وہ کسی کے دکھ درد کا مداوا نہیں کرسکتا تو اُس میں شریک ہو جاتا ہے۔

کسی بھی ملک کی طبّی سہولتوں کی حصول یابی اور معیار کو اس طرح نہیں جانچا جاتا کہ اُس کے متمول طبقے کو علاج معالجے کے کیسے اعلیٰ اور جدید ترین وسائل حاصل ہیں، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ عام آدمی کی دسترس میں کتنی اور کیسی سہولتیں ہیں۔ متمول اور مراعات یافتہ طبقہ تو بیرونِ ملک جا کر بھی اس سے کہیں بہتر سہولتیں حاصل کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ بیرونِ ملک علاج پر جو رقم سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ہر سال خرچ ہوتی ہے وہ ایک محتاط اندازے کے مطابق تین بڑے اسپتالوں کے بجٹ سے زیادہ ہے! یہ اور بات کہ قومی بجٹ میں جو رقم صحت اور طبّی سہولتوں کے لیے مختص کی جاتی ہے، وہ مضحکہ خیز بلکہ رقّت انگیز حد تک قلیل ہے۔ جہاں تک پرائیویٹ سیکٹر کا تعلق ہے تو مجھے یہ کہنے کے لیے معذرت یا کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں کہ ایک دو نہیں، بلکہ بیشتر پرائیویٹ کلینک اور اسپتال اب اسپتال کم اور ٹکسال زیادہ لگتے ہیں۔ ایسی ٹکسال جو چوبیس گھنٹے روپیہ بناتی اور اُگلتی ہے۔ حکومتیں آئیں بھی اور چلی بھی گئیں، مگر ایک پُرانے محاورے کے مصداق، پرنالہ وہیں یعنی عوام کے سر پر گرتا رہا۔ سرکاری اعداد و شمار سے ثابت کیا جاتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ WHO کی رپورٹوں کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔ فائیو ایئر پلان پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھائے جاتے ہیں۔ اعداد و شمار اور رپورٹیں اپنی جگہ، مگر معاف کیجئے، قارورہ کچھ اور کہتا ہے!

طب اور طبابت کو روزِ اوّل سے پیشہ کم اور مشن زیادہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ چلیے اصولاً ہی سہی۔ لیکن طب پر ہی موقوف نہیں، عملاً ہر پیشے کے اہداف و اقدار بہت بدل گئے ہیں۔ اب کسی بھی پیشے کا مقصدِ اولیٰ و اعلیٰ بیان کرنے کے لیے صرف پیشے کی ش کے تین بے فیض نقطے حذف کرنے پڑیں گے! اکثر خیال آتا ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ ڈاکٹروں کا ایک Time Bank ہو جس میں ہر ڈاکٹر ایک مقررہ و معینہ وقت کا عطیہ دے۔ ہفتے میں ایک دن سہی، ایک گھنٹہ بھی بہت ہوگا۔ ایک مرکزی ادارہ وقت کی اس زکوٰۃ اور رضا کارانہ خدمات کو ایک مربوط شیڈول کے تحت منظم شکل دے سکتا ہے جو غریب اور تنگ دست مریضوں کو علاج معالجے کی مفت سہولت کی ضامن ہو۔

کامیاب و کامگار لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ دنیا سے کچھ لینے والے اور دنیا کو کچھ دینے والے۔

جب ایک دن اچانک عمر کی نقدی، بقول ابنِ انشاء، ختم ہو جائے گی، دھڑکن دھڑکن کوچ نگارا باجے گا اور بنجارا لاد چلے گا تو اسے سپرد خاک کرنے والے یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس دنیا سے کیا کچھ لیا۔ سوال یہ ہوگا دنیا کو کیا دے کے جا رہا ہے۔ اُس دن لینے والا ٹوٹا گھاٹا پائے گا اور دینے والا سُرخرو ہوگا۔ آخر ایک چھوٹا سا بیج دنیا سے کیا لیتا ہے؟ یہی مٹی، پانی اور ہوا جو جُملہ جمادات و نباتات کو بھی میسر ہے اور گندی و بدبودار کھاد جس سے گھن آتی ہے۔ مگر وہ دیتا کیا ہے؟ وہ پھول بن کر مٹی کا سارا قرض ___ رنگ، خوشبو، شادابی اور شگفتگی کی شکل میں لوٹا دیتا ہے۔ خود مٹ کر صدہا بیجوں کو جنم دیتا ہے۔ اس کا ایک ایک بیج اپنے بطن میں سامانِ صد ہزار گُل و گلستان رکھتا ہے۔

کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس وادیٔ رنج و محن میں چمن بندی و آبیاری کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر بچہ ڈاکٹر بننے اور دکھی انسانیت کی خدمت کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔ میں بھی یہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ پر میں بھٹک کر چوتھی کھونٹ نکل گیا جہاں ذرا قدم یا نظر چُوک جائے تو آنکھ اور دل پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ میں خوار و خراب و خستہ ہونے اور ''عزتِ سادات'' گنوانے کے لیے کوچۂ سود خواراں میں جا نکلا۔ پر میرے اندر اب بھی جو بچہ وقت بے وقت بچپن کے کھلونے کے لیے مچلتا ہے، وہ آپ کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ اپنے حُسنِ خدمت سے دُکھ اور درد کو اپنی آنکھوں کے سامنے دور ہوتے دیکھنا بڑے شرف و سعادت اور بڑے نصیب کی بات ہے۔ جو طمانیت اور مسرت مرض اور درد کا مداوا کرنے اور وسیلۂ دلجوئی و شفا بننے میں معالج کو ملتی ہے، اُس کا اندازہ کچھ آپ ہی لگا سکتے ہیں کہ جو امر میرے لیے قیاس و تخمین ہے وہ آپ کا تجربہ ٹھہرا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، یہ قول حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے کہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ پیغمبروں کے مزاج کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی بے کس کی حاجت روائی کرتے ہو، یا کسی کی تکلیف دور کر دیتے ہو تو چند لمحوں کے لیے تمہیں ایک عجیب سی سرخوشی اور انشراح صدر محسوس ہوتا ہے تو یوں سمجھو کہ ویسی ہی کیفیت پیغمبروں پر ہمہ وقت طاری رہتی ہے۔ کیسے خوش بخت اور برگزیدہ ہیں وہ لوگ جنہیں اس کیفیت کا ہزارواں حصہ چند لمحوں کے لیے بھی نصیب ہو جائے۔

ایک شعر جو سنانا چاہتا ہوں پرانا ہے۔ کسی استاد کا ہے اور ناصحانہ ہے۔ لہٰذا بے دلی سے سنایا اور بے توجہی سے سنا جاتا ہے، جس سے اس احتمال کو تقویت پہنچتی ہے کہ ضرور کوئی کام کی بات کہی ہوگی تو آپ بھی سنیے:

؎ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

محبت، چارہ گری، کرم گستری اور رحم وہ اُلوہی صفات ہیں جو رحمان و رحیم پروردگار نے بندوں کو بخشی ہیں۔ یہی صفاتِ الوہی شرف و افتخار انسانیت اور روحِ کائنات کا عکس ہیں۔ وہ روح، جو ہر درد و کرب و ابتلا میں انسان کی شریک و سہیم ہے۔ کہیں کوئی قطرۂ خون نہیں گرتا اور کوئی آنسو آنکھ سے نہیں ٹپکتا جس میں یہ لرزاں نہ ہو۔ یہ ہر سقراط کے ساتھ زہر پیتی ہے اور عیسیٰ و منصور اور سرمد کے ساتھ دار پہ چڑھتی ہے۔ یہ ابراہیم کا خواب بھی ہے اور چُھری بھی اور اسمٰعیل کا گلا بھی اور جب کہیں میدانِ کرب و بلا میں حسین کی شہ رگ پہ شمشیر چلتی ہے تو یہ شہید بھی ہوتی ہے اور امر بھی رہتی ہے کہ یہ موت کے ذائقے سے واقف بھی ہے اور اس کو فنا بھی نہیں۔ آدمی اس وقت تک انسان اور انسان اُس وقت تک اشرف المخلوقات نہیں کہلایا جاسکتا جب تک وہ دوسروں کے دُکھ نہ اپنا لے۔ دُکھ خواہ جسمانی ہو یا ذہنی، سماجی ہو یا معاشی، انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا دفعیہ و تدارک بمنزلہ فرض دینی اور اس سے غفلت تقصیرِ کبیرہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربّانی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

دست بدعا ہوں کہ خدائے ذوالجلال ولاکرام آپ کے دردِ دل کو فزوں تر اور دستِ شفا اور حذاقت کو ارزاں و فراواں کر دے۔ آمین۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

(نوٹ: یہ مضمون فیض صاحب کی ۹۰ ویں سالگرہ کی تقریب میں آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء کو پڑھا گیا۔ اس کا بیشتر حصہ اس مضمون پر مشتمل ہے جو ''فیض امن میلہ: نذرِ کمال'' لاہور میں ۱۲ فروری ۱۹۹۲ء کو پڑھا گیا تھا۔ اس میں اس تعزیتی مضمون کے چند اقتباسات بھی شامل ہیں جو اردو مرکز لندن میں ۲۳ نومبر ۱۹۸۴ء کو پڑھا گیا تھا۔)

مرحوم اکابرین کی یاد میں تقاریب بطورِ خاص لائقِ ستائش و مبارکباد ہیں۔ اس لیے کہ وہ صحیح معنوں میں ارادت و عقیدت اور تحسینِ سخن شناساں کا سچا، بے غرض، خالص و پرخلوص اظہار ہوتی ہیں۔ ورنہ جہاں تک اللہ رکھے، زندوں کا تعلق ہے، کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا جب اُن کی نئی کتابوں کی رسمِ اجرائی کی تین چار تقریبیں نہ ہوتی ہوں۔ دو تین گھنٹے میں صاحبِ دیوان اور صاحبِ کتاب یعنی صاحبِ شام کی جتنی اور جیسی مبالغہ آمیز تعریف کی جاتی ہے، وہ اسے عمر بھر غلط فہمی میں رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہ چھت بلاشبہ بے حد مضبوط اور پائیدار ہے۔ اس کے نیچے اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ معمولی چھت تو کبھی کی ہم پر گر گئی ہوتی! ایسا لگتا ہے کہ اِسی کے بے مثل آرکی ٹیکٹ نے ہماری عدالتوں، اسمبلیوں اور پلاننگ کمیشن کی عمارتیں ڈیزائن کی ہیں۔ اس لیے کہ سب سے زیادہ جھوٹ اُنہیں کی چھت تلے بولا جاتا ہے:

روز ایک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

یہ بات میں تعریف میں غُلو کرنے والوں پر طنز و استہزا کی نیت سے نہیں کہہ رہا، اِس لیے کہ اِس طرح کی شاموں میں اِس طرح تالیفِ قلوب کی خاطر جھوٹ بولنے والے غُلو کاروں کی فہرست میں میرا نام بھی کہیں نہ کہیں ضرور آئے گا۔ یہ اور بات کہ یہ اُس زمانے کا قصہ ہے جب قُدسیہ بی بی حج پر اور میں ادبی اعتکاف میں نہیں گیا تھا۔

اس تقریب میں ایک مختصر وقفے کے بعد شیما کرمانی فیض صاحب کی تین خوبصورت اور خیال انگیز نظموں پر مبنی اپنی کوریوگرافی کے مسحور کن کمالات کا مظاہرہ کریں گی۔ ایسے نگار خانہ رواں اور رسمی رقص میں وہی فرق ہے

جو تنہا پورٹریٹ پینٹ کرنے اور میورل میں ہوتا ہے۔ یا بدھ کی مورتی اور اجنتا، ایلورا اور کھجوراہو کے فریسکو ز اور منظر تراشی میں پایا جاتا ہے۔ ایسے رقص سے پہلے تقریر کرنے میں قباحت یہ ہے کہ سامعین بار بار گھڑی دیکھتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں یہ شخص اسٹیج سے دفان ہو تو اصل پروگرام شروع ہو۔ رہا ڈانس کے بعد تقریر کرنا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے نہایت لذیذ اور پُر تکلف ڈنر میں مہمانوں کو آئس کریم کھلانے کے بعد آپ مٹی کی پیالیوں میں ستو یہ کہہ کر پیش کریں کہ فقیر نے دانہ ہائے گندم و جو اپنے دستِ خاص سے بھونے اور پیسے ہیں!

ایسی صدارتی تقریر کو تھیٹر کی اصطلاح میں curtain-raiser کہا جا سکتا ہے۔ کرٹن ریزر کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ جب تک اصل تے وڈا کھیل شروع نہ ہو، ناظرین کا جی کسی بالکل غیر متعلق ہلکے پھلکے آئیٹم سے بہلایا جائے۔ اس ترکیب سے گنجے ایکٹروں کو اطمینان سے وِگ اور داڑھی مونچھ لگانے اور میک اَپ سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کی مہلت مل جاتی ہے۔ اس طرح ایکٹریسوں کو اپنے فِگر کے نشیب کو فراز اور فراز کو نشیب بنانے کے لیے مزید وقت مل جاتا ہے۔ اس بہانے کچھ اور ٹکٹ بھی بک جاتے ہیں۔

رقص، ہمارے ہاں، ہنوز ممنوع و مکروہ و معتوب فن ہے۔ ہماری conditioning کچھ ایسی ہوئی ہے کہ جس کام یا عمل میں ہمیں لطف و انبساط یا محض راحت ہی محسوس ہو، اُس میں ہمیں گناہ کی ملاوٹ نظر آتی ہے! خیر، مرد تو اپنی قلندری، رندی اور رسوائی پر ہر دور میں فخر کرتے رہے ہیں:

بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم

لیکن بے چاری رقاصہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی دعویٰ کر سکتی تھی کہ

بصد سامانِ زیبائی، پسِ دیوار می رقصم

یادش بخیر، ہمارے ایامِ جوانی میں، شریف گھرانوں میں مور کے ناچ کے علاوہ کسی اور کا ناچ دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ بیت الخلا میں ایک پیسے کی سگرٹ چھپ کر پینے کا شمار عیاشی بلکہ نِری بدمعاشی میں ہوتا تھا! اس سے اُس زمانے میں سگرٹ کی خوردہ قیمت کے علاوہ معصوم بزرگوں کے معیارِ عیاشی اور پیمانۂ لہو و لعِب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تو میں عرض یہ کرنے چلا تھا کہ پہلے پہل جو زندہ ناچ اپنی زندگی میں دیکھا اُس کی دہشت عرصۂ دراز تک دل پر بیٹھی رہی۔ اِس یادگار رقص کا اہتمام چچا جان نے ہمارے ختنوں کی خوشی میں کیا تھا۔ یہ رقص دیکھ کر ہمارا نا پختہ ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ آئندہ بھی رقص دیکھنے سے پیشتر ہر مرتبہ اس مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایک مدت تک رقص کے نام ہی سے بدن میں ایک

کپکپی محسوس ہوتی تھی۔ بعد میں تو فقط پلنگ کی چادر اور پشواز دیکھ کر یہی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ تو خدا بھلا کرے ناہید صدیقی اور شیما بی بی کا جن کے بے ضرر رقص دیکھ کر یہ خوف دل سے نکلا اور ہمارا ہیاؤ کھلا۔ جیسا کہ آپ نے ہماری باتوں سے خود بھانپ لیا ہوگا۔

شیما کرمانی اپنے ٹیبلوز اور موضوعاتی رقص میں ڈرامائی situation اور نظموں کی فن کارانہ انداز سے تشکیل و تجسیم کرتی ہیں۔ مطلب یہ کہ انہیں ''رقصانے'' کا ہنر جانتی ہیں۔ ایک ذہین، مشاق اور جدّت پسند کوریوگرافر کی طرح وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ رقص اُس ساعتِ نایاب میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے جب رقاصہ نظر آنی بند ہو جائے اور صرف رقص نظر آئے! انگ باتیں کرے اور باتوں سے خوشبو آئے۔ رقص خواہ بھارت نٹیم ہو یا کتھک، منی پوری ہو یا اڑیسی ......اس میں خیال اور جذبے کا اظہار آنکھوں، ابروؤں اور ہاتھوں کی جنبش اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے کیا جاتا ہے۔ اور یہی کلاسیکی انداز، رکھ رکھاؤ اور رت ٹھاٹ شیما نے اپنایا اور برتا ہے۔

جس قسم کے ڈانس اور جس قماش کے ڈانسر آج کل زی ٹی وی اور اُس جیسے دوسرے انڈین چینلز پر دکھائے جارہے ہیں، اُن میں جسم کا صرف ایک حصہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر جذبے اور ہر ایسی خواہش کا اظہار و اعلان جس سے گھر بگڑے، اب صرف کولھوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ ہم تو بچپن سے یہی سنتے اور سمجھتے آئے تھے کہ کولھے صرف بیٹھنے، پتلون کو پھسلنے سے باز رکھنے اور اسکول میں بید لگوانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اب تو یہ دیکھا کہ پوری emotional range یعنی جذبات کی ساری سرگم کولھوں سے اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ، کیا بتائیں، دل پہ چھری سی چل جاتی ہے۔ مٹکنے مٹکانے اور ٹھمکا لگانے یعنی hip-swinging اور wiggling کو فنونِ لطیفہ کا درجہ دینے کا کریڈٹ اِن چینلز کو جاتا ہے!

یہ سب اپنی جگہ، مگر ہمارے یار طرحدار مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ اِن ڈانسز میں اتنے کوک شاستری پینترے، ایسی بے حیائی اور اس قدر ستر کشائی اور عریانی ہوتی ہے کہ واللہ پلک جھپکنے کو جی نہیں چاہتا! کچھ علاج اس کا بھی صاحب نظراں ہے کہ نہیں؟

جمناسٹک اور ایسے ڈانس میں فرق یہ ہے کہ جمناسٹک ایک rhythm، آہنگ، لوچ اور حسنِ تشکیل ہوتا ہے۔ جمناسٹک کے کچھ قاعدے اور ضابطے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے وقتوں میں جمناسٹک کرتے وقت کم از کم نیکر پہننا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ زی ٹی وی والے ڈانسز میں چولی اور پشواز کی جگہ چار گرہ سے بھی کم کی دھجی سے ہماری بینائی اور ایمان کی آزمائش اس طرح کی جاتی ہے کہ کوئی

پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چُھپائے نہ بنے۔ غالبؔ ہی نے غالباً ایسی ہی ستر پوشی کے لیے کہا تھا:

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ

رہے مردنا پچنے والے، سو وہ بھی اب ٹائی غلط جگہ باندھنے لگے ہیں!

جوشؔ صاحب کا یہ مقولہ اب تو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکا ہے کہ رقص اعضاء کی شاعری ہے۔ مرزا کو یہ قول اتنا پسند آیا کہ اکثر فرماتے ہیں، شاعری الفاظ کا رقصِ طاؤس ہے!

لکھتے لکھتے یونہی خیال آیا کہ ''رقص'' عربی لفظ ہے۔ ذرا لغت میں اس کے معنی تو دیکھیں۔ بعض اوقات لغت دیکھنے سے بھی کوئی نیا شوشہ یا شگوفہ ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی داد، بدقسمتی سے، صرف لغت مرتب کرنے اور اس کے پروف پڑھنے والے ہی دے سکتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ بھی میری حیرت اور فرحتِ دلکُشا میں شریک ہوں۔ اِس لفظ کے معنی ملاحظہ ہوں۔ توجہ چاہتا ہوں: اونٹ کی اچھلتے اور کودتے ہوئے دوڑ۔ گویا رقصِ شُتر مع شُتر غمزوں کے۔

حیرت ہوتی ہے کہ جس عرب نابغۂ روزگار نے یہ لفظ ایجاد یا وضع کیا، اُس نے ہزاروں برس پیشتر ٹی وی اور POP راگ اور رقص کی ایسی realistic تصویر کھینچ کے رکھ دی کہ جس قدر عش عش کریں کم ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھے جو شیماں بی بی کے رقص نے رقم کروا دیے، بات تو اکابرین کی یاد سے شروع ہوئی تھی۔ مجھے تو فیضؔ صاحب کی شاعری اور موہنی شخصیت کو یاد کرنا تھا جو اختلاف و تنازع سے ہمیشہ بالاتر رہی۔ شاید ہی کوئی شاعر اپنی زندگی میں اس طرح سراہا گیا ہو جس طرح فیضؔ صاحب سراہے اور چاہے گئے۔ اور کون ہے جس نے اپنی زندگی میں نصف صدی تک اقلیم سخن میں دلوں پر یوں راج رچا ہو اور اتنی محبتیں اور عقیدتیں سمیٹی ہوں؟

فیضؔ صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات لندن میں مخدومی ماجد علی صاحب اور محترمہ زہرا نگاہ کے یہاں ہوئی۔ یہ وہی ماجد صاحب ہیں جن سے ایک مشہور لطیفہ منسوب ہے۔ ایک دفعہ اُن کے باس یعنی وزیر خزانہ کے دفتر کے سامنے کچھ دور لوگ عزت مآب کے خلاف ''ایوب خان کا چمچہ! ایوب خان کا چمچہ!'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد صاحب سے پوچھا ''یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا ''سر! یونہی کچھ کٹلری کے بارے میں واویلا کر رہے ہیں!'' مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ماجد صاحب نے فیضؔ صاحب سے میرا تعارف کرایا یا نہیں۔ فیضؔ صاحب اُس وقت حسبِ معمول ہجومِ عاشقاں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں بھی حسبِ معمول بالکل خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ فیضؔ صاحب اُن دنوں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور اُس وقت موجودہ

صورتِ حال پر بہت نپا تُلا اور شگفتہ تبصرہ کر رہے تھے جس میں تلخی وطنز کا شائبہ تک نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے، یا پھر وہ خود ہی حالاتِ حاضرہ کا ذمہ دار ہے۔ ایک صاحب، جن کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی پلاس سے لکڑی میں سے زنگ خوردہ کیل کھینچ رہا ہو، وقفے وقفے سے اعلان فرما رہے تھے کہ پاکستان بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ میں یہ فقرہ سُنتا ہوں تو اِس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ کسی نہ کسی لیڈر نے یہ بشارت نہ دی ہو کہ پاکستان بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے! صاحبو! یہ کیسی نزاکت ہے کہ ۴۵ سال سے بدستور چلی آ رہی ہے! یہ تو بڑی مضبوط ساخت کی نزاکت معلوم ہوتی ہے!

دوسرے دن علی الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیض صاحب آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے گریبان میں منہ ڈالے، گُم صُم بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ میں نے اُنہیں بتایا کہ یہ یوسفی صاحب کا نارمل پوز اور پڑوس ہے! وہ بہت شرمیلے! بند بند سے آدمی ہیں۔ جب تک ڈھائی تین سو حاضرین نہ ہوں، کھلتے نہیں! فیض صاحب کہنے لگے، تم نے تعارف کیوں نہ کرایا؟ میں نے کہا، فیض صاحب! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ یوسفی صاحب آپ سے کبھی نہیں ملے۔ کہنے لگے، ہاں! کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ مجھے یاد نہیں۔ بڑی ندامت ہے۔ صبح ہی مجھے لے چلو۔

میں نے افتخار عارف سے کہا، فیض صاحب سے عرض کر دیجیے کہ آج شام عطار خود حاضرِ خدمت ہو کر اپنے مُشک کا تعارف کروا دے گا۔ جائے واردات وہی مرجعِ خلائق ماجد علی اور زہرا نگاہ کا دولت کدہ جہاں ماجد صاحب اردو کے بہترین مہمل اشعار سے جو اُنہیں بکثرت یاد ہیں، محفل کو گرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں "عمدہ مہمل شعر کہنے کے لیے بڑی ذہانت اور تائیدِ ایزدی درکار ہے جو ایسے ویسے شاعر کا کام نہیں۔ اردو شاعری میں ایک خرابی یہ ہے کہ گھٹیا آدمی بڑے بڑھیا شعر نکال سکتا ہے۔" اس کا سبب ردیف قافیے کی بیساکھیاں ہیں۔ پر غزل ہے بڑی ظالم صِنف۔ اپنے چاہنے والوں کو کہیں کا نہیں رکھتی۔

؎ غزل کھا گئی نوجواں کیسے کیسے

شام کو ملاقات ہوئی تو فیض صاحب خواہ مخواہ اتنے محجوب تھے کہ خود مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود کو اِس کوتاہی پر بھی قصوروار ٹھہرا رہے ہیں کہ میری اور اُن کی ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اس انکار اور حسنِ اخلاق سے میں اس لیے اور بھی متاثر ہوا کہ نہ جانے کیوں میرا خیال تھا کہ انہوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی۔ سُنی سُنائی

تعریف پر ایمان لے آئے ہیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور حسب معمول اپنے خول میں بند۔ اور جب دونوں سینیئر فریق شرمیلے واقع ہوں تو عزیزی افتخار عارف کا طوطی اگر بولے نہیں تو کیا کرے۔

اِس کے بعد جب ملے تو یوں لگا جیسے وہ مجھے سالہا سال سے جانتے ہیں۔

یہ تو ہوئی لندن میں تعارفی ملاقات۔ اب ایک اور یادگار ملاقات کی جھلک ملاحظہ ہو۔ ہفتے کی صبح تھی، جو لندن کی صبح کے بجائے کسی اور ملک کی صبح معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے کہ شرمیلا سورج کئی دن بعد سیاہ بادلوں کا گھونگٹ اُلٹ کے پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فیض صاحب جس خوبصورت مکان میں مقیم تھے وہاں ناشتے میں ایک دن پوریج اور دوسرے دن کارن فلیکس اور نیم برشت انڈا ملتا تھا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھے کہ آج ہری مرچ، پیاز اور زیرے والے پاکستانی آملیٹ کی باری تھی۔ گہرے نیوی بلو سوٹ اور شوخ ٹائی میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ وہ اپنا بستر آپ بناتے، کپڑے خود تہ کرتے اور کمرے کی چیزیں ٹھکانے سے رکھتے۔ کسی کو اپنا بنیان مشین میں بھی نہیں دھونے دیتے تھے۔ اس وقت زاد بوم سیالکوٹ کی باتیں کر رہے تھے جو ایامِ جلاوطنی میں ان کا محبوب موضوع تھا۔ دوسرا دل پسند موضوع وہ زمانہ تھا جب انہوں نے فلم بنائی تھی۔ اس کا ذکر وہ بڑی تفصیل اور للک سے کرتے تھے۔ ان موضوعات کے ساتھ مختصر وقت میں ایمرجنسی انصاف کرنے کے بعد صاحب خانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''بھئی یہ کیا ہر وقت غالبؔ، غالبؔ کرتے رہتے ہیں آپ لوگ؟ سوداؔ پڑھیے، سوداؔ بڑا جان دار، بہت تہہ دار شاعر ہے۔ اس پر صاحب خانہ بولے کہ ''جوش صاحب کو اس پر بہت اصرار ہے کہ کلکتے یا سرگودھے جانا ہے، بولا جائے۔ سرگودھا جانا ہے، غلط ہے۔ اس لیے کہ گھوڑا کی دُم اور تالا کی چابی نہیں کہتے۔ تو جنابِ والا، خاکسار گریمر اور اَملے کے اِسی قاعدے کے مطابق اسی اِملے میں جُملے گھڑ کر عرض کرتا ہے کہ سوداؔ کے قصیدے اور اِنشاؔ کی غزلیں اب فیشن میں نہیں رہیں۔ محققین نے شیفتہؔ کی زندگی میں نزاکت نامی ایک طوائف کا سُراغ لگایا ہے۔ سُراغ کیا، خود ان کے کلام میں ذکر ہے۔ بقول یُوسفی صاحب، چہ دِلا ورست دُزدے کہ بکف سُراغ دارد۔'' فیض صاحب آملیٹ کا ٹکڑا کانٹے میں اٹکائے، ملفوظات میزبان کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جوش صاحب کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا۔

ناشتے کی میز کے پاس ایک اور مہمان جن کا شیو بڑھا ہوا تھا فرش پر آلتی پالتی مارے عجب طریقے سے ناشتہ کر رہے تھے۔ وہ رات بھر کہیں مے نوشی کر کے آئے تھے۔ صبح اپنی میزبان سے کہا کہ بی بی! ہم

تو ملنگ آدمی ہیں۔ سُوکھی باسی روٹی سے ناشتہ کریں گے۔ ایسی روٹی فراہم کرنے میں چنداں دِقت نہیں ہوئی، اس لیے کہ لندن میں جو تازہ روٹی ''گریک بریڈ'' یا ''یونانی نان'' کے نام سے ملتی ہے، اُس میں یہ دونوں خوبیاں روزِ اوّل سے موجود ہوتی ہیں۔ ہم جس وقت پہنچے تو یہ مست ملنگ واقعی سوکھی روٹی کھا رہا تھا...... ایک پیالے میں ڈبو ڈبو کر جو ''رائل سیلوٹ'' سے لبریز تھا۔ تعارف ہوتے ہی ہمیں ''تم'' کہنے لگے اور اب کسی لمحے بھی ''تُو'' کہہ سکتے تھے۔ فرمانے لگے ''تمھیں سُن کے افسوس ہوگا کہ آج کل مُدرِکہ کام نہیں کر رہی۔'' ہم سمجھے کہ مُدرکہ سے مُراد اِن کی بیگم ہیں جو باسی نان کی طرح نام سے یونانی نژاد معلوم ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے از راہِ ہمدردی پوچھا:

How long has she been unemployed?

جھُنجھلا کے بولے، میری قوتِ مُدرکہ فیل ہوگئی۔ اب ہم یہ سمجھے کہ جیسے اِن کی اور قوتیں باری باری جواب دے چکی ہیں، ویسے ہی یہ بھی کوئی قوت ہوگی جو اچانک دغا دے گئی۔ فیض صاحب نے صراحت کی کہ اِن کی مُراد قوتِ اِدراک سے ہے تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر نہ جانے کس ضمن میں یہودی لابی کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ میرا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے عصا کو وطور کے غیر متوقع واقعہ کے بعد رکھنا شروع کیا ہوگا۔ وہ ترنگ میں تھے۔ فیض صاحب بھی خاموش سُنتے رہے۔ اُن کی کسی بھی بات کی تردید مشکل تھی۔ کہنے لگے، میں نے پروفیسروں تک کو اقبال کا یہ مصرع اِس طرح پڑھتے سنا ہے، جو سراسر غلط ہے:

؎ یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

اصل مصرع یوں ہے:

؎ یا تُو خود آ! شِکار ہو، یا مجھے، آ! شِکار کر

ہم نے عرض کیا، مگر اس طرح تو مصرع وزن سے گر جائے گا، جھٹکا لگتا ہے۔ اِس پر اُنھوں نے مصرع اپنی فی البدیہہ کمپوز کی ہوئی نُون غُنوی دُھن میں گا کر سنایا، جس میں ہر حرف کی آواز منہ کے بجائے ناک سے نکل رہی تھی۔ اس میں سکتہ پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پوچھنے لگے، کہاں ہے جھٹکا؟ اُنھیں نظر نہ آیا، ورنہ شعر اور شکار دونوں کا جھٹکا ہو چکا تھا!

کچھ دیر بعد جیسے ہی نانِ شبینہ کا نشہ چڑھا تو کہنے لگے ''صاحب! ایک نیا development ہوا ہے! یہ زمانے کو کیا ہو گیا؟ بیویوں نے مرنا ہی چھوڑ دیا! یہ ریت ہی دُنیا سے اُٹھ گئی۔ بخدا!''

یہ بُری خبر سنانے کے بعد اِن صاحب نے فیض صاحب کو شاعری سے متعلق چند ہدایات دیں۔

فیض صاحب کی ایک بہت ہی حسین نظم ''تنہائی'' کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ نظم اچھی ہے۔ مگر سُنسان بہت ہے! اس میں تنہائی ایسے محسوس ہوتی ہے جیسے لندن میں سردی، یعنی لگتی ہے تو لگتی ہی چلی جاتی ہے۔ کم از کم ایک لائن میں تو محبوبہ کو ڈال لیجے۔ اُن کا اِصرار بڑھا تو فیض صاحب چائے کی چُسکی ایک سُریلی سی سسکی کے ساتھ لیتے ہوئے بولے ''ہاں، بھئی ی ی، اگلے ایڈیشن میں ڈال دیں گے۔''

اردو ادب کی تاریخ میں تین مرنجاں مرنج اہلِ قلم ایسے گزرے ہیں جن کی ذاتی شرافت و شائستگی اور عظمت و برگزیدگی اُن کی تحریر سے بھی جھلکتی ہے۔ یہ تینوں اپنے مزاج و اقدار کی بلندی، شیرینی اور شائستگی کو اپنے الفاظ میں سمو دیتے ہیں۔ اور اپنے لہجے میں اپنی طبیعت و کردار کا سارا حُسن لے آتے ہیں۔ یہ ہیں خواجہ الطاف حسین حالؔی، رشید احمد صدیقی اور فیض احمد فیضؔ۔ جہاں قول، فعل کو اپنے پیچھے ہانپتا چھوڑ آئے، وہاں حرف اپنی حُرمت و تاثیر کھو دیتا ہے۔ خالی ظرف کی طرح لفظ بھی جتنے تھوتھے ہوتے ہیں، اتنے ہی زیادہ بجتے ہیں:

ے چھچھلے آنسو، چھچھلی لاگ
کچا پانی، کچی آگ

حرف بے تاثیر بُومرینگ کی مانند ہر بار شاعر کے پاس واپس آجاتا ہے۔ جو حرف کسی تجربہ اور آدرش کی آنچ پر نہ تپایا گیا ہو وہ کبھی دل میں نہیں اترتا۔ یہ بات نہ صناعی سے آتی ہے، نہ عروض و ریاض سے۔ شاعری میں فیضؔ صاحب کا رشتہ اہلِ قال سے نہیں، اہلِ حال سے ملتا ہے۔ انہوں نے اس رمز کو ابتدائے سفر ہی میں پالیا کہ صرف ایک جذبۂ صادق اور سوزِ دروں ہے جو

ے حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

فیض صاحب کی طبیعت میں صبر و تحمل، قوتِ برداشت اور بُردباری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بلکہ بلحاظِ مقدار ایسا لگتا تھا کہ کوٹ کوٹ کر نہیں، سالم بھر دی گئی ہے۔ لوگ اِسی کو کاہلی اور الکسی محمول کرتے تھے۔ اِس کے بھی لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک نوجوان نے پوچھا ''فیض صاحب! انتظار کرتے کرتے اتنے دن ہو گئے۔ انقلاب کب آئے گا؟'' ارشاد فرمایا ''بھئی ی ی ی...... آجائے گا۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔''

بعض باتیں ایسی ہی جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں۔ مثلاً انہیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت اور بُرائی نہیں سُن سکتے

تھے۔کوئی ان کے سامنے اَدبدا کر کسی کا ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن، زبان اور کان سب سُوِچ آف کر دیتے تھے۔ایک دفعہ مجھ سے پوچھا، آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فُرصت نہیں ملتی؟ میں نے کہا ''فرصت اور فراغت تو بہت ہے۔مگر کاہل ہوگیا ہوں۔پتّا نہیں مارا جاتا۔مطالعہ کی عیّاشی میں پڑ گیا ہوں۔اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو جانیے نِری حرام خوری پر اُتر آیا ہے۔'' میں بہت دیر تک خود کو اسی طرح بُرا بھلا کہتا رہا۔فیض صاحب خاموش سنتے رہے۔پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اتنے قریب آ گئے کہ اُن کی سگرٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی۔ کہنے لگے ''بھئی! ہم کسی کی غیبت نہیں سُن سکتے۔کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں۔اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے۔عفو و درگزر ثواب کا کام ہے۔''

سگرٹ کے ذکر پر یاد آیا کہ فیض صاحب کبھی ایش ٹرے کے محتاج نہیں رہے۔ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ راکھ ہمیشہ ان کی ٹائی پر ہی گرتی تھی۔کبھی اِدھر اُدھر گرتے نہیں دیکھا۔

فیض صاحب کے فطری عجز و انکسار اور حِلم و برداشت کے بے شمار واقعات ہیں جن میں سے دو نمونتہً بیان کرتا ہوں۔ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کیسے کیسے مرحلے سے آسان گزر جاتے تھے۔

یہ کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے۔سنا ہے کراچی میں ایک نجی محفل مشاعرہ تھی جو اتنی نجی بھی نہیں تھی۔کوئی پچاس ساٹھ حاضرین تو ہوں گے جن میں چالیس تو شاعر تھے۔بقیہ مصرع اٹھانے والے۔ ایک صاحب پنگ پانگ کی گیند کی طرح اُچھل اُچھل کر داد دے رہے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ داد کے فقرے کسی کتاب سے رٹ کر آئے ہیں۔چند یاد رہ گئے: بھئی واہ! کیا قیامت شعر نکالا ہے۔غالبؔ کی زمین اب آپ کی ہوگئی۔واہ وا! میاں! جیتے رہو۔ذرا پھر سے پڑھنا! کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔پڑھتے جاؤ۔ جی خوش کر دیا۔حضور پھر مرحمت فرمائیے۔واللہ سیری نہیں ہورہی! سبحان اللہ! کیا تیور ہیں۔تعریف سے مستغنی ہے! کس رُخ سے مصرع لگایا ہے۔تعریف نہیں ہوسکتی! ہائے! مقطع کیا ہے، گویا کلیجے میں میخ ٹھونک دی۔دوبارہ کرم ہو! رات کے ڈھائی بجے فیض صاحب کی باری آئی۔کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔جب اس شعر پر پہنچے

ے اِن طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نَے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے

تو وہ صاحب بولے ''سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا ٹھاٹ، کیا طنطنہ ہے! ریاست بول رہی ہے!'' فیض صاحب ہولے سے مسکرا دیئے۔پھر انہی صاحب کی فرمائش پر ایک اور غزل شروع کی۔ایک

مصرع پر اُن صاحب نے ایسی داد دی کہ نظام دین کے تنبو قناتوں کو سر پہ اٹھالیا۔ بار بار وہ مصرع پڑھوایا۔ جب کوئی شاعر دوسرے شاعر کو بے تحاشا داد دے کر اِس طرح بار بار مصرع پڑھوائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے شعر میں کوئی خامی یا فنّی سُقم نظر آرہا ہے جسے وہ بزبان شاعر اُجاگر کرانا چاہتا ہے۔ جب فیض صاحب نے وہ شعر چوتھی دفعہ پڑھا تو اُن صاحب نے مصرع ثانی اصلاح کر کے باآوازِ بلند پڑھ دیا۔ فیض صاحب نے قدرے سکوت کیا۔ پھر مسکرا کر مصرع کو اُسی طرح پڑھ دیا جس طرح وہ صاحب چاہتے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ فیض صاحب کے مصرع میں قطعاً کوئی سُقم نہیں تھا! مشاعرہ ختم ہوا تو لوگوں نے اُن صاحب کے پرخچے اُڑا دیئے۔

ایک محفل میں فیض صاحب اپنی نظم ''رقیب'' سنا رہے تھے۔ جس کا شمار، انہی کی نہیں، اردو کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ محفل میں ہمارے یار طرحدار اور البیلے شاعر ساقی فاروقی بھی موجود تھے۔ وہ ۲۵ سال سے لندن میں مقیم اور دوستوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ اپنی آسٹرین بیگم کو پیار میں گُنڈی اور Rottweiler کُتّے کو ایک دلآزار نام سے پکارتے تھے۔ کُتّا تو اپنے نام اور ساقی کے پیار کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہوگیا۔ اُنہوں نے مینڈک، کُتّے، خرگوش، مکڑے، بلّے وغیرہ پر بہت خوبصورت اور خیال انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ چار ٹانگوں سے کم کے کسی ذی رُوح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے اُنہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں ہو رہے ہیں۔ جس دن سے وہ ہم پر مہربان ہوئے ہیں، انہوں نے زمین پر قدم رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ کہ اُن کا ہر قدم ہماری دستارِ فضیلت پر پڑتا ہے۔

نازک مزاج ایسے کہ بور آدمی، خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لندن کی ایک ادبی محفل میں اسّی سالہ بزرگ شاعر اپنے استاد پنڈت لبھو رام جوش آنجہانی کا سوسوا سو اشعار پر مشتمل مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ ابھی آٹھ دس شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ ساقی فاروقی نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ پھر خود کھڑے ہوگئے اور باآوازِ بلند فرمایا ''اب آپ بیٹھ جایئے۔ آپ کے استاد تو آپ سے بھی زیادہ نالائق تھے۔'' یہ کہا اور واک آؤٹ کر کے نزدیک ترین پَب میں چلے گئے۔

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ فیض صاحب اپنی نظم ''رقیب'' سنا رہے تھے۔ اِس نظم میں فیض نے رقیب کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ بہت کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وارداتِ عشق پر ایک جُگ بیت گیا ہے۔ شہرِ تمنا میں جس دھنک تلے، دل پہلے پہل دھڑ کا تھا وہ اب

نگاہوں سے اوجھل ہے کہ اس کے سارے رنگ پگھل کر رگِ جاں میں اُتر چکے ہیں۔ لہو میں جو وحشتوں کا الاؤ بھڑکا کرتا تھا، اُس کے شعلے گردِ مہ و سال میں سیہ پوش ہوئے، لیکن دھیمی دھیمی تپش باقی ہے کہ آگ اب روشنی میں تبدیل ہو چکی ہے اور یادوں کی اس بسنت بہار روشنی میں محبوب کا چہرہ اور بھی حسین ہو گیا ہے۔ اب رقیب سے بھی ایک گونہ قُربت، یگانگت محسوس ہوتی ہے کہ اُس نے بھی انہی گلنار ہونٹوں اور ساحر آنکھوں کو چاہا تھا۔ کون ناکام ہوا اور کون شاد کام، اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رقیب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

فیض صاحب جب آخری لائن پر پہنچے تو ساقی فاروقی نے بلند آواز اور بڑے گستاخ لہجے میں کہا ''بس۔ نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ آگے مت سنایئے۔'' فیض صاحب کو اپنی تمام تر شاعرانہ عظمت کے باوصف، دوستوں اور خوردوں کی دلداری اتنی عزیز تھی کہ اُنھوں نے بقیہ نظم نہیں سنائی۔ احمد فراز، زہرا نگاہ اور شہرت بخاری نے جو وہاں موجود تھے بہتیرا کہا کہ بقیہ حصہ بھی سنایئے۔ مگر فیض صاحب بولے ''نہیں بھئی! جب ساقی نہیں سننا چاہتا تو ہم کچھ اور سنائیں گے۔''

وہ کسی کی دل آزاری اور آزردہ خاطری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی نہیں، مروّت اور دلداری کا یہ عالم بھی دیکھا کہ ایک دن حلقۂ نیاز مندانِ لندن میں بیٹھے کلام سنا رہے تھے کہ ایک سردار جی انہیں لینے آ گئے۔ اور وہ اٹھ کر اُن کے ساتھ برمنگھم چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ سردار جی انہیں اپنی بیکری کا افتتاح

کرانے کے لیے لے گئے ہیں! بعد میں کسی نے دبے لفظوں میں تعجب کا اظہار کیا تو کہنے لگے کہ سردار جی نے ہمیں بڑی محبت سے بلایا تھا۔ برطانیہ یا پاکستان میں ہم سے کسی نے کتابوں کی دکان کا افتتاح نہیں کرایا۔ بسکٹ بُرے نہیں تھے۔ سردار جی تو ایک طرف رہے، فیض صاحب کو تو ان کے بسکٹوں سے بھی بُوئے خلوص ووفا آرہی تھی!

فیض صاحب نے اپنے بارے میں لکھا ہے:

ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام، عشق کے آڑے آتا رہا
اور کام سے عشق اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو اُدھورا چھوڑ دیا

خیر، شاعری کے بارے میں تو فیض صاحب نے غلط بیانی کی حد چھوتی ہوئی کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ رہا اُن کا عشق، تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہمارے یہاں کاروبارِ عشق جس فراغت، محنت، مشقت اور خواری کا طالب ہے، فیض صاحب کی فطری کاہلی اُس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ خود کہتے ہیں کہ عشق کے لیے جتنی فراغت چاہیے، اُتنی مجھے نصیب نہیں ہوتی۔ فیض صاحب کی ایک مدّاح خدیجہ بیگم اُن کی بے نیازی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ "میں بہت مزے مزے کے کھانے اُن کے لیے بڑے چاؤ چاہت سے پکاتی۔ مگر ہر بار دیکھا کہ جو چیز بہت نزدیک ہوتی بس وہی کھاتے رہتے۔ دال قریب ہے تو وہ کھا رہے ہیں۔ مچھلی دور ہے تو وہ طلب نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی فرق ہی محسوس نہیں کیا کہ بینگن کا بھرتا نوش جان کر رہے ہیں کہ بھیجا! شاہی ٹکڑے لے لیے ہیں کہ بگھارے آلو۔" شاعر جب زندگی میں ہی "لیجنڈ" بن جاتا ہے تو یار لوگ اُس کے بارے میں طرح طرح کے قصّے گھڑ لیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ فلاں شاعر یا ادیب حسین چہروں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ہم نے لندن میں چھ سات سال فیض صاحب کو اور اُن کے روز و شب کو کافی قریب سے دیکھا ہے۔ ہمیں تو وہ بے نیاز سے لگے۔ ہم نے تو پارٹیوں میں یہی دیکھا کہ اگر کوئی شاہی ٹکڑا خود چل کر اُن کے پہلو تک پہنچ گیا تو فیض صاحب نے ہمارے حصّے میں آئے ہوئے بینگن کے بھرتے کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔

فیض کے زمانے کی شاعری کا پس منظر اور منظر نامہ کچھ یوں ہے کہ اردو شاعری ابھی پوری طرح

گل و بلبل، آشیانہ اور بجلی (اُس زمانے میں بجلی کو آسمان کی بجلی نہیں کہتے تھے)، شب ہجر کی طوالت، دل و جگر سے خون کا اخراج، موت کے بعد بھی غیر شرعی خواہشات کا غلبہ، مزار پر صفائی، مرمت اور روشنی کا ناکافی انتظام، قبر کے اندر مرحوم کی شان میں فرشتوں کی بڑھتی ہوئی گستاخیاں وغیرہ جیسے موضوعات سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا پائی تھی۔ عاشق کو فراق میں زیادہ مزہ آتا تھا:

ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

ہم بھی ایک مدت تک اس شعر کی لطافتِ احساس اور نزاکتِ خیال پر سر دُھنتے رہے، تا آنکہ ایک دن مرزا عبدالودود بیگ نے یہ کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیا کہ اِس صورت حال کا کریڈٹ طبیعت کو نہیں، صحت کو جاتا ہے!

فیض کی شاعری کا سارا اعجاز اور اس کی تمام تر پُر اَسرار غمناکی اور نغمگی اُن کے منفرد لہجے میں مُضمَر ہے۔ لہجہ میں بڑے شاعر کی چھب، چھاپ، تِلک اور شناخت ہے۔ لہجہ لفظ کا تیسرا بُعد ہے۔ لہجہ وہ طلسم ہے جس سے خزینۂ تاثیر کا سِم سِم کُھلتا ہے اور دُنیائے معانی کا در دِلکشا وا ہوتا ہے۔ یہ لفظ کو نیا مزاج دیتا ہے۔ تازہ توانائی، تیور اور کاٹ بخشتا ہے۔ لہجہ لفظ کا اعتبار ہے۔ لہجہ لفظ کا سمپورن ٹھاٹ ہے۔ یہ زیور نہیں، حرف کی حُرمت اور دمِ عیسیٰ کی حرارت ہے۔ یہ محرم رازِ نہاں خانۂ دل ہے۔ لہجہ نیتوں کا امین ہے۔ لہجہ آدمی کی پہچان ہے۔ لہجہ خود آدمی ہے۔

اور آدمی بھی کیسا۔ وہ آدمی جس کے دل میں کینہ و کدورت، بُغض و عِناد کا کوئی گزر نہ تھا۔ جس نے زندگی کے ہر رنگ اور انسان کے ہر رُوپ سے محبت کی اور ٹوٹ کے محبت کی۔

فیض کی شاعری محض الفاظ کی نگینہ سازی نہیں۔ نہ اُن کا فن مرصّع ساز کا کام ہے۔ اُن کا ڈکشن، بنیادی طور پر غزل کا ڈکشن ہے۔ نظم میں بھی۔ لیکن لہجہ اُن کا اپنا ہے۔ اِس سے پہلے، اِس لہجے میں، اور اِس طرح کسی نے اپنے غمِ تنہائی کو غمِ زمانہ اور غمِ جاناں کو غمِ روزگار سے ہم آہنگ نہیں کیا تھا۔ اُن کے اپنے درد کا رشتہ اپنے عہد کے دُکھ اور عذاب سے جا ملتا ہے۔ فیض کے مزاج میں جو ضبط اور ٹھہراؤ تھا وہ تمام و کمال انہوں نے اپنے دھیمے دھیمے اور غمناک لہجے کی شاعری میں سمو دیا ہے۔ مدّھم سُروں میں گِلۂ حیات اور شکایتِ زمانہ و اَبنائے زمانہ تو ہے، لیکن مایوسی، تلخی اور خشونت کا گزر نہیں۔ محتسب ایک سمبل اور علامت ہے۔ وہ اُس تک کو بُرا نہیں کہتے کہ ساری رونقیں اُسی کے دم قدم سے ہیں:

محتسب کی خیر، اُونچا ہے اُسی کے فیض سے
رِند کا، ساقی کا، مَے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

لہجے میں ایک میٹھی سی کسک محسوس ہوتی ہے جو درد تھمنے کے بعد نہ صرف جان کو گھلا دینے والے کرب والم کا پتہ دیتی ہے، بلکہ قدموں کے تازہ نشان بھی ضبط کی اُس رہگذر پر دکھاتی ہے جہاں سے کوئی شائستۂ حیات ابھی ابھی پابجولاں اور مست و رقصاں گزرا ہے۔

فیض صاحب نے حرفِ سادہ کو اعجاز کا ایسا رنگ بخشا کہ اپنے کلام کو بگاڑ کر پڑھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود، اُن کے چاہنے والوں کو اُن کی پڑھت کی اُکھڑی اُکھڑی طرز ایسی بھائی کہ مشاعروں میں وہی شرح و معیارِ بیان ٹھہری۔ گفتگو میں بھی وہ سگرٹ کے کش سے کوما، فُل اسٹاپ لگاتے جاتے۔ سگرٹ منہ میں نہ ہو، تب بھی کش کی سسکی اُسی طرح لیتے رہتے۔ مصرعے اور فقرے کی سانس ٹوٹ جاتی۔ وقفے وقفے سے گھائل سی سسکی سنائی دیتی۔ اور سننے والوں کا پیار، سکوتِ سخن میں حلاوتیں گھولتا چلا جاتا۔ درحقیقت وہ اپنا کلام اِس طرح پڑھتے تھے جیسے شاعر اپنے دشمنوں کا کلام پڑھتے ہیں۔ یعنی صحیح شعر میں جا بجا سکتہ پیدا کر کے۔ مگر یہ بھی اُن کی ایک ادائے دلبری تھی جس پر ہم ایسے نیاز مند تو فریفتہ تھے ہی، اُن کے نقالوں کو بھی اُن کا اندازِ شعر خوانی ایسا بھایا کہ پڑھتے وقت شعر کے علاوہ خود پر بھی سکتہ طاری کرنے لگے۔ کسی کہنے والے نے ازراہِ تفنن کہا بھی کہ فیض صاحب نے تحت اللفظ پڑھنے کی یہ مخصوص طرز دراصل اپنے نقالوں کا خانہ مزید خراب کرنے کی غرض سے ایجاد کی ہے۔

اس امر کی اب محض ایک تاریخی حیثیت رہ گئی ہے کہ فیض صاحب کا سیاسی مسلک کیا تھا۔ سیاسی عقائد اور اقتصادی نظریوں کے اختلاف و آویزش سے قطع نظر، دیکھنے اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ فیض صاحب کا اپنے مسلک و مشرب سے عہدِ وفا کتنا اُستوار تھا اور اُس پر کاربند رہنے میں انہوں نے کیسی پامردی اور استقامت کا ثبوت دیا۔ آزادیٔ فکر و اظہار، احترامِ آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری میں وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے، جس مسلکِ کج کلاہی کی سمت انہوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ راست کرلیا، پھر اُسے تاعمر نہ بدلا۔ اور اُسی نسخۂ وفا میں علاجِ گردشِ لیل و نہار ڈھونڈا۔ فیض صاحب کے کمِٹ منٹ اور استقامت کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ یوں تو ہمارے یہاں ایسے شاعر اور ادیب بھی ہیں جنہوں نے ہر دور میں ہر حکومت کی مخالفت کی۔ جیسے...... نام کیا لُوں، کوئی اللہ کا بندہ ہوگا۔ اور اپنی دانست میں ایسے بھی شیر بیشہ اور ملازمت پیشہ ہیں جنہوں نے ہر حکومت کی حمایت و اطاعت کو بمنزلہ فرضِ منصبی انجام دیا۔ مثلاً...... اب نام کیا گنواؤں۔ سرِفہرست اپنا ہی نام لیتے حجاب آتا ہے۔ آخر انکسار بھی کوئی چیز ہے۔ زراف کو اونٹ کی گردن پر اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ حکومتوں کو مزید خراب و خوار کرنے میں بعض اہلِ قلم سب سے آگے نہ سہی، سب سے پیچھے بھی نہیں رہے۔ سیاسی طاقت و اقتدار میں اَز خود بھی بگڑنے

اور گمراہ ہونے کی عظیم صلاحیتیں مُضمَر ہوتی ہیں۔ حکومتوں کا احوال پُر ملال دراصل Max Miller کی نوجوان ہیروئن جیسا ہوتا ہے:

When she was good, she was very very good, and when she was bad, she was very very popular.

مُجھ ایسے ادیب بے ادب تادیب کو کبھی کبھار شاہی اصطبل سے کوئی کاٹھ کا گھوڑا مع زین سنہری مل بھی جاتا ہے تو نہ اُس سے منزل طے ہوتی ہے، نہ خواہشِ جاہ ومنصب کی تسکین ہوتی ہے۔ پنجابی کی ایک مثل ہے کہ گھوڑی چڑھدا تے لگدا تھانیدار نی مائے۔ یعنی جب وہ گھوڑی پہ چڑھتا ہے تو بالکل تھانیدار لگتا ہے۔ مگر ہم گھوڑی پہ چڑھ کے بھی گھوڑا ہی لگتے ہیں۔ یعنی وہ گھوڑی جس پہ تھانیدار چڑھتا ہے! میڈیا ہو یا ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی دنیا، ہر دور میں اربابِ اقتدار کے ایسے ثناء خوانوں کی کمی نہیں رہی جن کے ایجاب وقبول کا عالم جیمس جوائس کی Molly Bloom کی ہمہ تن سُپردگی کی یاد دلاتا ہے۔

"He asked me with his eyes, yes, and with his hands, yes, and yes, I said, yes, I will, yes!"

خواتین وحضرات! یہ تحلیلِ نفسی کا مسئلہ نہیں، تذلیلِ نفسا نفسی کا کیس ہے

اِس تناظر اور ایسی فضا میں ہم پیچھے مُڑ کے دیکھتے ہیں تو فیض اُس قبیلے کی آنکھ کا تارا نظر آتے ہیں جس کا اصل موضوع، اوّل تا آخر، انسان کا دُکھ اور اُس کا مُداوا رہا ہے۔ فیض نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ دُکھ کسی اندھی مشیّت کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ زندگی کا المیہ یہ ہے کہ انسان کے سارے دُکھ درد کا سرچشمہ خود انسان ہی ہے۔ لیکن اِسی سے کچھ آس بھی بندھتی ہے۔ اس لیے کہ مَرَض قابلِ علاج اور جُرم لائقِ تدارک وتعزیر ہے:

جزا سزا سب یہیں ہوگی، یہیں عذاب وثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا روزِ محشر، یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

تیسری دنیا کے دُکھ اور اُس کے اسباب وعلل پر فیض کی بڑی گہری نظر تھی۔ تیسری دنیا کا اصل دُکھ بھوک، افلاس اور قحط نہیں ہے۔ تیسری دنیا کا دُکھ قحط الرجال بھی نہیں ہے، جس کا جتنا رونا رویا جاتا ہے۔ تیسری دنیا قحط الرِجال کی نہیں، قہرالرجال کی ماری ہوئی ہے۔

فیض صاحب کی نظریاتی وابستگی کچھ بھی رہی ہو، اُن کی شخصیت اور شاعری ہر تنازعہ اور تعصب سے

بالاتر رہی ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر اپنی زندگی میں اِس طرح چاہا اور سراہا گیا ہو جس طرح فیض صاحب مرکزِ توجہات رہے۔ اور کتنے ہیں جنھوں نے نصف صدی سے زیادہ اِقلیم سُخن میں دلوں پر یوں راج رچا ہو؟ اور اتنی محبتیں اور عقیدتیں سمیٹی ہوں؟ ساتھ ہی ساتھ، فیض قلعۂ لاہور اور جیل میں بھی فروکش رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ سرکاری رزق کے دروازے اُن پر بند کیے گئے۔ جلاوطنی اختیار کی۔ معتوب رہے۔ اگر کوئی ملازمت ملی بھی تو اُس کی حیثیت اُس وظیفے سے زیادہ نہ تھی جو اعلیٰ حضرت نظام دکن اُن لوگوں کا ازراہِ ترحمِ خسروانہ مقرر فرما دیتے تھے جن سے وہ ہمیشہ کے لیے خفا ہو جاتے تھے۔ یہ وظیفۂ عِتاب کہلاتا تھا۔ مگر یہ کیسا قیدی ہے کہ دورانِ اسیری خود جیلر اِس کے اعزاز میں محفل کا اہتمام کرتا ہے۔ اور یہ کیسا البیلا معتوب ہے کہ وزیرِ خزانہ اس کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کو افتخار اور شفاعت کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق کے 5-year پلان تو جلد یا بدیر تاریخ کے ردّی خانے میں پہنچ جائیں گے جہاں وقت کی اِقتدار فراموش دیمک اُنھیں بہت باریک کُتر اور کُتر کے رکھ دے گی۔ کیا عجب کہ وہ صرف اِسی ترجمے کی نسبت سے یاد رکھے اور بخش دیئے جائیں۔ فیض کی شاعری اِتنی سخت جان نکلی کہ انگریزی ترجمے بھی اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہ مجھے اس لیے کہنا پڑا کہ فیض کی شاعری میں پہلے پیار کی والہانہ فریفتگی اور سُپردگی ہے، جس کی تاب انگریزی زبان نہیں لاسکتی۔ انگریزی casual affairs اور dating کے لیے بہت کارآمد و کارگر ذریعہ اظہار ہے۔ مرد زندگی میں عشق ایک ہی دفعہ کرتا ہے۔ دوسری مرتبہ عیاشی۔ اور اُس کے بعد نری بدمعاشی۔ انگریزی زبان دوسری اور تیسری صورتوں کے رازہائے سرِ بستر کے اظہار کے لیے نہایت موزوں ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ بھی اِس کی تائید کرتے ہیں کہ پہلا عشق بالکل سچا، genuine اور پاک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُس زمانے میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی!

کچھ دیر کے بعد آپ فیض کا کلام ممتاز گلوکاروں سے سماعت فرمائیں گے۔ ایسا حسنِ اتفاق کم ہوتا ہے کہ خوبصورت کلام کو، گانے والا بھی اچھا مل جائے۔ میر تقی میر نے تو اِسی بات پر، اپنی عُسرت و تنگ دستی کے باوجود، اچھی بھلی ملازمت پر لات ماردی۔ ہوا یہ کہ ایک دن اُن کے آقائے نامدار رعایت خاں نامی نے فرمائش کی کہ میر صاحب! اِس گویّے کے لونڈے کو اپنے دو تین شعر ریختہ کے یاد کرا دیجئے تو یہ اپنے ساز پہ درست کرکے گا لے گا۔ میر صاحب نے اسے اپنی اور اپنے کلام کی توہین سمجھی۔ چنانچہ اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں کہ میں نے جواب دیا "یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔" کہنے لگا، میری خاطر سے! چونکہ ملازمت کا پاس تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ چھ شعر ریختہ کے اُسے یاد کرا دیئے۔ مگر یہ بات میری طبع نازک پر بہت گراں گزری۔ آخر دو تین دن بعد گھر بیٹھ رہا۔ اُس نے ہر چند بُلایا۔ نہیں گیا۔ اور اُس کی نوکری پر

لات ماردی۔''

لیکن فیض کے کلام کی نغمگی نے گلوکاروں اور اُن کی گائیکی کو بھی شہرتِ عام اور بقائے دوام بخش دی۔ مہدی حسن نے اُن کی ''گلوں میں رنگ بھرے'' والی غزل ایسی گائی کہ دونوں ایک دوسرے بلکہ ایک تیسرے سے منسوب ہوگئے۔ اقبال بانو نے ''ہم دیکھیں گے، لازم ہے کہ ہم دیکھیں گے'' اپنی سدا سُہاگن آواز میں ایسے جی جان سے گایا ہے کہ سننے والے کا دل، وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے، دیکھنے کے لیے زندہ رہنے کو چاہتا ہے۔ مادام نور جہاں، فریدہ خانم، غلام علی، نیرہ نور، ٹینا ثانی...... سبھی نے کلام اور گائیکی کا حق ادا کیا ہے۔ معاف کیجئے۔ ہم طاہرہ سیّد کا نام لینا بھول گئے۔ وہ بی بی تو ہمیں بہت ہی پسند ہیں۔ ہمارا املا بہت کمزور ہے۔ گانے کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں الفاظ کے ہجے بھی یاد کرا دیتی ہیں!

فیض کا شمار دنیا سے بہت کچھ لینے والوں میں نہیں ہوگا۔ وہ دُنیا کو بہت کچھ دے کر جانے والوں میں سے تھے۔ عظیم فن کار کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ایک ساعتِ دُرزدیدہ و نایاب کو بھی امر کر دیتا ہے اور لمحۂ شاداب کو ہمیشگی بخش دیتا ہے۔ اُس کی ہر بات اک مقام سے ہوتی ہے۔ موضوع، ذاتی غم ہو یا انسان کا جنم جنم کا دُکھ، فیض نے سطحِ محسوسات کو ایک نئی رفعت بخشی اور لہجے کو ایک نیا اعتبار اور آہنگ عطا کیا۔ یہ کہنا تو کسر بیانی ہوگی کہ فیض اپنے عہد کی آواز تھے۔ اُن کی آواز اُن کی اپنی آواز تھی۔ اِس کی گونج اتنی دور تک اور دیر تلک سُنائی دے گی کہ اُن کا عہد اُن کی آواز سے پہچانا جائے گا۔ اِس آواز نے آج کے دُکھ سے نڈھال لوگوں کو کل کے لیے جینے کا حوصلہ دیا۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے یہ عہد دیکھا اور امید اور درد میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سُنی۔ نصف صدی قبل لکھی ہوئی فیض کی نظم ''بول'' ہمارے دور کا عہد نامہ ہے، جس کے الفاظ میں رَجَز خوانوں کے نفَس گرم کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اِس کے لحن میں عہدِ عتیق کی بشارتوں کا جاہ وجلال گونج رہا ہے۔

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہو کہہ لے

خطبہ
جلسہ عطائے اسناد

انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹکچر

(۱۴ دسمبر ۲۰۰۲ء)

جنابِ صدر، محترم اراکینِ بورڈ آف گورنرز، عزیزانِ درس گاہِ فنونِ عالیہ،
معزز خواتین و حضرات،

آپ کے نہایت فاضل و فعّال ایگزیکٹو ڈائریکٹر جناب شاہد صدیقی نے چند روز قبل اس کنووکیشن میں دعوتِ خطاب دی تو میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اس کارِ عالمانہ و ناصحانہ کے لیے نگاہِ انتخاب عاجز پر کیوں کر پڑی۔ میری لاعلمی و نافہمی کو صدیقی صاحب نے بس ایک ہی بے ساختہ جملے سے دور کر دیا۔ فرمایا کہ ہم کبھی مشاہیر یا کسی صاحبِ اقتدار، وزیر باتدبیر یا اعلیٰ سرکاری افسر کو زحمتِ کلام نہیں دیتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اپنے کیریئر کے آخری جان و ایمان لیوا مرحلے میں، جس کا گراف دل کے مریض کا ECG معلوم ہوتا تھا، سرکارِ دولت مدار کا افسر نامدار بھی رہ چکا ہوں۔ انہوں نے یہ کہہ کر میرا بے جا تردّد دور کرنا چاہا کہ جو افسر یا بیوروکریٹس ریٹائر ہو گئے یا ڈسمس کر دیے گیے اُن کو ہم افسروں اور بیوروکریٹس میں شمار نہیں کرتے! اِس وضاحت کے بعد اِس عزّت افزائی کا سبب کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا، جس کے لیے شکر گزار ہوں۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ بینکرز اور بیوروکریٹس آج کل ایک ردِ خلائق اور مطعون برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی گیا گزرا ایک طبقہ ہے۔ وہ ہے ریٹائرڈ بیوروکریٹس اور بینکرز کا جس سے اب اِس نامہ سیاہ کا اٹوٹ تعلق ہے۔ ہمارے ہمدم دیرینہ وطرفدار مرزا عبدالودود بیگ تو ایک اور ستم ڈھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بیوروکریٹ کے املا میں ''کریٹ'' کی ے کے نیچے دو کے بجائے تین نقطے لگا دیے جائیں تو لفظ منہ سے بولنے بلکہ چغلی کھانے لگے گا! زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مجھے بیوروکریسی کے اجیت گڑھ اسلام آباد میں...... مگر غولِ بادشاہ گراں کی غلام گردشوں یعنی

سیکریٹریٹ سے دور...... ایک ایسے ادبی جلسے کی صدارت کا شرف حاصل ہوا، جس میں وزیرِ داخلہ اور سینیئر بیوروکریٹس بھی رونق افروز تھے۔ میں نے تمہیداً عرض کیا کہ اس سیاسی دارالخُون خرابہ میں آنے میں مجھے کافی تامّل ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ اسلام آباد درحقیقت جنت کا نمونہ ہے...... اس اعتبار سے کہ یہاں جو بھی آتا ہے، حضرت آدم کی طرح نکالا جاتا ہے!

متذکرہ جلسے میں میں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ میں ایک ڈرپوک سا آدمی ہوں۔ سیاسی موضوعات پر اظہار خیال سے احتراز کرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ حکومتِ وقت اگر خفا ہوگئی اور میں عتاب میں آگیا تو کہیں مجھے سندھ کا گورنر نہ بنا دے!

اب اسے ایک ربا خور فقیرِ بے ریا دریش کی بُزدلی کہیے یا مصلحت پسندی کہ متنازعہ مسائل اور ناگفتی حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کے لیے کہا جاتا ہے تو اپنا ایک جامع و مانعِ سزا و سَرزنش گھڑا گھڑایا جملہ دُہرا دیتا ہوں جس سے بقول مرزا، دانائی سے زیادہ ملا زمانہ وتیرۂ احتیاط، اہلکارانہ چالاکی اور مُنشیانہ گھاگ پن ٹپکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''دنیا جہان میں جہاں بھی جو کچھ ہو رہا ہے یا ہوتا رہا ہے وہ ہماری اجازت و ایما اور مشورے و مرضی کے بغیر ہوا ہے۔'' اِس کا اطلاق ہر اُس صورتِ حال پر ہوتا ہے جو کبھی ''موجودہ'' کہلاتی تھی۔

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

دیکھیے میں نے خود اظہار خیال کرنے کے بجائے شمع حفیظ جالندھری کے سامنے سرکا دی۔ ''بقول شاعر'' یا ''بقول شخصے'' بھی درحقیقت بُلٹ پروف جیکٹ پہن کر نشانہ بازی کرنے اور حفظِ ماتکلم ہی کی ایک صورت ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نامور اور منفرد آرٹسٹ گوگاں نے محبوبہ کو اپنی پینٹنگ پیش کرنے کے بجائے ریزر سے اپنا کان کاٹنے کو ترجیح دی، لیکن ملاحظہ کے لیے پیش نہیں کیا، نہ تقریر کی، جب کہ اسپین میں matador حسب دستور سانڈ سے خُونیں مقابلے کے بعد اُس کا کان کاٹ کر ناظرین اور اپنی محبوبہ کو بڑے فاتحانہ انداز سے بطور ٹرافی دکھلاتا ہے!

میرا خیال تھا، اور ہے، کہ مجھے اِنڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر کے کنووکیشن میں کسی مُشفقانہ خوش فہمی کی بنا پر دعوتِ کلام دی گئی ہے، ورنہ: کہاں میں کہاں یہ کلام اللہ اللہ! آرٹ میں اپنے درک اور دسترس کے بارے میں چند ذاتی گزارشات آغازِ گفتگو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ طالب علموں اور خُردوں کے سامنے جھوٹ بول کر حرف کی حُرمت اور لفظ کی تاثیر کھونا نہیں چاہتا۔ چوتھی جماعت میں چار دن فارسی پڑھنے کے بعد میں آمد، آمدی، آمدم، آمدیم، آمدند،

آمدید...... کی مغز پاش گردان سے ایسا وحشت زدہ ہوا کہ آنکھ بند کر کے ڈرائنگ لے لی۔ اور آگے چل کر ثابت ہوا کہ میٹرک تک ڈرائنگ کے دوران بھی بند ہی رکھی! ''آمد'' کے باب میں میرا مبلغ علم خوش آمدید، آمدنی، برآمد اور برآمدے تک محدود تھا جو فی الحال میری ضروریات سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ چار دن آمدنامہ کی گردان کے بعد دل میں ایسا ہول بیٹھا کہ خوشامدی کو خوش آمدی لکھنے لگا! فارسی سے قریب قریب نابلد ہونے کے باوجود میں کیسی اُردو لکھتا ہوں، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوا کہ شادی کی ایک تقریب میں کراچی گریمر اسکول کے ایک ذہین سے لڑکے نے پوچھا ''انکل'' کیا آپ کو simple اردو لکھنے میں بہت difficulty ہوتی ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں تو برخوردار، تمھیں یہ خیال کیسے آیا؟ بولا ''آپ کی وجہ سے گریمر اسکول کے لڑکے اردو میں بہت فیل ہوتے ہیں۔ میری فرسٹ پوزیشن بھی آپ ہی کے مضمون 'اورآنا گھر میں مرغیوں کا' کی وجہ سے ماری گئی!''

ڈرتا ہوں کہ چائے کے وقفے میں عزیزانِ آرٹ اسکول مجھ سے یہی کُڈھب سوال نہ کر بیٹھیں۔ غنیمت جانیے کہ میں نے فارسی صرف چار دن پڑھی سو وہ بھی دو نہ سمجھنے میں گزرے اور دو اُسے رٹنے میں! اگر تین چار دن اور پڑھ لیتا تو مجھے یقین ہے کراچی گریمر اسکول کے لڑکے برسوں اولیول (O Level) میں لڑھکتے اور مجھے غلط انگریزی میں کوستے رہتے!

معاف کیجیے، آغاز گفتگو میں سخن گسترانہ باتیں آپڑیں۔ ذکر ہو رہا تھا آرٹ اور ڈرائنگ کا۔ تو عزیزو، آٹھویں جماعت تک تو جیسے تیسے گزر ہوگئی، کیوں کہ میں گھڑا اور انگور کا خوشہ اچھا خاصا بنالیتا تھا گو کہ میرا ایک دوست کہتا تھا کہ تمہارے انگور تو نکاح کے چھوارے لگتے ہیں! نویں دسویں کلاس میں پہنچ کر یہ واضح ہوگیا کہ میری تمام آرٹسٹک مہارت اور کمالات گھڑے اور انگوروں پر ختم ہوگئے۔ ہندو ڈرائنگ ماسٹر کہتا تھا کہ ''میاں جی'' تمہارے انگور تو افطیاری کی کھجوریں لگتی ہیں! تمہارا گھڑا تو کاغذ پر پھر بھی پہچان لیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تم اس کے نیچے خوبصورت lettering میں لکھ دیتے ہو کہ یہ گھڑا ہے!

ایک دن مرزا کہنے لگے کہ کوئی کنواری کنّیا (دوشیزہ) ایسے اَن گھڑے گھڑے کو رنگین اینڈ دی پر اور اینڈ دی کو سر پہ رکھ کے پنگھٹ پہ پانی بھرنے جائے تو من چلے لونڈے اگر ہندو ہیں تو کنکریوں سے اور مسلمان ہیں تو غُلیل سے اور اگر بڈّھے ہیں تو فقط تنگ دھڑنگ نظروں سے آدھے رستے ہی میں گھڑے کو ڈھیر کر دیں گے! اور گوری وہیں کھڑی گھونگٹ کے پٹ کھول کے مُسکان بکھیر دے گی۔''

بھلا ہوا مری گگری ٹوٹی
پنیا بھرن سے چھوٹی

اُس نے ترس کھا کے یہ مشورہ دیا کہ تم اتوار کو میرے گھر آ کر ڈرائنگ کی مشق کیا کرو۔ دو تین اور غبی لڑکے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ میں وہاں ایک اُدھڑی کھجوری چٹائی پر زانوئے تلمذ ہر اتوار کو تہہ کرنے لگا۔ چٹائی کے کاٹ دار اور نکیلے پھوسڑے متذکرہ زانوئے تلمذ سے اتصالِ باہمی کے باعث تلملاہٹ کی کیفیت پیدا کرتے تو میں پہلو بدل کے جسم کے کسی اور حصّے کو محاورے کے مطابق تہہ کر کے اظہارِ ادب و شاگردی کرتا۔ وہ ٹیچر برہمن تھا۔ اُس نے میرے استعمال کے لیے بطورِ خاص ایک شیشے کا گلاس خریدا، کیوں کہ چھُوت چھات کے پیشِ نظر مجھے گھر کے برتن (دھات) کے گلاس میں جل نہیں پلایا جا سکتا تھا۔ اس گلاس کو وہ غریب خود گلی کی مٹی سے رگڑ کے دھوتا تھا۔ برہمن عورتیں گوشت خور مسلمان کے جھُوٹے گلاس کو کیسے ہاتھ لگا سکتی تھیں۔ یہ گلاس مجھے پانی پلانے کے بعد کھُلے آنگن کے ایک کونے میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ایک اتوار کو میں نے اسی کونے میں اس کے پاس ایک لمبی جھاڑو کھڑی دیکھی جس سے آنگن میں جھاڑو بہارُو دی جاتی تھی۔ اُس دن کے بعد سے میں نے ڈرائنگ سیکھنے کے علاوہ گرمی میں پیاسا رہنا بھی سیکھا۔

میں نے اس کا ذکر عبدالوحید ہاکی کیپٹن سے کیا۔ وہ ایک مسخرا تھا۔ کہنے لگا، پیاس کے علاوہ دیگر حوائج ضروریہ کو بھی ضبط کرنا سیکھو۔ چھوت چھات کا خیال رکھو اور دوسرے کے عقائد کا احترام کرنا سیکھو۔ لہٰذا رفع حاجت کے لیے کبھی اُس کے سنڈاس میں نہ جانا۔ ورنہ اُس کا پس افگندہ بول براز ★[1] تمہاری غلاظت سے ناپاک ہو جائے گا!

اور ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ جب میں میٹرک پاس کر کے کالج پہنچ گیا تو مجھ سے دو برس جُونیئر ایک طالب علم نے مطلع کیا کہ تمہارے کانچ کے اچھُوت گلاس کو اب فورتھ کلاس میں بطور ماڈل سامنے رکھ کر لڑکوں کو ڈرائنگ سکھائی جاتی ہے! چند روز سے ماسٹر صاحب کانسی کی اپنی ایک گڑوی (ہندوانہ طرز کی لٹیا) بھی میز پر رکھ کر still life کی ڈرائنگ کرواتے ہیں۔ تو کیا اس کا ناس بھی تمہیں نے مارا تھا؟

ڈیڑھ سال کی شاگردی اور فری ٹیوشن کے بعد میں کس درجۂ کمال پر پہنچا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دن اُستاد نے اپنی ایک واٹر کلر تصویر جس میں کرشن جی بانسری بجا رہے تھے، مجھے دی اور کہا کہ اسے 'کاپی' کرو۔ تین گھنٹوں کی دیدہ ریزی کے بعد جو تصویر میں نے بنائی، اُسے

★[1] پس افگندہ بول براز: پس افگندہ کے لغوی اور لغو سے معنی ہیں پیچھے پھینکا ہوا فضلہ۔ میں نے نفاست پسند قارئین کے ڈر سے اُس ظالم کی سلیس اردو کا odourless (بے بو) فارسی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، اصل فقرہ کچھ یوں تھا: ورنہ برہمنوں کا پہلے سے موجود پیشاب پاخانہ تمہارے گو موت سے ناپاک ہو جائے گا!
یہ نوٹ تقریب میں نہیں پڑھا گیا۔ نفاست پسند قارئین بھی نہ پڑھیں۔ اور اگر پڑھ لیا ہے تو اٹھ کر کلّی کر لیں۔

دیکھ کر استاد نے کہا کہ اس میں صرف بانسری ٹھیک بنائی ہے!

''Thank you, sir'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''پرمیانجی، کرشن جی کی بانسری کے سوراخوں میں تم نے اپنی اچکن کے بٹن کاہے کو ٹانک دیئے؟ سوراخ تک ٹھیک نہیں بنائے!''

''I am sorry Masterji''

اُن دنوں امتحان میں lettering کے دس نمبر علاحدہ ہوتے تھے۔ سو بحمداللہ، خوش خطی کے ہمیشہ دس میں سے دس نمبر حاصل کیے۔ اسکول اور یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد بھی یہی اسکور رہا۔ مطلب یہ کہ زندگی نے جتنے بھی ٹیڑھے سوال کیے، ان کے جواب ہم نے اکثر و بیشتر غلط ہی دیئے، لیکن خوش خطی کے ہمیشہ پورے نمبر حاصل کیے! عزیزو، کامیابی اور ناکامی، فتح وشکست اور کامرانی ونامرادی تو نوشتۂ تقدیر کے علاوہ اور بھی بہت سے عوامل، محرّکات اور اتفاقات پر منحصر ہیں، لیکن زندگی کو خوش سلیقگی، خوش نظری، خوش دِلی سے گزار لے جانا اور خارزارِ دُنیا سے اپنی کُلاہ کج کیے، دامن کشاں، نغمہ زناں اور رقص کُناں گزرنا ہر ایک کے اختیار میں ہے۔ کارِ دنیا جب عبادت کی طرح خلوصِ نیت، یکسوئی اور دلجمعی سے کیا جائے تو وہ اپنی جلو میں طمانیت وانبساط کی ایک سرمدی کیفیت لاتا ہے۔ نشاطِ کار ہم سے دنیا کی کوئی طاقت، کوئی آمر یا آجر نہیں چھین سکتا۔ حسنِ کارکردگی اپنا انعام آپ ہے۔ یہ کسی سند، کسی خِلعتِ فاخرہ یا تمغے کا نہ محتاج ہے نہ خواستگار، سچا اور کھرا فن کار کوئی مداری یا شعبدہ باز تو ہوتا نہیں جس کا تماشا تماشائیوں کی فرمائشی تالیوں کا تابع ہو اور جادو ''نظر بندی'' کا پابند ہو کے رہ جائے۔

بات گھڑے سے شروع ہوئی تھی، گھڑے پر ہی ختم کرنا چاہوں گا۔ آزادی سے قبل میں راجستھان میں جے پور کے ایک ضلع جھنجھنو (شیخاواٹی) میں ڈپٹی کلکٹر (ڈپٹی کمشنر) تعینات تھا۔ ایک دن دورے پر قصبہ اودے پور توراواٹی پہنچا جو راجپوت ٹھاکروں کی ایک ساونت سنتان ''بھومیا'' کا گڑھ تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ جیسے گھڑے میں زمانۂ طالب علمی میں کاغذ پر بناتا تھا، بالکل ویسے ہی گھڑے قصبے سے ذرا دور ایک دکان میں سجے ہیں! عام گھڑوں کی دکانیں کمہار واڑے میں تھیں۔ سرشتہ دار نے بتایا کہ بھومیا راجپوت بہت جری، غیور اور سفاک ہوتے ہیں۔ کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ اُسے ایسے ہی گھڑے میں بند کر کے کسی گڑھے میں زندہ گاڑ دیتا ہے۔ مجھے ان گھڑوں سے چڑ کا ایک اور جواز مل گیا۔ حال ہی میں میں نے چند خواتین آرٹسٹوں کی آئل پینٹنگز دیکھیں جن کا مرکزی موضوع عورت کی محرومیت، استحصال، زبوں حالی اور مظلومیت کے مختلف دردناک

پہلو تھے۔ تین تصویریں گھور گمبھیر رنگوں میں 'کاردکاری' پر بھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ خونی گھڑے بے طرح یاد آئے جنہیں میں زمانۂ طالب علمی میں انجانے میں بنایا کرتا تھا۔ اور جواب میرے لیے صرف عورت کی ازلی مظلومیت کا سمبل (علامت) بن کر رہ گئے ہیں۔

شاہد عزیز صدیقی صاحب نے گزشتہ ہفتے ازراہِ کرم مجھے اسکول کے مختلف شعبوں کے فائنل سال کے طلبہ و طالبات کے شاہکار دکھلائے تو میری نگاہیں اپنے منحوس گھڑے اور چھوارے سے مشابہ انگور تلاش کرتی رہیں۔ مجھے وہ گلاس بھی نظر نہ آیا جس میں میری پیاس بھری تھی۔ کیسے بتاؤں کہ اُنہیں نہ پاکر...... یعنی خود کو نہ پاکر...... مجھے کتنی خوشی ہوئی! نئی ذہین نسل اب اُن گھڑوں، جُھر یائے انگوروں اور خالی گلاسوں کو پیچھے، بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ اسکول کے نوجوان آرٹسٹوں کی فکر و نظر کی انفرادیت، تازہ کاری، ذکاوت اور جودت خطوط اور رنگوں سے جھلکتی ہے۔ پینٹنگ پر ہی موقوف نہیں، کیمونی کیشنز اور مجسمہ سازی کے نمونوں میں بھی چوکنا سماجی شعور اور جہاں تہاں غیر مبہم اور تند و تیز statement یعنی کلمہ اعلائے مدّ عا مجسم نظر آتا ہے جو چونکا دیتا ہے۔ ایک دورِ قدغن ایسا بھی گزرا ہے جب آرٹ میں ایسے ادّعا اور برملا اظہار و ابلاغ پر بعض بزرگ ناک بھوں ہی نہیں، آستینیں بھی چڑھا لیتے تھے۔ لیکن آرٹ اپنی تمام تر نمو پذیری اور توانائی زندگی اور اس کے مظاہر و مسائل سے حاصل کرتا ہے۔ آرٹ منی پلانٹ کی مانند نہیں ہوتا جو بغیر زمین، بغیر بیج، بغیر کھاد بغیر جڑ اور بغیر دیکھ ریکھ کے آپ ہی آپ خوب بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے۔ فن کار رزمِ خیر و شر میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے ایک محفوظ فاصلے پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ نہ دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے سادھی لگا سکتا ہے۔ اپنے عہد کے عذاب کی عکاسی اُس پر بمنزلہ فرضِ دینی لازم ہے۔ دانتے کہتا ہے کہ جہنم کا گرم ترین طبق ان لوگوں کے لیے ریزرو یعنی مخصوص ہوگا جو معرکہ حق و باطل میں غیر جانبدار رہے۔

میں بھٹک کر کہاں سے یہاں آنکلا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اپنی گفتگو کا آغاز اس تسلی بخش خوش خبری کے ساتھ کروں گا کہ خواہ میری باتیں بے ربط اور اُکھڑی اُکھڑی معلوم ہوں، لیکن تنبیہ و موعظت اور پند و نصیحت سے بہر صورت خود کو باز رکھوں گا۔ حفیظؔ جالندھری کا شعر ہے:

ہیں یاد مجھے آج بھی ایامِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

اتنی وضاحت کرتا چلوں کہ آتشؔ جوانی میں بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے۔ بلکہ بعض معتبر دیکھنے والے تو کہتے ہیں کہ اب بہتر لگتا ہے!

میں نے زندگی میں ایک ہی کنووکیشن ایڈرس سنا ہے۔ وہ بھی بدرجۂ مجبوری اپنے گریجویشن کی تقریب میں سُننا پڑا۔ اس کا سنہ اور تاریخ اس لیے نہیں بتاؤں گا کہ اسے سُنتے ہی آپ سلسلۂ سماعت منقطع کر کے میری عمر کا حساب لگانے میں منہمک ہو جائیں گے۔ میں آپ کو بھری محفل میں مینٹل ارتھمیٹک کے اُلجھیڑے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ تو عرض یہ کرنے چلا تھا کہ اس ایڈرس میں حسبِ معمول اتنی اور ایسی فارمولا نصیحتیں کی گئی تھیں کہ طلبہ اگر واقعی ان پر عمل کرتے تو کہیں کے اور کسی کام کے نہ رہتے۔ مطلب یہ کہ صرف دوسروں کو نصیحت کرنے کے لائق رہ جاتے اور لوگ ہماری زندہ مثال سے عبرت پکڑتے۔ یہ سچ ہے کہ اپنی پیشہ ورانہ اور پیسہ ورانہ خواری میں شائبہ خوبی تقدیر کے علاوہ کچھ ہماری نیم رضا کو بھی دخل تھا:

کجھ شہر دے لوک وی ظالم سَن
کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

اُس دن ہمیں دُنیائے دَنی، آشوبِ زندگی اور آنے والے دنوں سے اتنا ڈرایا گیا تھا کہ مستقبل کی دہشت دل میں ایسی بیٹھی کہ آج بھی کبھی کبھی بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ حال اور مستقبل کو دھتا بتا کے بقیہ عمرِ عزیز ماضی اور ذکرِ ماضی میں گزار دیں۔ کسی دانا کا قول ہے...... اشارہ اپنی ہی طرف نہیں ہے...... کہ انسان کے حق میں یہ کہیں بہتر اور باعث عیش و نشاط ہوتا کہ وہ پیدائش کے وقت اُسّی برس کا ہوتا۔ پھر بتدریج ستر، ساٹھ، پچاس سے کم ہوتے ہوتے منہ میں چُسنی لیے اپنے خالق سے جاملتا! صاحبو، کیسے مزے کی ہوتی وہ زندگی جس میں انسان بوڑھے سے جوان، جوان سے نوجوان اور نوجوان سے معصوم شیر خوار بچہّ بنتا چلا جاتا!

نصیحتوں، تنبیہوں اور ڈراووں سے لبریز وہ کنووکیشن ایڈرس سن کر میں نے وہیں تہیہ کر لیا کہ تادمِ حیات کوئی کنووکیشن ایڈرس نہیں سنوں گا۔ لہٰذا ایم۔ اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لینے تقسیمِ اسناد کے جلسے میں نہیں گیا۔ میرے سان گمان میں نہیں تھا کہ ایک دن، یعنی آج، خود مجھے سالانہ سمع خراشی کا یہ بظاہر خوشگوار فریضہ انجام دینا پڑے گا۔ کوشش کروں گا کہ بزرگانہ پند و نصیحت اور طلبہ یا ساری قوم کی اصلاح کا کوئی پانچ یا پندرہ سالہ منصوبہ معرضِ گفتگو میں نہ آنے دوں۔ لیکن اگر بے دھیانی میں کوئی کلمۂ انتباہ یا ناصحانہ فقرہ زبان پر آجائے تو اسے انسانی کمزوری سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔ بندہ بشر ہے، خواہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔

صاحبو، اگلے وقتوں کے لوگ جن میں اپنا شمار کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، درحقیقت خود ناقابلِ اصلاح نہ سہی، ماورائے اصلاح ضرور ہوتے ہیں...... قطع نظر اس سے کہ ان کا تعلق

کاروباری پیشوں سے ہے یا فنون اور شعر و ادب کے میدان سے، ان کے ساتھ نباہ کرنا نئی نسل کے لیے مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ دسمبر اور جون کا سنجوگ نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ کوئی سو برس قبل اکبر الہ آبادی نے کیسی پتے کی بات کہی تھی:

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

کچھ تُند جبیں اپنے اندازِ فکر، طرزِ بُود و باش اور آداب و اقدار کی صحت اور صداقت پر اس درجہ یقین رکھتے ہیں کہ اپنے ہی ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے موقف سے سرِ مُو اختلاف یا فنی جدّت اور فکری اجتہاد کو قربِ قیامت کی نشانی تصوّر کرتے ہیں! وہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل ان کی کج کلاہی کے سامنے اسی طرح اپنا قبلہ راست کرے جس طرح انھوں نے اپنی پیش رو نسل کے سامنے کیا تھا۔

اگر وہ سلام کا جواب اس طرح دیں جیسے سلامی لے رہے ہوں، تو ان کو کچھ نہ کہا جائے۔ ویسے یہ ان کی عادتِ راسخہ کے علاوہ اُن کا روایتی حق بھی بنتا ہے۔ میری عمر اور نسل کے لوگ عرصہ دراز سے ''وعلیکم السلام'' ہی کہتے آئے ہیں ایسی ہی شان اور طنطنے کے بزرگ کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ قبرستان میں داخل ہوتے تو ''السلام علیکم یا اہل القبور'' کہنے کے بجائے ''وعلیکم السلام! لیٹے رہیئے، لیٹے رہیئے!'' کہتے تھے۔

آرٹ کی دنیا میں بھی آپ کا سابقہ کچھ ایسے ہی مُدمَغ و متکبّر نقادوں سے پڑے گا جو وعلیکم السلام کہنے کے عادی ہیں۔ انہیں ہمارا بھی ''وعلیکم السلام! پڑے رہیئے، پڑے رہیئے!'' پہنچے!

میں نے جو لطیفہ ابھی سنایا اور جو باتیں اب تک اردو میں کیں، وہ انگریزی میں نہیں ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا یہ جانتے ہوئے کہ سالہا سال سے آپ کے ہاں کنووکیشن کے خطبے کی زبان انگریزی رہی ہے، میں نے اردو میں گفتگو کرنے کو ترجیح دی۔ خواتین و حضرات، میں اس پر شرمندہ یا معذرت طلب نہیں، داد خواہ ہوں۔

علاّمہ اقبال نے جو بات شعر کے بارے میں کہی ہے، اُس کا اِطلاق پوری صداقت کے ساتھ دیگر فنونِ لطیفہ پر بھی ہوتا ہے۔ مولانا گرامی کے نام اپنے ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں: ''جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی عیسیٰ مصلوب ہوا ہے''۔ اسی خیال کو ''مسجدِ قرطبہ'' میں دوسرے پیرائے میں بیان کیا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

شاعر اور فن کار جب تک سرد و گرم زمانہ اور آشوبِ آگہی سے نہ گزرے وہ کوئی اوکھا انوکھا،

جیتا جیتا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ پکاسو کہتا ہے: ''پینٹنگ درحقیقت نابینا لوگوں کا پیشہ ہے! آرٹسٹ جو کچھ دیکھتا ہے وہ پینٹ نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اُسے کینوس پر متشکل کر دیتا ہے۔'' قلم ہو یا مُوقلم جب تلک ''انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا'' والی دل فگار منزل نہ آئے، تھوتے لفظوں اور لکیروں سے بات نہیں بنتی۔

گوئٹے کا شیطان کہتا ہے ''یہ طلسمی مشروب پینے کے بعد تمہیں ہر عورت ہیلن نظر آئے گی!'' میں سمجھتا ہوں کہ اچھا اور سچا فن کار، اس سے بھی بڑے معجزۂ فن پر قادر ہے۔ جب اُس کا قلم یا بُرش کاغذ یا کینوس پر اظہارِ کمال کرتا ہے تو ہر چہرہ ہیلن کا چہرہ نظر نہیں آتا، بلکہ اُس کا اور فقط اُسی کا نظر آتا ہے جس کا وہ واقعتاً ہے۔ جب ہر چہرے میں ہیلن نظر آنے لگے تو یہ پینٹ اور برش کا اعجاز نہیں، بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ اسکاچ وہسکی کا کرشمہ ہے! یا زندگی اور شریکِ زندگی سے فرار کا شاخسانہ واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں۔ ایسی پناہ گاہ میں فینٹسی (fantasy) کا راج بزاج ہو تو تعجب کی بات نہیں۔

آرٹسٹ ہو یا فکشن نگار، اُس کے کمالِ فن کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ جو کچھ خود اُس نے دیکھا اور محسوس کیا، اُسے وہ دوسروں کو اُسی شدت و نُدرتِ احساس کے ساتھ دِکھلا سکا ہے یا نہیں۔ اپنی سرخوشی، اپنے درد اور اپنے اچنبھے کو کینوس پر بکھیر سکا ہے یا نہیں۔ رینوا (Renoir) سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی nudes کا رنگ روپ اور نکھار بالکل اصلی اور نیچرل لگتا ہے! اس کا کیا راز ہے؟ رینوا ریاض اور مشق و مزاولت کا قائل تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ میں مسلسل پینٹ کیے جاتا ہوں۔ جب کینوس پر جلد کا رنگ، texture اور گداز ایسا نظر آنے لگے کہ چُٹکی لینے کو جی چاہے تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ تصویر ٹھیک بنی ہے۔

دیکھیے استادِ فن اور امیچور میں یہی فرق ہے۔ امیچور اصل کے چٹکی لینے کو ترجیح دے گا! لیکن اس لمس آشنا چٹکی سے جو برش پکڑا جائے گا وہ ساری عمر ہر پھر کے چٹکی زدہ علاقے کی ہوس انگیز بُھول بُھلیّوں میں ہی ٹامک ٹوئیے مارتا رہے گا اور تصویروں میں اعجاز کا رنگ بھرنے کی بجائے اپنی مشاق چٹکی سے پڑنے والے نیل کی نمائش سے کبھی فارغ نہیں ہو گا۔ بوہیمین زندگی دور سے یعنی اُس کا ذکر ہماری دلچسپی بلکہ بعض اوقات حیرتِ رشک آور کا باعث ہوسکتی ہے۔ بوہیمین آرٹسٹ بھی ہو گزرے ہیں۔ لیکن آرٹ بوہیمین نہیں ہوسکتا۔

فائنل اِیئر کے طلبہ کے شاہکاروں کے ''Thesis Display'' میں جہاں Contemporary یعنی ہم عصری اور تازہ بہ تازہ، نو بہ نو موضوعات و رُجحانات پر کام دیکھ کر خوشی ہوئی، وہاں چند

موضوعات سے عدم دلچسپی اور صرفِ نظر دیکھ کر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ علامہ اقبال نے آج سے کم و بیش پچھتر برس پیشتر برِ صغیر کے فن کاروں اور لکھنے والوں سے گِلہ کیا تھا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

سنا ہے اس پر سعادت حسن منٹو نے یہ فقرہ کسا تھا کہ مرد کے اعصاب پہ عورت نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سوار ہوں گے! بہرحال، میں نے تو آپ کے اسٹوڈیوز میں نہ مردوں پر زنانی سواریوں کی تصویریں دیکھیں، نہ اُن دُکھیاروں پر سواری گانٹھنے والے ہاتھی گھوڑے نظر آئے! تفنن برطرف، جیسا کہ میں نے ذرا دیر پہلے عرض کیا، یہ امر باعثِ طمانیت و مسرت ہے کہ پینٹنگ اور دیگر شعبوں کے علاوہ، sculpture یعنی مجسمہ سازی میں سب سے تیز اور بلند بانگ سوشل اور سیاسی کمنٹ نظر آیا۔ وہاں دو جانے اور آسانی سے پہچانے جانے والے حریفوں کے دو مجسّمے دیکھے جن کے ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے میں پستول ہے۔ ڈوری کھینچنے سے یہ کٹھ پتلی نما مجسّمے ایک دوسرے کو باری باری پھول پیش کرتے اور پستول دکھاتے ہیں۔ اسی طرح دو چہروں والے جنگجوؤں کی صفیں کسی عنوان یا تشریحی نوٹ کے بغیر اپنے عزم و رزم کے انداز دکھا دیتی ہیں۔

آرکیٹیکچر میں قابلِ رشک اختصاص و کمال کا اندازہ نوشیروان بلڈنگ کی انوکھی تنصیبِ نو اور تعمیرِ مکرّر مطابق اصل سے ہوتا ہے۔ ایک صدی پرانی عمارت کی ایک ایک نمبر و نشان زدہ اینٹ سلسلہ وار نکال کر دوسری جگہ، یعنی یہاں ہُو بہو اصل عمارت کھڑی کر دینا جہاں انجینئرنگ اور آرکیٹیکچر کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، وہاں انسانی عزم اور جذبے کی ایک جن جنّاتی یادگار بھی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے حکم کی تعمیل میں ایک قوی ہیکل جن پلک جھپکتے میں ملکہ سَبا کو تخت سمیت اٹھا لایا تھا۔ لیکن ہمارے جناتی آرکیٹیکٹ تو سموچا محل جُوں کا تُوں اٹھا لائے۔ اگر اس میں کوئی ملکہ عالیہ زندہ یا مُردہ حالت میں ہوتی تو عجب نہیں کہ اس عفیفہ کو بھی تاج و تخت یا تابُوت سمیت لا کے یہیں کسی درشن جھروکے میں بٹھا دیتے! صاحبو، اینٹ سے اینٹ بجانے کا محاورہ تو سنتے آئے تھے، جس کے معنی ہیں بالکل تباہ و برباد کر کے نام و نشان مِٹا دینا۔ آپ نے تو سو سال پرانی اینٹ سے اینٹ جوڑنے کا محیرّالعقول نمونہ شہرِ قائد کے قلب میں کھڑا کر دیا! جرمن فلسفی شیلنگ (Joseph VonSchelling) نے آرکیٹیکچر کو Frozen Music یعنی منجمد موسیقی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تاریخی عمارت اپنی نغماتی کہانی اپنی زبانی سناتی ہے۔ ہم اسے جلترنگ کے وزن پر سنگ ترنگ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

تنہا اسی عمارت پر مُنحصر نہیں، کراچی میں Renaissance اسٹائل کی خوبصورت عمارتیں اور

Gothic طرز کی سبک و نازک خطوط والی عمارتیں کب سے ہماری توجہ اور داد کی طالب و منتظر کھڑی ہیں۔ وہ اپنے حسن اور دلکش خطوط کی داد وصول کرنے کے لیے اسٹیج پر مٹک مٹک اور ٹھمک ٹھمک کے catwalk کے لیے آنے سے تو رہیں۔ خود ہمیں ان کے سامنے نگاہ روبرو، باادب، باملاحظہ کھڑا ہونا چاہیے اور نگاہ بھر کر دیکھنے کے بعد، ان کی طرف پُشت کیے بغیر، اُلٹے قدموں واپس آنا چاہیے۔ جو ادارے اور درس گاہیں اس شہر' اس کے ماضی اور آثار قدیمہ کی قدر کرنا سکھاتے ہیں، وہ ایک ثقافتی فرضِ کفایہ انجام دیتے ہیں...... ایک ایسا فرض جس کی ادائیگی وہ انشراح وہ انبساط بخشتی ہے جو کسی طور پر عیشِ فراواں سے کم نہیں۔

کراچی کی عمارتیں نہ اتنی قدیم ہیں جتنی کہ یونان اور روم کی۔ نہ اتنی پراچین جتنی کہ اشوک کے استوپا۔ لیکن قابل التفات ہونے کے لیے چہرے پر جھریاں ہونی چنداں ضروری نہیں۔ امریکا میں تو ستّر سالہ عمارت قدیم تصور کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ بزرگوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ یعنی بے اعتنائی اور حقارت آمیز! امریکا کے پاس بہترین جغرافیہ ہے اور مختصر ترین تاریخ جو اتنی قریبی اور تازہ ہے کہ اس پر حالاتِ حاضرہ کا گمان ہوتا ہے۔

کراچی کی عمارتوں کے آرکی ٹیکچر سے واقفیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ ماڈرن آرکی ٹیکچر ابھی اپنا سراپا اور قابلِ قبول طرز و لہجہ دریافت نہیں کر پایا ہے۔ اسے آدھا تیتر آدھا بٹیر بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے مجھے آدھے تیتر آدھے بٹیر پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا، بشرطیکہ دونوں میری پلیٹ پر ہوں۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ رزقی مرحوم، جن کی تصویر آپ کے ہال میں آویزاں ہے، بڑے بانکے اور طرحدار انسان تھے۔ ڈیزائننگ میں آرائشی پیچ و خم سے احتراز کرتے اور سیدھی لائنز اور فنکشنل ڈیزائن پر اصرار کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے بہت ہی عزیز دوست میاں فضل حسن ان سے میرے مکان کا نقشہ بنوانے گئے۔ دوستی کے معاملے میں وہ بے حد possessive واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ مجھے بنیان بھی اپنی پسند اور ناپ کا خریدوایا! محض دُسراتھ کی خاطر مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ مجھے کیسے مکان میں رہنا چاہیے، اس کے بارے میں وہ حتمی رائے رکھتے تھے جس سے اختلاف کو وہ اپنائیت اور آدابِ دوستی کے خلاف تصور کرتے تھے۔ رزقی صاحب نے مکان کا ایک رَف اسکیچ بنا کر دکھایا تو فضل صاحب کہنے لگے کہ اس میں تھوڑا سا مغل آرکی ٹیکچر کا ٹچ دیجیے...... دو تین خوبصورت محرابیں، ایک آرائشی طاق۔ اور کہیں سنگِ مرمر کی جالی۔

رزقی صاحب نے اپنا اسکیچ فوراً پھاڑ دیا اور بولے، ''آپ یوسفی صاحب کا مکان بنوانے آئے ہیں یا مقبرہ؟''

آج کل ہر قدیم، فرسُودہ اور فیشن سے خارج چیز کو قومی اثاثہ اور تاریخی ورثہ تصور کرنے کا رُجحان بھی نظر آتا ہے...... سوائے زائد المیعاد بڈھوں کے جنہیں لوگ اب ایسا عجوبہ سمجھتے ہیں جس کی کسی عجائب گھر میں گنجائش نہیں۔ لیکن مستند تاریخی عمارتوں کے باب میں کسی شک وشبہ کا جواز نظر نہیں آتا۔ وہ بلا شبہ اُس شہر اور قریہ کا زیور ہیں جہاں وہ ہیں۔ وہ ایسی ہی توجہ اور دیکھ بھال کا مطالبہ کرتی ہیں جو نازک اور قیمتی زیورات سے مختص ہے۔ ہر عمارت اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے۔ اپنے اداشناسوں سے کلام کرتی، دامنِ دل کو کھینچتی اور غور و تدبّر پر آمادہ کرتی ہے۔ موئنجودڑو کی زنگی کھنڈرات سے نکل کر اپنی کتھا سناتی اور نیرت بھاؤ دکھاتی ہے۔ اسی طرح کرِیل بیل اُس عہد کے فنِ نقاشی کی تنومند علامت بن جاتا ہے۔ فن کار سنگ وخشت سے اپنے خواب کی تعبیر کو تعمیر کرتا ہے۔ وہ کیا دیکھتا اور دکھاتا ہے، سنگِ سادہ و خارا کو معجزۂ فن کیسے بناتا ہے، اس کی تصویر ہنگیرین آرٹسٹ Breuer نے بڑے دلکش انداز و پیرائے میں کھینچی ہے:

> "Colours which you can see with ears; sounds to see with eyes; the void you touch with your elbows; the taste of space on your tongue; the fragrance of dimensions; the juice of stone."

معاشرے اور معیشت کے معاشی اور غیر معاشی مسائل کی موجودگی اور سنگینی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ صدیوں اور قرنوں سے ہمارا مزاج pessimistic یعنی قنوطی اور یاس پسند رہا ہے اور لہجہ حزین وگلوگیر گا ہے تلخ و ترش۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک دوسرے سے مایوسانہ باتیں کرنے میں ہمیں مزہ آتا ہے۔ اچھی اور اُمید افزا خبر سے ہمارے کیفِ ملال اور نشاطِ افسردگی میں کھنڈت پڑتی ہے۔ یوں بھی اچھی خبر آتی ہی کب ہے۔ اور ناگاہ آ جائے تو جب تک ہم اس میں نقصان اور نحوست کا شائبہ دریافت نہ کرلیں یا فقط اپنے زورِ یاس پسندی اور ملکۂ رنجوری سے تاریک پہلو پیدا نہ کرلیں، ہمیں چین نہیں آتا! ہم مستقبل کو گہرے سیاہ رنگ کے گلاسز سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ملک کے مستقبل اور سلامتی کے بارے میں بدفالی اور مایوسی پھیلانے والی باتیں کرنا ہمارے دانشوروں، سیاست دانوں اور ڈرائنگ روم کے بقراطوں کا کُل وقتی پسندیدہ مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ اس پر یاد آیا کہ ادیب شہیر شاہد احمد دہلوی مرحوم کے دفتر میں ایک جلے تن منشی کام کرتا تھا۔ وہ ہر وقت ہر آئے گئے سے اپنی بیوی کی برائی کرتا رہتا تھا۔ سب عاجز تھے۔ ایک دن وہ حسب معمول شاہد احمد صاحب سے بیوی کی برائی کرنے لگا تو انہوں نے پوچھا ''منشی جی، کیا آپ کی بیوی سوتیلی ہے؟''

تو کیا ہم سوتیلے وطن کی روٹی اور نمک کھاتے ہیں؟ کبھی کبھی تو ہم اپنے وطنِ عزیز سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے خاکم بدہن، یہ دشمن ملک یا دارالحرب ہے!

خواتین وحضرات، میں یہ کڑوی سی بات خدا اور سیاست دانوں کو حاضر و ناظر جان کر کہنا چاہوں گا کہ گزشتہ پچپن برسوں میں کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا جب کسی نہ کسی نامور لیڈر یا غوغائی سیاست دان نے بڑے وثوق اور ناقابلِ فہم شماتت کے ساتھ یہ اعلان نہ کیا ہو کہ پاکستان اس وقت بہت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے! اس پر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد سے یہ اضافہ کیا گیا کہ صورتِ حال بالکل ۱۹۷۱ء جیسی ہے! مطلب یہ کہ پاکستان، خاکم بدہن دولخت بلکہ چار لخت ہوا چاہتا ہے! وہ وقفے وقفے سے یہ دھمکی دے کر خوف و ہراس اور افتراق پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ وہ ایسے نجومی ہیں جن کو خود ساختہ crystal ball میں جو دھواں، دُھند اور اندھ کار★ ہمہ وقت نظر آتا ہے وہ دراصل ان کے اپنے دل کا غُبار ہے جو ووٹ، نوٹ اور لوٹ کھسوٹ کے مزید مواقع حسب منشا یعنی اندھا دھند نہ ملنے کے باعث جمع ہوتا رہا ہے اور سیاسی پلیٹ فارموں اور بعض کالموں کی کاغذی چمنیوں سے صبح وشام پیچ وتاب کھاتا، اٹھتا رہتا ہے۔ یہ تو وہ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ جب ہم کسی مریض کے بارے میں یہ کلمہ نحس زبان پر لاتے ہیں کہ اُس کی حالت نازک ہے تو ہماری مراد چل چلاؤ ہوتی ہے! مادرِ وطن کے بارے میں یہ کہتے ہوئے کہ حالت نازک ہے وہ نہ جھجکتے ہیں نہ شرماتے! نازک دور، نازک موڑ، نازک مرحلہ، نازک صورتِ حال، نازک وقت...... عیب وغیب دانوں کی یہ بدشگونیاں اور پیش گوئیاں سنتے سنتے سینے چھلنی اور کان پک گئے۔ چشمِ بد دور، ایسا لگتا ہے کہ نزاکت ہم پر ختم ہے! صاحبو، یہ کیسی نزاکت ہے جو پچپن برس سے بدستور چلی آ رہی ہے! یہ تو بڑی مضبوط، مستحکم، چٹانی اور اٹوٹ قسم کی نزاکت معلوم ہوتی ہے۔ پے در پے خانہ ساز کرائسس اور خودساختہ بُحران جن سے ہم ڈرائے، آزمائے، تپائے اور پرکھے جا رہے ہیں بحمد اللہ ملک وقوم کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور نہ کبھی بگاڑ سکیں گے۔ اس لیے کہ یہ نظریاتی ملک جس کا خواب ہمارے پُرکھوں نے دیکھا تھا، سدا قائم اور پائندہ وتابندہ رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ فن کار کے لئے مایوسی ہی نہیں بے حسی بھی حرام ہے۔ وہ مُستغنی الاحوال نہیں ہوسکتا۔ وہ جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں زندگی کا عکاس، نقاش اور صورت گر ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ میں روشنی کے سرچشمے کا پرستار ہوں۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی دیکھتا ہوں۔ میں شب اور ظلمتِ شب کی پرستش نہیں کرتا۔ نہ زرے

★ اندھ کار: (ہندی) اندھیرا۔ تاریکی، تیرگی۔ بے عقلی۔ آندھی
یہ سب درست۔ لیکن جو نحوست ''اندھ کار'' میں بھری ہے، وہ ان مترادفات میں کہاں سے لائیں۔

خواب کا حال بیان کرتا ہوں:

> چو غلام آفتابم، ہمہ آفتاب گویم
> نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

آپ نے میرے افکارِ پریشاں اور گزارشات، طوالت کے باوجود توجہ اور صبر و تحمل سے سماعت فرمائیں۔ شکرگزار اور دست بدُعا ہوں کہ ربِّ جلیل و کریم کا فضل، ہدایت اور رحمتِ بے پایاں ہمیشہ آپ کے شاملِ حال رہیں۔ آمین

کلاہِ مَمریزی

(محکمہ ثقافت حکومت خیبر پختونخواہ کی دعوت وفرمائش پر یہ مضمون پریس کلب، پشاور میں ۱۶ دسمبر ۲۰۰۳ء کو پڑھا گیا۔)

صدر گرامی قدر، محترم مہمان خصوصی جناب اعجاز احمد قریشی، محترم موضوع خصوصی جناب مَمریز خاں، جناب امجد نذیر، جناب ڈاکٹر صابر کلوروی، معزز خواتین وحضرات،

حکومت صوبۂ سرحد کے شش جہات محکمۂ کھیل، ثقافت، سیاحت، امورِ نوجواناں، آثارِ قدیمہ وعجائب گھر کی جانب سے جب مجھے دعوت نامہ ملا تو مسرّت کے ساتھ ساتھ بلکہ اُس سے ذرا پہلے حیرت بھی ہوئی۔ اس لیے کہ بینکرز آج کل بوجوہ بہت بدنام ہیں۔ پھرتے ہیں سُود خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ جی ہاں، NAB ★[1] کے سوا کوئی پوچھتا نہیں۔ چناں چہ بینکوں کے تین پریسیڈنٹ نقلِ مکانی کر چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے جیل میں ہیں اور خیریت سے ہیں۔ دیگر احوال یہ کہ اُن کے گھر سے پانچ منزلہ ٹفن کیریر میں کھانا آتا ہے۔ شنید ہے رات دو بجے تک ۵۶ انچ ٹی وی پر فلمیں دیکھتے ہیں۔ ہمارا پبلک امیج اتنا خراب ہو گیا ہے کہ آج کل یار لوگ relired بینکر کو retarded بھی سمجھتے ہیں! اسے محض اتفاق کہنے اور ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ مغرب میں bankers اور undertakers (تکفین وتدفین کے انتظامات کاروباری طور پر کرنے والے) کا روایتی لباس (جسے ان کی پیشہ ورانہ یونیفارم کہنا چاہیے) سیاہ رنگ کا رہا ہے۔ امجد نذیر صاحب کی جانب سے دعوت کلام ملی تو میں اس شش وپنج میں پڑ گیا کہ محکمے کے جن مختلف شعبوں کا ابھی حوالہ دیا ہے، ان میں سے کس شعبے میں اپنا شمار کروں۔ پہلے شعبے کھیل کو ہی لیجیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملازمت کے ایک انٹرویو کے دوران مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کو ایامِ نوجوانی میں کس اسپورٹ سے دلچسپی رہی ہے؟ میں اگر چاہتا بھی تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کرکٹ، کبڈی، ہائی جمپ، ویٹ لفٹنگ یا javelin throw کا شوق رہا ہے۔ میرا حُلیہ، جُثہ، تن نادرستی اور موٹے شیشے والی ۷۔ نمبر کی عینک جھوٹ بولنے یا شیخی مارنے میں سختی سے مانع تھی۔ لہٰذا میں نے جواب

★[1] NAB: National Accountability Bureau، جس کا کام کرپشن اور بدعنوانیوں کا سراغ لگانا ہے۔

دیا کہ نوجوانی میں کیرم، تاش اور Snakes and Ladders بڑے شوق اور مہارت سے کھیلتا تھا۔ پچاس میل کے radius (نصف قطر) میں مجھے کوئی کیرم میں ہرا نہیں سکتا تھا۔

اس پر انٹرویو بورڈ کے مدراسی چیئرمین نے پوچھا:

"Did you encounter any challenge at the fifty first milestone?"

مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔ پہلے Yes, sir کہا۔ پھر No, sir!۔ میں بوکھلا گیا اور ایک دفعہ تو وہ بدلحاظ بھی چکرا گیا۔ اُس کو میرے اصل دعوے کی تردید کی تو جرأت نہ ہوئی، لگا اُلٹے سیدھے سوال کرنے:

''بتاؤ لوڈو کس زبان کا لفظ ہے؟ یہ کھیل کس نے ایجاد کیا؟''

میری سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دوں۔ بیساختہ منہ سے نکلا "Next question?"

میں خود بھونچکا رہ گیا!

سوائے چیئرمین کے بورڈ کے چاروں ممبر مسکرا دیے۔

انٹرویو میں مجھے ۶۵ نمبر ملے اور میں نے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کے مقابلے کے امتحان میں کوالیفائی کر لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ زمانہ جسے جوانی دِوانی کہتے ہیں، ہم نے سچ مچ دِوانے پن میں گزار دیا۔ مطلب یہ کہ راتیں گزار دیں ہیں سہارے کتاب کے! وہ کھیل جنھیں مردانہ سمجھا اور کہا جاتا ہے، ان کے متعلق ہمارا وہی عقیدہ تھا جو نامور امریکن اسپورٹس مین Henry Blaha کا رگبی، سوکر اور فُٹ بال کے بارے میں ہے:

"Rugby is a beastly game played by gentlemen; soccer is a gentleman's game played by beasts; football is a beastly game played by beasts."★[1]

کرکٹ کے بارے میں آج بھی میرا وہی خیال ہے جس کا اظہار نصف صدی قبل کر چکا ہوں کہ دراصل کھیلتا تو صرف ایک ہی شخص ہے، باقی ماندہ اکیس اشخاص خلوصِ دل سے اس مغالطے میں رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں! وہ خود سے زیادہ تیز رفتار گیند کے پیچھے دوڑتے پھرنے، یا دن بھر وکٹ کے پیچھے بحالتِ رکوع کھڑے رہنے کو کھیل سمجھتے ہیں!

★[1] اس کا ترجمہ میرے بس کا کام نہیں۔ کوئی فُٹ بالر ہی کر سکتا ہے۔

رہی اِقلیمِ ثقافت تو وہ بھی ہمارے لیے علاقہ غیر کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے کہ بظاہر اس پر ایک شاداں و فرحاں اور رقصاں و زمزمہ خواں انبوہِ طرحداراں کی حکمرانی ہے، جن میں ریما، میرا، عکسی مفتی، نصرت فتح علی خاں اور عالم لوہار کے علاوہ تہواروں پر دھنک رنگ پوشاکوں میں سوانگ سا رچانے والے اور بھولے بسرے نغموں سے جادو جگانے والے دھوم مچاتے نظر آتے ہیں۔ اسی ہفتے ہم نے دیکھا کہ اداکارہ ریشم اور ہندوستان سے آئی ایکٹرس ارمیلا متوندکر نے ایک دوسرے کو ہار پہنائے اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی نظر ڈُباؤ low neck-line کا ناقدانہ و حاسدانہ جائزہ لیتے ہوئے تصویریں کھچوائیں۔ اس عمل کو اخباروں نے cultural exchange سے تعبیر کیا۔

حاشا وکلّا، میرا مقصد ان بیبیوں کا مذاق اڑانا یا تضحیک نہیں۔ اس لیے بھی کہ ۱۹ اکتوبر کو اسلام آباد میں ایسی ہی ایک تقریب میں ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں کی لیڈر شریمتی اجیت کور سے میں خود اپنے گلے میں ایسے ہی ہار کے علاوہ جپھی بھی ڈلوا چکا ہوں۔ یہ بڑی باکمال اور محبتی خاتون ہیں۔ سلام پرنام سے پہلے آگے بڑھ کے بغل گیر ہوتی ہیں اور بسا اوقات اپنے قد کے باعث، دراز قامتوں سے بغل گیر ہونے کے بجائے کمر گیر ہو کے رہ جاتی ہیں! وہ جپھی ڈالنے کی اتنی شوقین اور عادی ہیں کہ اگر شیر بھی سامنے آجائے تو وہ بے اختیار اس کے بھی جپھی ڈال دیں گی! اس کے بعد شیر ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، یہ ان دونوں کا بالکل نجی مسئلہ ہے۔ تہذیب و ثقافت سے متعلق ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ لندن کے جواہر لال نہرو ہال میں ہندوستان کی ایک باکمال ڈانسر اُڑیسی، کتھک اور بھارت نٹیم کے آئٹم باری باری پیش کر رہی تھی۔ ایک رقص کے دوران اُس نے ایک توڑا ایسا پیش کیا کہ پھرکی کی طرح گھومتے گھومتے ایک بارگی کھڑی رہ گئی۔ پنڈتائی ٹھاٹ میں تتکار کے بول بند ہو گئے۔ مِردنگ کی تھاپ اور دُرت تین تال تھم گئی۔ تھرکتے پاؤں میں بندھے گھنگھروؤں کی چھنن چھنن بتدریج کم، بہت کم ہوتے ہوتے فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ صرف ایک گھنگھرو کی آواز سنائی دینے لگی۔ نرتکی کا حال نرتکی جانے، دیکھنے والے تو بس سانس روکے سنتے رہے۔ ہال میں مکمل سناٹا تھا جو ہزار تالیوں پر بھاری تھا۔ جو دوست مجھے اپنے ہمراہ لے گئے تھے گھنگھرو کی اکلوتی چھن چھن اور مکمل سناٹے سے وجد میں آگئے۔

کہنے لگے "پوری پرم پرا، ساری سنسکرتی اور تہذیب بول رہی ہے!"

مرزا بولے "مگر آپ نے غور فرمایا کہاں سے بول رہی ہے!"

آپ کے محکمے کا تیسرا اہم شعبہ سیاحت اگرچہ میرے لیے 'no man's land' (ممنوعہ علاقہ)

نہیں، تاہم یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس میدان میں بھی، مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی۔ چوتھی یا پانچویں جماعت کی درسی کتاب میں مولوی محمد اسمٰعیل کا یہ نصیحت آموز شعر پڑھا تھا:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

اِطلاعاً عرض ہے کہ ہمیں تو یہ مشغلۂ نوجوانی سات کم ساٹھ برس کی عمر میں نصیب ہوا جب بیرونِ ملک جانے کے لیے پہلا پاسپورٹ بنا! ہر چند کہ ہمارے تمام سفر اول تا آخر سرکاری خرچ پر تھے، لیکن اردو سفرنامے پڑھ پڑھ کے ہمیں سفر سے زیادہ سفرنامے لکھنے کا ہوکا تھا! دیکھا گیا ہے خواہش حد سے گزر کر جتنی زیادہ خالص و شدید ہو جائے، آگے چل کر اتنی ہی لغو اور نامعقول ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہی کچھ ہوا۔ کراچی ائرپورٹ پر چیک اِن ہوتے ہی ہم نے ''گرافک'' نوٹس لینے شروع کر دیے۔ ہمارے دائیں پہلو میں aisle سیٹ پر ایک بزرگ عملیات و وظائف میں بآوازِ بلند مُستغرق تھے۔ اور کچھ پڑھ کے انجن کی طرف بار بار پھونک دیتے تھے کہ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ نابکار کسی بھی وقت دھوکا دے سکتا ہے۔ کئی بار پھونک کی توامِ آلود پھوار براہِ راست ہمیں اپنے چہرے پر بھی محسوس ہوئی! ہم اپنی نئی نوٹ بک میں ان کی حرکات و سکنات کی تصویر کھینچنے میں اتنے محو تھے کہ آنکھ اٹھا کر ائیر ہوسٹس کی طرف نہیں دیکھا، جب کہ مروّجہ فیشن اور ''فورمٹ'' کے مطابق سفر اور سفرنامے کا آغاز جہاز میں قدم رکھتے ہی اُس قتالۂ سفرنویساں کے غمزہ و ادا کی تصویر کشی سے شروع ہو جانا چاہیے۔

تین ہفتے بعد گھر لوٹے تو بریف کیس میں چار سو صفحوں پر محیط نوٹس کا پلندہ تھا۔ کچھ دن بعد مرزا کو دکھایا تو سبقاً سبقاً پڑھنے کے بعد فرمایا کہ اسے کون پڑھے گا؟ اسے تم اپنی نیک چلنی کے ثبوت میں اہلیہ اور عدالت کے حضور تو پیش کر سکتے ہو، لیکن عام پڑھنے والا سات آٹھ صفحوں کے بعد ہی خراٹے لینے لگے گا۔ بعض سفرنامے vulgarity کے باعث unreadable ہوتے ہیں۔ یہ پہلا سفرنامہ ہے جو کثرتِ پاکبازی کے باعث unreadable قرار پائے گا۔ یہ تو کسی تیرتھ یاترا کی کتھا معلوم ہوتا ہے! یار، تم انگلستان گئے تھے یا گنگا نہانے؟

ہم نے بہ نظرِ تنقید اپنے سفرنامے کے نوٹس پڑھے تو اس نتیجے پر پہنچے کہ طرزِ نگارش میں بحمد اللہ کوئی سقم یا خامی نہیں۔ البتہ واقعات نے دغا دی۔ مطلب یہ کہ پیش ہی نہیں آئے! ہم بیروت، ایتھنز اور روم کی گلیوں بازاروں میں خوب گھومے۔ جنیوا، پیرس، لندن، نیویارک اور میامی بھی دیکھنے کی طرح دیکھے۔

لیکن ہمیں تو حدِ بدنظری تک وہ سیم تن حسینائیں اور لولیانِ لندن و نیویارک نظر نہ آئیں جو ہمارے سانولے سلونے سفرنویسوں کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے منتظر و بیتاب بتائی جاتی ہیں:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیری
ہزار ہا زنِ امیدوار راہ میں ہے ★[1]

غرض کہ جیسے گئے تھے ویسے ہی پاسپورٹ پر مُہریں لگوا کے اور مُلکوں مُلکوں اپنی جامہ تلاشی بلکہ striptease کروا کے آ گئے!

تاہم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہمیں بھی اس مقولے پر یقین آ گیا کہ بہترین فکشن آج کل سفرناموں، آٹوبایوگرافیز اور انکم ٹیکس گوشواروں کی شکل میں لکھا جا رہا ہے!

ایک زمانہ تھا کہ انگلینڈ کے رؤسا و اُمرا اپنے صاحبزادگان کو بالغ ہوتے ہی یورپ کی سیاحت پر بھیج دیتے تھے۔ اِس تجربے کو اُن کی تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ تصور کیا جاتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ بھری جوانی میں ایک رئیس زادے کو یورپ میں بلکہ یورپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ نورِ چشم کس کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کرے گا؟ اس کا اندازہ لگانے کے لیے قبلہ والد صاحب کو اپنے ذہن پر زیادہ زور نہیں دینا پڑے گا کہ انگریزی محاورے painting the town red یا sowing wild oats والا زمانہ اور رنگ رلیوں اور رت جگوں کے ذریعہ مکتبِ حُسن و شباب میں تعلیم و تدریس کا طریقہ بزرگوار کو ابھی تک ذرا ذرا یاد ہو گا۔

بہر کیف، اس میں شک نہیں کہ شوقِ سیاحت تازہ بہ تازہ، نو بہ نو مناظر، نوادر اور مکاشفات سامنے لاتا ہے۔ سیّاح پر کھلتا ہے کہ جینے اور جینے دینے، زندگی کو برتنے، بسر کرنے، بوسانے ★[2]، بھوگنے اور پرکھنے کے قرینے، گزران کی صورتیں اور پیمانے اور بھی ہیں، جو پہلی نظر میں بالکل معکوس اور غلط لگتے ہیں۔ پھر بقول مرزا، ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب منکشف ہوتا ہے کہ آدمی کو جب تک صحیح وقت پر غلط صحبت نصیب نہ ہو، وہ انسان نہیں بنتا! سو فی صد خالص سونے کی اینٹ تو بن سکتی ہے، زیور یا زرہ بکتر نہیں بن سکتا۔ سیاحت و آگہی، بصیرت، سیر چشمی، رواداری اور ایجابی اندازِ فکر و نظر بخشتی ہے جو محض کتابوں اور مخطوطوں کی ورق گردانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ طرز و عرفانِ زیستن آسمانی یا لدُنّی نہیں،

★[1] تحریف: ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں۔ (سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں۔)

★[2] بوسانا: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا بوسے سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسری یہ کہ لفظ میں نے صرف راجستھان میں سنا تھا۔ کسی نعمت سے پوری طرح لطف اندوز اور مستفید ہونا۔ کسی چیز کا مبارک اور باعثِ مسرت ثابت ہونا۔

ٹھیٹ زمینی اور جڑیلا ہوتا ہے۔ اس کے حصول و اکتساب کے اپنے آداب و تقاضے اور اپنی شرائط ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے محبوب ادیب، دانشور، محفل آرا اور طناز فقرہ طراز سموئیل جانسن نے جو کچھ کہا ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ کا محکمہ اسے اپنا motto (لوح پر ثبت رہنما مقولہ) بنا لے:

> As the Spanish proverb says, "He who would bring home the wealth of the Indies must carry the wealth of the Indies with him." So it is in travelling: a man must carry knowledge with him, if he would bring knowledge with him.
>
> Boswell's Life of Johnson

مفہوم اس کا یہ ہے کہ اگر سات سمندر پار سے علم و ہُنر کی سوغات لانا چاہتے ہو تو رختِ سفر میں اپنے علم و ہنر کا ارمغان ساتھ لے جانا مت بھولنا۔

بالترتیب، چوتھا شعبہ امورِ نوجواناں ہے۔ جہاں تک میری معلومات اور نظر کام کرتی ہے آج کل کے نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کے بزرگ ہیں۔ اُدھر بزرگ بھی مجبور ہیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
بوڑھوں کو بھی جو موت نہ آئے تو کیا کریں

مجھے تو اپنے ہم عصر اور ہم عمر بزرگ، برگزیدہ کم اور گزیدہ زیادہ نظر آتے ہیں۔ رہے ایامِ نوجوانی کے امور تو مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ اب جو مُڑ کے دیکھتا ہوں تو اوامر و نواہی کا غُلغلہ تو آج بھی سنائی دیتا ہے، امور اور نوجوانی دور دور نظر نہیں آتی! بچپن اور جوانی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے آنے کا احساس ان کے جانے کے بعد ہوتا ہے۔ جب کہ بڑھاپے کا احساس اور ہول اُس کے آنے سے بہت پہلے ہونے لگتا ہے۔ بقول مرزا، بڑھاپا ظالم شروع ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے! اور جب بھر کے آتا ہے تو ہر یاد، ہر نقشِ ماسوا مٹاتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی خود چیخ اٹھتا ہے:

اب کچھ بھی نہیں مجھ کو بڑھاپے کے سوا یاد!

آپ کے محکمے کا پانچواں شعبہ عجائب گھر ہے جہاں میں اس لیے نہیں جاتا کہ کسی دانا نے نصیحت کی تھی کہ ایسی جگہ ہرگز نہ جاؤ جہاں لوگ تمہیں عجوبہ سمجھیں! دوسری وجہ عدم دلچسپی کی یہ کہ آج کل عجائب گھر کے اندرون کے مشمولات یعنی exhibits (اشیائے نمائش) کے مقابلے میں عجائب گھر کے باہر زیادہ

عجائب اور عجوبے نظر آتے ہیں۔ اگر باہر والے زندہ عجائب کو اندر کر دیا جائے ...... میرا مطلب ہے میوزیم کے اندر...... تو معاشرے کی بہت سی برائیوں کا آپ ہی آپ خاتمہ ہو جائے گا۔

مذکورہ بالا پانچوں محکموں کے مشاغل و وظائف سے میری وابستگی کو خارج از امکان قرار دینے کے بعد مرزا عبدالودود بیگ کہنے لگے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھیں کیے از آثار قدیمہ جان کر برائے نمائش بلایا گیا ہے۔ آج کل اُونچے اور روشن خیال گھرانوں میں بزرگوں کو عید بقر عید پر اُجلے کپڑے پہنا کر بطور زندہ antique، ڈرائنگ رُوم کے کسی کونے میں زیارت کے لیے سجا دیا جاتا ہے۔ وہ سال بھر اِسی دن کے انتظار میں جیتے ہیں!

میں گزشتہ مئی میں پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی دعوتِ کلام پر بحیثیت مہمانِ خصوصی حاضر ہوا تھا۔ میرے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ نے مجھے سال بھر انتظار نہیں کرایا اور چھ ماہ بعد ہی یاد فرما لیا۔ یہ اس لیے اور بھی باعثِ ممنونیت ہے کہ آج کی شام مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح کے یادگاری سال کے تقریباتی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں وزیرِ ثقافت گرامی قدر راجہ فیصل زمان صاحب اور محکمے کے نہایت لائق، باذوق اور فعّال مُعتمد جناب امجد نذیر کا بطور خاص شکر گزار ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ ادیبوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی یہ بدعتِ مُبارکہ جس کا آغاز انھوں نے کیا ہے، ایک مستقل سلسلے کی شکل اختیار کر لے گی۔

چھ ماہ بعد دوبارہ پشاور وارد ہونے میں مجھے بوجوہ تامّل تھا...... مخدومی و محبّی جناب عبداللہ صاحب اور محترمہ ڈاکٹر روبینہ شاہ جہاں کا شکر گزار ہوں کہ ان کی ترغیب اور اصرار سے یہ جھجک دور ہوئی۔ جون ایلیا کا ایک شعر ہے:

ے نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

اِسے قدرے تصرّف کے ساتھ اِس طرح پڑھا جائے تو تجدید و تکرارِ ملاقات پر بھی صادق آئے گا:

ے نظر پر بار ہو جاتا ہے چہرہ
جہاں جیو وہاں اکثر نہ جیو

اٹھائیس برس بعد مئی میں پشاور آیا تھا تو ہر چیز بدلی بدلی، نئی نئی سی لگی۔ حد یہ کہ اپنے حبیب لبیب ممریز خان کو بھی فقط ان کی پاٹ دار آواز اور قراقلی کُلاہ یا پاخ سے پہچان پایا۔ میری غیر موجودگی میں

انہوں نے چشمِ بد دور اتنی لمبی اور نورانی داڑھی رکھ لی ہے کہ میں تو میں FIA اور CIA والے تک انہیں شناخت نہیں کر سکتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنے استاد محترم ڈاکٹر ظفر الحسن، صدر شعبہ فلسفہ، علی گڑھ یونیورسٹی بہت یاد آئے۔ ان کی سفید بُرّاق داڑھی بھی نورانی تھی، جو ان کے سرخ و سفید چہرے اور تیکھے نقوش پر پھبتی تھی۔ اُن کا ملازم بشیر کہتا تھا کہ وہ بڑی پابندی اور شوق سے اِس کے نیچے روزانہ نئی ٹائی باندھتے ہیں، جس کی نہ صرف گرہ بلکہ نچلا سرا تک ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔ خاص تقریبوں میں بو لگا کر جاتے تھے، جس کی موجودگی کا علم صرف انہیں اور بشیر کو تھا۔

اتنے عرصے بعد پشاور آیا تو پرانی باتوں اور یادوں نے بے طرح ہجوم کیا۔ پشاور کا ائیر پورٹ کسی اور شہر کا لگا! پرانا ائیر پورٹ مریز خاں نے ٹھیکے پر تعمیر کیا تھا۔ اُس زمانے میں اکثر فرماتے تھے کہ ''صیب'' میں تو یہ ٹھیکہ لے کے پچھتاتا ہوں۔ اگر کوئی فلائٹ انجن کی خرابی کے باعث لیٹ ہو جائے یا کسی دُکھیا کا خانہ خراب خاوند کسی ائیر ہوسٹس سے ہنس ہنس کے باتیں کرتا پایا جائے تو وہ بد بخت بھی مُجھی کو قصوروار ٹھہراتی ہے!''

اُس بد بخت کو الزام کیوں دوں۔ کل جب میری فلائٹ ایک گھنٹے تک ائیر پورٹ کا ہوائی طواف کرتی رہی تو خود مجھے بھی کچھ شک گزرا، جو نیا ائیر پورٹ دیکھ کر دور ہوا، بدگمانی کے لیے مریز خان سے معافی کا خواستگار ہوں!

ایک بات یاد آئی۔ غیر متعلق ہے۔ اسی لیے کہے بن نہیں رہا جاتا! مرزا کو ایک دفعہ پوری محنت اور تیاری کے باجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ طرارہ آ گیا۔ کہنے لگے، اللہ معاف کرے، مجھے تو یہ دنیائے دَنی اشرف المخلوقات سے ٹھیکے پر بنوائی ہوئی لگتی ہے! ٹینڈر طلب کیے بغیر۔ ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّو بیاں۔

مریز خان سے میرا تعارف ۳۸ برس قبل ہوا تھا۔ وہ اور زمانہ تھا۔ مریز خان بینک سے نہ سُود لیتے تھے، نہ دیتے تھے۔ چنانچہ اکثر پریشان رہتے تھے۔ جب بزنس میں، بقول ان کے، نحوست پیدا ہو جاتی تو بنّوں میں گندم کی کاشت پر توجہ دیتے۔ اور جب گندم کی فصل دغا دیتی تو بزنس کو اُسی نقطۂ نحوست سے دوبارہ شروع کرتے جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے۔ دین دار اور پرہیز گار مسلمان ہیں۔ شدید زکام میں بھی ہر چھینک کے بعد الحمدُ لِلّٰہ ضرور کہتے ہیں۔ اگر تابڑتوڑ چھینکیں دم نہ لینے دیں تو قضا پڑھ لیتے ہیں! مجھے اُس زمانے میں antiques جمع کرنے کا شوق تھا۔ مریز خاں میرے لیے کہیں سے مہاتما بدھ کا مجسمہ خرید لائے۔ سنگ سیاہ سے تراشا ہوا گندھارا آرٹ کا خوبصورت نمونہ تھا۔ میں نے کہا اس کی شکل

آپ سے کافی ملتی ہے۔ بولے، یارا، یہ میری بدبختی ہے۔ آپ کو میرے چہرے پر جو نحوست نظر آ رہی ہے۔ وہ اس خانہ خراب حکومت کی پالیسی کا نتیجہ ہے!

میں جنوری ۱۹۷۹ء میں بسلسلۂ ملازمت لندن منتقل ہو گیا۔ دو ماہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مرزی خان چلے آ رہے ہیں۔ بغیر اطلاع کے! کہنے لگے، آپ کی یاد بہت ستانے لگی تو پاسپورٹ بنوا کے لندن آ گیا۔ چار پانچ دن بعد مجھے بتائے بغیر اپنی میلی شلوار ہیرڈس اسٹور کے ڈبل روٹی والے شاپر میں ٹھونس کر لندن کے مہنگے ڈرائی کلینرز Sketchleys کے کاؤنٹر پر پہنچے۔ اور وہ شلوار، جس کا اک ہی پائنچہ ہماری تمام ضروریات کے لیے کافی تھا، شاپر سے نکال کر شاپ اسسٹنٹ کے سامنے پھیلا دی۔ لڑکی کی سمجھ میں نہ آیا یہ کیا شے ہے۔ انہوں نے پہلے اسے اردو میں سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر پشتو میں تشریح کی۔ اس کے بعد اس خیال سے کہ فرنٹیئر میں جو لوگ پشتو نہیں بولتے اُن سے ہندکو میں بات کی جاتی ہے، انہوں نے ہندکو کے دو تین کڑک جملوں کا تڑکا دیا۔ وہ کُند ذہن پھر بھی نہ سمجھی تو اوورکوٹ کے نیچے سے اپنی ٹانگ نکال کر دکھائی کہ اس شے کو اس شے پر پہنتے ہیں۔ وہ انہیں حیرت سے دیکھنے لگی کہ اس سائز کی ٹانگیں لندن میں بھی آسانی سے دستیاب نہیں! اس کی حیرانی اور پریشانی دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنے اوورکوٹ کے تینوں بٹن کھول کر شمالی علاقہ جات بھی دکھلائے۔

جہاں تین زبانیں اپنا مفہوم واضح کرنے میں فیل ہو گئیں وہاں بالآخر body language (متکلم اشارے) نے مشکل آسان کر دی۔ لڑکی نے شلوار کی ڈرائی کلیننگ (گولڈن سروس) کے وہ چارجز بتائے جو اپنے ہاں بڑے ڈرائنگ رُوم کے پردوں کے ہوتے ہیں! پھندنے دار کلابتونی ازار بند کے وہ چارجز علاحدہ سے لگائے جو تین سلک ٹائیوں کے ہوتے ہیں۔ ازار بند واقعی اتنا لمبا تھا کہ جتنا وقت اسے شلوار کے نیفے کی بُھول بُھلیوں میں ڈالنے میں صرف ہوتا، اتنے وقت میں آپ پشاور سے بنّوں کے گندم کے کھیت میں پہنچ سکتے ہیں! لڑکی نے شلوار اور ازار بند کا ٹوٹل یعنی میزان کُل کاغذ کے پُرزے پر لکھ کر انہیں دکھایا۔ انہوں نے پاؤنڈز کو اپنی ہتھیلی پر انگلی سے لکھ کر ایکسچینج ریٹ سے ضرب دیا۔ اس میں حساب کی غلطی شامل کرنے کے بعد جو حاصل ضرب و جمع برآمد ہوا وہ کفِ دست کے علاوہ دماغ میں بھی نہیں سما رہا تھا۔ انہوں نے اُس میموڑی سے (جی ہاں، انہوں نے اس انگریز لڑکی کے لیے یہی لفظ استعمال کیا تھا) باڑہ کے آبِ شاب آور میں دُھلی پشتو میں فرمایا کہ بدبختا، اتنی ڈھیر ساری رقم میں تو میں بنّوں میں گندم کی فصل کٹنے کے بعد دوسری شادی کر سکتا ہوں۔ بلکہ اُسے کھڑے کھڑے طلاق، مہر اور نان و نفقہ دے دِلا کے پشاور میں اپنی بیاہتا بیوی کو سونے کی چوڑیاں خرید دا سکتا ہوں!

گھر واپس آئے تو کہنے لگے، میں نے اس میم کی بچی کو خوب کھری کھری سنائیں۔ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ یارا جی، اگر آپ اتفاق سے بنّوں کی کسی حسینہ کو گندم کے کھیت میں بے نقاب دیکھ لیں تو قسم سے آپ کی تو وہیں نکسیر پھوٹ جائے۔ یہ ہمارا ہی دل گُردہ ہے کہ ایمان بچائے پھرتے ہیں!

میں نے کہا، وہ لڑکی آپ کی ڈانٹ ڈپٹ کہاں سمجھی ہوگی؟

بولے "یارا جی، پشتو زبان غیرت کی زبان ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ کسی کو بُرا بھلا کہیں تو جتنا آپ نے کہا ہے، اگلا اس سے بھی کہیں زیادہ فوراً سمجھ جاتا ہے! میں نے کراچی کے لوگوں کو اردو میں گالی دیتے بھی سنا ہے۔ لگتا ہے بے نمک محاورے بول رہے ہیں! دراصل گالی لفظ میں نہیں ہوتی۔ لہجے میں ہوتی ہے۔ گالی میں گندگی تو لہجہ بھرتا ہے! ویسے سب سے گندی گالی تو آنکھیں بکتی ہیں۔ جبھی تو لوگ ڈارک گلاسز لگائے پھرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں آپ کو تو ڈاکٹر نے نُسخے میں لکھے ہیں!

ذرا دیر پہلے باڑے کے مقوّی پانی کا ذکر آیا تو یہ بتائے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اُن دنوں ایّوب خان کے ایک نہایت سرکردہ اور عمر رسیدہ وزیر نے ایک خوبصورت خاتون سے، جو دو دفعہ بیوہ ہو چکی تھی، نئی نئی شادی رچائی تھی۔ وہ اپنے لیے روزانہ پشاور سے باڑے کے تازہ پانی کا ایک کین سرکاری کوریئر کے ذریعے منگواتے تھے۔ چوری چھپے بیوی بھی دو تین گھونٹ پی لیتی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس پانی سے موصوف کو حسبِ دلخواہ فائدہ ہوا یا نہیں، لیکن دنیا جانتی ہے کہ اُس بی بی نے تیسری شادی کر لی! میں نے ممریز خاں سے پوچھا کہ آپ تو ماشاءاللہ دن بھر یہ پانی پیتے ہیں۔ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

انہوں نے اس کا جو بیساختہ اور برافروختہ سا جواب مِلی جُلی پشتو اور اردو میں دیا، اُس کا مطلب میں تو یہی سمجھا کہ یہ تو کوئی ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ اُن کی طبیعت میں مزید سُورمائی اور مردانگی کے بجائے جو پژمُردگی بلکہ فقط مُردگی نظر آتی ہے، وہ بزنس کا بیڑا غرق ہونے سے پیدا ہوئی ہے یا اس پانی کا اثر ہے۔ اس منسٹر کو تو بنّوں کا پانی پینا چاہیئے تھا جو کرے خشک کھیتی کو پل میں ہری۔ گندم کی فصل اس سال اتنی زوردار تھی کہ انہوں نے مجھے بھی بینک میں جنرل منیجری پر لات مار کے بنّوں میں گندم کی کاشت کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہاں گندم کا پودا راقم کے قد سے چار فٹ لمبا ہوتا ہے اور بنّوں کی اوس کراچی کی بارش کے برابر ہوتی ہے۔

دوسرے دن مجھے خدا حافظ کہنے ایئرپورٹ آئے تو ایک کین تازہ آبِ شباب آور کا ساتھ کر دیا! مرزا نے مشورہ دیا کہ اسے فوراً اپنے کسی دشمن کے گھر بھیج دو تا کہ اُس کی بیوی بھی چوری چھپے پی سکے۔

مریز خان کو لندن کی صرف دو چیزیں پسند آئیں۔ فرماتے تھے دریائے ٹیمس کا پانی ایسا ہے کہ ایک گلاس سے دو پراٹھے فوراً ہضم ہو جاتے ہیں۔ دوسری ادا جو انہیں بے طرح بھائی یہ تھی کہ سیف وے اسٹور کی معمّر اسسٹنٹ ہر سودا خریدنے والے کو بڑے پیار سے Thank you, love کہتی تھی۔ یہ ایک لفظ سننے کے لیے وہ ظہر اور عصر کی نماز کا سلام پھیرتے ہی اسٹور جاتے اور کوئی نہ کوئی غیر ضروری چیز خرید لاتے۔ ایک دن میں اس اسٹور سے ٹارچ اور موزے خرید کر لایا۔ دوسرے دن دونوں چیزیں واپس کر کے ان کے بدلے کافی خرید لایا۔ مریز خاں کو اسٹور کا یہ ''کسٹمر فرینڈلی'' دستور اتنا پسند آیا کہ دوسرے ہی دن سے یہ وتیرہ بنالیا کہ جو غیر ضروری چیز بعد نماز ظہر کے خرید کر لاتے اُسے بعد از نماز عصر اُس سے بھی زیادہ فضول چیز سے exchange کرنے پہنچ جاتے! وہ اس ادا پہ مرمٹے کہ خریدا ہوا مال واپس لیتے وقت بھی وہ شفیقہ اتنے ہی پیار سے Thank you, love کہتی تھی! ایک دفعہ میں نے ہمت کر کے انہیں اس فضول خرچی پر ٹوکا تو کہنے لگے، میں نے تو کبھی آپ کو فضول شعر پہ سبحان اللہ! واہ واہ واہ واہ! کہتے ہوئے نہیں ٹوکا!

جو چیز انہیں بالکل پسند نہیں آئی وہ لندن کی سیڑھیاں تھیں۔ ہمارا اپارٹمنٹ گیارہویں منزل پر تھا۔ وہ لفٹ استعمال کرنے میں اپنی توہین محسوس کرتے تھے۔ کہتے تھے ہم اونچی اونچی مردانہ سیڑھیوں کے عادی ہیں۔ یہاں کی سیڑھیاں اتنی نیچی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے زنانیوں کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ چوڑائی اتنی کم کہ میں اپنا پیر پوری طور اٹھا اور جما نہیں پاتا کہ سیڑھی ختم ہو جاتی ہے! دو دفعہ گر چکا ہوں۔ یارا جی، زینے اتنے ذلیل ہیں کہ گرنے سے چوٹ تک نہیں آتی!

اسی زمانے میں خبر آئی کہ ارلز کورٹ کے ایک فلیٹ میں رہنے والے اکیس سالہ پاکستانی نے اپنی چالیس سالہ پڑوسن سے شادی کر لی، جس پر سب کو تعجب ہوا، سوائے مرزا کے! فرمایا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ لندن کے فلیٹوں کے زینے اتنے تنگ ہیں کہ آدمی خود کو زینے کے ناکے ★ میں پرو کر چڑھتا اُترتا ہے۔ دوسرے کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی عورت نیچے آ رہی ہو اور اسی وقت نیچے سے مرد اوپر جا رہا ہو تو درمیان میں نکاح کے سوا کوئی مہذب صورت نظر نہیں آتی۔

مریز خان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے ایک اونچی قراقلی ٹوپی کا تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ محبت اور

★ ناکا: سوئی کا سوراخ

''اردو لغت'' کے مُرتّبین نے تشریحاً ایک استاد کا یہ شعر نقل کیا ہے:

اُس کے وصفِ دہن تنگ کا آیا جو خیال
مجکو دکھلانے لگا سوئی کا ناکا مضموں

اپنائیت کا یہ عالم کہ ٹوپی وہ بطورِ خاص اپنے ہی سر کے سائز کی بنواتے ہیں۔ گزشتہ ۳۸ برسوں میں اپنی ملاقاتوں کا حساب ٹوپیاں گن کر کرلیتا ہوں۔ ملاقات اور کُلاہِ مریزی کا مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار رہتا ہے جتنی بے صبری سے غالبؔ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں بار بار بُلائے جانے اور سیدھی صف میں دسویں نمبر پر خلعت سات پارچہ و جیغہ و مالائے مروارید سے نوازے جانے کے آرزو مند اور منتظر رہتے تھے۔

ایک دن میں نے اِتراتے ہوئے کہا کہ بفضلہٖ اب اتنی ٹوپیاں جمع ہوگئی ہیں کہ کراچی میں مریزی قراقلی کی دکان کھول سکتا ہوں۔

مرزا کو ہمارے غُبّاروں میں سُوئی چبھونے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ تڑاخ سے بولے ''ایسی دکان کا جس میں سب ٹوپیاں دکاندار کے اپنے ہی سر کے odd سائز کی ہوں وہی انجام ہوگا جو اکثر ٹھیکے داری اور گندم کی کاشت کا ہوتا ہے!''

ہماری سرپوشی کو تو مریز خاں نے اپنے ذمّہ لے لیا۔ پاپوش کا اہتمام برادر محترم عبداللہ صاحب کرتے ہیں۔ وہ بھی ویسی ہی اپنائیت برتتے ہیں اور اعلا چمڑے کی اپنے ناپ کی پشاوری چپلیں اسپیشل آرڈر سے بنوا کر عنایت کرتے رہتے ہیں۔

ہم نے مریز خان کو کبھی سبزی یا غلّے سے غلّہ یعنی دال روٹی کھاتے نہیں دیکھا۔ کل میں نے ان سے کہا کہ میں تو ویجی ٹیرین ہوگیا ہوں۔

بولے، ہمارے یہاں بھی زچّہ کو گوشت نہیں کھانے دیتے۔ گائے کو وہ potential چپلی کباب یعنی چپلی کباب کی نابرشتہ اوران گھڑ شکل سمجھتے ہیں۔ فربہ بھینس کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ اگر بھینسا دیکھ لے تو انہیں سینگوں پر اُٹھالے۔ کہتے ہیں، کراچی آتا ہوں تو ڈھب ڈھب شوربے میں لاغر بکرے کی بوٹی تلاش کرتے کرتے میری تو آنکھوں میں موتیا اتر آتا ہے۔ ہم تو بھُنے، نیم برشت گوشت کے عادی ہیں۔ دُمبے تک کو زیادہ پانی نہیں پینے دیتے۔

یادوں کی یلغار ایک دفعہ شروع ہوجائے تو تاریخی ترتیب و توقیت اور تقدیم و تاخیر کا فرق مِٹ جاتا ہے۔ اس وقت مجھے مردان کا ورجینیا تمباکو کا وہ بیوپاری یاد آرہا ہے جو ہر تیسرے چوتھے مہینے کراچی آتا اور میری بیوی کے لیے چیختے چنگھاڑتے رنگوں کا قمیص کا کپڑا ضرور لاتا تھا، جسے میں تالیفِ قلب کے خیال سے شکریے کے ساتھ قبول کرلیتا تھا۔ اظہارِ خلوص و تپاک کا ان کا اپنا انداز تھا۔ بولر کی طرح دوڑ کے اس طرح بغل گیر ہوتے کہ مجھے اُدھر اٹھا لیتے۔ پھر سطحِ زمین سے ایک فٹ کی اونچائی سے واپس

زمین پر پٹخ کے مصافحہ کرتے۔ اس کے بعد سلام علیکم یا مزاج شریف کہنے کے بجائے، معلوم ہے کیا کہتے تھے؟...... ''اللہ آپ کی مغفرت کرے۔'' وقتِ رخصت بھی یہی دعا فرماتے! میں اس قبل از وقت دعا سے اتنا محظوظ ہوتا کہ انہیں اشارتاً بھی نہیں ٹوکا۔ البتہ ایک دن یہ ضرور کہا کہ آپ قمیص کے کپڑے کا ناحق تکلف کرتے ہیں۔ بیوی ریشمی کپڑے نہیں پہنتی۔ بہت سادگی پسند ہے۔

انہوں نے کپڑا ہمیں واپس پکڑاتے ہوئے کہا ''تو پھر اسے اپنی کسی جان پہچان والی کو دے دینا جو سادگی پسند نہ ہو۔ اللہ آپ کی مغفرت کرے۔'' انہوں نے پہلی مرتبہ صحیح موقع پر دعائے مغفرت کی۔

ایک دفعہ عید کے چار پانچ دن بعد آئے تو میرے لیے چاندی کی ایک چھوٹی سی خوبصورت ڈبیا کا تحفہ لائے۔ میں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ کہنے لگے، اس میں نسوار رکھنا۔ میں نے کہا، میں نسوار نہیں سونگھتا۔ بولے، تو پھر جو کچھ سونگھتے پھانکتے ہو، وہ اس میں رکھ لینا۔ اللہ آپ کی مغفرت کرے۔

خدا جانے قصہ خوانی بازار کا وہ چڑچڑا سا حلوائی حیات ہے یا نہیں جس کے ہاں، بقول مرزا، شتر مُرغ کے انڈے کے برابر کالی گلاب جامن ملتی تھی۔ میں پہلی مرتبہ خریدنے گیا تو اُس نے پوچھا، کتنے سیر چاہیئے؟ میں حساب لگانے لگا کہ میں ہوٹل میں کتنے عدد کھاؤں گا۔ گھر کے لیے کتنی اور دوستوں کے لیے کتنے عدد؟ مرزا کے لیے کتنے سیر کافی ہوگی اور قاضی عبدالقدوس کے لیے کتنے سیر ناکافی ہوگی۔ پھر گلاب جامنوں کی تعداد کو وزن یعنی سیروں میں منتقل کرنے لگا۔ میری مینٹل ارتھمیٹک ہمیشہ سے کمزور رہی ہے۔ گاہکوں کا ازدحام تھا۔ مجھے مذبذب اور چکرایا ہوا دیکھ کر کہنے لگا، کس کے لیے خرید رہے ہو؟ کتنی چاہئیں؟ میں پھر بھی خاموش رہا تو کہنے لگا، اگر اپنے لیے چاہئیں تو ایک ہی کافی ہوگی!

پھر اس سے ہماری دوستی ہو گئی۔

یہ سب دوست یاد آ رہے ہیں۔ جہاں بھی ہوں ہمارا سلام پہنچے۔

دسمبر کی ایک یخ صبح کا ذکر ہے۔ مریز خاں نے مجھے اسی باکمال و چرب زبان حلوائی کی پوریاں ڈینز ہوٹل میں کھاتے دیکھا تو کہنے لگے، بازار کی چیز کھانا اچھی بات نہیں۔ آپ کا گھر بمقام ۸ نمبر، رحمان بابا کالونی، آؤٹ سائیڈ باجوڑی گیٹ، پشاور میں ہے۔ یاراجی، مجھے تو اپنا خانہ خراب کرایہ دار سمجھو! بس حکم کرو۔ افغانی نان کے برابر پوری بنوادوں گا۔ ایک ہی کافی ہوگی۔

بازار کی چیزوں سے پرہیز کی تلقین پروفیسر قاضی عبدالقدوس بھی کرتے رہتے ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ میرے سوتیلے چچا اپنے خُسرِ بزرگوار کے اس پندِ سُودمند کو آموختہ کی طرح دہرایا کرتے تھے کہ

رات کو پھل، خصوصاً خربوزہ، ہرگز نہ خریدو اور طوائف کو کبھی نہار منہ نہ دیکھو۔ مطلب یہ کہ دن بھر دھوپ کھایا ہوا خربوزہ اور بازارِ حسن میں رات بھر کی جاگی طوائف کا چہرہ میک اپ کے بغیر علی الصبح نہ دیکھو ورنہ دل دونوں سے ہمیشہ کے لیے کھٹا ہو جائے گا۔

نصیحت کی صداقت و افادیت اپنی جگہ، لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بزرگوار کا حلقۂ خرید و دید و وعید کن perishable commodities (جلد بدبو دینے اور سڑنے والی اشیا) تک محدود تھا! نیز یہ کہ جہاں دیدہ بزرگوار نے اپنی اولاد و ذریات کے لچھن دیکھ کر ہی تو انہیں باسی تباسی خربوزہ کھانے اور طوائف کے بن ڈھلے چہرے کی نہار منہ زیارت سے منع فرمایا ہوگا۔ واضح رہے کہ اردو لغت (جلد ۱۷) میں خربوزے کو ''قبض کشا، پیشاب آور اور مفرح'' بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ صراحت نہیں کی گئی کہ خربوزہ بذاتہٖ فرحت بخش ہے یا اس کی فرحت بخشی متذکرہ دو حوائج سے فراغت کا قدرتی نتیجہ ہے۔

اُس زمانے میں چنار گُل سے بھی تعارف ہوا۔ وہ لنڈی کوتل کے تاجروں کا تاجدار تصور کیا جاتا تھا۔ یہ اس لیے بھی قابلِ تعریف ہے کہ وہ بمشکل دستخط کرسکتا تھا جو خطِ مرمُوز یا مِصری hieroglyph کا نمونہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک دفعہ میں مریز خاں کے ہمراہ لنڈی کوتل گیا تو اُس نے بہت مختصر نوٹس پر میری دعوت کھلے آسمان کے نیچے کی۔ دستر خوان بچھانے سے پہلے ایک پورٹیبل رہکلے (چھوٹی اُٹھاؤ توپ) سے پانچ ٹھوتھے گولے داغے گئے۔ پشاور کے برانچ منیجر نے بتایا کہ ان کا مقصد مہمان کی آمد کے اعلان اور اعزاز کے علاوہ دشمنوں کے دلوں میں خوف بٹھانا بھی تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان تعظیمی اور تنبیہی دھماکوں سے اس ویرانے میں کتنے قبائلی دلوں میں ہیبت بیٹھی۔ اتنا ضرور دیکھا کہ کوؤں کے غول کے غول ہول کھا کے بے تحاشا کائیں کائیں کرتے کہیں اور چلے گئے جہاں مہمان کے اعزاز میں توپ نہ چل رہی ہو۔ کوّے تو خیر کوّے ہیں۔ خود توپ اپنے چلنے سے ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ چکرا کر لٹو کی طرح گھومنے لگی۔ ہر بار دو گولنداز بڑی مشکل سے اُسے قابو میں لاتے اور زور زوری سے دوبارہ داغے جانے پر رضامند کرتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جس گچھے دار مونچھوں والے ملازم نے چاندی کے نقشین آفتابے سے سِلفچی میں معززین کے ہاتھ دُھلائے وہ بھی اُن کے پہلو بہ پہلو دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ میں نے قبائلی مساوات پر اپنی حیرت اور ستائش کا اظہار کیا تو بینک منیجر نے کہا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب وہ اپنے کندھے پر تولیہ ڈالے آپ کے ہاتھ دھلوا رہا تھا تو بالکل ویسا ہی پستول جیسا کہ مالک کے پاس تھا، اُس کی کمر پٹی میں بھی اُڑسا ہوا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ ہتھیار

پاس ہو تو آپ ہی آپ مساوات منوالیتا ہے۔

کھانے کے بعد چنار گل نے مجھے درّہ کا بنا ہوا فاؤنٹین پین کی شکل اور سائز کا ایک پستول تحفتہً دینا چاہا۔ میں نے کہا، اس کا میں کیا کروں گا؟ بولا "سامنے کی جیب میں لگا لیں۔ میں تو جاہل ہوں۔ آپ عالم آدمی ہیں۔ عُلما شُلما میں اٹھتے بیٹھتے ہوں گے۔ مذہبی اور سیاسی بھینسا بھینسی، کڑتے اوباسی ★[1] میں آسانی رہے گی!"

وہ تو بقول خود ان پڑھ تھا۔ مگر کچھ ایسا بر خود غلط نہ تھا۔ زندگی ان پڑھ آدمی کو ایسی عملی سُوجھ بُوجھ، معاملہ فہمی اور وَرڈلی وزڈم (فراستِ دنیوی) بغایت ارزانی کرتی ہے کہ دانا دنگ رہ جاتے ہیں۔ ہما شُما کس شمار میں ہیں۔ بڑے بڑوں نے تیر، تفنگ، تلوار، بندوق، توپ اور ایٹم بم کو کبھی پہلی اور کبھی کبھار آخری دلیل اور بُرہانِ قاطع کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس کی ایک دلچسپ مثال "آبِ حیات" میں ملتی ہے۔ محمد حسین آزاد رقم طراز ہیں کہ آتش کو خار جا معلوم ہوا کہ ایک نواب صاحب شیخ امام بخش ناسخ کو خلعت دینے والے ہیں۔ یہ بھی ارتجالاً ایک غزل کہہ کے مشاعرے میں پہنچ گئے۔ اور ایک قرابین (چوڑے منہ کی چھوٹی بندوق) بھی بھر کر ساتھ لیتے گئے۔ پھر کیا ہوا، اُس کا حال خود آزاد کی زبانِ مُعجز بیان سے سُنیے:

"(آتش) بیٹھے ایسے موقع پر تھے کہ عین مقابل شیخ صاحب (شیخ امام بخش ناسخ) کے تھے۔ اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا۔ اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اٹھاتے تھے اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے۔ اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا:

ع "سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"

۱۹۷۵ء کا ذکر ہے۔ پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک تقریب میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ایسا بے داغ مخملی لان اس سے پہلے یا اس کے بعد نہیں دیکھا۔ گہما گہمی ذرا کم ہوئی تو میں ٹہلتا ہوا سرونٹ کوارٹرز کی طرف جا نکلا۔ ایک بوڑھے مالی سے سلام دعا کے بعد لان کی ہریالی، شادابی اور قالینی دبازت کا راز پوچھا تو کہنے لگا، تم نے تین سوال کیے ہیں جن کے چار جواب ہیں۔ پہلا جواب یہ کہ پشاور کا پانی زور آور معجونی ہے۔ سوکھے تنکے پر بھی چھڑک دو تو وہ بھی ہرا ہریلا ہو جائے گا۔ تم بھی پیا کرو۔

★[1] کڑتے اوباسی (پشتو): بحثا بحثی/ مین میخ نکالنا۔

دوسری بات یہ کہ لان انگریز کے وقتوں کا ہے، جب پودوں پر دوائیں نہیں چھڑکی جاتی تھیں۔اب تو گوبر کے کھاد میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے! تیسری وجہ یہ کہ اُس زمانے میں مالی مالی ہی ہوتے تھے۔ باتوں کے باغ نہیں لگاتے تھے۔ مالی تھے، مراثی بکواسی نہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس سو برس پرانے لان کے نیچے تہ در تہ سات لان ہیں جن کی سینچائی سات نسلوں کے پسینے سے ہوئی ہے۔ جب جا کے یہ رنگت، یہ سات قالینوں کی تہ دار دباوٹ پیدا ہوئی ہے۔

میں سوچنے لگا کہ پشاور بھی ایک قدیم و عظیم شہر ہے۔ اس کی ثقافت و روایت یک سطحی و یک رُخی نہیں۔ اس کی ہر تہ میں باثروت تہذیبوں اور تمدنوں کا رُوپ، رنگ، رچاؤ اور نکھار ہے۔ اس نے لاتعداد لشکر و کارواں اپنے دشت و جبال اور وادی و دمن سے گزرتے دیکھے ہیں۔ اُن طالع آزماؤں اور حملہ آوروں کے گھوڑوں کے سُموں سے اُڑتی دھول اور چنگاریاں بھی دیکھی ہیں جو جس سرزمین کو فتح کرنے نکلے، پایان کار وہیں کے ہو رہے۔ یہ خطۂ آزادگاں سدا سے اپنی آن و ثقافت کا امین اور ناقابلِ تسخیر رہا ہے اور رہے گا۔

؎ از قرن تا بہ قرن لشکرِ ظلم است ولے
از ازل تا بہ ابد فرصتِ درویشانست

فرموداتِ فیضی

(یہ مضمون جناب دوست محمد فیضی کے کالموں کے مجموعہ ''اظہارِ خیال'' کی تقریبِ اجراء منعقدہ ۷ اپریل ۲۰۰۲ء میں پڑھا گیا۔)

معززّ خواتین وحضرات،

صاحبِ شام جناب دوست محمد فیضی چار بار منسٹر رہ چکے ہیں۔ اس کے باوجود عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں! کچھ تو ہے کہ لوگ ہی نہیں کرسی وزارت اور سرکار بھی کچے دھاگے میں بندھی چلی آتی ہے! کس کی مجال کہ ان کے عاجزانہ حکم سے سرتابی کر سکے یا اپنائیت سے معمور فرمائش پوری نہ کرے۔ عجیب بات ہے جب سے میں نے اعلان کیا ہے کہ میں ایک عرصے سے گوشہ گیر اور ''تارک الکلام'' ہوں، اور تقریر کرنے اور تقریظی مضامین لکھنے میں میری زبان وقلم میری نیازمندی کا ساتھ نہیں دیتے، مجھے نئی کتابوں کے فلیپ اور پیش لفظ لکھنے اور ان کی رسمِ اجراء کی مدحیہ تقریب میں اخلاقاً جھوٹ بول کر سرخرو ہونے کے دعوت نامے کثرت سے ملنے لگے ہیں۔ معذرت کرتا ہوں تو دل شکنی ہوتی ہے۔ تالیف وتسخیرِ قلوب کے لیے ''منہ زبانی'' تقریر کر کے خود کو اور سامعین کو بھی آزما کے دیکھ لیا۔ نہ اپنا جی خوش ہوا، نہ تالیاں بجیں۔ مرزا نے تسلّی دی کہ غم نہ کرو۔ نامقبول ہونا بہرصورت نامعقول ہونے سے بہتر ہے! ایک قباحت یہ بھی ہے کہ مزاح نگار قصیدے میں بھی ہجو ملیح کا پہلو نکال لیتا ہے۔ اور اس میں وہ اپنی عادت و جبلّت سے مجبور ہے۔ کبھار میں شیرنی اپنے ننھے بچے تک کو خون آلود دانتوں اور تیز کیلوں تلے دبائے گھومتی پھرتی ہے! اُس کو تو ممتا کے اظہار کا بس یہی طریقہ آتا ہے۔

عزیزی دوست محمد فیضی نے جب اپنے کالموں کے مجموعے ''اظہار خیال'' کی تقریبِ اجراء کی صدارت کی دعوت بصد خلوص واحترام دی تو اس عزت افزائی کے شکریے کے بعد میں نے وہی بندھی ٹکی معذرت کی جواب خود مجھے بھی ناقابلِ قبول لگتی ہے۔ جواباً انہوں نے اپنی صدارت کا قصہ

سنایا جسے میں نے لطیفہ اس لیے نہیں کہا کہ اسے سن کر میں دل ہی دل میں محظوظ تو ہوا، مگر احتراماً ہنسا نہیں! وہ کچھ یوں ہے کہ جب وہ ایک تقریب میں خطبۂ صدارت کے لیے کھڑے ہوئے تو وزارتی منصب اور صدارتی اعزاز کو لازم وملزوم وملزم قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ خواتین وحضرات! یہ عجیب ماجرا ہے کہ لوگ ہم سیاست دانوں کو بُرا سمجھتے اور برا کہتے ہیں۔ پھر اوّلین تقریب میں ہمیں ہی ہار پھول پہنا کر کُرسیٔ صدارت پر بٹھاتے ہیں! اس کی وجہ اور مماثلت میری سمجھ میں تو اس طرح آئی کہ حج کے دوران یوں تو لوگ شیطان پر لعنت بھیجتے اور لاحول پڑھتے رہتے ہیں، لیکن جب منیٰ میں شیطان بالمقابل استادہ نظر آتا ہے تو اُس پر کنکریاں مارنے کا لطف وثواب ہی کچھ اور ہے!

مرزا کہتے ہیں کہ صدقے جایئے! مُسلمانوں نے علامتی بُت بھی بنایا تو فقط پتھر مارنے کے لیے!

فیضی میاں نے شیطان کو کنکریاں مارنے کی تمثیل سے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ اس پر میں ڈرتے ڈرتے یہ اضافہ کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ ہمارے ہاں معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ہمارے میدانِ سیاست میں تو ایک شیطان دوسرے شیطان کو کنکریاں مارتا ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی پھینکی ہوئی کنکریاں بٹور کر اُسی کی کنکریوں سے اُسی کو مارتے ہیں۔ یہ سنگ ہائے دشنام اور کنکریاں کثرتِ استعمال سے گِھس گِھسا کر ۱/۲ رہ گئی ہیں۔

اب ان سے نہ چوٹ لگتی ہے نہ نیل پڑتا ہے۔ اُدھر فریقین کی جلد بھی اتنی موٹی ہوگئی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی پھولوں کی چھڑیوں سے گُدا گُدا رہا ہے!

انہوں نے میری عذر معذرت اس طرح سماعت فرمائی جیسے اُونچا سننے لگے ہیں۔ میں نے مزید وضاحت کی تو ایسا لگا جیسے میں اُونچا بولنے لگا ہوں۔ مجھے بھی یہ سمجھنے میں کچھ دیر لگی کہ یہ بہرا پن اور دیر فہمی تو پختہ کار سیاست دانوں کا مخصوص اندازِ سماعت وشنیدن ہے! پھر خود ہی کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ یہ اعلان بھی تو کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے!

انہوں نے یہ بھی عندیہ دیا کہ as a special case ہم آپ کی پسند کے فرضی مرض میں مبتلا ہونے کا اعلان بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے دو تگڑے سے وَرکر آپ کو دائیں بائیں سہارا دے کر ڈائس پر چڑھا دیں گے۔ بس آپ روز مرّہ والی پھُرتی نہ دکھایئے گا۔ کرسی پر خاموش بیٹھے رہیئے گا۔ آخر میں مختصر سی صدارتی تقریر بھی کافی ہوگی۔''

میں اسی سوچ میں پڑ گیا کہ انہوں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ تقریر مختصر ہو، لیکن حقیقت یہ ہے

کہ مختصر تعریف و مدحت سے کسی بھی ممدوح کی سیری نہیں ہوتی، جب کہ مذمّت کتنی بھی مختصر ہو کافی وکاری ہوتی ہے۔

مرزا نے مجھے کچھ مذبذب دیکھا تو بولے''اختصار میں زیادہ محنت پڑتی ہے تو مختصر مذمّت کو گولی مارو۔ لمبی تعریف وستائش بھی مزہ دیتی ہے، بشرطیکہ جھوٹی ہو اور جھوٹ میں سچ کی ملاوٹ نہ ہو۔ رہا یہ سوال کہ کون کتنی دیر بولے گا، اس کا فیصلہ تو بے صبرا audience پہلے ہی پانچ جملوں کے بعد کر لیتا ہے! مختصر نویسی کا بُوٹنگ سے بہتر کوئی استاد نہیں! بائی دی وے، تمہارے دو دِلے پن کی وجہ یہ ہے کہ تم تمام عمر فُٹ بال میچ میں ہاکی اِسٹک سے گول کرنے کی کوشش کرتے اور اسے اپنے ہی پیر پہ مارتے رہے ہو!

کڑھا ہوا سیاست داں''ناں'' اور''نہیں'' کو کبھی حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ بلکہ''ناں'' کو''ہاں'' کی شرماتی، لجاتی شکل جان کر جو کرنا ہے کر گزرتا ہے! چناں چہ جب میرا معقول عُذر، اقرار بالجبر میں تبدیل ہو گیا تو فیضی نے مطلع کیا کہ گو کہ یہ تقریب کتاب سے متعلق ہوگی، لیکن آپ اسے ادبی جلسہ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ وجہ یہ کہ حاضرین کی بھاری اکثریت سیاسی ورکرز پر مشتمل ہوگی، جن کو ادب سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی آپ کو باکسنگ یا شیر کے شکار سے! بہر کیف، یہ ایک تاریخی اجتماع ہوگا۔ دو وزرائے کرام، جنرل معین الدین حیدر اور نثار احمد میمن صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ سابق وزراء راجہ ظفرالحق، الٰہی بخش سومرو صاحب اور اعجازالحق صاحب بھی اظہارِ خیال فرمائیں گے۔ یہ سب حضرات سیاسی گفتگو کرتے ہیں۔ اور خوب داد سمیٹتے ہیں۔ علمی و ادبی گفتگو سمجھنے اور خوبصورت فقروں پر تالی بجانے والے تو آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے۔ لہٰذا آپ ایسے احباب کو اپنے ساتھ لانا چاہیں تو ہم انہیں اگلی صف میں install کر دیں گے!

اخلاق، ایمانداری اور حفظِ مراتب کا تقاضا ہے کہ یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ اس وقت اگلی صف میں جو معزز و محترم حضرات تشریف فرما ہیں وہ میرے ہمراہ نہیں آئے ہیں۔ اگر وہ رسماً یا بے دھیانی میں میرے کسی فقرے پر تالی بجائیں یا مسکرا دیں تو اسے غلط معنی نہ پہنائے جائیں۔

فیضی نے اطلاعاً کم اور ہدایتاً زیادہ، یہ کہا کہ ان کے بیشتر کالم سیاسی موضوعات پر ہیں۔ لہٰذا خطبۂ صدارت میں اس پہلو پر بطور خاص روشنی ڈالی جائے تو حاضرین کی توقع کے عین مطابق ہوگا۔

خواتین و حضرات، سیاست نہ میرا کوچہ ہے، نہ میدان۔ بہر حال مارے باندھے حالات حاضرہ پر اظہارِ تاملات و تفکرات کر سکتا ہوں، بشرطیکہ آرٹس کونسل کے ادبی جلسے میں مخدومی راجہ ظفر الحق صاحب میر تقی میر پر اظہار خیال فرمائیں اور مُحبّی و معظمی الٰہی بخش سومرو صاحب منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کے محاسن پر گفتگو کریں۔ تالیوں کی فکر نہ کریں۔ مجھے اگلی صف میں مع تالی بجانے والوں کے پائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ ایسے بلند پایہ اور نامور سیاستدانوں اور صحافیوں کی تقریروں کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ بالکل ناکافی ہوگا۔ کہنے لگے کہ پانچ پانچ چھ چھ منٹ کی تقریریں کافی ہوں گی۔ مقصد تو شرکت کی برکت ہے۔ مہمانانِ خصوصی سے اختصار سے کام لینے کی عمومی درخواست کی جائے گی۔

میں بھی ایک ایسی ہی عمومی درخواست کے جھپیٹے میں آچکا ہوں۔ یہ ایک نیم سیاسی، لیکن مکمل سرکاری محفل کا قصہ ہے۔ چیف منسٹرز ہاؤس میں کراچی کے پچاس ساٹھ ادیب و دانشور جمع تھے۔ میری باری سے دو دانشور پہلے تحکمانہ انداز میں یہ اعلان کیا گیا کہ اب کوئی صاحب تین منٹ سے زیادہ نہ بولیں۔ اس لیے کہ صدرِ مملکت جناب فاروق احمد لغاری کو ایک شادی میں شرکت کی غرض سے ٹھیک ڈھائی بجے لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ''پریسیڈنشل پلین'' تیار کھڑا ہے۔ سکیورٹی ایسکورٹ جلدی مچا رہا ہے۔ ابھی سے سیٹیاں سنائی دے رہی ہیں۔

کراچی میں ان دنوں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ آٹا مہنگا تھا اور بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس بوریوں میں سے کراچی کے مشہور ''اشرفی'' برانڈ آٹے کی بجائے ''اشرافوں'' کی لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ لغاری صاحب بچشم و بگوشِ خود حالات حاضرہ اور امن و امانِ غیر حاضرہ دیکھنے اور سننے کے لیے تشریف لائے تھے۔ ساڑھے پانچ منٹ بعد مجھ تک ان کی بزم میں مائک آیا تو میں سرکارِ بے سرکار کے مدارالمہام سے جو مائلِ پرواز تھے عرض پرداز ہوا کہ آپ اہالیانِ کراچی کی تعزیت، عیادت اور پُرسشِ حال کے لیے تشریف لائے ہیں، لیکن تین منٹ میں حالاتِ حاضرہ گوش گزار نہیں کیے جا سکتے۔ سرِدست غالبؔ کا ایک شعر سنتے جایئے جو بعض نسخوں میں ہے، بیشتر میں نہیں ہے:

؎ نہ پوچھ حال اِس انداز اِس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ

محفل پر با ادب خاموشی چھا گئی، جس میں خوف کا شائبہ بھی تھا۔ صدر محترم سب سے رخصتی مصافحہ کرنے لگے۔ میری باری آئی تو ذرا ٹھٹکے۔ فرمایا، اُس شعر کا مطلب کیا ہے؟

عرض کیا ''وہ بھی تین منٹ میں بیان نہیں کیا جا سکتا!''

''اظہارِ خیال'' سبقاً سبقاً نہ پڑھیں اور فقط فہرستِ مضامین پر سرسری نظر ڈالیں، تب بھی کینوس کی فراخی اور موضوعات کے تنوع کے علاوہ ہر موضوع کے مختلف پہلوؤں کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سیاسی مسائل اور راز ہائے درون و بیرونِ خانہ پر فیضی نے گھر کے بھیدی اور خود تماشا و خود تماشائی کی حیثیت سے جرأت، دیانت اور ذہانت سے تبصرہ کیا ہے۔ میں اس کی داد تو دے سکتا ہوں، اس پر معلوماتی اضافہ نہیں کر سکتا کہ نہ یہ میرا میدان ہے، نہ میلان اور نہ منصب۔ ساری عمر غلط قبلے کی طرف سجدہ کرنے سے ملازم پیشہ شخص کے ضمیر پر سیاہ گٹا پڑ جاتا ہے۔ پھر وہ بولتا کم اور تولتا زیادہ ہے۔ اُس کی تیغِ زبان نیام میں رکھے رکھے ہی زنگ آلود اور کند ہو جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اسے سان پہ چڑھا کے نئی دھار رکھتا ہے۔ پھر اس عصائے پیری کی ٹیک لگا کے اٹھتا بیٹھتا، محفل محفل ٹہلتا، ڈھلکتا پھرتا ہے اور اپنے آقایانِ ولی نعمت اور باسز کی نالائقیوں کے قصے سنا کے دل ''پشوری'' کرتا ہے۔ افسوس کہ میں اپنے باسز کی نالائقیوں کے قصے نہیں سنا سکتا۔ وجہ اس کی یہ کہ ان کی نالائقیوں کے طفیل ہی میں وقت سے پہلے باس بن گیا! قصے سنائیں وہ لنڈورے [1] جن کا میں باس بنا!

اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ ملازمانہ وضعِ احتیاط اور دِل کی گہرائیوں میں جاگزیں خوف، ریٹائرمنٹ کے بعد بھی نہیں جاتا۔ اُونٹ کے بارے میں مشہور ہے کہ مستقل بوجھ ڈھونے، تابعداری دکھانے اور بندھے رہنے کے باعث وہ ان حالوں کو پہنچ جاتا ہے کہ اگر مالک اسے کسی چھوٹے سے پتھر یا سُوکھی ٹہنی سے بھی باندھ دے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ بہت مضبوطی سے کسی بھاری پتھر یا کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ لاکھ زور لگائے اور بلبلائے، رسّی نہیں تڑا سکتا۔ اپنے ہاں کچھ اسی سے ملتا جلتا رشتہ اور احوال آمر اور عوام کالانعام کا ہوتا ہے! آپ نے نہ سہی، میں نے تو وہ زمانہ دیکھا ہے جب عوام الناس کے لیے یہ لفظ (عوام کالانعام) کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ لغت میں اس کے معنی ہیں ''عام لوگ جو مثل چوپایوں کے ہیں۔'' مرزا اس پر بھی بس نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں کہ آج کل

---

[1] لنڈورے: دُم کٹے۔

عوام الناس سے مُراد وہ عوام ہیں جن کا ناس مار دیا گیا!

کتاب کے آغاز میں اگر اکٹھے سات خیال انگیز دیباچے نہ ہوتے، تب بھی کتاب کی پذیرائی اور مقبولیت میں فرق نہ آتا۔ لیکن فیضی رِسک نہیں لیتے۔ بسیار گیر و محکم گیر کے قائل ہیں۔ بھلے وقتوں میں یو پی، بالخصوص لکھنؤ، میں دستور تھا کہ بہو بیٹی ڈولی میں بیٹھ کر جاتی تو اس میں ایک پتھر رکھ دیا جاتا تھا۔ اس پتھر کا مقصد و مصرف یہ تھا کہ کہاروں کو زنانی سواری کا اصل وزن معلوم نہ ہو۔ مبادا وہ اس کی تشہیر کریں۔ غالباً یہ اس لیے بھی ضروری سمجھا جاتا تھا کہ مردوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ بسا اوقات فقط وزن کی کمی اور کمر کی غیر موجودگی پر عاشق ہو جاتے ہیں! متذکرہ سات سنگ ہائے گراں مایہ میں سب سے ہلکا پتھر ہمارا ہے۔ ایک دفعہ عزیزی افتخار عارف کی زرنگار ڈولی میں رکھ دیا تھا۔ سو آدھا رہ گیا! وہ جس بھاری پتھر کو چُوم کر چھوڑ دیں یا پتھر کے دل والے کے گھٹنے چُھو لیں وہ کھڑا کھڑا آدھا رہ جاتا ہے!

فیضی کی سیاسی تحریریں بھی، ان کی تقریروں کی طرح، ان کے رکھ رکھاؤ، سُبھاؤ اور لہجے کی مٹھاس کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے حُسنِ اخلاق، انکسار اور شیریں بیانی کے سبھی مُعترف و مُعرِف ہیں۔ یہ اتنے تپاک اور عجز و انکسار سے ملتے ہیں کہ، اللہ معاف کرے، کبھی کبھی تو شک گزرتا ہے کہ کہیں یہ ہمارے قیمتی ووٹ پر بُری نظر تو نہیں ڈال رہے۔ اس لیے کہ ہم جیسے عام آدمی کے پاس لے دے کے ایک یہی ایسی چیز ہے جس پر ''جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی۔''

فیضی بزرگوں کی بہت عزّت کرتے ہیں۔ ہر تیسرے جملے کے بعد ہمیں بزرگ کہہ کر ہمارے درجات بلند کرتے ہیں۔ اور بار بار بزرگی کی یاد دلا کر، اپنی دانست میں، ہمیں ٹین ایجرز کی سی حرکتیں کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ دورانِ گفتگو یہ وضاحت بھی کرتے جاتے ہیں کہ وہ بزرگوں کی عزّت کرنے پر کیوں مجبور و مامور ہیں۔ اللہ اور فیضی ہماری بدگمانی معاف کریں، ہمیں تو بعض اوقات یہ وہم ہوتا ہے کہ وہ ہماری بزرگی پر اتنا زیادہ زور غالباً اپنی جوانی کو ہائی لائٹ کرنے کی غرض سے کرتے ہیں! اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔

اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بزرگوں کا ادب و احترام اپنی جگہ، لیکن آرٹ اور ادب کی دنیا میں جو عزّت فقط اور فقط سِنِ پیدائش کی بناء پر کی جائے، وہ عزّت کی ذلیل ترین صورت ہے!

بزرگی کا ذکر آیا تو جوش صاحب کی مشہورِ زمانہ و زنانہ رباعی (برائے نام تحریف کے ساتھ) سنائے بغیر نہیں رہا جاتا:

ے ممکن ہو تو سولی پہ چڑھانا یا رب
یا آتشِ دوزخ میں جلانا یا رب
فیضی کہے ہم سے کہ ہیں آپ بزرگ ★
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

جوش صاحب نے فیضی کے بجائے ''معشوق'' لکھا ہے، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی ملاقات فیضی سے نہیں ہوئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ جیسی تعظیم و تکریم سے یہ بزرگوں اور اپنے سینئرز سے پیش آتے ہیں، اس میں تصنّع اور تملّق کا شائبہ نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ آخری یعنی چوتھی بار منسٹر ہوئے (یہ چوتھی اور آخری دفعہ کی قید تاریخی اعتبار سے ہے۔ نہ شرعی مناہی ہے، نہ خاکم بدہن پیش گوئی) تو انہوں نے آرٹس کونسل میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح کیا۔ ایک تصویر ملاحظہ کرتے ہوئے جب فوٹو کھچوانے کا لمحہ آیا تو انہوں نے کمال سعادت مندی سے ہمیں آگے یعنی تصویر کے عین سامنے کھڑا کر دیا۔ پھر اپنی بیگم کو احتراماً ہمارے پیچھے کھڑا کیا۔ اور بیگم کے پیچھے خود عادتاً کھڑے ہوگئے۔ ماورائے وزارتی پروٹوکول، ادب آداب اور خیالِ خاطرِ احباب اِن کے سیاسی ڈسپلن اور مزاج کا حصہ ہے۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ آئندہ ایسے لوگ چوتھی بار کُجا، ایک بار بھی کُرسیٔ وزارت تک نہ پہنچ پائیں گے۔

یہ اور بات کہ دوسرے دن اخبارات میں جو تصویر چھپی، وہ ماشاء اللہ ان کی پچاس انچ چوڑی پشت کی تھی، جس کی اوٹ میں نہ صرف ہمارا چہرہ، فرمایشی مسکراہٹ سمیت، بلکہ سموچا وجود چھپ گیا تھا۔ حالاں کہ ہم تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، فوٹو کھنچوانے کے لیے کھڑے کیے گئے تھے۔

پس ثابت ہوا کہ چشمِ بددُور، مؤدّب وزیر کا پچھایا یعنی پشت بھی ہما شُما کے front (اگایا) سے کہیں زیادہ photogenic اور public interest (مرکزِ توجہِ خلائق) کی حامل ہوتی ہے!

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ہم جب بھی ان کے ہاں گئے، انہوں نے وقتِ رُخصت آگے بڑھ کر نہ صرف پچھلا دروازہ کھولا، بلکہ ڈرائیور کی سیٹ والا دروازہ بھی کھول دیا۔ ملاقاتی کی کار کے دروازے کھولنے میں وہ سبقت اور پُھرتی دکھاتے ہیں۔ ہم جیسوں نے تو یہ عادتِ شریفہ، اللہ غریقِ رحمت کرے، جنرل ضیاء الحق سے سیکھی ہے۔ ایک ضعیف سی روایت ہم تک پہنچی تھی کہ جس

★ معشوق کہے ہم سے کہ ہیں آپ بزرگ

ماتحت یا صحافی یا سیاست داں کی کار کا دروازہ وہ غیر معمولی ادب و احترام سے کھولتے اُس کا دوسرے ہی دن، بالترتیب، ڈِسمس ہونا، کوڑے کھانا، جیل جانا یقینی تھا۔
واللہ اعلم۔

اس روایت کے پیش نظر جب پانچوں نیشنلائزڈ بینکوں کے صدور کا وفد میری سربراہی میں جنرل ضیاء الحق کے حضور پیش ہوا تو ہم نے کاریں آرمی ہاؤس سے بہت دور پارک کیں اور پیدل سَپَڑ سَپَڑ کرتے اُس ہال نما کمرے میں پہنچے جہاں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھنگیوں کی توپ کے مِنی ماڈل کے سامنے گردن پر arthritis والا کالر، کلائی پر رِسٹ کیپ اور حاضرین پر تیوری چڑھائے، تن کے بیٹھے تھے۔ پھر کچھ ایسا بجوگ پڑا کہ مسلم کمرشل بینک کے پریسیڈنٹ ای۔ اے گاردا نے اسی وقت بحالتِ خوف اور بصورتِ احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ اور کچھ عرصے بعد راقم الحروف نے بھی طوقِ ملازمت اتار کے جنرل ضیاالحق کو لوٹا دیا۔ سپردم بتو زیورِ ہیچ را۔ مگر یہ ایک علاحدہ داستان ہے۔ پھر کبھی۔

فیضی اپنی بیگم کے لیے بھی کار کا دروازہ اتنی ہی مستعدی، لپک جھپک اور فِدویانہ فروتنی سے کھولتے ہیں جتنی کہ جنرل ضیاء الحق اپنے سے بدر جہا کم مرتبہ و منصب لوگوں کی کار کا دروازہ کھولنے اور ساتھ ساتھ روزی روزگار کا دروازہ بند کرنے میں دکھاتے تھے۔ ایک دفعہ ہماری بیگم نے گِلہ کیا کہ تم میرے لیے صرف اُس وقت کار کا دروازہ کھولتے ہو جب لوگ دیکھ رہے ہوں۔ جب کار گھر پہنچتی ہے تو بیچارہ ڈرائیور دراوزہ کھولتا ہے!

میں نے کہا ''میں نے کسی دانا کا قول پڑھا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو دوڑ دوڑ کے بیوی کے لیے کار کا دروازہ کھولتے دیکھو تو اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو کار نئی ہے۔ یا پھر بیوی نئی ہے۔''

فیضی کا شمار معجز بیان مقرروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک نامور اسٹوڈینٹ لیڈر رہ چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہیں اور لکھا ہے، ایسے ہونہار لوگ سنِ بلُوغت کو پہنچنے سے پہلے سنِ بلاغت کو پہنچ جاتے ہیں! اسٹوڈینٹ لیڈر کی خوبی جو اُس کا ہینڈی کیپ بھی ہے، یہ ہے کہ وہ سٹرا بھترا ہو جائے اور اُس کی بھنویں اور پلکیں تک سفید بھَک ہو جائیں، تب بھی اسٹوڈینٹ لیڈر ہی کہلائے گا۔ کراچی میں اسٹوڈینٹ لیڈر اور اسٹوڈینٹ بریانی کی مقبولیت کو مارشل لا ءبھی کم نہیں کر سکتا۔ دستاویزی ثبوت کے طور پر خود فیضی، جاوید جبّار، فتح یاب علی خاں اور معراج محمد خاں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ رہی اسٹوڈینٹ بریانی تو ہم نے اسے لندن، نیو یارک اور ہوسٹن کے ریستورانوں میں بھی مہکتے دیکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس نے زمانہ طالب علمی میں یہ بریانی چکھ لی وہ تمام عمر چاول کو کسی اور شکل

میں دیکھنا اور حلق سے اتارنا گوارا نہ کرے گا۔

اسٹوڈینٹ لیڈر اپنے فطری اعتماد، بے خوف لہجے، دوٹوک اندازِ بیان، سُتھری اور سجل سیاست سے صاف پہچانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بزرگ سیاست داں...... اور ادیب بھی ...... بالعموم یاس پسند اور قنوطی ہوتے ہیں۔ انہیں سفید رنگ نظر نہیں آتا۔ اُنہیں ہر چیز، خصوصاً مستقبل، یا تو سیاہ نظر آتا ہے یا خاکی!

میں نے بہت سوچا کہ سیاست، سیاسی مسائل اور سیاست دانوں پر کچھ اظہارِ خیال کروں۔ لیکن جہاں راست گوئی میں تلخ نوائی کا شائبہ ہو وہاں خاموشی اختیار کرنا بُزدلی کی عارفانہ صورت ضرور ہے لیکن خیالِ خاطر وخوفِ اربابِ سیاست بھی تو کوئی چیز ہے۔ ایک اُلجھن تو یہ کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ politicians کو سیاست داں کیوں کہتے ہیں۔ جہاں تک سیاست کے اسرار و رموز اور طریقہ ہائے واردات سے علمی سطح پر واقفیت کا سوال ہے تو ان کی بدرجہ بہتر تفہیم، تشریح اور ترسیل کا دعویٰ تو پروفیسر، سیاسی مبصرین و تجزیہ نگار اور ریسرچ اسکالر کر سکتے ہیں۔ عملی سیاست اور realpolitik میں منزل اُنہیں کو ملی جو چانکیہ کا ارتھ شاستر اور میکاولی کی The Prince پڑھے بغیر ان کے وضع کردہ قوانینِ جہاں داری و جہاں گیری و جہاں بانی پر instinctively یعنی جبلّی طور پر عمل پیرا تھے۔ تمہید لمبی ہوگئی، کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ politician کا صحیح ترجمہ سیاست کار ہے۔ سیاست داں نہیں۔ داں کا لاحقہ تو پاندان، نمک دان اور چوہے دان ہی پر پھبتا ہے، یعنی وہ چیز جس میں نمک رکھا جائے یا جس سے چوہے پکڑے جائیں۔

فیضی نے ایکٹرس ریکھا اور مولانا کوثر نیازی پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر کی پے در پے سہرا بندیوں اور نواز شریف پر بھی بالترتیب اظہار حیرت و محبت کیا ہے۔ ''وزارت ہے مطلوب و مقصود''، ''سیاسی نکاح'' اور ''سیاست کا حال مت پوچھو'' کے زیرِ عنوان چبھتی ہوئی نکتہ چینی کی ہے، جس سے متفق ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ہماری سیاست کا طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ہمیں ہر سیاسی پارٹی نامہ سیاہ اور ہر لیڈر داغدار نظر آتا ہے۔ اگر عام آدمی سے پوچھا جائے کہ اس کی رائے میں کس بے داغ شخص کو ملک کا پرائم منسٹر ہونا چاہیئے تو اُس کے ذہن میں اپنے نام کے سوا کسی اور کا نام نہیں آتا! یہ اور بات کہ پرائم منسٹر شپ کے لیے اُس غریب کے پاس ''بے داغیت'' کے علاوہ اور کوئی کوالی فیکیشن نہیں ہوتی۔ اسی طرح جمہوریت کی بقاء، فروغ اور عملداری کے لیے مجھ جیسے عام آدمی کی contribution (حصہ) فقط ایک ووٹ اور بے دلی سے بجائی ہوئی تالی تک محدود ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ حکومت خواہ فوجی ہو یا غیر فوجی...... حکومت اور قوالی میں

گا تا تو دراصل ایک ہی شخص ہے۔ باقی ماندہ فقط تالی بجاتے ہیں، مگر سمجھتے یہ ہیں کہ وہ بھی برابر گا رہے ہیں! کرکٹ میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ ''یکتائی'' نظر آتی ہے۔ ایک کھلاڑی کھیلتا ہے اور گیارہ جَل ککڑے اسے کھیلنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں!

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مرزا سویلین حکومت کے لیے''غیر فوجی حکومت'' کی چڑاونی، ٹھینگا دکھاتی اصطلاح کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اس کو دُرست مان لیا جائے تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دورِ حاضر میں غیر فلمی شاعری میں احمد فراز اور افتخار عارف کے نام سرِ فہرست ہیں اور بشریٰ رحمٰن نے غیر مردانہ موضوعات پر اچھے افسانے لکھے ہیں؟

تفنن برطرف، آج کل اخبارات میں بڑے زور شور سے قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں کہ ملک کا آیندہ وزیرِ اعظم کون ہوگا۔ جنگ اخبار کے کالم نگار محترمی نذیر ناجی نے دو قسطوں میں بیس پچیس امیدواروں کی فہرست شائع کی ہے بعض کالم نگار اور سیاسی مُبصر تو امیدوار کا نام اس طرح نکال رہے ہیں جیسے فٹ پاتھ پر براجمان نجومی اپنے طوطے کی چونچ سے قسمت کا حال بتانے والا لفافہ نکلواتے ہیں! اگر کوئی شخص اس طوطے سے سات دن تک قسمت کا لفافہ نکلوائے تو ہر روز نیا حال، نئی پیش گوئی نکلے گی! امیدواروں کی بعض فہرستیں تو اتنی لمبی ہیں کہ کالم میں نہیں سماتیں۔ ان میں ہمارے نام کے سِوا سب کے نام ہیں! ایسے کالم پڑھ کر بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ

؎ کالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ یہ فہرستیں الہامی ہیں! کیوں کہ الہام و اِلقا کے بغیر اُن کے ناپسندیدہ سیاست دانوں کی ایسی مکمل فہرست مرتب نہیں کی جا سکتی!

فیضی نے یہ کتاب بجا طور پر اپنی بیگم کے نام معنون کی ہے، جو بقول اُن کے اُن کی شریکِ حیات ہونے کے علاوہ اُن کی ''شریکِ خیالات'' بھی ہیں۔ ''ہم خیال'' انہوں نے غالباً خوفِ فسادِ خلق اور خدشۂ الزامِ گروپ بندی کے باعث نہیں کہا۔ سنتے آئے ہیں اور اب آنکھوں سے بھی دیکھ لیا کہ کامیاب آدمی کے پیچھے ایک عورت ضرور ہوتی ہے۔ اس پر اتنا اضافہ کر لیجئے کہ بقولِ شخصے ناکام آدمی کے پیچھے ایک سے زیادہ ہوتی ہیں! دیباچے میں فیضی رقم طراز ہیں کہ بیگم ہی نے انہیں کالم نگاری کی راہ سجھائی۔ یہ بڑی سمجھ داری کی بات تھی۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بیگمات نئی راہ سُجھانے کی بجائے پرانی راہوں کو out of bounds قرار دے دیتی ہیں۔ اس مبارک فیصلے سے بیگم کی دانائی اور دور اندیشی ثابت ہوتی ہے کہ شوہر کو دھندے سے لگا دیا۔ انگریزی کہاوت

کے مصداق، ٹھالی آدمی کا خالی ذہن شیطان کی ورکشاپ ہوتا ہے۔ بیگم مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ہمارے ہاں نقشہ اس کے برعکس ہے۔ خدانخواستہ بیگم ہماری ہم خیال ہوتیں یعنی ہمارے محشرِ خیال میں برابر کی شریک ہوتیں تو خانہ خرابی کی صورت نکاح نامے کی روشنائی خشک ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو جاتی!

کالم نگاری کے نفع نقصان کا ذکر چھڑ گیا تو ایک واقعہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بات پرانی ہے۔ اس لیے اب اسے بتانے میں خفت محسوس نہیں ہو رہی۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر نے ہم سے فرمائش کی کہ آپ اپنی پسند کے موضوعات پر ہفتہ وار کالم لکھیں۔ میں اس پر نیم رضامند ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ اپنے پسندیدہ موضوعات تو سارے کے سارے ناقابلِ اشاعت ٹھہرے۔ رہے ناپسندیدہ موضوعات، تو ان پر اظہارِ خیال فرمانے کے بعد میں جیل جا کر کیا کروں گا۔ میں آزاد یا فیض تو ہوں نہیں کہ زنداں سے شاداں و نازاں ایک شاہکار لے کے نکلوں۔ ہتھکڑی بیڑی بجاتا جاؤں گا اور بغلیں بجاتا نکلوں گا۔

ان خدشات کے پیشِ نظر میں نے معذرت کر لی کہ بندہ پہلے ہی ایک بدنامِ زمانہ حرام پیشے یعنی سُود خوری سے بخوشی وابستہ رہا ہے۔ مزید رسوائی مول لینا نہیں چاہتا۔ کہیں پڑھا تھا کہ کوٹھے پر بیٹھنے والی ایک طوائف سے ایک فلم ڈائریکٹر نے کہا کہ ہم تمھیں اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ جو عزت اللہ نے مجھے یہاں بیٹھے بیٹھے بخشی ہے، اُسے میں فلمی دنیا جیسی بدنام جگہ جا کر خاک میں نہیں ملانا چاہتی!

نیرنگیٔ زمانہ اور سیاسی و حکومتی بوالعجبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے، فیضی معروضی انداز، توازن، شگفتگی اور شایستگی کو حتی الوسع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سیاسی خرخشوں، معرکوں اور مُجیڈوں میں شایستگی کی کیا تعریف و معیار ہوگا، اس پر، یادش بخیر، دس بارہ برس قبل گرما گرم اور بے نتیجہ بحث ہو رہی تھی جو مرزا کے اس قول فیصل پر ختم ہوئی کہ شایستہ کہلانے کا صرف وہ شخص مستحق و سزاوار ہے جو حالاتِ حاضرہ پر گالی بکے بغیر دو منٹ گفتگو کر سکے۔ ہمارے یہاں ہر عہد میں حکومتِ وقت کی مذمّت و تنقیص کو صحافیانہ جرأت و حق گوئی کا معیار و پیمانہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اب یہ رویّہ ایک syndrome کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

گزشتہ صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں Seven Year Itch کا بڑا چرچا تھا۔ اس نام کی ایک مشہور فلم بھی بنی تھی، جس میں میرلن منرو مردوں کو اس لیے بھاتی تھی کہ وہ عفیفہ دونوں آنکھیں تو برابر کھلی رکھتی تھی لیکن پورے وجود سے آنکھ مارتی تھی۔ سَیون ایرز اِچ کے پیچھے یہ نفسیاتی

مفروضہ تھا کہ سات برس کی ازدواجی زندگی یعنی فرمائشی محبت کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے سے اُکتا جاتے ہیں اور تبدیلیٔ بستر و طلاق کے خواہش مند اور نئی بانہوں کے آرزومند ہوتے ہیں۔ دونوں اس امر پر متفق ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں! تازہ ترین سروے کے مطابق باہمی بیزاری اور اُکتاہٹ کی مدّت اب گھٹتے گھٹتے تیس ماہ یعنی ڈھائی سال رہ گئی ہے! یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ امریکہ میں پچاس فی صد جوڑے شادی کی دوسری سالگرہ سے پہلے طلاق لے لیتے ہیں اور دوسری شادی رچا کے پھر سے بیزاری کے دن گننے لگتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس میعادی بیزاری کا اطلاق حکومت اور عوام کی love-hate relationship یعنی پیار پھٹکار پر بھی ہوتا ہے۔ فیضی چار دفعہ وزارت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ وہ اس کُلیّے کی تصدیق یا تردید کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

اس کا علاج صرف پُرامن اور بروقت تبدیلی ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ فقط ناخن کاٹنے یا اکھاڑ دینے سے خارش نہیں مٹتی۔

فیضی نے اوّل تا آخر سادہ اور عام فہم زبان میں گفتگو کی ہے۔ لکھنے والے ہی جانتے ہیں کہ آسان زبان میں مطالب ادا کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ فیضی اس وادی سے آسان و شاد کام گزرے ہیں۔ شاعر نے اپنے محبوب کے شفاف پہلو کی جو تعریف کی ہے، وہ ان کی نثر پر بھی صادق آتی ہے:

مثلِ آئینہ ہے اُس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

سیاست کار کی بات میں جب اِدھر سے اُدھر کا پہلو صاف نظر آنے لگے تو جانیے کہ آدمی سچّا اور کھرا ہے۔ آگے چل کر دُکھ اٹھائے گا۔

پیش لفظ میں فیضی ازراہِ انکسار لکھتے ہیں: ''زبان و بیان کی جو غلطیاں نظر آئیں، اُن کی ذمہ داری میرے عوامی پس منظر پر ہے۔ اس لیے کہ عوامی زبان ہر حال ادبی زبان کی ذرا بگڑی ہوئی شکل ہی ہوتی ہے۔'' اس سے ہمیں دوگونہ اختلاف ہے۔ اولاً، غلطیوں کا سرچشمہ منبع و مخرج بالعموم پس منظر میں نہیں ہوتا۔ مثلاً ہماری ہی ادبی و غیرادبی غلطیوں کو لیجیے۔ ان کی تمامتر ذمہ داری نہ پس منظر پر ہے نہ پیش منظر پر بلکہ ہماری اپنی پس و پیش پر جس کا مرکزِ کسالت ہمارے ہی اندر ہے، باہر نہیں۔

ثانیاً، زیرِ گفتگو مضامین میں فیضی تو بنفسِ نفیس و ناطق نظر آتے ہیں، غلطیاں ہمیں نظر نہیں آئیں۔

فیضی سے قطعِ نظر، گھاگ لیڈر زبان اور تلفظ کی غلطیاں کثرت سے اس لیے بھی کرتے ہیں کہ لوگ صرف ان ہی کا مذاق اُڑانے میں اُلجھے رہیں۔ دوسری قسم کی غلطیوں پر کسی کی نظر نہ جائے!

ان کے بیانِ عجز ترجمان سے ایک وجہ اختلاف یہ بھی ہے کہ عوامی زبان کو ادبی زبان کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینا دونوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اگر محض فقرے پر فقرہ ہی چُست کرنا مقصود ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ایک زمانے میں ہمارے ہاں ڈیرے دار طوائف اور یورپ میں ''مسٹرس'' رکھنا دراصل رشتۂ اِزدواج کی ذرا بگڑی ہوئی شکل تھی! جناب مصطفےٰ کھر نے حال میں آٹھویں شادی کی ہے۔ تو کیا ہم اسے غیر شرعی خواہشات کی ذرا بگڑی ہوئی شرعی شکل کہہ سکتے ہیں!

؎ یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

صراحت کے بغیر بھی یہ بالکل عیاں ہے کہ گلیوں، بازاروں، کھیتوں، کھلیانوں اور چوپالوں میں بولی جانے والی muscular (عضلاتی) اور کسرتی زبان اپنا مفہوم کسی اینچ پینچ اور جھالر پھُندنوں کے بغیر بھی اختصار، رسان اور دل نشینی کے ساتھ ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو یہ کہنا درست ہوگا کہ عوامی زبان زیادہ expressive اور graphic یعنی کاشفِ مفہوم اور صورت گر ہوتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ''ادق ادبی زبان میں کوئی قصیدۂ غرّا تو کہہ سکتا ہے، دشمن کی گالی کا جواب نہیں دے سکتا۔ نہ آپے سے باہر ہو کے غصّے ہو سکتا ہے، نہ دھاڑیں مار کے اپنے پیاروں کا ماتم کر سکتا ہے۔ اور تو اور 'اسطوخودوس'★ زبان میں ٹوٹ کے اظہارِ محبت بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ارے صاحب، یہ کوئی تمہارا مضمون تھوڑا ہی ہے کہ پڑھنے والے کو ہر جُملے سے لطف اندوز ہونے سے پہلے تین چار دفعہ لغت دیکھنا پڑے۔ پھر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اگلا لغت پہ ہنس رہا ہے یا تمہارے لطیفے پر!''

مارک ٹوین بلاشبہ عظیم ترین مزاح نگار ہے۔ مگر نرا مزاح نگار ہی نہیں۔ ہیمنگوے (Hemingway) نے جو خود بھی امریکی ادب میں سب سے بڑا فکشن نگار تسلیم کیا جاتا ہے مارک ٹوین کے شاہکار کے بارے میں کہا ہے:

> "All modern American literature comes from one book by Mark Twain called Huckleberry Finn."

★ اسطوخودوس: نزلے اور پاگل پن کی یونانی دوا جسے اطبا دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں۔ ہم نے یہ اصطلاح ایسی گنجلک اور چکرا دینے والی طرزِ تحریر کے لیے وضع کی ہے جس کے مطالعہ سے دماغ پہ جھاڑو پھر جائے!

یہ قول تمہیداً و سنداً اس لیے نقل کرنا پڑا کہ مارک ٹوین کے خیال میں شگفتہ تحریر اور مزاح بالخصوص چٹاخ پٹاخ مکالمہ، ٹھیٹ مقامی dialect اور slang (بولی ٹھولی۔ عامیانہ روزمرہ) کے بغیر اوجِ کمال کو نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی چاشنی اور آمیزش تحریر کو تازگی، تاثیر، زور اور قبولِ عام بخشتی ہے۔

اس طولانی تقریر اور محفل کے اختتام پر آپ کے حسنِ سماعت کی داد دینا مجھ پر لازم ہے۔ میں تو اپنی کار بہت دور پارک کر آیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وقتِ رخصت فیضی کس کس کی مشایعت کرتے ہیں اور آگے بڑھ کے کس کس کی کار کا دروازہ کھولتے ہیں۔ اور جو بغیر کار کے یہاں آئے ہیں، اُن سے کس طرح کُھل کے گلے ملتے ہیں۔

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

خطبہ
جلسہ عطائے اسناد
لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS)
(منعقدہ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء)

جناب پرو چانسلر، جناب ریکٹر، جناب وائس چانسلر، عزیزان جامعہ، معزز خواتین و حضرات،

مجھے یہاں اور ایسے جامہ و جُبّہ و دستارِ عالمانہ میں دیکھ کر جتنا تعجب آپ کو ہو رہا ہوگا، اُس سے کہیں زیادہ حیرت مجھے ہو رہی ہے۔ ابھی ابھی ڈریسنگ رُوم میں یہ سوانگ بھر کے قدِ آدم آئینہ دیکھا تو کیسے کہوں کہ معاً خود کو تعظیم دینے کو جی چاہا! اور جھوٹ کیوں بولوں، بے تحاشا یہ بھی جی چاہا کہ اِس خِلعتِ مُستعار کو جس پر میرا اعزازی استحقاق ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں، کبھی نہ اُتاروں۔ پھر خیال آیا کہ بندۂ خدا، یہ تو جیّد عُلما و فضلا، اساتذۂ کرام، داناؤں اور دانشوروں کا جامۂ فضیلت ہے۔ تم کہاں کے دانا ہو، کس ہُنر میں یکتا ہو؟

یہ کسرِ نفسی نہیں، گزارشِ احوالِ واقعی ہے کہ عمرِ عزیز کی اکتالیس بہاریں اور اتنی ہی برساتیں ایک ایسے رسوائے زمانہ پیشے کی نذر ہوگئیں جس کے ڈانڈے بلکہ شرحدیں Shylock کے ظالم دھندے سے جاملتی ہیں! البتہ اِدھر چند برسوں سے فقط مزاح نگار اور لکھار کی حیثیت سے جانا، پہچانا اور پُکارا جاتا ہوں۔ اور اسی اضافی حیثیت میں اکثر موضوع اور مُوردِ تنقیص و تحسین ٹھہرایا جاتا ہوں! بہر حیثیت، ایسے غیر متعلق تنگنائے اختصاص اور عیاں محدودات کے حامل شخص کو کنووکیشن ایڈرس کی دعوت دینا اُس کو قلم جوکھم میں اور حاضرین کو سمعی صبر و تمکین کی آزمائش میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

چند روز قبل ایک عزیز دوست نے جو اسلام آباد میں ایک بلند منصب پر فائز ہیں، اِسی سے ملتے جلتے ''ڈبل رول'' کا ایک مزیدار قصہ سنایا۔ وہ پریسیڈنٹ ہاؤس میں ایک پُر ہجوم تقریب کے بعد مائک پر اعلان کروا رہے تھے کہ غلام نبی ڈرائیور گاڑی لے آئے۔ چار دفعہ متواتر اعلان کے

باوجود غلام نبی ڈرائیور نہیں آیا تو ہمارے دوست نے جھونجھل اِس طرح اتاری کہ پانچویں بار اعلان کرایا کہ غلام نبی جو پندرہ برس سے مالی کا کام کرتا رہا ہے اور ڈیڑھ ماہ سے ڈرائیوری کر رہا ہے، گاڑی لے آئے۔ اعلان ہوتے ہی سابق مالی غلام نبی نے کار پورچ میں لا کے کھڑی کر دی!

یہ تو مدعو کرنے والے کرم فرما ہی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے کس حیثیت میں یاد اور طلب کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ بہر صورت و بہر عنوان حاضرِ خدمت ہوں۔ مالی سے مماثلت پر نہ متاسف ہوں نہ محجوب کہ یہ تو ایک قابلِ رشک اطلاقی علامت اور انطباقی استعارہ ہے۔ عزیزو، آگے چل کر آپ کا پیشہ کچھ بھی ہو اور جو بھی وسیلۂ معاش آپ اختیار کریں، آپ کا شِعار اور کسبِ کمال کا طریقۂ کار وہی ہوگا، اور ہونا بھی چاہیے، جو باغبان کا ہوتا ہے۔ میاں محمد بخش کہتے ہیں:

؎ مالی دا کم پانی دینا، بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھَل پھُل لانا، لاوے یا نہ لاوے

غالبؔ نے بھی بڑے اعتماد اور فخر سے کہا تھا:

؎ آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

مفہوم یہ کہ ہم نے صحرا کے ایک ایک کانٹے کو اپنے خونِ دل سے رنگ کر صحرا میں باغبانی اور پھول کِھلانے کا قاعدہ قانون اور ضابطہ ہائے چمن بندی و گلشن آرائی رقم کر دیے ہیں، جن سے بنجر، بیہڑ اور سنگلاخ زمینیں پھبک اٹھتی ہیں۔ دانش گاہ کی خالصتاً علمی، آدرش وادی، نِتھری، سُتھری اور شفاف فضاؤں سے باہر نکلنے کے بعد آپ کو زندگی میں ایسے چھوٹے بڑے صحرا اور خارزار بکثرت ملیں گے جن کو خونِ دل سے سینچ کر گُل و گلزار بنانا آپ کا وظیفہ اور فریضۂ جاریہ ہوگا۔ اس سے عہدہ برآ ہونا فی نفسہٖ فوزِ عظیم ہے کہ یہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

اگر ہم اپنے گرد و پیش، حلقۂ اثر اور ماحول اور ماحول میں اپنے حصے کی تبدیلی اور بہتری نہ لا سکے تو جانو ہم نے رب کی بخشی ہوئی صلاحیتوں اور قوتوں کو رائگاں کیا۔ گویا ساری زندگی اکارت اور عمر کی پونجی کُلّھم ہٹے کھاتے میں گئی۔

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ تہلکہ مچا دینے والی تبدیلی اور انقلاب ان کے عزم و ارادے اور جدّ و جہد کے بغیر ''Act of God'' کی مانند واقع ہو۔ یعنی اگر کسی چُھپاتے اور چَھپاتے سُرخا سُرخ انقلاب یا تربوزی سبز (یعنی باہر سبز، اندر لالوں لال) یا ہلدی اور یرقانی فِکر سے بھی زیادہ زرد انقلاب کو آنا ہی ہے تو ایک خاکی رنگ صبح اچانک قدرتی و آسمانی آفت اور سونامی کی مانند محض

مشیتِ الٰہی سے آجائے جو نا قابلِ دست اندازیٔ انسان ہو!

انقلاب آمد دلیلِ انقلاب

یہ لوگ ساری عمر اپنے پسندیدہ رنگ کے انقلاب کے جو آپی آپ آجائے مُتمنی و مُنتظر رہتے ہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف اس کے آثار و علامتیں دیکھتے ہیں، مگر انقلاب ہے کہ کسی طرح آکے نہیں دیتا۔ یہ وہ راسخ العقیدہ احدی★ ہیں جو اپنے کرنے کے تمام کام اور فرائض خدا کو سونپ کر نچنت ہوجاتے ہیں! دراصل یہ اپنے حصے کی تگ ودَو، کارکردگی، پہل، جانفشانی اور تاریخی و جدلیاتی رول کی ادائیگی سے جی چُراتے ہیں۔ اور اپنی سہل انگاری، تساہلِ اہلکارانہ اور تجاہلِ عارفانہ کو ورڈلی وزڈم یعنی دنیوی سُوجھ بُوجھ، بُردباری اور دانائی سے تعبیر کرتے ہیں!

بڑی تبدیلی لانے کی خواہش میں مُضمَر افراط وتفریط کے خطرات پر لیڈی ایسٹر (Astor) نے جو اپنے زمانے کی نہایت ممتاز و مقبول شخصیت ہونے کے علاوہ برٹش پارلیمنٹ کی پہلی خاتون ممبر بھی تھی، کیسی چبھتی ہوئی بات کہی، جس کی کاٹ کو اپنے ترجمے سے کُند کیے بغیر، پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا:

"The main dangers in life are the people who want to change everything... or nothing."

رہی کلیدِ کامیابی تو معتبر روایت ہے کہ کسی شخص نے ایک ولیٔ کامل سے جاکے پوچھا کہ حضرت! اللہ تعالیٰ کے بنادے اسمائے حسنہ میں کون سا اسمِ اعظم ہے جس کے واسطے سے جو دُعا بھی کی جائے وہ شرفِ قبولیت پاتی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ رزقِ حلال کماؤ۔ پھر اللہ کو جس نام سے بھی پُکاروگے، وہی اسمِ اعظم ہوگا۔

پاکستانی یونیورسٹیوں کو اگر کمالِ جامعیت اور بین الاقوامی معیارِ درس و تدریس کے اعتبار سے پرکھا اور ''شارٹ لسٹ'' کیا جائے تو LUMS یقیناً ملک کی دو بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہوگی۔ میرے لیے یہ امر باعثِ صد افتخار و مسرّت ہے کہ جناب سیّد بابر علی نے مجھے اس جلسۂ تقسیم اسناد میں طلبہ و سامعین کرام سے خطاب کا نادر موقع فراہم کیا جس کے لیے میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ مجھے اس کا بخوبی علم اور احساس ہے کہ جامعہ کے پہلے کنووکیشن سے گزشتہ سال تک اس خطبے کی زبان انگریزی رہی ہے۔ لیکن ذاتی طور پر میں غلط انگریزی کو صحیح اردو پر ترجیح دینے کا قائل نہیں۔ لہٰذا میں نے اردو میں گفتگو کرنے کی اجازت چاہی جو مجھے بخوشی مل گئی۔ اگر میں

★ احدی: کام چور۔ انتہائی کاہل۔ وہ شخص جو کوئی بھی کام نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلے اور پانی تک کے لیے ہل کے نہ دے۔

فارسی یا پنجابی میں مخاطِب ہونے کی اجازت چاہتا تو مجھے یقین ہے وہ بھی اتنی ہی خوشدلی سے مل جاتی۔ اس لیے کہ بابر علی صاحب کو یہ فخر اور قابل رشک امتیاز حاصل ہے کہ ایک شاندار اور جید جامعہ کی داغ بیل ڈالنے کے علاوہ انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ادبی شاہکار اپنے مُوقّر اِدارے کی زیرِنگرانی شائع کر کے اہلِ ذوق اور شائقین کو تحفتہً ارسال کرتے رہتے ہیں۔

اِس کرم فرمائی کے مستحقین کی ''میلنگ لسٹ'' کا شمار' نظرِبد سے بچانے کے لیے، classified documents میں ہوتا ہے!

انتہائی پُر خلوص اظہارِ ممنونیت کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ عزیزانِ جامعہ سے اردو میں گفتگو کرنے کی عذر معذرت قطعاً نہیں کروں گا۔ انگریزی کی بہ نسبت اردو میں بظاہر ایک ہی خرابی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے! قطع نظر اس سے کہ کسی کی مادری زبان کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ گانا، گنتی، گلہ گزاری اور گالی اپنی ہی زبان میں مزہ دیتی ہے! بڑے سے بڑا ہفت زبان بھی نوٹ اپنی مادری زبان ہی میں گنتا ہے! میں بھی ساری عمر اوروں کے، لُوٹ کھسوٹ تک کے نوٹ مادری زبان ہی میں نہ صرف گنتا رہا ہوں بلکہ ماہ بماہ اس کی معقول سے بھی بڑھ کر تنخواہ پاتا رہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی یہ نُسخہ تجویز کر چکا ہوں کہ مایوسی، قنوطیت اور ڈپریشن کے مریضوں کو تازہ اور نئے نوٹوں کی خوشبو نہار منہ سنگھا دی جائے تو طبیعت سنبھل جائے گی۔ یہ خوشبو قلب کو تقویت، آنکھوں کو طراوت اور روح کو طمانیت بخشتی ہے۔ لیکن اس کی تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ نوٹ اپنے ہی ہوں۔ دوسری اور تیسری شرط بھی یہی ہے۔

صرف ایک چیز ایسی ہے جس کا شمار کسی بھی زبان میں رکھنے کو انسان کا جی نہیں چاہتا۔ وہ ہے انسان کے اپنے گناہ اور خطائیں۔ اسی لیے اللہ نے اس کام پر فرشتے تعینات کیے ہیں جو صرف گنتی رکھتے ہیں۔ لذّتِ گناہ سے ازل تا ابد محروم!

مجھے کبھی کسی اچھے اسکول، کالج یا یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو مسرّت، ستایش اور رشک کے مِلے جُلے جذبات کے علاوہ، مجھے اپنے سِنِ پیدائش پر بے اختیار غصہ آتا ہے۔ کاش یہ وہی ہوتا جو اوسطاً عزیزانِ جامعہ کا ہے تو آج اور اِس وقت میں بھی آپ کی خُرسند و بشاش صفوں میں شانہ بشانہ کھڑا ہوتا اور ایک اعلا اور معتبر درس گاہ سے سندِ فضیلت وصول کر کے کیسا مسرور و مفتخر محسوس کرتا۔ پھر جلسے کے اختتام پر آپ ہی کی طرح اپناہُڈ ہوا میں اتنا اونچا اُچھالتا کہ آن کے کسی اپنے ہی ہم عمر اونگھتے مہمان کے برہنہ سر پر لینڈ کرتا!

دیکھیے، آپ کو مبارکباد دینے چلا تھا اور ہوائے تصوّر میں اپنی ہی کلاہِ افتخار اُچھالنے لگا! میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

ماشاء اللہ، آج جن طلبہ و طالبات کو فارغ التحصیل ہونے کی سند دی جارہی ہے وہ بلاشبہ
شقت سیمسٹرز (semesters)، سخت امتحانوں اور سخت تر ڈسپلن سے کامیاب گزرے ہیں۔
کی بات پوچھیے تو زمانۂ طالب علمی میں دو کانٹے ایسے تھے جن کی چبھن آج بھی محسوس ہوتی ہے۔
، بزرگوں کی من نہ کردم، شُما حذر بکنید (''میں نے نہیں کیا، تم پرہیز کرو۔ خود تکلیف اٹھا کر
روں کو نصیحت کرنا۔'') قبیل کی نصیحتیں جن سے ہماری ناطقہ و ناکہ بندی کردی گئی تھی۔ دوم،
ن، ان دونوں نے حیران و پریشان رکھا۔

بزرگوں کی نصیحتوں پر تنقید کرنے یا برسرِ عام ان کا مذاق اڑانے کی گستاخانہ حرکت سے خود کو
سے باز رکھوں گا۔ اس لیے کہ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے کہتے ہیں کہ اب میں بالکل ویسی
یحتیں کرنے لگا ہوں! خود مجھے بھی احساس ہو چلا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، نصیحت میں
ت کا رنگ اور رقّت جھلکنے اور چھلکنے لگی ہے۔ کسی نے کیسا ظالم شعر کہا ہے:

یہ تردّد، یہ فکرِ اہل و عیال
تم تو پروردگار بن بیٹھے!

رہا دوسرا جمبو کانٹا، یعنی امتحان، امتحان کی تیاریاں اور امتحان کی دہشت اور نتیجے کا 'ٹینشن'......
یسا لگتا تھا کہ یہ بلائیں کبھی باغِ جوانی میں بہار نہیں آنے دیں گی۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ اگر
ن نہ ہوتے تو ہماری زندگی جنّت کا نمونہ ہوتی۔ اب حیرت ہوتی ہے کہ ہماری (-7) نظر اُن
ڑوں اَن پڑھ لوگوں کی طرف کیوں نہ گئی جو کبھی کسی امتحان میں نہیں بیٹھے۔ اور اسی وجہ سے ان
ہوں کی زندگی دوزخ کا نمونہ بن گئی۔ ہم اپنے پروفیسروں سے حسد کرنے لگے تھے۔ محض اس بنا
انہیں کسی امتحان میں بیٹھنا نہیں پڑتا! یہ اور بات کہ وہ ہمارے رول ماڈل بھی تھے۔ اب ہم اپنی
تفکّر و تساہل کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دراصل ہم امتحان میں بیٹھے
بی۔اے کی ڈگری (فرسٹ کلاس فرسٹ) حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور خود پڑھنے سے پہلے
مانے کے شدّت سے خواہش مند تھے!

ہماری حالت اُس چیلے جیسی تھی جو علم کی تلاش میں ایک پہنچے ہوئے گرو جی کے پاس ناریل،
، سینڈور اور گرو دکشنا (نذرانہ) لے کر گیا۔ ڈنڈوت کے بعد ہاتھ جوڑ کے عرض کی کہ مجھے اپنا
بنا لیجیے۔

گرو جی نے کہا ''بچہ، چیلا بننا تو بڑا کٹھن کام ہے۔''

اس پر اُس نے کہا ''تو پھر مجھے گرو ہی بنا لیجیے!''

ایک قدیم ضرب المثل ہے کہ گرو جو کہ تھا وہ تو گُڑ ہو گیا، ولے اُس کا چیلا شکر ہو گیا۔ مطلب

یہ کہ شاگرد اپنے اُستاد سے بہت آگے نکل گیا۔

عزیزانِ گرامی قدر، آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایسے گرو نہیں ملے۔ اور گرو آپ سے بھی زیادہ خوش قسمت نکلے کہ اُن کا پالا ایسے ہکّٹ شاگردوں سے نہیں پڑا۔ آپ جس ڈسپلن سے بتدریج، بمراحل اور باقاعدہ گزرے ہیں وہ یقیناً اس امر کی ضمانت ہے کہ آپ تجارت وصنعت اور معیشت کے جس شعبے سے بھی وابستہ ہوں گے، اُس کے انتظامی تقاضوں اور نت نئے چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پیشہ ورانہ صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں۔ یادش بے خیر! ہمارے زمانے میں management اگر کوئی علم تھا بھی تو اُس کی حیثیت سِفلی علم سے زیادہ نہ تھی جو سینہ بہ سینہ، ڈانٹ ڈپٹ کی آمیزش کے ساتھ، منتقل ہوتا رہتا تھا۔ کھٹارا گاڑی جس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے تھے اب ذاتی ذہانت، جودتِ طبع اور جدّت طرازی کی بجائے بُزرگوں کی دعاؤں، دوسروں کے گاڑھے پسینے اور اپنے عرقِ انفعال کے زور پر چُرخ چُوں کرتی چل رہی تھی۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب ہسٹیریا کی مریضہ کا علاج مرچوں کی دُھونی اور جوتوں سے کیا جاتا تھا۔ کمنگر اور اکھاڑے میں پچھڑے اور عمر سے اُترے پہلوان سُوسمار، سانڈے، گوہ، نیولے وغیرہ کی چربی کے تیل کی مالش سے ہڈی جوڑتے تھے اور اگلے وقتوں کی ہڈی جڑ بھی جاتی تھی! بینکنگ جیسے اختصاصی پیشے میں ٹرننگ کا کوئی باضابطہ انتظام یا تصور تک نہ تھا۔ جس بینک میں میں نے ابتدائی پندرہ برس گزارے وہاں ایک زمانے میں سوائے چیف اکاؤنٹنٹ کے کسی کو بینک کے Manual of Instructions کی جلد دوم، جو سیکیورٹی کی غرض سے لندن میں چھپوائی گئی تھی، پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اگر نالائق افسران اور گھاگ کلرک بینک کے تمام procedures سے واقف ہو گئے تو قوی امکان ہے کہ غبن کر بیٹھیں گے! میں نے اس مینول کا حصّہ دوم مقررہ عہدے اور استحقاق سے بہت پہلے پڑھ ڈالا۔ وہ اس طرح کہ مینول کی الماری کی چابی مجھے مقررہ عہدے اور استحقاق سے بہت پہلی تھما دی گئی تھی۔ نتیجتہً اس چوری شُدہ علم کی بدولت مُعیّنہ مدّت سے بہت پہلے مقررہ عہدے پر، اپنے سے سینیئر افسران کو supersede کر کے فائز کر دیا گیا۔ چارج لینے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جلد دوم کے مطالعے کو اپنے سے سینیئر افسران کے لیے لازمی قرار دے دیا۔ اس اقدام کو انھوں نے ذہنی ایذا رسانی، مردم آزاری اور سابق جونیر کی گھٹیا انتقامی کارروائی پر محمول کیا۔ منہ سے تو کسی نے کچھ نہ کہا، لیکن پڑھ کے نہیں دیا۔ البتہ شیخ غلام کبریا نے جو ''اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل'' کی کشمیری بریانی کی منہ تک آئی ڈکار اور مقراض اللعبت فقرے کو روکنے کے قائل نہیں تھے اور ہمیں Sir ایسے چڑاؤنے لہجے میں کہنے لگے تھے جیسے four letter گالی دے رہے ہوں، فرمایا کہ ''یارا جی'' اب اسے پڑھنے سے فیدہ؟'' مطلب یہ کہ جب تم ہمیں supersede

کے چیف اکاؤنٹنٹ بن ہی گئے تو اب ہم اسے پڑھ کے کیا تمہارے آگے بین بجائیں گے؟

چیف اکاؤنٹنٹ کے علاوہ مجھے کمپنی سکریٹری اور چیف انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر بھی
ٖ دے دی گئی۔ آخر الذکر عہدے پر ترقی اس لیے بھی لائق تحسین و آفریں تھی کہ اُس وقت بینک
سرے سے کوئی انسپکٹر تھا ہی نہیں جسے میں اپنا ماتحت کہہ سکوں یا جو مجھے واقعی اپنا چیف گردانے!
عرصے تک میں خود ہی اپنا باسِ بالادست اور خود ہی اپنا تابعدار ماتحت، خود ہی حکم نامے پہ دستخط
نے والا اور خود ہی بے چون و چرا تعمیل کنندہ بنا رہا۔

اس سہ گونہ ترقیٔ درجات سے میری تنخواہ میں تو ایک پائی کا اضافہ نہیں ہوا، لیکن بینک کو مبلغ
روپے دو آنے کا نقصان ہوا۔ اس سے زیادہ کا خسارہ اس لیے نہیں ہوا کہ چھ چھ آنے والے
ربر اسٹیمپوں کی کُل قیمت یہی بنتی تھی۔ انگریز جنرل منیجر اینڈرسن نے تاکیداً کہا تھا کہ مذکورہ بالا
ت ناموں کی کاپیوں کو ہمہ وقت lock and key میں رکھو کیوں کہ دوسرے انہیں غلط استعمال
کے تمہیں جیل بھجوا سکتے ہیں اور بلا اجازت و اطلاعِ نقلِ مکانی و غیر حاضری کی بنا پر تم ڈِسمس کیے
لتے ہو! ویسے بھی convict کو چیف اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر دوبارہ نہیں دھانسا جا سکتا!

ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مجھ سے ' بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ ' ٹوٹل یعنی حاصل جمع میں ۳ پائی کی
ٖ ہو گئی جو اُس نے پکڑ لی۔

اُس کا چپراسی لطیف ترکی ٹوپی کا پھُندنا زور زور سے جُھلاتا ہوا آیا۔ ''صاب سلام بولتا ہے۔
والا!'' اُس نے آنکھ مار کے خبردار کیا۔

اینڈرسن اس حد تک الکحالک تھا کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے بائیں جیب میں وہسکی کی شیشی رکھ
بینک آتا تھا۔ بائیں جیب میں اس لیے رکھتا تھا کہ دائیں ہاتھ میں سخت رعشہ تھا۔ لیکن اس ہاتھ
دستخط کرنے میں اسے کوئی دِقت نہیں ہوتی تھی۔ رعشے کی وجہ سے اس کے دستخط اتنے جِناتی اور
ل نقل و جعلسازی ہو گئے تھے کہ کوئی نارمل یعنی بغیر رعشے والا ہاتھ انہیں forge کر ہی نہیں سکتا
مختصر یہ کہ وہ دائیں ہاتھ سے اہم سرکاری کاغذات اور چیک پر دستخط تو کر سکتا تھا لیکن شراب بغیر
ئے، ڈُھلکائے نہیں پی سکتا تھا! تعجب کی بات یہ کہ کتنا ہی نشے میں ہو، غلطی فوراً پکڑ لیتا تھا۔ بلکہ
کہنا چاہیے کہ غلطی پکڑنے کے لیے ہما شُما کی طرح آنکھوں کا محتاج نہ تھا، فوراً سونگھ لیتا تھا!

میں کمرے میں داخل ہوا تو تین پائی کی غلطی پکڑنے میں اپنی کامیابی پر مجھے ایسی داد طلب
ل سے دیکھا کہ اپنی اوقات سے نفرت ہو گئی۔ ارشاد ہوا، ذاتی طور پر میں تمہاری غلطیوں اور
ے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن تم بینک کے چیف انسپکٹر آف برانچز ہو۔ کم از کم اِس

وقت تک تو ہو۔ میں چاہوں گا کہ تم چیف اکاؤنٹنٹ کے کام کا سختی سے thorough انسپکشن کرو!

اس واقعے کا ذکر میں ازراہِ مشیخت یا مذاقاً نہیں کر رہا، بلکہ آج سند پانے والے لائق و خُرسند و خِردمند طلبہ و طالبات کو دُہری مبارکباد دینا مقصود ہے کہ آپ کو پیشے کے رموز و اسرار سے واقف ہونے کے لیے نہ تو میری طرح چوری چھپے معلومات حاصل کرنا پڑیں، نہ ان مرحلوں سے گزرنا پڑا جو اُس نسل کے بینکرز کے مقسوم میں لکھے تھے۔

ہاں، یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس الکا حالک انگریز بینکر نے یہ بھی کہا کہ ۳ پائی کی غلطی ۳ ملین کی غلطی سے زیادہ ذلیل ہوتی ہے! اس لیے کہ اس سے غلطی پن کے علاوہ غلطی کرنے والے کی کم ہمتی بھی ظاہر ہوتی ہے!

میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ غلطی کرنے سے پہلے اس نُکتے اور فرق کو ملحوظ رکھوں گا!

میں نے زندگی میں پند و موعظت سے لبریز بس ایک ہی کانووکیشن ایڈرس گوشِ نصیحت نیوش سے سنا ہے، جو کسی بھی سادہ دل اور معصوم طالب علم کو تادمِ حیات خوش فہمی اور مغالطے میں رکھنے کے لیے کافی تھا۔ وجہ یہ کہ اُس خطبہِ معلیٰ میں دانشِ سقراط سے زیادہ بیچاک بُقراط کا غُلغلہ تھا۔ اس کے بعد میں نے عہد کیا کہ اکیڈیمک گاؤن پہن کر دوبارہ ایسا خطبہ ہرگز نہیں سنوں گا۔ صاحبو، سچ تو یہ ہے کہ ایسا عالمانہ اور جبر جنگ گاؤن پہن کر میں جاہلانہ بات کر تو سکتا ہوں۔ سُن نہیں سکتا۔ کیا خبر تھی کہ ایک دن یعنی آج آپ کو اس آزمائش میں مبتلا کرنا میرے خوشگوار فرضِ منصبی میں شامل ہوگا۔ لیکن معاف کیجیے، دل کی بات غلط وقت پر زبان پر آئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ خطبہ لکھتے ہوئے مجھے ایک طرح کی انتقامی مسرت محسوس ہو رہی ہے!

ے وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چُکا دیا

حاشا وکلّا، مجھے اپنی ذات سے ایسی کینہ پروری کی توقع نہیں تھی!

صدی بہ صدی، نسل در نسل اور سال بہ سال بدلتے ہوئے زمینی حقائق، بیوپار اور بیوہار کے نئے طور طریق، فکر و نظر کے تغیّر پذیر زاویے، پیداوری تکنیک اور توسیع و ترقی کے جدید ضابطے......

یہ سب عوامل اس کے متقاضی ہیں کہ اپنی دانست میں ہم علم و فضل اور ٹیکنالوجی کے بلند ترین درجے پر پہنچ جائیں، ہمارے پانچ یا پچاس سالہ منصوبے اور قومی عزائم خواہ عرشِ معلیٰ کی رفعتوں کو چھونے لگیں، لیکن ہمارے پاؤں اپنی گُل زمین، اپنی سوہنی دھرتی پر مضبوطی سے جمے رہنے چاہئیں۔ یونانی mythology (دیومالا) میں ایک دیو Antaeus کا ذکر ملتا ہے جو اپنی ساری طاقت و توانائی زمین سے حاصل کرتا تھا۔ اُسے کُشتی اور دُوبدُو میں کوئی پچھاڑ یا ہرا نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ اُس کے پاؤں

ہمہ وقت زمین سے جُڑے رہتے تھے۔ اس اَجیت دیو کو یونانیوں کے عظیم ترین ہیرو ہرکولیز (Hercules) نے بالآخر اس طرح زیر، ذلیل اور ہلاک کیا کہ کولی میں بھر کے زمین سے اَدھر اٹھا لیا۔ زمین سے پیروں کا تعلق منقطع ہوتے ہی اُس کی ساری طاقت، کس بل اور شہ زوری دم بھر میں ختم ہوگئی۔ موت نہ سہی، مگر اس سے بھی بدتر انجام یعنی پُر مذلّت زوال اُن لوگوں اور قوموں پر آتا ہے جو زمین، اہلِ زمین اور زمینی حقیقتوں سے اپنا رشتہ ناتا توڑ لیتے ہیں۔

ہماری Corporate Bottom Line کتنی ہی منافع بخش، منافع خیز، منافع ریز، منافع بیز ہو اور اَن رَنگت ہندسوں بھری کیوں نہ ہو، ہم اس چیختی، کراہتی زمینی حقیقت سے کیسے نظر چُرا سکتے ہیں کہ وطنِ عزیز میں تین کروڑ سے زیادہ افراد یعنی ہر پانچواں آدمی خطِ افلاس سے نیچے گویا آدمی ڈُباؤ گہرائی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی ماہانہ آمدنی ۶۷۰ روپے یعنی ۲۲ روپے یومیہ ہے! ۲۲ روپے میں دونوں وقتوں کے لیے ۵ روٹیاں آئیں گی۔ چٹنی کے لیے پیسے نہیں بچیں گے۔

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

ہمارے معاشرے میں میری طرح خالی خُولی سوچ بچار کرنے والوں، ادیبوں، لکھاریوں، مزاح نگاروں اور فقرہ تراشوں کا کیا مقام ہے، اس کا تازہ ترین تجربہ مجھے ہوسٹن (امریکا) میں ہوا جہاں میرے اعزاز میں ایک پاکستانی انجمن نے پُرتکلّف و پُرتکلّم تقریب پزیرائی کا اہتمام کیا تھا، جس میں شرکت کا ٹکٹ ۲۰ ڈالر کا تھا۔ اخراجات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو انجمن کے منتظمین ایک بڑے پاکستانی بزنس مین کی خدمت میں، وفد کی صورت، اس درخواست کے ساتھ حاضر ہوئے کہ آپ یوسفی صاحب کی تقریب کو اِسپانسر کردیجیے۔ موصوف نے پوچھا، یہ صاحب کیا کرتے ہیں؟

جواب ملا ''کچھ نہیں کرتے، لکھتے ہیں۔''

''کیا لکھتے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''یہی ہنسی دِلگی کی باتیں۔''

''تو کیا معین اختر سے بھی بہتر ہیں؟'' اُس نے سوال کیا۔

اس بزنس مین نے نہ صرف یہ کہ اسپانسر نہیں کیا، بلکہ ۲۰ ڈالر کا ٹکٹ تک نہیں خریدا! لیکن ہمیں اس سے بے حد و حساب فائدہ ہوا۔ یہ سبق سیکھا کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

آج کل جس تیزی سے بعض مینجمنٹ اِنسٹی ٹیوٹز اپنی conveyor سے نیم پُخت اور اَن گھڑ

MBAs نکال رہے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد جَلبِ مُنفعت کے علاوہ تعداد بڑھانا بھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ کوالٹی اور ریسرچ ان کے نصاب میں شامل نہیں، بلکہ نیّت اور نظریہ تعلیم میں بھی فتور نظر آتا ہے۔ بُری بھلی تھیوری تو جیسے تیسے طوطے ★[1] کی طرح رٹا اور معجونِ فلک سیر ★[2] کی طرح چٹا کے ڈگری ہاتھ میں تھما دیتے ہیں، لیکن طلبہ نے جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ پڑھا ہے، اُس کو مارکٹ سِناریو (منظر نامے) اور منڈی کے گُذھب میکنزم سے دور کی بھی نسبت نہیں ہوتی جہاں تک کیریر کا تعلق ہے تو نشاط خاطر رہے کہ طوطے کی طرح رٹ کر پاس ہونے والے طلبہ نرے ٹیچر ہی بن سکتے ہیں۔ پھر اپنے ہی جیسے طوطوں کو ''رٹا'' لگوا کر اپنے ہی جیسا ٹیچر بنا سکتے ہیں۔ ایسے طلبہ کو مارکیٹ کے کھردرے حقائق، مسائل، میلانات اور پیچ و خَم کا ذرا علم اور اندازہ نہیں ہوتا۔ ان غریبوں کی حالت اُس باز کی سی ہوجاتی ہے جسے ایک شیخ نے گھر کی چار دیواری میں پالتو کبوتروں پر جھپٹنا' جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر پکڑنا کئی فاقوں کے بعد سکھایا تھا۔ جب باز کی ٹریننگ مکمل ہوگئی تو شیخ اُسے بڑے فخر اور پیار سے ہاتھ پر بٹھا کر صحرا لے گیا۔ اور بُشکار کے تِلوروں پر چھوڑا۔ مگر باز سیدھا گھر گیا۔ وہاں ایک پالتو کبوتر پر جھپٹا۔ اُسے خون آلود چونچ میں دبائے لوٹا اور شیخ کو پیش کر دیا!

تو صاحبو، فقط تھیوری اور کتابیں رٹنے والے آگے چل کر کاغذی کبوتر ہی پکڑ سکتے اور مینجمنٹ ''جارگن'' کے طوطا مینا اُڑا کر تماشائیوں سے تالیاں بجوا سکتے ہیں۔

حکایت کا اطلاق ان جانبازوں اور جنگجوؤں پر بھی ہوتا ہے جو دشمن کی سرکوبی کے لیے سر پہ کفن باندھ کے نکلتے ہیں اور آدھے رستے سے پلٹ کر اپنوں پر ہی پل پڑتے ہیں!

★[1] طوطا: میرے علم میں ہے کہ صحیح املا تو تا بتلایا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کہیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، طوطے کو ط سے لکھتا ہوں تو اُس کی لالوں لال چونچ کا خم تک صاف نظر آنے لگتا ہے۔ ت سے لکھوں تو صرف ہرا رنگ ہی نہیں، خود طوطے بھی احتجاجاً پھر امار کے اڑ جاتے ہیں۔ نا بابا، نا بابا! فقیر پُر تقصیر تو انشاء اللہ تا دم تحریر ''تمت بالخیر'' اپنے ہرے ہریالے طوطوں کو ط سے ہی لکھتا رہے گا۔ ہمارے بعد جو لیکھک، لکھاڑی آئیں وہ شوق سے اپنے بدرنگ تُوتیاں طوطے اُڑائیں اور بچے دانوں اور لغت نویسوں سے داد کے ڈونگرے برسواتے رہیں۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ طوائف کو اگر ت سے توائف لکھا جائے تو نہ تو اُس کی پشواز نظر آئے گی، نہ ٹُھمکا۔ گھنگھروں کی چھما چھم بھی سنائی نہیں دے گی۔ پھر وہ دشمن جان و مال و ایمان طوائف دکھلائی نہیں دے گی بلکہ گیلی اور سُلگتی لکڑیوں سے چولھا پھونکتی جھونکتی، بالوں میں اُنہی کے دھویں اور لہسن کے بھگار کی دُھونی لگائے، آٹے میں سَنے ہاتھوں کو نچا نچا کر بدذات پڑوسن سے لڑتی ایک عام سی پاکباز گھر گرہست نظر آنے لگے گی! تماشبینوں کو اگر کوٹھے پر بھی گھر کا ہو بہو نقشہ نظر آئے تو وہ آفت کے مارے گز گز بھر اونچی سیڑھی پہ سیڑھی پھلانگتے اور ہانپتے کانپتے اوپر کاہے کو قدم رنجہ و رنجیدہ فرمائیں گے؟

★[2] معجون فلک سیر: بھنگ کی معجون جو ترنگ میں آسمان کی سیر کراتی ہے۔

گلۂ جفائے وفا نُما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بُت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری!!

LUMS کو یہ اختصاص اور اولیّت کا اعزاز حاصل ہے کہ اس کے اپنے Case Development Centre نے اب تک ۳۳۲ کیس اسٹڈیز مکمل کرلی ہیں۔ باقاعدہ ریسرچ، تجزیے اور نقد ونظر پر مبنی Case Method اب MBA پروگرام کا حصہ ہے، جس میں خانہ زاد باز کی پرواز و شکار اور clay pigeon پر نشانہ بازی کی گنجائش نہیں۔ اس سے نہ صرف ملکی تجارت وصنعت کی توسیع وترقی میں مدد ملے گی بلکہ اُن کی منصوبہ بندی اور بہتر انتظام وانصرام میں ایک حقائق آشنا وژن کی کارفرمائی بھی نظر آئے گی۔ جو ڈگری آج آپ کو مل رہی ہے وہ فقط قرطاسِ فضیلت ہی نہیں، سندِ افضلیت بھی ہے۔

یہ ڈگری ''کھل جا سم سم'' والا منتر تو نہیں سکھاتی جس سے خزینوں اور دفینوں کے دَر وا ہوتے چلے جائیں، نہ یہ جادوئی کلید ہے جس سے ہر قُفل کُھل جائے۔ یہ تو تیشۂ وبازوئے فرہاد بھی ہے اور دستِ دہقاں میں آلۂ کشاورزی وکشائش روزگار بھی ہے جس سے پہاڑ کٹ جاتے ہیں اور سنگلاخ زمین سونا اُگلنے لگتی ہے۔

مذکورہ بالا دو واقعات میں نے ازراہِ تفنن گوش گزار نہیں کیے۔ نہ ان سے اپنی مبینہ بے توقیری کی تشریح وتشہیر کرکے ہمدردی حاصل کرنا مقصود ہے۔ دِکھلانا صرف یہ تھا کہ بزنس اور انڈسٹری کا مزاج، زبان اور تقاضے ادبی محفلوں اور کلاس رُوم کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ سماجی، سیاسی یا کاروباری ماحول پر محض لاحول پڑھتے رہنے سے ماحول کا تو بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ویسا کا ویسا ہی رہتا ہے۔ البتہ لاحول پڑھنے والے کی قلبِ ماہیت ہوجاتی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ خود cynic ★ہوجاتا ہے! مکتبوں، مدرسوں، دانش گاہوں اور جامعات سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہلا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ کاروبارِ دنیا ہمیشہ ٹیکسٹ بُک کے مطابق نہیں چلتا۔ کسی دانا نے کیسی پتے کی بات کہی ہے:

> "Education is what survives when what has been learnt has been forgotten."

جس طرح ہومیوپیتھک دوا کو جتنا زیادہ dilute یعنی پَنھیایا جائے، اُتنی ہی اُس کی potency یعنی تاثیر، خاصیت اور زود اثری تیز تر ہوتی جاتی ہے، اسی طرح کتابی علم جب تک تجربے کی کُٹھالی میں گل، پگھل اور ڈھل ڈھلا کر حقائقِ حاضرہ کے ساتھ یک رنگ وہم رنگ و یک دگر نہ ہوجائے، وہ صحیح معنوں میں نافع یعنی کارآمد، کارگشا و کارآفریں نہیں ہوسکتا۔ جب دونوں مدغم

★ cynic: اخلاقی اقدار اور نیکی میں شک کرنے والا۔ کلبیت زدہ۔

ہو جائیں تو انسان ''نشۂ علم میں سرمستِ غرور پڑا نہیں ہوتا'' بلکہ علم اُس کے وجود کے رگ و پے میں بھینی بھینی خوشبو کی مانند رَچ بس جاتا ہے۔

؎ باسی ہار میں جیسے خوشبو پھول پہننے والے کی

یوں کہنے کو تو طالب علم امتحان دینے اور ڈگری پانے کے بعد فارغ التحصیل کہلاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل امتحانات کا لامتناہی سلسلہ تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ زندگی ہر مرحلے، ہر موڑ اور ہر قدم پر تازہ کاری، محبت، جفاکشی اور استقامت کا مطالبہ کرتی ہے محنت کا اب تک ایک ہی شارٹ کٹ دریافت ہوا ہے: اور زیادہ اور زیادہ محنت! کامیاب وفائز الحرام آدمی کی زندگی میں کبھی دم لینے کی فرصت یا وقفہ آرام وتعطل نہیں آتا اور نہ آنا چاہیے جہدِ مسلسل پر عمل پیرا انسان کبھی بھی نگارِ ہستی سے یہ کہنے کا تصور نہیں کر سکتا۔

دست بدعا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی محنت وریاضت کو بارآور اور باعثِ خیر و برکت کرے۔

نیرنگِ فرہنگ

(۱)

جناب صدر، خواتین و حضرات،

میں اکادمی ادبیات پاکستان کا شکر گزار ہوں کہ مجھے ''شان الحق حقّی قومی ادبی سیمینار★[۱]'' میں اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا۔ میں نے ۱۷ جون ۲۰۰۳ء کو اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی کے زیرِ اہتمام اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری مرتبہ شان الحق حقّی کی تقریبِ تعارف و تبریک میں ایک طویل مضمون ان کی موجودگی میں پڑھا تھا۔ آج ان کی یاد میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں، ضروری حک و اضافے کے ساتھ اس ہدیۂ تبریک کو بطور تبرک پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ تاہم نشان خاطر رہیں کہ جہاں مضمون کی طوالت آپ کے حسنِ سماعت پر گراں گزرتی نظر آئے گی، وہیں فی البدیہہ قطع و برید سے اس طور کام لوں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

تو وہ مضمون کچھ اِس طرح شروع ہوتا ہے:

مسز امینہ سیّد، مینیجنگ ڈائرکٹر اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے تین دن کے مختصر نوٹس پر یاد فرما کر میری توقیر و منزلت بڑھائی اور مشق زُود نویسی کا موقع فراہم کیا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ فی البدیہہ، فرمائشی اور قلم برداشتہ تحریر میں ان تمام خطرات اور خرابیوں کا احتمال رہتا ہے جو اکثر فی البدیہہ اور ارتجالاً تقریر کرنے میں در آتی ہیں، مگر رسمی تالیوں کے شور میں دب جاتی ہیں۔ ایسی فی البدیہہ تحریر سے نفسِ مضمون کے بجائے فی الفوریت ٹپکتی بلکہ مُوسلا دھار برستی ہے۔ میرا اشارہ پُرجوش طُولِ کلامی، خطیبانہ اور بے ربطی، مجذوبانہ کے خطرے کی طرف ہے، جس کی پیشگی معذرت لازم ہے۔

مرزا عبدالودود بیگ نے میری ژولیدہ بیانی کا سلیس اردو میں یہ ترجمہ کیا: ''منہ زبانی'' تقریر

★[۱] اس مضمون کے بیشتر حصے ''شان الحق حقّی قومی ادبی سیمینار'' اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد میں ۲۹ مارچ ۲۰۰۸ کو پڑھے گئے۔

کی تمام خوبیاں اور خرابیاں ''منہ زبانی'' تحریر میں بھی تمام وکمال عود کر آتی ہیں!

حقی صاحب ایک مدت بعد وطن آئے ہیں۔ یہ عُقدہ آج تک نہ کُھلا، اور نہ کبھی پوچھنے کی ہمت ہوئی کہ وہ دفعتاً دیس کیوں سُونا کر گئے۔ یقیناً کوئی معقول وجہ ہوگی۔ کُرید زیادہ اور تشویش سے ذرا کم تجسس لاحق ہے۔ مسلمانوں، بالخصوص پاکستانیوں پر بلادِ مغرب میں عرصۂ زیست تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ آزادیِ فکر و اظہار و عمل اور کشائش کار و روزگار کی جن امیدوں کے ساتھ وہ دیارِ غیر گئے تھے، اب ان کے بر آنے میں رَخنے پڑ رہے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر نے جنگجو راجپوت سرداروں کا ایک جیش دور دراز اور دور از کار مہم پر بھیجا تھا۔ پھر گھر والوں کو ان کی خبر نہ آئی۔ کتنے ہی ساون آئے۔ اور آنسوؤں کی جھڑی لگا کے گزر گئے۔ لیکن جانے والے لوٹ کے نہ آئے۔ اور نہ شاہی خبر رساں اور وقائع نویس کوئی خبر کوئی سندیسا لائے۔ برہ کی ماری ابھاگن ٹھکرانیوں نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضداشت اس دلگداز دوہے کے ساتھ پیش کی:

ے سونا لاون پی گئے، سُونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے، رُوپا ہوگئے کیس

مطلب یہ کہ پیا سونا لینے گئے اور ہمارا دیس سُونا کر گئے۔ ہمیں تو نہ سونا ملا نہ پیا ملے۔ سارے بالوں پہ چاندی بکھر گئی۔

اس بات کو اب پچیس تیس برس ہونے کو آئے۔ ہمارے حقی صاحب نے جانے والے سے انوکھی فرمائش کی تھی:

ے نہ آنا فقط کرکے درشن مُسافر
اُٹھا لاؤ آنکھوں میں ساری نگریا

اس بار وہ خود سات سمندر پار سے ایک گنجینۂ معنی و مطالب کی بے بہا سوغات اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی شکل میں ہمارے لیے لائے ہیں۔ یوں کہنے کو تو اس کی ترتیب و تدوین میں دس برس لگے، لیکن ڈکشنری سے نگاہ اٹھا کر مولف پر نظر کیجیے تو منکشف ہوگا کہ اس کے پیچھے تو ستر برس کا ریاض، تحقیق و تفحّص اور مشق و مُزاولت اس طرح پوشیدہ ہے کہ چُھپائے نہیں چھپتی۔ اجازت دیجیے کہ آپ سب کی جانب سے انہیں ہدیہ تبریک و تشکّر پیش کروں۔

ایسی کتاب پر گفتگو کرنے سے پہلے...... اور بعد میں بھی...... میں صاحبِ کتاب پر گفتگو کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ خود حقی صاحب کے بقول:

ے ساز میں ہے رواں صاحبِ ساز کا لہو

میرے تاثرات اگر بے ربط، اندازِ سخن گسترانہ یا خرامِ خامہ زِگ زیگ نظر آئے تو اسے صاحبِ کتاب سے دفورِ ارادت مندی پر محمول کیجئے۔ بے اختیار غالب یاد آتا ہے مزاح نگار بھی مغل بچّوں کی مانند ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اُس کو اگر غالب کی طرح مار رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو اُس کے گلے کا ہار بن جاتے ہیں جو کہیں زیادہ اذیّت ناک صورت ہے۔ لیکن یہاں رشتے کی نوعیت کچھ اور ہے۔ ہم حقّی صاحب کو مرشدی و آقائی کہتے اور مانتے آئے ہیں۔

اُڑتی سی اک خبر ہے کہ کسی گستاخ نے حقّی صاحب سے پوچھا کہ کینیڈا جا کر آپ نے داڑھی کیا برفانی موسم کی رعایت سے بڑھائی ہے؟ جواب ملا کہ وقت تنگ ہے اور کرنے کے کام بہت ہیں۔ روزانہ شیو کرنے میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ داڑھی مونڈ دوں تب بھی مقبولیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

اب جو ہم نے اپنی ناقابلِ اصلاح پیشہ ورانہ عادت کے مطابق حساب لگایا تو دھک سے رہ گئے! پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص ۱۷ برس کے سِن سے ۸۰ برس کی عمر تک روزانہ دس منٹ شیو پر صرف کرے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ۲۲۹،۹۵۰ منٹ جن کے ۳۰۰۰۰ گھنٹے بنتے ہیں، اس زیاں کاری میں برباد کیے۔ ذہن نشین کرنے کی غرض سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ۱۵۹ دن تک مسلسل، بغیر ایک سیکنڈ کے وقفے کے، شیو کرتے رہے! حقّی صاحب نے کینیڈا میں قیام کے دوران کم از کم ۳۰۰۰۰ منٹ پس انداز کر کے اس ڈکشنری میں ''اِنوسٹ'' کر دیئے۔ اِنوسٹ کے معنی اس ڈکشنری میں سرمایہ منافع کے لیے لگانا ہیں۔ سو سرمایہ حقّی صاحب کا، منافع تمام تر ہمارا۔

سنا ہے اُس گستاخ نے دوسرا سوال بھی داغ دیا۔ پوچھا ''آپ کے سر پر تو ماشا اللہ اب بھی اتنے بال ہیں کہ یوسفی صاحب اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی سرپوشی کے بعد بھی ڈھیر سارے بال بچ رہیں گے جن سے ''جنگ'' اخبار کے ایڈیٹر محمود شام کے لیے ایک گھنگرالا ''وِگ'' بنایا جاسکتا ہے، پھر آپ نے یہ بھٹو صاحب جیسی چھجّے دار ٹوپی پہننی کیوں شروع کر دی؟

خفیف سی مسکراہٹ کے بعد فرمایا ''معاف کیجئے، ٹوپی پہنی نہیں جاتی۔ اوڑھی جاتی ہے۔ شلوار اور شلوکا پہنا جاتا ہے۔ لنگوٹ کسا جاتا ہے۔ لنگوٹی باندھی جاتی ہے۔ تہمد اور ارادہ باندھا جاتا ہے۔ خود اور زِرہ بکتر پہنے جاتے ہیں۔ تاج سر پر رکھا جاتا ہے۔ نوٹ نیفے میں اُڑسا جاتا ہے۔ فوجی وردی اور نئے فیشن کے سوٹ ڈانٹے جاتے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں عید پر زرق برق پوشاکوں میں مُلبّس ہوتی ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ رہی میری ٹوپی تو اسے اوڑھنے میں ایک حکمت ہے۔ نہ اوڑھوں تو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یار لوگ نماز کے وقت میری داڑھی دیکھ کر کہیں مجھی کو اِمامت کے لیے کھڑا نہ کر دیں۔ میری جان اور اُن کے ایمان پر بن جائے گی!

حلقۂ اربابِ غیبتِ دوستاں نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہ دونوں گستاخانہ سوال خود راقم الحروف نے کیے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خدشہ و خوفِ امامت میں حقی صاحب سے بہت پہلے بھی ایک پیش امام مبتلا رہ چکا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دور اقتدار و دبدبہ میں ایک سال ایسا بھی آیا کہ حکومت کی قائم کردہ رُویت ہلال کمیٹی نے اٹھائیسویں روزے کے بعد عید کے چاند کا اعلان کر دیا جسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ صبح جو سرکاری مولوی مارے باندھے نمازِ عید پڑھانے آیا وہ بے حد خوفزدہ تھا۔ وہ پہلی رکعت میں رکوع کے بعد اللہ اکبر کہہ کر نمازیوں کو سجدے میں لے گیا۔ اور جب سب سجدے میں چلے گئے تو انہیں اسی حالتِ عُبودیت میں چھوڑ کر سٹک گیا!

اس روایت کے بعد مجھے دوسری مرتبہ واللہ اعلم بالصواب کہنا پڑ رہا ہے!

(۲)

حقی صاحب سے ہم وقتاً فوقتاً اصلاح لیتے رہے ہیں۔ ان کی اصلاح اب تک صرف تحریر و گفتار تک محدود رہی ہے جو ہمیں تو کردار کی اصلاح سے زیادہ دشوار اور صبر آزما معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہر گناہ، ہر لغزش معاف کر سکتے ہیں، سوائے غلط تلفظ، غلط املا اور غلط روزمرّہ کے۔ جب سے ڈکشنری پر کام شروع کیا ہے اضافت اور punctuation یعنی اوقاف میں comma کی غلطی پر بھی سختی سے گرفت کرنے لگے ہیں۔ جہاں تک دیگر اقسام کی غلطیوں کا تعلق ہے وہ بزرگانہ چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ غلط آدمی اور بر خود غلط خاتون کو کچھ نہیں کہتے لیکن تذکیر و تانیث پر اچھے اچھوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ محض ڈانٹ کھانے کی بنا پر میں اپنا شمار اچھے اچھوں میں نہیں کر سکتا!

مرزا جان جاناں مظہر کے بارے میں محمد حسین آزاد رقم طراز ہیں کہ ''خلافِ وضع اور بے اُسلوب حالت کو دیکھ نہ سکتے تھے، جس چارپائی میں کان ہو، اُس پر بیٹھا نہ جاتا تھا۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ دلّی دروازے کے پاس ایک دن ہوادار میں سوار چلے جاتے تھے۔ راہ میں ایک بنیے کی چارپائی کے کان پر نظر پڑی۔ وہیں ٹھیر گئے اور جب تک اُس کا کان نہ نکلوالیا، آگے نہ بڑھے!''

اس تاریخی واقعے کا حوالہ اس لیے بھی دینا پڑا کہ آقائی و مُرشدی نے کبھی کسی غلطی پر میرے کان تو نہیں کھینچے، لیکن اس کا اقرار و اعتراف واجب ہے کہ ان کے دستِ خاص سے اپنی ادبی اور اُسلوبِ بیان والی چارپائی کے کان نکلوانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ تاہم کسی نک چڑھے نقاد یا پیشہ ور گھٹ بُنے کو اب بھی جہاں تہاں کان یا ٹیڑھ نظر آئے تو اس میں حقی صاحب کی کوتاہی نہیں، بلکہ

چار پائی کی ساختیاتی کج پائیگی اور built-in اُلار کے علاوہ اُس پر لیٹنے والے کی مستقل مزاجی کو دخل ہے۔ اس لیے کہ اب خود اُس کا ڈھانچا چار پائی کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ یعنی چار پائی کے کان کے عین مطابق ٹیڑھا ہو کہ مستقلاً اُرِیواں★ ہو گیا ہے۔ چار پائی میں کان نہ ہو تو وہ نہ سو سکتا ہے اور نہ سوچ سکتا ہے۔ یہ مزاح نگار کا مزاج بھی ہے اور مقدر بھی۔ ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب بارش میں بھیگی اور اکڑی چار پائی کے کان نکالنے کا مروّجہ طریقہ یہ تھا کہ اس پر سارے محلّے کے بارش میں نہائے ننگ دھڑنگ اور ہڑدنگے لونڈے لہاڑیوں کو خوب کُدوایا جاتا تھا۔ لیکن ہم نے ذرا دیر پہلے جس قسم کی ادبی چار پائی کا استعارۃً ذکر کیا اس کے کان بالکل اسی طرح نکالنے کے ورزشی کرتب اب نقاد انجام دیتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھتے ہیں جب تک کہ چار پائی جھلنگا نہ بن جائے۔ اور وہ ٹوٹے بانوں پر کودتے کودتے زمین پر نہ آ رہیں! پھر کھلتا ہے کتنے پانی میں ہیں۔ حقّی صاحب نے کیا خوب کہا ہے:

؎ پاؤں لگنے لگے ہیں مٹّی پر
کم ہوئی پانیوں کی گہرائی

شفیع عقیل کی کتاب ''سیف الملوک'' کی رسمِ اجراء کی تقریب میں جو مضمون میں نے سات برس پہلے ستمبر ۱۹۹۲ء میں حقّی صاحب کی موجودگی میں پڑھا تھا اس میں ایک جگہ عربی لفظ مِن وعَن آتا ہے۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے احتیاطاً ''نوراللغات'' دیکھی۔ اس میں اس لفظ کا تلفظ نہ صرف مَن وعَن نکلا، بلکہ یہ بھی صراحت تھی کہ شعرا نے بہ تشدیدِ نون اوّل کہا ہے، یعنی مَنّ وعَن۔ سند میں تعشّق کا یہ شعر:

؎ اندھا بھی دیکھ لے کہ یہ صورت ہے فوت کی
شکل ان میں مَنّ وعَن نظر آتی ہے موت کی

حالی کا بھی ایک شعر نون پر تشدید کے ساتھ بطور سند نقل کیا گیا تھا۔ اس صراحت و سند سے لیس ہونے کے بعد میں نے جلسے میں بڑے اعتماد اور محققانہ وثوق سے مَن وعَن پڑھا۔ البتہ اس ڈر کے مارے کہ حقّی صاحب ٹھیٹ دلّی کے روڑے ٹھہرے، لکھنوی شعرا کے اتباع میں نون پر تشدید نہیں لگایا۔ مضمون سامعین کو مَن وعَن پسند آیا۔ وہ تالیاں بھی بجیں جن کی گونج اگلے کو خواب میں بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ ایک خوش خُلق بزرگ جن کے کان میں ہیئرنگ ایڈ لگی تھی مجھے مبارک باد

★ اُرِیواں: ''اوپر ایک طرف کے کنارے سے لے کر دوسری طرف کے کنارے تک ٹیڑھا۔ داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے کہ سارا دھڑ بیکار ہو جائے۔ اس کو اردو محاورے میں اُرِیواں کہتے ہیں۔'' اردو (لغت)

دے رہے تھے کہ حقی صاحب تیز تیز قدموں سے روسٹرم تک آئے اور انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی اٹھا کر کہنے لگے کہ آج آپ نے تلفظ کی دو غلطیاں کی ہیں!

ہم نے دو کو غنیمت جانا۔ اس لیے کہ ہم تو ان کے سامنے اتنے ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ہر جملے پر دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں زبان و بیان اور املا و تلفظ کی اتنی غلطیاں نہ کر بیٹھیں کہ تعداد بتانے کے لیے ہاتھ کی انگلیاں کم پڑ جائیں اور نوبت پوروں اور پائے استاد کی انگلیوں تک پہنچ جائے۔

حقی صاحب نے ہر دو شمار کنندہ انگلیوں کو پتلون کی جیب میں واپس رکھنے کے بعد فرمایا کہ ''صحیح تلفظ مِن وعَن ہے۔ مَن وعَن غلط ہے۔'' میں نے اپنی غلطی کی تائید میں ''نور اللغات'' کی سند دُہرا دی۔ وہ متعجب ہوئے۔ پھر خاموش ہو گئے۔ دوسری غلطی کیا تھی، مجھے یاد نہیں۔ اگر اس مضمون کے دوران آپ کو کوئی تلفّظ کی غلطی نظر آئے تو جان جائیے کہ یہ وہی ہے۔

اس کے بعد حقی صاحب چائے پیے اور سموسہ کھائے بغیر اور کسی کو خدا حافظ کہے بغیر، خالی پائپ حسبِ معمول ہونٹوں میں دبائے گھر چلے گئے۔ میں نے بھی سموسے نہیں کھائے۔ بس رسمی تعریف اور اسی نوع کے کلماتِ تحسین سے پیٹ بھرتا رہا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں اور بیگم گھر پہنچے تو دیکھا کہ حقی صاحب کب سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بے چینی سے میرے منتظر ہیں۔ وہ پانچ چھ قدیم و ضخیم لغات گھر سے ڈھو کر لائے تھے جن کا لُغوی و معنوی وزن میرے ہر دو اوزان سے کہیں زیادہ ہوگا! انہوں نے ایک ایک لغت کھول کر مِن وعَن کے میم کے نیچے والا زیر دکھا کر مجھے زیر کیا۔ چوتھے لغت میں زیرِ خود انہیں ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا مجھ سے فوراً magnifying glass (محدّب شیشہ) لانے کو کہا، حالاں کہ مزید قائل و خفیف ہونے کے لیے اب مجھے مزید سند و نظیر کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی غلطی مجھے magnifying glass کے بغیر بھی کچھ زیادہ ہی موٹی نظر آ رہی تھی!

جیسے ہی اِس استادانہ تادیب سے فارغ التلفظ ہوئے تو مجھے ہکا بکا مگر اصلاح شدہ چھوڑ کر جانے لگے۔ اُس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ بیگم کہتی ہی رہیں کہ میں میز پر کھانا لگا رہی ہوں۔ مگر وہ خالی پیٹ خالی پائپ کے سسکی بھرے کش لگاتے ایک عالمانہ و بے نیازانہ شان سے رخصت ہو گئے۔

یہ واقعہ میں نے ازراہِ تفنن بیان نہیں کیا۔ بلکہ یہ دکھانا مقصود تھا کہ حقی صاحب زبان و بیان اور تلفّظ کی صحت کی خاطر کتنے اور کیسے کیسے کشٹ اٹھا سکتے ہیں۔ کاش وہ اپنی صحت پر بھی اتنی ہی توجہ دیتے! وہ perfectionist (اکملیت پسند) ہیں۔ مَن لگن، جتن اور انہماک ان کے ہر کام اور ہر شغل سے آشکارا ہے۔ فن سے دلبستگی ان کے ہاں زُہد و ریاضت کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی بیگم سلمیٰ حقی

اپنے مضمون ''وہ اور اُن کی شاعری'' میں لکھتی ہیں کہ ''جب انہوں نے شوقیہ پینٹنگ شروع کی تو رات رات بھر پینٹ کرتے رہتے۔ لیکن ایک ساتھ چند راتیں اسٹول پر بیٹھ کر جو کاٹیں تو ایک مرتبہ کمر ایسی اکڑی کہ آٹھ دن تک بستر سے نہ ہل سکے۔'' حقی صاحب دُھن کے پکے اور منکسر مزاج شاعر، ادیب اور عالم ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں جید عالموں، نقادوں اور دانشوروں کی کمر نہیں اکڑتی، گردن اکڑتی ہے۔ اور ایسی اکڑتی ہے کہ زمین نظر نہیں آتی۔ سر کبھی تعظیماً جھکتا بھی ہے تو آئینے کے سامنے اپنے ہی حضور!

(۳)

لُغت دیکھنے کی عادت آج کل اگر کلیتاً ترک نہیں ہوئی تو کم سے کم تر اور نامطبوع ضرور ہوتی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ vocabulary یعنی زیرِ استعمال ذخیرۂ الفاظ بڑی تیزی سے سکڑتا جارہا ہے۔ لکھنے والے نے اب خود کو پڑھنے والے کی مُبتدیانہ ادبی سطح کا تابع اور اُس کی انتہائی محدود اور بس کام چلاؤ لفظیات کا پابند کرلیا ہے۔ اس باہمی مجبوری کو سادگی وسلاستِ بیان، فصاحت اور عام فہم کا بھلا سا نام دیا جاتا ہے! قاری کی سہل انگاری اور لفظیاتی کم مائیگی کو اس سے پہلے کسی بھی دَور میں شرطِ نگارش اور معیارِ ابلاغ کا درجہ نہیں دیا گیا۔ اب تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ پھلوں سے لدا درخت خود اپنی شاخِ ثمردار شائقین کے عین منہ تک جھکا دے! لیکن وہ کاہل خود کو بلند کرکے یا ہاتھ بڑھا کر پھل تک پہنچنے کی کوشش ہرگز نہیں کرے گا۔★[۱] مجھے تو یہ اندیشہ ستانے لگا ہے کہ کہیں یہ سلسلۂ سلاست وسادگی، بالآخر تنگنائے اظہار اور عجزِ بیان سے گزر کر، نری body language یعنی اشاروں اور نرت بھاؤ بتانے پر آکے نہ ٹھہرے! عزیزو، جو جیے گا وہ دیکھے گا کہ ادب کی ننگی Muse نہائے گی کیا، نچوڑے گی کیا۔ ہمیں تو یہ دونوں منظر دیکھنے کے لیے جینے کی آرزو بھی نہیں۔

غالبؔ، آزادؔ، سرسید احمد خاں، حالیؔ، شبلیؔ، سرشار، غلام رسول مہر، صلاح الدین احمد اور منٹو کی نثر کا

★[۱] ممتاز شاعر ونقاد پروفیسر ارشاد الحق خلشؔ چاکسوی نے ہم سے یہ بات سنی تو بہت پسند آئی۔ تین چار دن بعد انہوں نے ایک ادبی تقریب کے صدارتی خطبے میں ہمارے فقرے کا ترجمہ اپنی اُسطوخودُوس زبان میں کیا۔ انہیں بعض ژولیدہ بیان اور دقاق عالموں کی طرح ہر وقت اور ہر جملے سے پہلے یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں لوگ ان کی بات سمجھ نہ جائیں! چنانچہ فرمایا کہ فی زمانہ کاہل الوجود لوگ مُتمنّی ہیں کہ فواکہاتِ نورس اور ثمر ہائے پیش وبیش رس سرِ شاخ سے خود بخود ہُوتی پرواز کرکے ان کے لعاب آلود دہن پر مُنتہی ہوں!
''مُنتہی'' ہونے کا یہ تیر بہدف ولقمہ بدہن استعمال انہی کا حصہ ہے! ہم نے سنا تو تین دن تک سر دُھنتے اور عش عش کرتے رہے۔ دیکھیں اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا۔

آج کی تحریروں سے موازنہ کیجیے تو واضح ہوگا کہ بیسیوں نہیں، سیکڑوں جاندار الفاظ کہ ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم تھا، عدم استعمال اور تساہلِ عالمانہ کے سبب متروکات کی لفظ خور کانِ نمک کا حصّہ بن گئے۔ اُن کی جگہ اُن مطالب و مفاہیم، اتنے معنوی ابعاد، تہ داریوں اور رسائیوں، اُن جیسی نزاکتوں اور لطافتوں، ویسے رنگ و نیرنگِ معانی، شکوہ و طنطنے کے حامل نادرہ کار الفاظ نہ آنا تھے، نہ آئے۔ اور آتے بھی کیسے۔ ہر لفظ انوکھا، یکتا، بے مثل و بے عدیل ہوتا ہے۔ دوسری نسل کے DNA سے اس کی کلوننگ نہیں ہوسکتی۔ ہر لفظ ایک عجیب وغریب، ہرا بھرا، سدا بہار جزیرہ ہوتا ہے، جس کی اپنی آب وہوا، اپنے موسم، اپنی شفق اور دھنک، اپنی بجلیاں اور ان کے کڑکے، اپنی نباتات اور تُکل زمیں تلے اپنی معدنیات ہوتی ہیں۔ اس کے اپنے کولمبس، اپنے کوہ ودشت پیما، سیّاح، سیلانی اور کان کن ہوتے ہیں۔ جب بے غوری، غفلت اور فراموش کاری کا بحیرۂ مُردار کسی جزیرے کو نگل جاتا ہے تو نہ کبھی اُس کا جنازہ اٹھتا ہے، نہ کہیں عُرس پر قوّالی یا دھمال ہوتی ہے۔ بحر کی تہ سے اُس جیسا جزیرہ پھر نہیں اُبھرتا۔ جس طرح ہر فردِ بشر بالکل unique یعنی اینق اور بے مثیل و بے مثنیٰ ہوتا ہے، اور اُس کا کوئی مماثل یا نعم البدل ہوا، نہ ہوگا، اسی طرح صحیح معنوں میں لفظ کا کوئی متبادل یا مترادف نہیں ہوتا۔ البتہ لفظوں کی برادری میں بھی عوضی کام کرنے والی نفری، سوانگ بھرنے والے بہروپیے اور نقّال ضرور ہوتے ہیں! دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کُھلا۔ ان کی ہُنرمندی اور بہروپ سے ہم لطف اندوز تو ضرور ہوسکتے ہیں، لیکن فریب کھانا آئینِ سخنوری وسُخن دانی میں حرام ہے۔

ایک زمانے میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد ڈاکٹروں کو بقراطی حلف (Hippocratic Oath) اٹھانا پڑتا تھا جس میں وہ یہ عہد کرتے تھے کہ وہ مریض کے رنگ ونسل وحیثیت سے قطع نظر، اُس کی جان بچانے کے لیے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ میرے خیال میں شاعروں، ادیبوں، لکھاریوں اور قلم کاروں کو بھی ایک باقاعدہ رسمِ حلف برداری میں کراماً کاتبین کو حاضر وناظر جان کر یہ عہد کرنا چاہیے:

''ہم اپنے قلم کی قسم کھا کر عہد کرتے ہیں کہ کسی جاندار، کارآمد، اپنے مفہوم اور اُس کے اظہار پر پوری قدرت رکھنے والے اور گئی رُتوں کی خوشبوؤں میں بسے لفظ کو آنکھوں دیکھتے محض اس جُرم کی پاداش میں مرنے نہیں دیں گے کہ عدم استعمال کے باعث عام آدمی یا سہل انگار قاری اُس سے ناآشنا ہے۔ اور نہ کسی جیتے جیتے، ہنوز کاغذی پیرہن میں سانس لیتے ہوئے لفظ کو قدامت ومتروکات کے دشتِ خموشاں میں زندہ دفن ہونے دیں گے۔ ہم اِس عہد سے پھریں تو ربِّ ذوالجلال لفظ کی تاثیر اور اس کا اعجاز ہم پر حرام کردے۔ ہم عہد کرتے ہیں۔''

اس کا اِطلاق ہر زبان کے قلم کاروں پر ہوتا ہے۔

لفظ کی جانکنی اور موت پر یہ نوحہ کناں تمہید اس لیے باندھنی پڑی کہ ڈکشنری لفظ کو حیات نو بخشنے، زندہ اور زیرِ استعمال رکھنے کی معتبر ضمانت ہے۔ ہر اصطلاح اور ہر لفظ انسان کے علم و آگہی اور احساس کی زمانی سرحد کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ اگر تمہیں کسی غیر آباد، سنسان اور بے چراغ جزیرے میں خراب مزاح لکھنے کی پاداش میں چھوڑ دیا جائے تو تم قرآن مجید کے علاوہ اور کون سی کتاب ساتھ لے جانا پسند کرو گے۔ تو میں ایک لمحہ تامّل کیے بغیر کہوں گا کہ ایک جامع و مستند ڈکشنری جو تمام عمر میری حیرت و محویت، دلبستگی اور سرشاری کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں جب ہم ڈکشنری کھنگالتے ہیں تو اس لفظ سے پہلے اور اس کے بعد بہت سے دلچسپ، رنگا رنگ، کار آمد اور معجز نما الفاظ اور ان کے مشتقات سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ جس نے نئے لفظ سے پہلی نظر میں پیار نہیں کیا، اُس نے ابھی پڑھنا نہیں سیکھا۔ جس نک چڑھے اور تُند جبیں ادیب و شاعر نے نئے پرانے الفاظ سے پیار دُلار کا رشتہ نہیں رکھا، اُس پر شعر و ادب کی میوز اپنے بھید بھاؤ نہیں کھولتی۔ لفظ اس نامحرمِ نکتۂ راز پر اپنی لذتیں تمام نہیں کرتے۔

اکبر الہ آبادی کی عادت تھی کہ سونے سے کچھ دیر پہلے اپنے آپ سے سوال کرتے کہ آج میں نے کون سی نئی بات سیکھی۔ جواب اگر نفی میں ملتا تو ڈکشنری اٹھا کر کوئی نیا لفظ ہجے اور معنی کے ساتھ یاد کر کے سو جاتے۔

سوچتا ہوں کیسی اچھی نیند آتی ہوگی انہیں۔

(۴)

حقی صاحب سدا سے لفظ کے رسیا ہیں۔ لغت نویسی سے ان کا شغف فطری، دیرینہ اور موروثی ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی ضخیم و جامع لغت کی کلیدی تحقیق اور ترتیب و تدوین میں اساسی نوعیت کا جتنا اور جیسا کام انہوں نے کیا ہے اس کا ذکر اور اعتراف کرنے میں نہ جانے کیوں بخل سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ کوئی اتوار، کوئی چھٹی ایسی نہیں گزری جب وہ صبح سے شام تک اردو لغت بورڈ میں تحقیق و تدوین میں منہمک نہ رہے ہوں۔ انہوں نے پورے اٹھارہ برس، بلکہ یوں کہیئے کہ دو جُگ بھر عمر اس لیبر آف لَو (کارِ محبت و مشقت) میں بے مُزد و بے غِل و غِش ★ بتا دی۔ راتیں گزار دی ہیں سہارے لُغات کے!

اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری بلاشبہ مستند ترین اور جدید ترین ڈکشنری ہے۔ مطالب و مفاہیم کی

★ بے غِل و غِش۔ غِل: کینہ۔ کدورت
غِش: کھوٹ۔ ملاوٹ۔

وضاحت آسان اور عام فہم زبان میں کی گئی ہے۔ سند اور مثال کے طور پر نقل کیے گئے جملوں سے لفظ کا مطلب اور محل استعمال آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ گُنجلک اور ادق پیرائے سے جس کے لیے میں نے ''اسطوخودوس'' کی اصطلاح وضع کی ہے، A سے Z تک اِحتراز کیا ہے۔ معاف کیجیے، خود میری اصطلاح اِملا، تلفظ اور معنی کے اعتبار سے بے حد ثقیل اور tongue twister یعنی زبان وقلم توڑ ہے، لہٰذا یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک یونانی دوا کا جِناتی نام ہے جسے حکیم اس کی خاصیت کی وجہ سے دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں! میں اسے انہی معنوں یعنی دماغ پر جھاڑو پھیرنے کے معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ میں کہنے یہ جارہا تھا کہ کہیں بھی علمیت بگھارنے اور مشکل کو مشکل تر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس pitfall سے (جس کا ترجمہ میں گپت گڑھا یا جنگلی ہاتھی پکڑنے والا کھیدا کرنا پسند کروں گا) تو انگریزی زبان کے بابائے لغت نویسی ڈاکٹر سیموئل جانسن بھی اپنے قاری اور خود کو نہ بچاسکے۔ Net (جالی۔ جال) کے معنی کی وضاحت اِس اُسطو خُوڈوس زبان میں کی گئی ہے:

"Net. Anything reticulated or decussated at equal distances, with interstices between the intersections."

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حقی صاحب نے liger کے بالکل صحیح معنی یعنی ''باگھ اور بڑا ایشیائی درندہ، شیر'' بیان کیے ہیں۔ آپ کہیں گے، بندۂ خدا، اس میں خوشی یا تعجب کی کون سی بات ہے؟ ہے، صاحبو، ہے! وہ یوں کہ ہمارے پسندیدہ لُغت نویس حضرت وارث سرہندی، ایم۔ اے نے اپنی تالیف کردہ ''علمی اردو لغت'' میں، جس سے ہم دن میں بیس پچیس دفعہ استفادہ کرتے ہیں، ''شیر'' کے یہ معنی بتائے ہیں: ''شیر۔ ایک گوشت خوار جانور جس کا قد گدھے کے برابر ہوتا ہے!'' (استعجابیہ نشان میرا ہے)

میرا خیال ہے، بلکہ یقین ہے کہ فاضل مولّف نے رواروی میں یہ معنی کسی ایسی لغت سے نقل کر دیے ہیں جس کے مولّف و مرتّب نے شیر تو بہت دور کی بات ہے، گدھا تک نہیں دیکھا!

راقم الحروف نے تادمِ تحریر شیر کے برابر گدھا یا گدھے کے برابر شیر نہیں دیکھا۔ یہ ایک علمی ولُغاتی مسئلہ ہے۔ لہٰذا ایمانداری سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ عاجز نے گدھا تو ہر شکل اور روپ بہروپ میں بہت قریب سے دیکھا ہے، لیکن شیر سے دن تُو دن مُچیٹے کا ہنوز اتفاق نہیں ہوا۔ عین ممکن ہے آنکھ سے آنکھ ملانے کے بعد اگر بچ گئے تو اُس کے قد، جُثے اور غصّے کے بارے میں اپنے قیاس و اندازے میں ''زمینی حقائق'' کے مطابق ترمیم و اضافہ کرکے اعلان کردیں کہ من اندازِ قوت رامی شناسم۔

جس عُزلت گزیں نے کبھی شیر نہیں دیکھا، اُسے اُستاد ذوق نے شیر کو شناخت کرنے کا گُر بتایا ہے:

؎ شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

لیکن ہمیں تو اس میں کئی قباحتیں نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ شیر سے مُڈ بھیڑ کا امکان خشکی پر ہی ہوتا ہے۔ پانی میں خود کو لقمۂ شیر بنوانے کا امکان صرف اس صورت میں ہوگا کہ دونوں ایک ہی سوئمنگ پُول میں سیدھا تیرنے کی پریکٹس کر رہے ہوں۔

دوم، شیر کو تیراکی کے اسٹائل سے پہچاننے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ پہلے اس ظالم کو کچھار سے ہنکال اور کھدیڑ کر کسی ندی نالے پر لایا جائے۔ پھر پانی میں اُترنے پر آمادہ کیا جائے۔ ہم تو اُس کی زبان بھی نہیں جانتے۔ زبانِ یارِ من عُرفش و من عُرفش نمی دانم۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کام تو رستم سے بھی نہ ہوگا۔ البتہ گرمی پہ آئی ہوئی شیرنی اسے ایک ادائے سپردگی سے، آب کیا چیز ہے، گرداب میں کُود پڑنے اور سیدھا تیرنے کا مظاہرہ کرنے پر رضامند کر سکتی ہے۔

سوئم، ہماری فارسی کی استعداد کسی لحاظ سے قابلِ رشک نہیں۔ لہٰذا ''رفتن'' سے ہمیں کچھ ایسا عندیہ ملتا ہے کہ شیر صرف جاتے وقت سیدھا تیرتا ہے۔ اب قابلِ غور یہ پہلو ہے کہ شیر کو آتے وقت تو اُس کا شکار ہونے والے مرحومین نے ایک نظر ضرور دیکھا ہوگا۔ لیکن ہم نے آج تک کسی ایسے ''زندہ'' کو نہیں دیکھا جس نے شیر سے بالمشافہ ملاقات کے بعد اِسے خالی پیٹ جاتے بھی دیکھا ہو۔ شیر ہمیشہ سیر ہو کر جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ یہ ساری بحث فضول یعنی اکیڈیمک ہے۔ تمھیں آسان پہچان بتائے دیتا ہوں۔ جانور اگر تمھیں پھاڑ کھائے تو جان جاؤ کہ وہ شیر ہی ہے، گدھا نہیں۔

'جان جاؤ' کی ایک ہی کہی! اس پر وہ یہ اضافہ بھی فرماتے ہیں کہ ''Zoology سے اس طرح جانکاری بڑھانے اور سائنٹیفک معلومات حاصل کرنے والے لوگ اگلے جنم میں گدھے کی جون اور رُوپ میں ظہور فرماتے ہیں اور آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں کہ اپنے وزن سے بیس گُنا وزن ڈھوتے، تھوڑا سا چارا، چوکر اور دن بھر چابک کھا کر شام کو مالک اور مادہ کے حضور بالترتیب سرِتسلیم و تشکر جھکائے کھڑے ہو جاتے ہیں!''

عجیب اتفاق ہے کہ آج (۱۰ مئی ۲۰۰۸ء) کے جنگ اخبار میں ایک دلچسپ و معنی خیز خبر اِس جلی سُرخی کے ساتھ چھپی ہے!

پاکستان میں دس سال کے دوران گدھوں کی تعداد میں ۲۱ فی صد اضافہ

اس سے مرزا کی بشارت کی تصدیق ہوگئی۔ میں بھی تو کہوں ملک میں بلا کی ''دبڑ گھونس'' کا ہے کو مچی ہے! خبر میں مزید وضاحت کی گئی ہے کہ ۱۹۸۶ میں گدھوں کی تعداد ۲۹ لاکھ ۹۸ ہزار تھی جو ۲۰۰۸ میں بڑھ کر ۴۴ لاکھ ۲۴ ہزار ہوگئی۔ مطلب یہ کہ تیس برس میں ۴۷ فی صد ریکارڈ اضافہ ہوا! بھیڑوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۲ کروڑ ۶۴ لاکھ ہوگئی جب کہ گھوڑوں کی تعداد ۳ لاکھ ۸۸ ہزار سے گھٹ کر ۳ لاکھ ۴۴ ہزار رہ گئی۔

گھوڑوں کی تعداد غالباً اس لیے کم ہوگئی کہ اب ویسے سوار بھی تو نہیں رہے۔ گھوڑا فقط لگام سے قابو میں نہیں آتا وہ سوار کا آسن پہچانتا اور مضبوط پھڑکتی رانوں کے زنبوری دباؤ کی تعمیل پر مجبور ہوتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ گدھوں، گھوڑوں اور بھیڑوں کے مذکورہ و مطعونہ بالا اعداد و شمار کو اگر علامتی و استعاراتی تصور کر کے سیاسی Animal Farm پر منطبق کیا جائے تو اصل صورتِ حال بھیڑوں تک کی سمجھ میں آسانی سے آجائے گی!

شیر کے علاوہ کافی (Coffee) کے معنی بھی صاحب نے اس ڈکشنری میں بالکل صحیح بیان کئے ہیں۔ کوئی گُنجلک اور مُنگھم پن نہیں ہے۔ آپ کہیں گے، لو اور سنو! کافی کے معنوں میں گھپلے کا کیا اِمکان ہے؟ ہے! جناب والا، بالکل ہے! حضرت مہذب لکھنوی نے اپنی جامع و مستند ''مہذب اللغات'' میں کافی کو ایک aphrodisiac بیان کیا ہے! میں نے جان بُوجھ کر اُن کے اردو الفاظ نقل نہیں کیے۔ حقّی صاحب نے aphrodisiac کے معنی ''جنسی خواہش کو اُبھارنے والی دوا'' لکھے ہیں۔ جو خواص ''مہذب اللغات'' میں کافی سے منسوب کئے گئے ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو مولّفِ کو کیمسٹری یا طب کا نوبل پرائز ملنا چاہیے تھا۔

میں کسی دوست یا واقف کار کو کثرت سے کافی پیتے دیکھتا ہوں تو بڑی مشکل سے اُن سے یہ پوچھنے سے خود کو باز رکھ پاتا ہوں کہ آپ نے ''مہذب اللغات'' میں اس مشروب کے معنی دیکھ کر تو کثرت سے پینا شروع نہیں کر دیا؟

خوفِ طوالت اپنی جگہ، لیکن کیا کریں تیسری مثال از خود نوکِ قلم پر آگئی تو بلا تبصرہ نقل کیے دیتے ہیں۔ انگریزی لفظ breast کے معنی حقّی صاحب نے سیدھے سُبھاؤ ''پستان'' بیان کیے ہیں۔ تاہم ہم نے پستان کے بھی معنی معلوم کرنے کے لیے پھر اپنی پسندیدہ و مستند ''علمی اُردو لغت۔ جامع''

کھولی تو صفحہ ۲۶۱ پر یہ گوہرِ نایاب نظر آیا:

''پستان...... چھاتی کے دائیں بائیں دو اُبھار ہوتے ہیں۔ عورتوں کے یہ بہت بڑھ جاتے ہیں۔ ان میں دودھ ہوتا ہے۔''

یہ کہنا کافی نہیں ہوگا کہ فاضل لغت نویس نے بے ستوں سے جُوئے شیر نکال کر کوزۂ لُغت میں بند کردی۔ اُس نے اگر ایک طرف سلاست، ذوقِ سلیم اور تہذیب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو دوسری طرف انسانی بدن سے ناواقف اور بے خبر لوگوں کی معلومات عامہ اور طِفلانہ تجسس میں دلچسپ اضافہ کیا ہے۔

یہ ذکر چل نکلا ہے تو حقّی صاحب کو داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ معانی و مفہوم کی وضاحت میں وہ سلاست کا دامن نہیں چھوڑتے۔ مثلاً sexy کے معنی جنسی کشش رکھنے والا بتاتے ہیں۔ جب کہ نیاز فتح پوری sexy کو تمایلِ جنسی کہتے ہیں جو پہلی نظر میں کسی یونانی جڑی بوٹی یا اس سے شفا پانے والی بیماری کا نام معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب بوندا باندی کو تقاطرِ اَمطار کہا جاتا تو لوگ لغت دیکھنے کے بجائے چھتری نکال لیتے اور پائینچے چڑھا لیتے تھے!

(۵)

ایسا لگتا ہے کہ ناقدری lexicographers (لُغت نویسوں) کا مقدر ہے۔ حقّی صاحب کے والد گرامی مولوی احتشام الدین ناداںؔ نے بھی ایک اہم ڈکشنری کی تالیف و تدوین میں گراں قدر خدمات انجام دیں، جن کا قرار واقعی اعتراف و اعلان نہیں کیا گیا۔ لغت نویسی سے والہانہ شغف اور ناقدریٔ زمانہ، دونوں حقّی صاحب کو ورثے میں ملیں۔ ان سے پہلے، بہت پہلے، یعنی آج سے ٹھیک ۲۵۷ برس قبل ڈاکٹر سیمول جانسن بھی اس جان و آن لیوا مرحلے سے گزرا تھا۔ اُس نے لارڈ چیسٹر فیلڈ کی زیرِ سرپرستی صرف تین سال میں، اور وہ بھی تنہا اور بلا شرکتِ غیرے، ایک جامع انگلش ڈکشنری مرتب کرنے کا معاہدہ کیا اور 10 £ کی مضحکہ خیز پیشگی رقم بھی مربّی مذکور سے بادِلِ ناخواستہ وصول کی! ایک دوست نے جب یہ سنا کہ جانسن نے یہ طولانی اور جانگسل مہم تین سال میں سر کرنے کا بِیڑا اُٹھایا ہے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے جانسن کو یاد دلایا کہ فرنچ اکیڈیمی کے چالیس جید عالم فاضل ممبروں نے پورے چالیس برس کھپا دیئے، جب کہیں جا کے فرنچ ڈکشنری مرتب و مکمّل ہوئی۔ اور آپ یہ کام صرف تین سال میں کرنے چلے ہیں!

جانسن نے بغیر کسی تامّل کے جواب دیا ''جناب والا، تناسب بھی تو یہی ہے۔ آیئے ذرا

حساب لگا کر دیکھتے ہیں۔ چالیس فرنچ عالموں کو چالیس برسوں سے ضرب دیتے ہیں۔ حاصلِ ضرب ۱۶۰۰ ہوا۔ تو جناب والا، جو تناسب ۳ اور ۱۶۰۰ کے درمیان بنتا ہے، بالکل وہی تناسب ایک انگریز اور ایک فرانسیسی میں ہے!''

رہی وہ ناقدری جو لغت نویسوں کا مقدر اور قدرِ مشترک ہے تو اس کا مختصر قصہ یہ کہ معاہدے کے بعد لارڈ چیسٹر فیلڈ انتہائی اہانت آمیز بے رُخی اور رُکھائی سے پیش آیا جس کے نتیجے میں جانسن نے قطع تعلق کر لیا۔ سات سال کی شبانہ روز محنت اور دیدہ ریزی کے بعد ڈکشنری مکمل ہوئی۔ اس اثناء میں اُسے ایک پینی کا بھی محنتانہ یا معاوضہ نہیں ملا۔ اُس نے ڈکشنری میں جس انوکھے طریقے سے دل کے پھپھولے پھوڑے اُس پر تعجب سے زیادہ پیار آتا ہے۔ ذرا Lexicographer اور Patron کے ''لغوی'' معنی ملاحظہ فرمائیے:

"Lexicographer. A writer of dictionaries a harmless drudge." (drudge کے معنی حقی صاحب نے اپنی ڈکشنری میں یہ بیان کیے ہیں: کان دبا کر کام کرنے والا، خصوصاً بھاڑے کا ٹٹو۔) Patron. Commonly a wretch who supports with insolence and is paid with flattery. یہ تو سرپرست کے لُغوی معنوں کی بجائے باہمی رشتے کی لغویت کی وضاحت معلوم ہوتی ہے۔

(wretch کے معنی حقی صاحب نے کمینہ، گھٹیا، ذلیل اور بدھو بتلائے ہیں)

پایانِ کار ڈکشنری شائع ہو گئی تو طرفہ ماجرا ہوا! لارڈ چیسٹر فیلڈ نے اس کی تعریف و توصیف میں رسالہ The World میں اپنے دو مضامین شائع کرائے جنھیں پڑھ کر جانسن اور تپ گیا۔ جواباً اس نے جو خط لارڈ چیسٹر فیلڈ کو لکھا وہ مکتوب نگاری کی تاریخ میں ایک عظیم شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ میں اصل متن نقل کرتا ہوں۔ کیوں کہ قوی امکان ہے کہ میں جانسن کے طنز کے تیور اور طنطنے، مخمل میں لپٹے ڈنک کی کاری کاٹ، شکوے کے عالمانہ شکوہ اور ہز لارڈشپ کی جناب میں مودّبانہ گستاخی کو اپنے ناقص ترجمے میں منتقل نہ کر پاؤں۔

"Seven years, my Lord, have now past, since I waited in your outward rooms, or was repulsed from your door; during which time I have been pushing on my work through difficulties, of which it is useless to complain, and have brought it, at last, to the verge of publication, without one act of assistance, one word of encouragement, or one smile of favour. Such treatment I did not

expect, for I never had a Patron before....

" Is not a Patron, my Lord, one who looks with unconcern on a man struggling for life in the water, and when he has reached ground, encumbers him with help? The notice that you have been pleased to take of my labours, had it been early, had been kind, but it has been delayed till I am indifferent, and cannot enjoy it; till I am solitary, and cannot impart it; till I am known, and do not want it...."

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ پہلا طویل جملہ ۶۴ الفاظ اور ۱۱ commas (،) پر مشتمل ہے، جب کہ تیسرے اور چوتھے جملے میں ۹۷ الفاظ اور ۱۰ کوما ہیں۔ کوما کا استعمال بلاشبہ ماہرانہ وقادرانہ ہی نہیں، قاتلانہ بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خنجر کو کبھی آدھا اور کبھی دستے تک دل میں اتارنے کے بعد جانسن اسے اندر ہی اندر و(واؤ) کی مانند گھما کر نکال لیتا ہے، تاکہ پھر گھونپ سکے۔ ہر بار خنجر ہز لارڈ شپ ہی کی زرّیں آستین سے پونچھ کر یہ عمل ۲۱ دفعہ دہراتا ہے۔

کوشش کے باوجود بے مہریٔ اربابِ ادب کا گلہ اور حکایتِ لُغت نویسی دراز سے دراز تر ہوگئی، جب کہ صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ ناقدر شناسی کی ریت سدا سے چلی آئی ہے۔ وہی ناقدریٔ اربابِ لغت آج بھی ہے!

(۶)

اردو لُغت بورڈ میں ''بے نامی'' کارگزاری کے بعد ''فرہنگ تلفظ'' ان کا نہایت وقیع اور قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ فرہنگ اور اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری کے وہ تنہا مُرتّب، مترجم اور مؤلف ہیں۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود میں ان کے کسی ایسے ہم عصر کا نام نہیں بتا سکتا جو تنِ تنہا یہ کارنامہ اس حُسن وخوبی سے اتنے کم وقت میں ایسی راہبانہ خاموشی اور بے نیازی کے ساتھ سرانجام دے سکتا۔ زیرِ تبصرہ وتوصیف ڈکشنری اور فرہنگ اتنی کم مدت میں اس لیے مکمل ہوگئیں کہ حقی صاحب نے تنہا مرتب کیں۔ اگر یہ کام چالیس الہ دینوں پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کردیا جاتا تو وہ چالیس جادوئی چراغوں کی روشنی میں چالیس برس میں بھی مکمل نہ کرپاتی!

کچھ راہیں، کچھ منزلیں اور ہفت خواں ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں تنِ تنہا، بے کارواں اور بے ہمرہاں طے کیا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا شریکِ سفر ہوجائے تو نہ صرف منزل کھوٹی ہوتی ہے، بلکہ دونوں پتھر کے ہوجاتے ہیں! راہی خود رواں دواں، خود کارواں اور خود سالارِ کارواں ہوتا ہے۔

اُسے منزل کے سِوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اور اپنے قدموں کی چَپ وراست چاپ کے سِوا اور کوئی آواز، کسی کوہِ نِدا کی صدا قطعاً سنائی نہیں دیتی:

شورِ جرس، آوازِ حُدی خواں، بانگِ مُنادی کچھ بھی نہیں!

فرہنگ تلفظ اپنی نوعیت کی واحد، مستند اور اَپ ٹو ڈیٹ لغت ہے۔ (اپ ٹو ڈیٹ کا ترجمہ حقّی صاحب نے تابہ اِمروز کیا ہے) یہ کام جس تبحرِ علمی، انہاک اور دیدہ ریزی کا متقاضی تھا، اس کا اندازہ کچھ وہی خاص الخاص مقربین کرسکتے ہیں جنھوں نے حقّی صاحب کو یہ مُہم تنہا سر کرتے دیکھا ہے۔ ان کے ایک حبیب لبیب ماجد علی صاحب مرحوم بیان کرتے تھے کہ حقّی صاحب ۱۹۹۴ء تک اپنے خاص قلم سے تین لاکھ ایک سو پچھتّر اعراب لگا چکے ہیں۔ اور اس باریک نویسی کے دوران تین تین سو روپے کے تین فولادی نِب جواب دے چکے ہیں! ہمیں اس پر حیرت تو اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم اُن کی جُزئیات پسندی، احتیاط، حزم بالجزم اور باریک بینی سے بخوبی واقف ہیں۔ البتہ رشک ضرور آیا۔ وہ اس لیے کہ تین لاکھ ایک سو پچھتّر زیر، زبر، پیش اور جزم لگانا تو کارے دارد، اتنے ڈھیر سارے اعراب گنتے گنتے ہماری آنکھیں اور حافظہ تو فولادی نب سے بہت پہلے جواب دے جائیں گے۔ آنکھوں میں دائمی squint ہو جائے گا۔ حقّی صاحب نے اس کے معنی اَحول ہونا، بھینگا، اور آدھی آنکھ میچ یا جُھکا کر دیکھنا بیان کیے ہیں۔

صاحبو، اس میں تعلّی، تفنّن یا مبالغے کو ذرا دخل نہیں۔ صحیح جگہ، صفائی، صحت، نفاست اور باریکی سے اعراب یعنی زیر، زبر، پیش لگانا چشم و قلم جوکھم کا کام ہے۔ اسے بجا طور پر کسی ماہر بیوٹیشین کے کام سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ غالبؔ نے اپنے مشہور مصرع ''سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوے'' میں ایسی ہی تیزی اور باریکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر آپ نے بارہا نہیں تو اتفاقاً ہی سہی بیوٹی پارلر میں ابروؤں کو پہلی تاریخ کا چڑھتا چاند بنتے دیکھا ہوگا، رخساروں پر صحیح جگہ اور صحیح مقدار میں سُرخی، پپوٹوں اور آنکھوں کے نیچے crow's-feet یعنی کوّا پنجی شِکنوں پر سینڈل کے رنگ سے میچ کرتی شیڈ و لگاتے اور پلکوں کو نیزے کی انی بنتے بھی دیکھا ہوگا۔ ہم نے بھی ایک مرتبہ رُخِ زیبا پر غلط جگہ ایسا خوبصورت ارغوانی رنگ کا تل بنا دیکھا ہے کہ حقّی صاحب کے متذکرہ بالا ترجمے و معنی کے مصداق آدھی آنکھ میچ کر کمالِ فن کی داد دینے کو بے اختیار جی چاہا۔ اگر آپ نے رُوپ سنوار سنگھار کی یہ باریکیاں دیکھی ہیں تو ہمارے یارِ طرحدار مرزا عبدالودود بیگ کا فقرہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا، جو اُن سے اُس وقت سرزد ہوا جب انہوں نے ایک ادبی تقریب میں ایک چہرے پر یہ تازہ بہ تازہ کاریگری دیکھی۔ بے اختیار پکار اٹھے کہ معلوم ہوتا ہے ابھی ''ماہ رُخ بیوٹی پارلر'' سے صحیح جگہ غلط اعراب لگوا کر سیدھی چلی آرہی ہیں!

خدا گواہ ہے، یہ بات ہم نے حقی صاحب کی اعراب نگاری کی صحت اور حسن کی اہمیت جتلانے کی غرض سے کہی ہے۔ حاشا وکلا کسی بیوٹی پارلر کی پبلیسٹی مقصود نہیں۔

تلفظ کی وضاحت باقاعدہ فرہنگ میں ہو یا کسی اور شکل و پیرایے میں، اس سے استفادہ مشق و مہارت چاہتا ہے۔ اس جمال کی تفصیل کے لیے روز مرۃ استعمال ہونے والا ایک لفظ ملاحظہ فرمایئے جس کے ہم نے تین تلفظ سنے ہیں:

تج رُبہ

تج رَبہ

تجربہ

فرہنگ میں تلفظ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

فت ت، سک ج۔ کس ج ر، فت ب، اند

معنی آزمائش۔ لیکن معنی تک پہنچتے پہنچتے ہماری تو سانس فت سک فت سک کرتے کرتے اکھڑ جاتی ہے۔

آیئے۔ اب ذرا اسے decode کریں: ت پر فتحہ یعنی زبر، ج ساکن۔ ر پر کسرہ یعنی زیر۔ ب پر زبر۔ اند سے مراد اسم مذکر۔

صحیح تلفظ ہوا تج رِبہ جو میں نے سوائے حقی صاحب کے کسی اور کو بولتے نہیں سنا۔

(۷)

حقی صاحب کے بارے میں سب سے اہم اور کانٹے کی تلی ہوئی بات جو کبھی نہیں بھولنی چاہیئے یہ ہے کہ وہ لفظ کے رسیا، مزاج داں، نبّاض، فصّاد، ★[1] اُس کے رازہائے دروں کے محرم، نگینہ ساز، محک، پارکھ، جوہری تراشندہ و نگارندہ سبھی کچھ ہیں۔ اِن سب اوصاف و جہات کا جامع اور خوبصورت مُرقّع شیکسپیئر کے شہرۂ آفاق ڈرامے اینٹنی اینڈ کلوپیٹرا کا منظوم ترجمہ ہے جو حقی صاحب کے مختلف النوع ادبی کارناموں میں شاہکار کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کی پہلی قسط رسالہ ''ساقی'' دہلی میں ۱۹۴۱ میں شائع ہوئی تھی۔ منظوم ترجمہ چالیس سال کے ادبی چلّے کے بعد ۱۹۸۲ء

★[1] فصّاد: فصد کھولنے والا۔ نشتر کی نوک سے رگ میں شگاف لگا کر زائد یا فاسد خون نکالنے والا۔

اب یہ تکلیف دہ طریقہ متروک ہوا۔ کیوں کہ فاضل وفاسد و گرم خون کے اخراج اور اسے ٹھکانے لگانے، ٹھنڈا اور معتدل کرنے کے اور بھی ڈھنگ کے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، جن میں نشتر، جونک سینگی وغیرہ کی محتاجی نہیں۔

میں مکمل ہوا۔

اپنی زبان میں، کسی دوسری زبان بولنے اور لکھنے والے کی بات، کسی تیسرے شخص تک بعینہٖ اور بجنسہٖ پہنچانا اور کمالِ ترسیل کی داد وصول کرنا، نہ صرف جُوئے شیر لانے، بلکہ سوچے کو وہ بے ستوں اور خودکُش کوہکن فرہاد کو آلۂ خودکشی یعنی خون آلود تیشے سمیت اٹھا لانے کے مترادِف ہے! نام یاد نہیں آرہا، کسی دانا ہی کا قول ہے جو ترجمے...... ہر ترجمے کی دشواریوں پر صادق آتا ہے:

When it is faithful, it is not good, and when it is good, it is not faithful.

اُس نکتہ داں کی خوش بیانی کی داد دینے کے بعد عرض ہے کہ اللہ میری بدگمانی معاف کرے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اُس دانا نے ترجمے کے ساتھ ساتھ اپنی محبوباؤں کے لچھن بھی بیان کر دیے ہیں، بات تو سچ ہے، مگر بات ہے رسوائی کی۔

ترجمہ اگر منظوم بھی ہو تو یہ دشواری دوگونہ ہو جاتی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی صبا رفتار گھوڑے کی ٹانگ کسی ہرن کے ساتھ باندھ دی جائے اور حکم دیا جائے کہ اب دوڑو! ذرا زقند لگا کے دکھاؤ!

بات دراصل یہ ہے کہ ہر زبان کا اپنا ذائقہ اور خوشبو ہوتی ہے۔ ذرا غور تو کیجیے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ کسی بھی زبان میں ذائقے اور خوشبو کو بیان کرنے کے لیے سات آٹھ سے زیادہ صفات نہیں ملیں گی۔ آنکھ کے نشے نے زبان و قلم کو اس بابِ خاص میں گونگا کر دیا۔ مثال کے طور پر ہم چنبیلی، موتیا اور مُشک کی خوشبوؤں اور ان کے باہمی فرق کو کن الفاظ اور کن صفات کے حوالے سے بیان کریں گے۔ ترجمے میں کچھ اسی نوع کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بالکل اسی طرح ہر زبان کا اپنا آہنگ، اپنا انگ اور ٹھاٹ، اپنا ماضی و روایات، اپنی تلمیحات، محاکات و تعلیقات ہوتی ہیں، جن کے مترادفات و متبادلات دوسری زبان میں تلاش کرنا دونوں زبانوں کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ نمونے کے طور پر میں اسی ڈرامے کے چوتھے ایکٹ، سین ۱۴ کی دو بالکل سادہ لیکن پُرکار لائنز پڑھتا ہوں جن کا لفظی ترجمہ یا مفہوم تو بآسانی بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے نِندا سے لہجے، تھکی تھکی مدّھم لَے اور خواب ناک آہنگ کو کسی بھی زبان میں مکمل طور پر منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میرا دعویٰ نہیں، اقرارِ عجز ہے:

Unarm, Eros; the long day's task is done, And we must sleep.

اساسی اور ساختیاتی نوعیت کے ان تحفظات اور محدودات کا اطلاق ان لاثانی و لافانی مصرعوں

پر بھی ہوتا ہے جن میں شیکسپیئر اپنے اور Elizabethan diction کی ساری لطافتیں اور بلاغتیں اس مردافگن ساحرہ اور بے بدل "courtesan of genius" پر نچھاور کر دیتا ہے:

Enobarbus: Age cannot wither her, nor custom stale
Her infinite variety: other women cloy
The appetites they feed, but she makes hungry,
Where most she satisfies. For vilest things
Become themselves in her; that the holy priests
Bless her, when she is riggish. (Antony and Cleopatra, Act 2, Scene 2)

یہ ناقابلِ ترجمہ ہیں۔ لیکن اس سے خدانخواستہ انگریزی زبان کی فوقیت یا برتری ثابت کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ ترجمہ نگاری کے built-in یعنی پیوستہ اور بنیادی ہینڈی کیپ کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ اردو اور فارسی غزل کے، دس بیس نہیں، بے شمار ایسے خوبصورت اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا انگریزی یا کسی اور یوروپین زبان میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

اردو اور انگریزی کے نامور اور صاحبِ طرز نقّاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے یہی نکتے کی بات ہم سے کہیں بہتر اور پُر زور پیرایے میں صرف ایک بامحاورہ اور استفہامیہ فقرے میں سمودی ہے! اپنے مضمون ''شان الحق حقی کی یاد میں'' لکھتے ہیں کہ ''غالبؔ اور اقبالؔ کے ان اشعار کا:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

آپ انگریزی میں ترجمہ کیا کریں گے اور کیا کھا کر کریں گے؟ شاعری کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا دشوار اور شکیب طلب ہی نہیں بلکہ ناممکنات سے ہے۔''

انگریزی میں ترجمہ تو بہت دُور کی بات ہے، ہم تو دیوانِ غالبؔ کے پہلے ہی یعنی ''کاو کاو'' والے شعر کی اردو میں ڈھنگ سے تشریح بھی نہیں کر سکتے۔ کاو کاو کرتے ہی رہ جائیں گے!

غالبؔ کے اشعار کو چھوڑیے۔ ہم تو پروفیسر اسلوب صاحب کے کٹیلے فقرے ''کیا کھا کر کریں گے؟'' کا انگریزی میں ترجمہ What will you eat/devour before translating it? کر کے اپنی بھد اڑوانا نہیں چاہتے۔ پھر تو کچھ کھا کے سو جانے کو جی چاہے گا!

ہمارے ہاں اگلے وقتوں میں شادی بیاہ کے معاملات میں کُفو اور غیر کُفو کا فرق بہت اہمیت رکھتا تھا۔ کُفو سے مراد ''جنس ، نوع، طبقے، رتبے، معاشرت وتہذیب وغیرہ'' میں مماثلت ہوتی تھی۔ غیر کُفو میں شادی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ زبانوں کے بھی کُنبہ قبیلے، خاندان اور حسب نسب ہوتے ہیں۔ان کے ملاپ اورآمیزش پر بھی کُفو اور غیر کُفو کا کسی حد تک اطلاق ہوسکتا ہے۔ تاریخی اور ترکیبی اعتبار سے اردواور فارسی ہم کُفو ٹھہریں۔ ہندی بھی ایک بھولی بسری کزن لگتی ہے۔

الفاظ کے شجرہ نسب میں خون کے رشتے بھی نظر آتے ہیں۔ اور دودھ شریک واخیافی کا بھی نسّابانِ[★] جدّ ومورث شناس بالآخر سراغ لگا لیتے ہیں۔ انگریزی یا کسی اور یوروپین زبان سے ایسی لسانی نسبت کی تلاش بہت واضح تحفظات سے مشروط ہوگی۔ Beethoven اور Mozart کی Symphonies کے اعجاز سے کسی گراں گوش اور کافرِ نعمت ہی کو مجالِ انکار ہوگی۔ شیکسپیئر کے لافانی ڈرامے بھی اپنی جگہ ...... بلند و برتر جگہ، اعلاوارفع جگہ، عصرِ حاضر کی بضاعت و دسترس سے باہر و بالاتر جگہ...... لیکن، گستاخی معاف، اینگلوسیکسن صوت وآہنگ کے ساتھ راگ درباری کا تال میل یا غزل کا سنجوگ انمل، بے جوڑ اور عِنا بالجبر کی زد میں آسکتا ہے۔

خیر، شیکسپیئر تو سات سمندر پار لندن اور اسٹریٹفرڈ میں ندی کنارے اپنی دل کشا کٹیا میں بیٹھا ڈرامے لکھ رہا تھا، لیکن ذرا غور کیجیے، دلّی تا لکھنؤ کتنا سا فاصلہ ہے۔ وہ بھی سدا سے اور دونوں کی بلا سے...... ناقابلِ عبور رہا ہے! روایت ہے، جو اگر غلط بھی ہے تو سچ پر ضرور دلالت کرتی ہے، کہ میر کو جب لکھنؤ میں حسبِ دل خواہ داد نہ ملی تو اس نے لکھنؤ والوں سے کہا ''میری شاعری وہی سمجھ سکتا ہے جس نے (دلّی کی) جامع مسجد کی سیڑھیاں دیکھی ہوں اور وہاں کی زبان سنی ہو۔''

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ شجرۂ نسب کی شاخوں پر اب ڈال کے پکّے بزرگوں کی بجائے بینک بیلنس اور پلازے (plazas) لٹکتے ہیں! اگر گزشتہ سونسلوں کو ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑا کردیا جائے تو اس سَلَف مینار کو پلازہ کا ہم قامت و قیمت کہلانے میں ایک قدِ آدم کی پھر بھی کمی رہ جائے گی۔ شجرے کی انہیں زردار و زردان لٹکنوں کو دیکھ کر شادی بیاہ کے رشتے طے کیے جاتے ہیں۔ اور اب یہی پیمانہ ومعیارِ نجابت و توقیر ٹھہرا!

حقی صاحب سے زیادہ ان مشکلات اور محدودات کا احساس اور کس کو ہوسکتا ہے؟ وہ ان کٹھن گھاٹیوں اور مترجِم ڈُباؤ کھائیوں اور خندقوں سے آسان گزرے ہیں۔ انہوں نے مَتن اور مُکالمات

[★] نسّاب: ''علمِ انساب کا جاننے والا۔ وہ شخص جو مختلف خاندانوں کی تاریخ، تفصیلات اور مختلف افراد کے متعلق واقفیت رکھتا ہو کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے آباواجداد کون تھے۔''

کو اردو کے مزاج، محاورے اور روز مرۃ کے قریب سے قریب تر لانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کے ترجمے میں زبان کے مقامی عُنصُر اور تخلیقی جوہر کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود اکثر کہتے ہیں کہ اُن کا ترجمہ شیکسپیئر کی بہ نسبت ہر کردار کی طبقاتی اور سماجی حیثیت، اس کی بولی اور روز مرہ سے قریب تر ہے۔ ایسے مُکالموں میں Shakespearean diction کے شکوہ، گُونج اور گمک، ٹیوڈر (Tudor) ٹھاٹ، یونانی اور اساطیری تلمیحات کی تلاش بے سُود ثابت ہوگی۔ حقی صاحب نے کنیزوں، لونڈیوں اور خدمت گاروں کے مُکالموں کو ٹھیٹ دِلّی کی بولی ٹھولی میں، یا دیہاتیوں کی کھُردری زبان میں کیسے اور کیوں کر ڈھالا ہے اس کا تھوڑا بہت اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''دیہاتی: اب میں ایسا کودن بھی نہیں۔

جانوں ہوں کہ عورت جات تو سیطان سے بھی نہ نِگلی جائے۔ وہ تو دیوتاؤں ہی کے لائخ ہے۔ پر جب لگ اُس پر سیطان کی سنوار نہ ہو۔ اُس کا ہاتھ لگا اور گئی۔ سّچی کہوں یہ سیطان دیوتاؤں کو بڑی چوٹ دیوے ہے عورت جات کے بارے میں۔ کیوں؟ کہ وہ دس بنادیں تو پانچ کو سیطان بگاڑے ہی بگاڑے۔''

اس زبان پر عموماً اور لہجے پر خصوصاً دبے لفظوں میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ شیکسپیئر کا لہجہ نہیں ہے۔ جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقی صاحب نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ یہ شیکسپیئر کا لہجہ ہے؟ وہ تو خود اسے اپنے یہاں کی کنیزوں، لونڈیوں، خدمت گاروں اور دیہاتیوں کا لہجہ کہتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے تصور کیجیے، ملکہ قلوپطرہ اگر لال قلعے میں رونق افروز ہوتی اور شیکسپیئر بَلّی ماروں میں گلی قاسم جان کی ایک بوسیدہ حویلی میں ٹپکتی چھت کے نیچے بیٹھا نیزے کے قلم سے لکھ رہا ہوتا تو شوخ چشم کنیزیں اور اُچھال چھکا لونڈیاں شاید اسی بیگماتی لہجے اور کرخنداری زبان اور اسی ہُڑدنگے لہجے میں جولیس سیزر اور انطونی کے ساتھ اس سدا سُہاگن حرافہ کی شب مستیوں، لچھنوں اور تریا چلتروں کا آنکھوں دیکھا حال ایک دوسرے کو سناتیں اور کبھی اپنا اپنا پیٹ اور کبھی ایک دوسرے کی چُٹیا پکڑ کے دونوں ہنکوڑ ماروں پر کھِل کھِل ہنستیں!

غالباً کچھ اسی سے ملتے جلتے سیاق و سباق میں، یعنی مقامی و مُروّجہ روز مرۃ اور slang کے برمحل اور بے تکلفانہ استعمال کی بنا پر حقی صاحب اپنے منظوم ترجمے کو اصل متن سے علی الاعلان بہتر و افصح قرار دیتے ہیں! یہ اور بات کہ شیکسپیئر کا اس رائے سے متفق ہونا چنداں ضروری نہیں۔

بہرحال، یہ ان دونوں بڑوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ ہم بیچ میں بولنے والے کون؟

(۸)

حقی صاحب سے میری نیاز مندی کی مدت کچھ اوپر ۴۷ برس بنتی ہے۔ جس زمانے میں تعارف ہوا میں پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک دو کمروں والے مکان میں رہتا تھا، جسے میں گھر اور جمشید روڈ، عامل کالونی اور ناظم آباد میں رہنے والے ''کوارٹر'' کہہ کر ہمیں اپنی اقامتی اوقات یاد دلاتے تھے۔ کرایہ ۳۵ روپے ماہوار جو گھریلو بجٹ پر گراں گزرتا تھا۔ ایک کمرے میں ''گھس بیٹھے'' مرغے مرغیاں اور مستقل مہمان مقیم تھے جو مرغوں کی باری باری اذانوں اور آؤٹ آف ٹرن (باری کے بغیر یا خلاف) کُلیلوں کے چشم دید اور گوشِ شنید گواہ تھے۔ سوتے میں جاگتے اور جاگتے میں سوتے تھے اور اس ناخفتہ بہ صورتِ حال سے نالاں تھے۔ اس لیے بھی کہ جب مرغے اذان دینا بند کردیتے اور مُرغیاں کُڑکُڑانا موقوف کردیتیں تو بچے، میرا مطلب ہے لڑکے مرغوں سے بھی زیادہ کڑکیلی آواز میں گھنٹوں ان کی اذان کی نقل یعنی کُکڑوں کوں، کُکڑوں کوں کرتے اور بچیاں عنقریب انڈا دینے والی مرغی کی طرح کُڑکُڑاتی، کِلکارتی پھرتیں۔ دوسرے کمرے میں جس کا فرش اُدھڑا ہوا تھا ہم میاں بیوی اور چاروں بچے، بقول مرزا، وال ٹو وال بچھے ہوتے تھے۔ اسی غریب و ادیب پرور کالونی میں معروف مارکسٹ نقاد پروفیسر ممتاز حسین رہتے تھے جو اسے بُورژوا بستی قرار دیتے تھے۔ خلقِ خُدا کی اس بستی نے کیسے کیسے صاحبانِ کمال اور نابغۂ روزگار شخصیات کو پناہ دی ہے۔ دو تین نام ہوں تو گنواؤں۔ کہکشاں اُتر آئی تھی۔ آرزوؔ لکھنوی، آرٹسٹ شاکر علی، شاہد احمد دہلوی، محمد حسن عسکری، جمیل جالبی، عزیز حامد مدنی، نقی محمد خاں خورجوی، محمود علی خان جامعی، فاطمہ ثریا بجیا، زہرا نگاہ، انور مقصود حمیدی۔ آرزوؔ لکھنوی نے تو ایک صاحب کی مساوی شراکت میں ایک ریستوراں بھی بس اسٹینڈ کے پاس کھولا جس کا نام ''طعامستان'' رکھا۔ مساوی شراکت سے ہماری مراد ہے کہ ایک پارٹنر نے سوفی صد سرمایہ لگایا اور دوسرے نے اسے سوفی صد ٹھکانے لگایا! پڑوسیوں کا خیال تھا کہ ریستوراں کا دِوالہ گاہکوں نے نکالا! وہ اس طرح کہ ہمہ وقت شاعروں، بے گھر ادیبوں اور بے روزگار intellectuals کا جماؤ بلکہ پڑاؤ رہتا جو ایک کڑک چائے کی پیالی کا آرڈر دے کر چار گھنٹے ادبی و آفاقی مسائل اور خرخشوں پر گھمسان کی بحثا بحثی کرتے۔ مرزا اسے طعامستان کی بجائے ''طعامِ مستان'' کہتے تھے۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہندوستان سے کراچی وارد ہونے والا وہ مہاجر انٹلکچول جو اِس قرطبۂ کاملاں میں نہیں رہا، اس کی نماز جنازہ جائز نہیں، سوائے شان الحق حقی کے جو جیکب لائنز

کے ایک سرکاری کوارٹر میں سکونت پذیر تھے۔ وہی نقشہ تھا مگر زیادہ آباد و بارونق۔ ہم تو جب بھی گئے ایک کمرے میں کبوتروں کے بیتاب جوڑے اور بچے دیکھے اور دوسرے میں کتابیں، مہمان اور مہمانوں کے ملاقاتی۔ ہم کسی کی پرائیوٹ زندگی کے بارے میں جاسوسانہ کرید یا حاسدانہ ٹوہ لگانے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ لہٰذا ابھی یہ نہ پوچھا کہ گھر میں گھر والے کہاں فروکش ہیں۔ ویسے کچّا صحن بظاہر دس چار پائیوں کے برابر تھا۔ بیگم رشید احمد صدیقی کو پہلے پہل اسی کوارٹر میں (مہمان) دیکھا۔ اس بھرے پُرے گھر میں کبوتروں کی ریل پیل تو دیکھی، لیکن چھتری کہیں نظر نہ آئی۔ یہ سوچ کر ہم آج بھی مرعوب ہونے کی حد تک حیران ہوتے ہیں کہ حقّی صاحب کو چھتری کے بغیر گرداں کبوتر★[1] پالنے، اُنھیں سدھانے اور بھولے بھٹکے کبوتروں کو بام سے زیرِ دام لانے کا ہُنر، لُغوی اور علامتی، ہر دو اعتبار سے خوب آتا ہے! ادب میں بھی وہ کسی اور کی چھتر چھاؤں یا خود اپنی چھتری کے قائل یا محتاج نہیں رہے۔ ہاں کوئی کبوتر خود ہی ان کے آنگن میں یا شانے پہ آن بیٹھے اور غٹرغوں کرنے لگے تو وہ اُسے تالی بجا کے یا ہُش کہہ کے اُڑانے سے تو رہے۔ ان کا تعلق کبھی بھی کسی گروپ یا مخصوص ادبی حلقے سے نہیں رہا۔ ہر کام تنہا کیا۔ ہر منزل اپنے ہی دم قدم سے تنہا سر کی۔ مختلف شعبوں میں اہم مناصب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ کیریئر کا بیشتر حصہ اطلاعات ونشریات کے شعبے اور ڈائرکٹوریٹ آف فلمز اینڈ پبلی کیشنز میں گزرا۔ ایک رسالے کے ایڈیٹر بھی رہے۔ پاکستان ٹیلی وژن میں جنرل مینجر سیلز اور اس کے بعد ایک معروف ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں بحیثیت مُشیر کام کیا۔ جو کام کیا پوری تندہی اور جانفشانی سے کیا۔ کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ کیا۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن علم وادب کے ساتھ ان کا جو کمِٹ منٹ (تعہد) اور پیمانِ وابستگی جیکب لائنز کے کوارٹر میں تھا، وہی ناظم آباد کے کشادہ مکان ''شعاع ساز'' اور ڈیفنس کے خیابانِ تنظیم پر کتابوں بھرے بنگلے میں رہا۔ وطنِ مالوف سے دور مانٹریال اور ٹورنٹو میں بھی ان کے شغف اور انہماک میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ وہاں بھی وہی وضعِ دیرینہ، وہی لیل ونہار۔

حیرت و ستائش کا مقام ہے کہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض و مصروفیات کے باوصف وہ اپنے جینِ حیاتی★[2] مقصد و مشغلے، شعر وادب، تصنیف و تالیف، تحقیق و تنقید سے ایک لحہ بھی غافل نہ

★[1] گرداں کبوتر: (کبوتر بازی کی اصطلاح) ''اُڑانے کا کبوتر جو ہر طرف اُڑ کر پھر اپنے گھر واپس آجاتا ہے۔'' پروین شاکر نے ایسے ہی کبوترانہ اوصاف والے مرد کی تعریف کی ہے:

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

★[2] جینِ حیاتی: زندگی بھر کا۔ تمام عمر کا۔

رہے۔ ان کے کلام کی اصناف ومحاسن، تصنیفات کا تنوع، کیفیت اور کمیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک زندگی میں ایسا اور اتنا کام کیسے اور کیوں کر کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انہیں سات زندگیاں اور آواگون عقیدے کے مطابق سات جنم اور سات جُون بھی ملیں تو وہ ہر بار یہی کچھ کریں گے۔ اسی طرح کریں گے۔ اور اسی روح پرور مشغلے میں، بالکل اسی دُھن اور دَھج سے جینے کی طرح جئیں گے۔ انہیں صرف ایک نگاہ بھر کے نہیں، جی بھر کے دیکھیے کہ ایسے دیوانے پھر نہیں آئیں گے۔ اس لیے کہ وہ تہذیبی سانچے ہی ٹوٹ گئے جن سے ایسی راسخ العزم، کثیر الجہات اور جامع الکمالات شخصیتیں ڈھل کر نکلتی تھیں۔

ایسے صاحبانِ جنوں، نابغۂ روزگار شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ وہ ایک ''مقدس دیوانگی'' میں مبتلا رہتے ہیں۔

تو اب ایک اور دیوانے کی حکایت پر اپنی گزارشات ختم کر کے اجازت چاہوں گا۔ انشاء جی کے بقول:

ے دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا

مہرِ دو نیم

کیسی شاعری اچھی ہوتی ہے اور خراب شعر کی کیا پہچان ہے، اس کی وضاحت بعض شعراء اپنے مجموعۂ کلام کے مقدمے میں کرتے ہیں اور بعض فقط اپنے ہی اشعار سے یہ فرق ذہن نشین کرا دیتے ہیں۔ افتخار عارف نے یہ کھکھیڑ نہیں اٹھائی۔ نہ بقلم خود مقدمہ لکھا اور نہ کمزور اور ڈھیلا شعر کہا۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام کا آغاز دو مؤقر مقدموں سے ہوتا ہے۔ فیض صاحب اپنے خیال انگیز مقدمے بعنوان ''جدید اردو ادب کا معتبر نام'' میں لکھتے ہیں ''افتخار عارف کے کلام میں میرؔ و غالبؔ سے لے کر فراقؔ و راشدؔ تک سبھی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ لیکن آپ نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہے، کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ بلکہ لے اور آہنگ کی طرح، کچھ ایسا ہی اجتہاد لغت اور محاورے میں بھی کیا ہے۔'' تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا رُوپ دینے کی بھی فیض صاحب نے دل کھول کر داد دی ہے۔ انہوں نے افتخار عارف کے کلام میں ظلم و تعدی، جبر و زباں بندی کے خلاف احتجاج اور رزق کے اسیروں کی محتاجی اور تذلیل پر بھی بڑے جامع اختصار کے ساتھ توصیفی تبصرہ کیا ہے۔ فیض صاحب اگر ہماری کسی کتاب کے بارے میں ایسے ستایشی کلمات رقم فرماتے تو ہم صرف مقدمہ چھاپ کر دوستوں، حاسدوں اور جلے تن نقادوں میں مفت تقسیم کر دیتے اور اصل کتاب کی اشاعت کو کسی کم مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھتے۔ لیکن افتخار عارف نے رِسک نہیں لیا اور ایک اور بھاری بھرکم مضمون بطور مقدمہ ثانی شامل کرنا ضروری جانا۔ جس پر چہ میگوئیاں ہوئیں کہ کتاب تو آخر کتاب ہے، فوجداری عدالت تک میں ایک ہی جرم پر دو مقدمے نہیں چلائے جا سکتے۔ نہ جانے معترضین یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ افتخار عارف اپنی وضعِ احتیاط اور لکھنؤی رکھ رکھاؤ کو کسی صورت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لکھنؤ میں یہ دستور تھا کہ بہو بیٹیاں، بالخصوص نئی نویلی دلہنیں ڈولی میں کہیں جاتیں تو رستے میں کہاروں کو کندھا نہیں بدلنے دیتی تھیں۔ روانہ ہونے سے پہلے ڈولی میں ایک پتھر رکھوا دیتی تھیں، جس کا مقصد غالباً یہی ہوگا کہ کہاروں کو بھی سواری کے اصل وزن کا اندازہ نہ ہو سکے۔ صاحبو، پروفیسر گوپی چند نارنگ کا وقیع مضمون دو

بھاری پتھر ہے جو چُوم کر چھوڑ نے کی بجائے سنگوا کر ساتھ رکھنے کے لائق ہے کہ ہما شا کی نظر گزر سے محفوظ رکھے گا۔

میں نے کبھی شعر نہیں کہا، از بسکہ میرے کام نثر سے اچھے خاصے نکل جاتے ہیں، لہٰذا آئندہ بھی شعر سرزد ہونے کا احتمال نہیں۔ میں نقاد بھی نہیں کہ اچھے بھلے شعر میں مین میکھ نکالنا میرے فرائض منصبی میں شامل ہو۔ غالباً کیا، یقیناً انہی بے ضرر خامی نما خوبیوں کی بناء پر منتظمین نے مجھے اظہار خیال کی دعوت دی ہے۔ انہیں یہ خیال نہ آیا کہ مجھ جیسے گوشہ نشین نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کچھار میں جا کر شیر کو vegetarianism کے فوائد وفضائل پر لیکچر دے! میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں خود افتخار عارف سے رجوع کرنا چاہیئے کہ وہ اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر اور شاعر کے پارکھ بھی ہیں۔ وہ خراب شعر، منمناتا ترنّم، صحیح سائز کی قمیص، شوربے کا سالن اور ٹھنڈا کباب برداشت نہیں کر سکتے۔ خراب شعر اور نثری نظم کہنے والوں کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ حرام ہے۔ یہ بھی قدیم تہذیب کی مبنی بر خوف شائستگی تھی کہ بدکو، جس نے خلقِ خدا کو زندگی حرام کر دی ہو، کبھی اُس کی زندگی میں نہ ٹوکتے تھے نہ روکتے۔ لیکن اس کے غُسلِ میت اور تجہیز و تکفین کے بعد جب یہ خدشہ نہیں رہتا کہ وہ ظالم کفن پھاڑ کے اُٹھ کھڑا ہوگا تو لوگ ایسے کی نماز جنازہ حرام ہونے کا فتویٰ سرگوشیوں میں صادر فرماتے ہیں! شعر کہنے کا تو دور دور امکان نہیں، ہمارا قلم تو افتخار عارف کے فتوے کے خوف سے نثر لکھنے میں بھی کانپ کانپ اٹھتا ہے، کیوں کہ پشتو محاورے کے مصداق ہم اپنا مُردہ خراب کروانا نہیں چاہتے۔ لیکن ضمیر جعفری کو یہ اندیشہ لاحق نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''مشرقی وضعداری کا کوئی نمونہ دیکھنا ہو تو ان کو دیکھیے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے قدم ماضی میں ہوتے ہیں اور سانس مستقبل میں لیتے ہیں۔ بزرگوں سے تپاک اور سعادت مندی کا یہ عالم کہ میں تو اپنی تجہیز و تکفین کے انتظامات بھی اطمینان کے ساتھ ان کے سپرد کر سکتا ہوں۔''

داد افتخار عارف خراب شعر کی بھی برابر دیتے ہیں کہ یہ ان کی شائستگی اور حسِ مزاح کا دُہرا تقاضا ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ اچھے شعر پر سینے (اپنے) پر ہاتھ رکھ کے سبحان اللہ! سبحان اللہ! کہتے ہیں۔ لیکن بُرا شعر سماعت فرماتے ہیں تو منہ سے کچھ ایسی مبہم آوازیں نکلتی ہیں جو ڈکشنری میں نہیں ملتیں۔

لگاتار خراب اشعار سننے پڑیں تو دائیں ہاتھ سے بار بار اپنا بازو پیٹتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شاعر نے بہت ہی خراب شعر پڑھے تو اٹھ کر اپنے مخصوص لکھنوی انداز سے اس کے گھٹنے پکڑ لیے، جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ کہیں وہ اپنے شعر سنا کر بھاگ نہ جائے اور وہ اسے اپنی تازہ غزل بھی نہ سنا سکیں! مگر یہ انداز دادو بیداد صرف مختصر اور نجی محفلوں میں دیکھنے میں آیا۔ مشاعروں میں رویہ مختلف ہوتا ہے۔

خراب شاعر کے لیے افتخار عارف نے ایک اصطلاح وضع کی ہے ''بکری شاعر''۔ بکری میں ہمیں تو بظاہر تین خرابیاں نظر آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جو کوئی بھی اس پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے، چُھری پھیرنے کی نیت سے پھیرتا ہے! دوسری خرابی اس بچاری کی یہ کہ افتخار عارف اس کے کباب بڑے شوق سے کھاتے ہیں! اس کے علاوہ ہم نے کراچی میں انہیں بارہا ایسے ریوڑ میں بھی دیکھا جو انہیں اپنے سینگوں پر اُٹھائے پھرتا ہے، جب کہ لندن کی بعض محفلوں میں اچھے شعر کی داد ایسی بے ساختگی اور زور شور سے دی جاتی ہے کہ گویا وہ مزیدار کثیفہ ہے۔ یعنی تالی بجا کر! غور کرنے پر بکری میں تیسرا عیب یہ نظر آیا کہ جو گھاس یا پودا اسے پسند آتا ہے اُسے جڑ سے اکھاڑ کر کھاتی ہے۔ اس زمین پر وہ دوبارہ نہیں اُگ سکتا۔ بکری شاعر بھی غزل کی زمین کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے!

اس ممیاتی اصطلاح کا اس لیے بھی ذکر کرنا پڑا کہ ابھی کچھ دن ہوئے ہمارے پسندیدہ ادیب مخدومی سلیم احمد صاحب نے جو شاعر ہونے کے علاوہ صاحبِ اُسلوب ادیب، نڈر نقاد، ڈرامہ نگار اور صحافی بھی ہیں اپنے ایک انٹرویو میں یہ فرمایا کہ ''شاعری تو میرا کمزور بچہ ہے۔ مگر یہ نہ بھولیے کہ ہاتھی کا بچہ ہے!'' ہم ایک مدت سے سلیم احمد صاحب کی طنازی کے قتیل ہیں۔ لہٰذا نہایت ادب کے ساتھ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اپنی معنوی اولاد کو ہاتھی کا بچہ کہنا، بچارے ہاتھی پر سراسر بُہتان ہے!

اپنے کلام کو ازراہِ شاعرانہ تعلی ہاتھی کا بچہ کہنے کے بعد سلیم احمد صاحب نے بہ نظرِ حوصلہ افزائی افتخار عارف کو ہاتھی سے تشبیہ دیتے ہوئے اپنے کالم میں لکھا ''مثل مشہور ہے کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں۔ تو سوال یہ ہے کہ افتخار عارف کس کے ہاتھی ہیں؟'' انہوں نے ازراہِ شفقت یہ بھی لکھا کہ ''ان کا مجموعہ آئے تو شاعری کے چوہوں کو دکھاؤں کہ ہاتھی کا روٹ ایسا ہوتا ہے۔'' اس استعارے کو آگے بڑھاتے ہوئے نصر اللہ خاں صاحب نے ''حریت'' کے کالم

میں یہ شوشہ اٹھایا کہ سوال یہ نہیں کہ ہونہار ہاتھی کس کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کاں کا ہے؟'' (جی ہاں، کہاں کا ہے؟ کو انہوں نے اسی پیار بھرے املا اور ''گرائیں'' تلفظ کے ساتھ لکھا ہے۔) تو عرض ہے کہ ''تم جہاں کے ہو، واں کے ہم بھی ہیں۔'' جہاں تک یہ سوال ہے کہ کس کا ہاتھی ہے تو ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں۔ اس نسل کا نہیں ہے جو لال عماری اور زرّیں جُھول سمیت زندگی اور ادب میں جھومتی جھامتی درانہ گھس آئی ہے۔ مطلب یہ کہ پورس کے ہاتھیوں والی نسل سے نہیں ہے۔

صاحبو، یہ کیسا بجوگ پڑا ہے کہ شاعروں کے قد و قامت کا اندازہ و تعین کرنے کے لیے ہمیں چوہے، ہاتھی، ہاتھی کے بچے اور بکری کو پیمانہ بنانا پڑتا ہے، حالاں کہ ان دکھیاروں کی وجہِ شُہرت شاعری نہیں! ایک زمانہ وہ بھی تھا جب شاعروں کو تلامیذ الرحمٰن (خدا کے شاگرد) کہا جاتا تھا۔ پیرِ رومی، بادشاہ سخن، جہاں استاد، ملک الشعرا، رئیس المتغزلین، لِسان العصر اور حکیم الامّت کے القاب سے تکریم وارادت مندی کا اظہار آج بھی کیا جاتا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے رشید حسن خان کو خدائے تدوین کا لقب دیا ہے۔ اور تو اور ایک صاحب شہنشاہِ ظرافت کے گُدھب لقب سے مُلقب ہوئے! یہ شہنشاہ اور ظرافت دونوں کے ساتھ کُھلی مسخرگی ہے! حافظ شیرازی کی بات اور ہے وہ تو لسان الغیب ٹھہرے۔ جب عقل فیصلہ کرنے سے قاصر ہو تو ان کے کسی شعر سے فال نکال کر اُس پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ پھر بدعقیدگی اتنی بڑھی اور حالات اتنے خراب ہوئے کہ ان کے دیوان کے قابو سے باہر ہو گئے تو لوگ طوطوں سے فال نکلوانے لگے۔ طوطے سے مستقبل کا حال پوچھنے میں یہ فائدہ ہے کہ ہمیشہ ایک اور نیک فال نکالتا ہے، جس کا سبب یہ کہ دماغ کی بجائے چونچ سے کام لیتا ہے!

ابھی کچھ دن ہوئے ہمارے ایک نامور دانشور نے بڑے دُکھ کے ساتھ گِلہ کیا کہ معاشرے نے کرکٹرز، کامیڈینز، گویّوں، طوائفوں اور ایکٹروں کو جو کچھ دیا، کیا کبھی وہ کسی ادیب یا شاعر کو بھی عطا فرمایا؟

کہنے کو تو جواباً کہا جا سکتا ہے: کیا ادیبوں اور شاعروں نے معاشرے کو وہ کچھ دیا جو کہ کرکٹرز، کامیڈینز، گویّوں، طوائفوں اور ایکٹرز نے دیا؟ سیدھا سادھا demand and supply (طلب و رسد) کا مسئلہ ہے جو نیا نہیں ہے۔ جوش صاحب بھی گلہ کر چکے ہیں:

کوئی مُشتری ہو تو آواز دے
میں کمبخت جنسِ ہُنر بیچتا ہوں

کم و بیش سو برس قبل مولانا حالی نے ایسے مال کی نکاسی اور لیوال نہ ہونے کا سبب بھی بتلا دیا تھا:

مال ہے نایاب، پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ ★[1]

لیکن ایک لحاظ سے بات اس دل جلے دانشور نے بھی کچھ ایسی غلط نہیں کہی۔ اب موسیقاروں ہی کو لیجیے۔ ہم بھی ان کی عزت و توقیر کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم انہیں شہنشاہِ موسیقی، سنگیت سمراٹ، ملکہ موسیقی، ملکۂ ترنم اور ملکۂ غزل کا تاج پہنائے بغیر ان کی قدر و توقیر نہیں کر سکتے؟ ہم تو شاعری میں بادشاہِ حسن، شاہِ خوباں، اور شہِ شمشاد قداں کی باغی رعایا بننے کے لیے بھی تیار ہیں۔ لیکن نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ کھڑے مسُور کی دال بھی ذرا سی بڑی اور چھلکے سے باہر جھانکتی نظر آ جائے تو ملکہ مسُور کہلاتی ہے! ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے کسی بھی شُعبے میں ہمارا کام بادشاہوں اور اس کے نتیجے میں طوائف الملوکی کے بغیر نہیں چل سکتا!

سوال یہ ہے کہ آخر یہاں لندن اور یورپ میں ایسی ملکاؤں کی تاجپوشی کیوں نہیں ہوتی؟ ایک beauty queen (ملکہ حسن) البتہ ہوتی ہے۔ مگر سالِ رواں کا سنہری تاج دھوم دھام سے پہنانے کے بعد اُس دُکھیا کو سال بھر کپڑے نہیں پہننے دیتے! عرصہ ہوا ہم نے ایک فلم اسٹوڈیو میں (جس کا دِوالا عاشق کی حسرت کی طرح نکل رہا تھا، یعنی مشکل سے اور دھیرے دھیرے۔) شُوٹنگ کے دوران ''ملکہ جذبات'' کی زیارت بھی کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اُس کو عمر کے جس مرحلے میں دیکھا، اُس میں اُس غریب کے پاس فقط جذبات رہ گئے تھے۔ وہ اس وقت ساجن سے بچھڑنے کا گیت اس طرح گا رہی تھی کہ ہونٹ ہل رہے تھے، مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ گویا، بقول شاعر، زندگی کے ساز کی طرح تھیں۔ بج رہی تھیں اور بے آواز تھیں۔ اسکرین پر ساون کا مہینہ تھا۔ ایک غیر تکنیکی وجہ یعنی روپے کی کمی اور موسم کے عدم تعاون کے باعث جھما جھم مینہ برسنے کا سماں نہ دکھلایا جا سکا۔ لہٰذا نزدیک ترین نلکے کے پانی میں شرابور پندرہ بیس چھتریاں دِکھا کر اسی نلکے کی ٹپاٹپ سنوادی تھی! ٹخنوں سے ایک بالشت اوپر اُٹھے پائنچے

★[1] احمد فراز کا حسبِ بدحالی شعر، جو ہمیں بہت پسند ہے، ہم نے عمداً اوپر نقل نہیں کیا مبادا یہ خیال گزرے کہ ہم بڑوں کے مابین شرارتاً بیت بازی کا مقابلہ کرانا چاہتے ہیں! تو ملاحظہ ہو:

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اُس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

سے برساتی ندی نالوں کی گہرائی، سڈول پنڈلی کا قُطر ★[1] اور ناظرین کا شوقِ نظارگی آخری ملی میٹر تک ناپا جا سکتا تھا۔

دیکھیے میں بھٹک کر کہاں آنکلا۔ بھٹکنے بھٹکانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بعض اوقات راستے میں بالکل غیر متعلق لیکن قابلِ دید و ذکر مناظر بھی مل جاتے ہیں۔ کوئی دھیانی گیانی ہو تو الکھ نگری میں جا نکلتا ہے! میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ اظہار کے پیرائے کچھ بھی ہوں اور قدر دانی و قامت پیمائی کے پیمانے خواہ نئے ہوں یا پرانے، افتخار عارف کو اپنا انداز قد ٭پچنوانے میں دیر نہیں لگی۔ ''مہرِ نیم روز'' کی جو پذیرائی ہو رہی ہے وہ کم، بہت ہی کم کتابوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کی شاعری کی عمر کلیتہً دس برس بنتی ہے۔ لیکن ان دس برس میں انہوں نے وہ مسافتیں طے کر ڈالیں جن سے اچھے اچھوں کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔

اس دس سالہ شاعری میں تین ادوار صاف پہچانے جاتے ہیں جن سے ان کے قابلِ رشک حد تک تیز ذہنی و شعری ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلا دور لندن آنے سے پہلے کی شاعری پر محیط ہے۔ اس میں انہیں اپنی تنہائی اور بے زمینی کا شدید احساس ہے۔ وہ خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ ''میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے۔'' اپنی مٹی سے بچھڑنے کا غم انہیں بہت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زمینی رشتے ناتے توڑنا اتنی بڑی خطا ہے کہ

؎ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری سزا کیا ہے؟

اس دور میں زندہ و شرمندہ نظر آتے ہیں:

؎ تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان، بہت شرمندہ ہیں

لندن نے ان کی یہ شرمندگی ویزا کی روشنائی خشک ہونے سے پہلے ہی دور کر دی!

★[1] قُطر: یعنی diameler! اللہ اللہ! یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ خود ہمیں اردو لفظ کے معنی انگریزی میں بیان کرنا پڑیں گے! جن نازک طبائع پر یہ عام فہم طریقِ تشریح بہت گراں گزرے وہ یہ معنی ملاحظہ فرمائیں:

''وہ خطِ مستقیم جو دائرے کے مرکز میں سے گزر کر محیط تک دونوں طرف چلا جائے۔'' علمی اردو لغت

اس پر اتنا اضافہ کرنے کی اجازت دیجیے: اور ہم جیسے انگریزی داں جُہلا کے سر پر سے اس طرح گزر جائے کہ عضوِ مذکور دماغ کو دو مساوی حصّوں میں تقسیم کر کے آدھاسیسی (دردِ شقیقہ۔ migraine) کا مزہ چکھانے کے بعد محیط اللغات کے چوگرد چکّر لگاتا رہے۔

صاحبو، لندن بڑا مردم شناس، مزاج داں اور غمگسار یار دیار ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بعض نعمتیں طلب یا تمنا کرنے سے پہلے ہی مل جاتی ہیں۔ یہاں بندگانِ خدا اور مُتلاشیانِ ناکتخدا ایسی منزل سے بھی گزرتے ہیں جب ایک میم سے بچھڑنے کے غم کو دوسری اور دوسری کے غم کو تیسری چوتھی اور پانچویں سے ملنے کی خوشی سے بہلاتے رہتے ہیں۔ پھر وہ آسُودگان یہ دعا نہیں کرتے کہ "میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے" بلکہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جس مکان میں رہتی ہے..... میرا گھر کر دے!

۷۷ سے ۸۱ تک کا زمانہ ان کی شاعری کا دوسرا دور ہے، جس میں انہوں نے ایک بے حد حساس اور خوددار انسان کی حیثیت سے اپنی انا اور انفرادیت کو ایک بالکل نئے اور تقاضنگیر ماحول میں برقرار و سرفراز رکھنے کی نیک نیتی سے کوشش کی ہے۔ مصاحبی، ربارداری اور نوکری چاکری کی اصل مصیبت یہ ہے کہ انسان جو مَسجودِ ملائک رہ چکا ہے، اب وہ مسجودِ خلائق بننے میں زیادہ خوشی اور فخر محسوس کرتا ہے!

؎ روز اِک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے، یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

پھر دھڑتے سے یہ اعلان کہ "کچھ بھی کرلیں گے، یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے" یہ وہ محنت ہے جس میں خالی پِتّا مارنے کی بجائے اپنی پَت[1] اور پندار اَرپن[2] کرنا پڑتا ہے۔

خدمت سے انکاری اور محنت نہ کرنے کا عزم بالجزم والا لہجہ زیادہ عرصے قائم نہ رہا۔ اس لیے کہ ابتدائے ملازمت کی جھنجھلاہٹ دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی اور ذہن و احساس میں ایک نئی پختگی اور لہجے میں نئی گھلاوٹ آرہی تھی۔ "رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی" جو بقول اس کے اپنا جو ہر پندار، سرِ قریہ زر بیچ آیا تھا اور جس کو اس متاعِ گراں مایہ کے:

؎ جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

اب اپنے آپ سے صلح کرنے پر مائل نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی حیرتوں اور مایوسیوں سے وہ بصیرت حاصل کی ہے جو ارادوں کے فسخ ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اب وہ شہرِ ناپُرساں وکم نظراں

---

[1] پت: (ہندی) عزتِ نفس۔ آبرو

[2] ارپن: (ہندی) دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے یا منانے کے لیے بھینٹ چڑھانا۔

سے اتنا نالاں نہیں رہا۔ اب وہ ملکوں ملکوں، گھاٹ گھاٹ گھوم آیا ہے اور پیاسا نہیں لوٹا۔

یہ تیسرا دور ہے۔ اب شاعر غور و فکر پر مائل اور اپنے آپ سے باتیں کرتا نظر آتا ہے:

ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
کوئی تو ہوگا
کوئی نہیں ہے
کوئی نہیں ہے
تو کون ہے جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اُچھالتا ہے
جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے
نہیں کوئی ہے
نہیں کوئی ہے
کوئی تو ہوگا

بچھڑ کر زندہ رہنے والے عاشق اور کرکٹ کے بارہویں کھلاڑی کی پیشانی پر اب سوچ کی لکیریں اُبھر آئی ہیں۔

اس رُجحان و میلان پر خوشی بھی ہوتی ہے اور تعجب بھی کہ غزل میں بہت جلد اپنا مقام بنا لینے کے باوجود انہوں نے نظم پر برابر توجہ دی۔ سرِ دست یہ فیصلہ کرنا دشوار ہونے کے علاوہ غیر ضروری بھی ہے کہ وہ غزل بہتر کہتے ہیں یا نظم۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ امتیازِ مساوات کسی بھی شاعر کے لیے باعثِ رشک و افتخار ہوتا۔ تعجب اس لیے کہ غزل بڑی ظالم اور اَکل کھرّی صنف ہے۔ اپنی ہر سوکن کو مار رکھتی ہے اور اپنے چاہنے والے کو بھی کہیں اور کا نہیں رکھتی:

ع غزل کھا گئی نوجواں کیسے کیسے!

غزل کے معنی اُس کراہ کے بھی بتائے جاتے ہیں ''جو غزال بے بسی کی حالت میں نکالتا ہے، اُس وقت جب وہ بھاگ نہیں سکتا اور تیر اُس کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے۔''

غزل میں اوسط درجے کا اچھا شعر کہنا اتنا آسان ہے کہ سچ مچ کا خراب شعر کہنے کے لیے

مافوق البشر نالائقی کی ضرورت ہے۔ لیکن اعلیٰ شعر کہنا اتنا ہی دشوار ہے۔ غزل کے دو ترشے ترشائے مصرعوں میں ساری بات سمیٹنے کا ملکہ یا عادت ہو تو پھر نظم کا گھیر، پھیلاؤ اور archelectonics (حُسنِ ترتیب و تنظیم و ساخت) سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ اس طرح نظم کے mural پر چلنے والے برش سے ہاتھی دانت پر miniature پینٹ نہیں کی جا سکتی۔ افتخار عارف اس کٹھن منزل سے آسان گزرتے دکھلائی دیتے ہیں۔

افتخار عارف کو اپنے موقف، آہنگِ اضافت اور لہجے پر پورا اعتماد ہے۔ وہ اپنی بات جم کر کہتے ہیں اور پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں۔ کہیں کہیں آواز رنج و ملال سے بھرّا جاتی ہے، مگر اس کی گُونج اور گمک نہیں جاتی۔ انکسار کا اظہار بھی کرتے ہیں تو اپنی گلاہ کو کج ہی رہنے دیتے ہیں۔ مزاجاً ان کا رشتہ یگانہ سے ملتا ہے۔ وہ میؔر کے قبیلے کے آدمی نہیں۔ انہیں اعتراف ہے کہ ''ہم میؔر تو کیا ہوتے کہ غالبؔ بھی نہیں تھے۔'' ان کا عجز اپنی جگہ، مگر وہ وفورِ انکسار میں غالبؔ پر ہاتھ صاف کر گئے۔ غالبؔ میں ہمیں تو کسی کمزوری کے آثار نظر نہیں آئے، بجز اس کے کہ اس نے کچھ اشعار افتخار عارف کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنی ذات اور بات کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ ہی کا شکوہ نہیں، لہجے کا شکوہ بھی ہے۔ شکوہ بھی کرتے ہیں تو لہجے کے شکوہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لہجہ لفظ کی تیسری dimension (بُعد) ہے۔ یہ لفظ کو نئے معنی دیتا ہے۔ نئی توانائی، گیرائی اور رنگ و آہنگ بخشتا ہے۔ لہجہ لفظ کا اعتبار ہے۔ لہجہ لفظ کا سمپُورن ٹھاٹ ہے۔ لہجہ زیور نہیں، حرف کی حُرمت ہے۔ لہجہ محرمِ رازِ نہاں خانۂ دل ہے۔ لہجہ نیّتوں کا امین ہے۔ لہجہ آدمی کی پہچان ہے۔ لہجہ خود آدمی ہے۔ یہ نہ ہو تو لفظ کھوکھلے، بے رس، بے تاثیر...... فقط پُرشور آوازیں

ع نہ کوئی جوت، نہ جھنکار، نری آوازیں

افتخار عارف ذہنی سرشاری اور سربلندی کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ رجزیہ اور لہجہ احتجاج کا ہے۔ مناجاتی انداز میں بھی ان کے لہجے کا طنطنہ باقی رہتا ہے کہ

ع اُس کی ہر بات اک مقام سے ہے

ذاتی لحاظ سے تیسرا دور انتہائی آسودگی کا دور ہے۔ وہ لندن وارد ہوئے تو ان کے سامنے یہ مسئلہ تو نہیں تھا کہ

؎ ہم نے یہ مانا کہ لندن میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

اس پر یاد آیا کہ جب ہمارے دیرینہ رفیقِ کار جناب سلیم صدیقی نے، جو یہاں تشریف فرما ہیں، ہمیں اپنی ذاتی نگرانی میں پہلی بار لندن کا guided tour کرایا تو اس شہر کے سارے اسرار و رموز ایک ہی جملے میں کھول دیئے۔ وہ اپنے ہر کلیدی جُملے سے پہلے اپنا دایاں ہاتھ اور انگشتِ شہادت ہر دو کی پوری لمبائی تک سُوئے آسماں بلند کر کے اور بالجبر ''سر!'' کہہ کر اپنے مخاطبے کا آغاز کرتے ہیں۔ چناں چہ اس دفعہ بھی یہی کیا۔ یہاں اتنا اور بتا دوں کہ ''سر'' کہنے سے مخاطَب کو کسی مغالطے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ جب وہ ''سر'' کہیں تو اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں جو صرف ان کے مزاج و لہجہ شناسوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مطلب تو یہی کہ وہ اسے اپنے سے عمر میں دس سال بڑا اور عقل میں بیس سال چھوٹا سمجھتے ہیں۔ یوں تو ہم یو۔ بی۔ ایل کے پریسیڈنٹ تھے، مگر وہ ہمیں اس زمانے میں ''سر'' اس طرح کہتے تھے جیسے مارک انٹونی بُروٹس کے بارے میں بار بار کہتا ہے:

And Brutus is an honourable man.

بہر حال یہ بھی ان کی دلآویز ادا ہے جس کے ہم شیدائی ہیں۔ تو لندن کے بارے میں کہنے لگے کہ سر، یہاں کا اصل مسئلہ روٹی نہیں، اسے ہضم کرنا ہے! یہاں بھی افتخار عارف کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یادِ ماضی نے البتہ اُنہیں بہت ستایا۔ ''سوادِ رومتہ الکبریٰ میں'' پی ٹی وی کی یاد بہت آئی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنی کلاہ کی طرف سے فکر مند دکھائی دیتے تھے۔ کج کلاہی ان کی مجروح خودداری کا باوقار سمبل ہے۔ جب وہ لندن آئے تو خسرو کی طرح کہہ سکتے تھے کہ میں نے اپنی سمتِ قبلہ ایک کجکلاہ کی طرف راست کر لی ہے:

؎ من قبلہ راست کردم برطرفِ کج کلاہے

خسرو کا قبلہ تو کجل کلاہِ کج کلاہاں حضرت نظام الدین اولیا تھے، لیکن یہاں یہ کلاہ خود افتخار عارف کے سر پر تھی! اپنی کج کلہی کی جو قیمت انہیں ادا کرنی پڑی اُس کا جا بجا ذکر ہے۔ دُکھ کے ساتھ۔ مگر بغیر معذرت کے:

؎ یہ قرض کج کلہی کب تلک ادا ہوگا
تباہ ہو تو گئے ہیں اب اور کیا ہوگا

ہم نے ان کا سنہ قبل از تباہی کلام دیکھا ہے اور بعد از تباہی بھی۔ تباہی کے بعد ان کی طبع کی روانی،

کلام، صحت، منصب و مشاہرہ، مکان، کار، بینک بیلنس اور بنیان کا سائز، چشم بددور، بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ خدا ایسی تباہی سب کو نصیب کرے۔ آمین۔

پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے اب وہ اپنے حَجلۂ اَنا سے حُجرۂ استغنا کی جانب روانہ ہونے والے ہیں کہ یہی عرفانِ ذات کی منزل ہے۔ اور اس کی خاک سرمۂ چشمِ دانشوراں ہے۔ فیضی کہتا ہے کہ یہ وہ بارگاہِ ادب ہے جہاں بڑے بڑے سردار اور بادشاہ تاج کی بھیک مانگنے اُن خاک نشینوں کے حضور آتے ہیں جو برہنہ سر بیٹھے ہیں:

دریں بارگاہِ ادب، سروراں
جوئند تاج از برہنہ سراں

عصری عالمی شاعری اور اس کے تجرباتی اسالیب اور رجحانات سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا ڈکشن بُنیادی طور سے کلاسیکی رکھا ہے۔ اس کے پورے لوچ اور رچاؤ کے ساتھ۔ اس ڈکشن کو جدید تلازمات و علائم کے استعمال میں کہیں حارج نہیں ہونے دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی شاعری کی دوسری دہائی میں اس میں کتنی لچک، اُپج اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ المیۂ کربلا اور اس کی متعلقہ امیجری کو انہوں نے بڑے جذبے، توانائی اور معنویت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ لشکر، فرات، دشت، مشکیزہ، تیر، نوکِ سناں پر سر، بے ردا سر، جلتی ہوئی خیمہ گاہیں، بُریدہ بازو، فصیلِ شہر، قبیلہ، بیعت...... یہ سب ان کے شعر کی زرتار بُنت میں بار بار ابھرتے ہیں۔

اُفتادِ طبع کے لحاظ سے افتخار عارف احتجاج کے شاعر ہیں۔ احتجاج کا سبب، نوعیت اور لَے جو پہلے ان کے ذاتی کرب تک محدود تھی، اب آہستہ آہستہ اجتماعی دائرے میں پھیلتی نظر آتی ہے۔ کہنے کی بہت سی باتیں انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہی ہیں۔ جرأت سے جم کر کہی ہیں۔ احتجاج بظاہر ایک منفی رویّہ اور عمل ہے۔ لیکن جب تک انسان میں نیک و بد کی تمیز اور خوب سے خوب تر کی تمنا و جستجو باقی ہے، شاعر و فن کار احتجاج کرتے رہیں گے۔ احتجاج کسی مجرّد آزادیٔ فکر و اظہار کا نام نہیں۔ احتجاج آج کا ردّ و انکار اور کل کا اقرار و اعلان ہے۔ احتجاج کسی پکّے راگ کی مدّھم اور مکّھم لے نہیں، رَجز کے واشگاف بول ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" تو ہر وہ شاعر جو اپنے پیغام کو خوف یا مصلحت کے باعث مسخ کرتا یا خاموش رہتا ہے، وہ صریحاً خائن ہے کہ وہ ایک مقدس امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ انتباہ و احتجاج شاعر و فن کار کا حق بھی ہے اور فریضہ بھی۔ بابا فرید کہتے ہیں:

کوک فریدا کوک توں جیوں رکھا جوار
جب لگ ٹانڈا نہ گرے تب لگ کوک پکار

یعنی اے فرید، تو اپنی صدا اسی طرح لگا تا رہ جس طرح کھیت کا رکھوالا لگا تا ہے۔ جب تک فصل تیار ہو کر کٹ نہ جائے، ترا کام کوک پکار ہے۔ سو کوکتا رہ کہ یہی تیرا منصب ہے اور یہی تیرا نصیب بھی۔ میؔر بھی کیسے زخمی لہجے میں کہتے ہیں:

شاعر ہو، مت چپکے رہو، اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو، ابیات پڑھو، کچھ باتیں ہم کو بتاتے رہو

افتخار عارف چپ رہنے والوں میں سے نہیں ہیں۔

چادر، چاندبی بی اور کالم بھر چاندنی

زیادہ عرصہ نہیں ہوا، میں نے ایک ادبی تقریب میں اپنے خود ساختہ ہینڈی کیپ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگ مزاح نِگار سے کوئی سنجیدہ بات سُننے کے روادار نہیں۔ چنانچہ ایک نہایت ثِقہ پروفیشنل انجمن نے فرمائش کر کے مجھ سے بطور مہمانِ خصوصی اسلامی بینکنگ کے حق میں مزاحیہ تقریر کرائی تھی جس کا اُلٹا اثر ہوا۔ ملنگوں اور مجذوبوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کی اُوٹ پٹانگ بَڑ کا مطلب اہلِ غرض اپنے اپنے طور پر سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ میرا شمار بھی اِسی زُمرۂ ذُومعنی لفظ کاروں میں ہونا چاہیئے۔ اُسی زمانے میں ایک تعزیتی جلسے میں نہایت سنجیدہ مضمون پڑھا جسے مزاحیہ سمجھ کر سامعین نے تالیاں بجا بجا کے داد دی، جس سے مرحوم کی روح کو تکلیف، پسماندگان کو اذیّت اور...... جھوٹ کیوں بولوں...... مجھے تو خوشی ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شاعر کو اپنے کمزور شعر پر غلط داد سے جتنی خوشی ہوتی ہے، اُتنی خوشی اچھے شعر کی داد پانے سے نہیں ہوتی۔ ایک تقریب میں سچی لیکن بے محل سی بات کہنا پڑی کہ مزاح نگار اور خاتون افسانہ نگار کو میں ایک ہی بریکٹ میں رکھتا ہوں۔ سبب یہ کہ اگر کوئی اہلِ قلم، مزاح نگار کہلانے لگے تو پھر خواہ وہ مرثیے یا المیہ ڈرامے لکھنے لگے یا حاکمان و صاحبانِ اِمروز کا ''روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ'' ہی کیوں نہ لکھے، کہلائے گا مزاح نگار ہی! اسی طرح اگر کوئی لکھنے والی ایک بار ''خاتون افسانہ نگار'' کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو جائے تو پھر یہ چپکواں لیبل چھُٹائے نہیں چھُٹے گا۔ اُس کے فن پر جو ہُنر پوش شُٹل کاک بُرقع مردوں نے ایک دفعہ ڈال دیا، اُس کا نقاب اگر روز مرّہ استعمال یا کثرتِ رُونمائی سے جِھیر جِھیر اور لیر لیر ہو جائے اور وہ خاتون سرجیکل آپریشن سے جنس تبدیل کروا کے میری ہم جنس اور، نظر بد دور، میری ہم شکل لگنے لگے، یا اُس کے مولانا ایدھی جیسی چھا جائیل داڑھی یا پروفیسر پریشان خٹک جیسی شباب آلود مونچھیں نکل آئیں، تب بھی لوگ اُس دُکھیا کو سابق خاتون افسانہ نگار ہی کے نام و لقب سے پکاریں گے کہ یہی طعن آلود تشخص اُس کا مُقدر ٹھہرا! قراۃ العین حیدر اور ہاجرہ مسرور کو اگر خاتون افسانہ نگار کہا جائے تو وہ بجا طور پر آزردہ ہوں گی۔ جب کہ ہمیں یا جون ایلیا کو اگر کوئی خاتون عظیم مرد شاعر کہے تو کم از کم راقم الحروف تو بہت خوش ہوگا۔ جون ایلیا

کی اور بات ہے، بلکہ کیا بات ہے! اُن کا تو فقط نام ہی مردوں کو امید افزا مغالطے میں ڈالنے کے لیے کافی ہے!

اُس وقت میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ تین برساتوں کے بعد ایسا بجوگ پڑے گا کہ ایک مزاح نگار کو ایک خاتون افسانہ نگار پر مضمون پڑھنا پڑے گا۔ اگلے وقتوں میں دو نیک ستاروں کے ایک بُرج میں جمع ہونے کو قران السعدین کہتے تھے۔ لیکن دو دُمدار ستاروں کو ایک دوسرے کی قسمت کا حال بتاتے دیکھا نہ سنا۔ جو کچھ فلک دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

آج کی رونقِ محفل محترمہ بُشریٰ رحمٰن ایک کثیر التصانیف اور جامع الحیثیات ورحیثیات ادیبہ ہیں۔ ناول نگار، افسانہ نویس، سیاست داں، سابق ممبر پنجاب اسمبلی، ممتاز سماجی کارکن، فعّال فیمی نسٹ (feminist)، شعلہ بیان خطیبہ، شاعرہ، کالم نگار، ایڈیٹر و پبلشر، ایک سلسلۂ عالیہ سے بیعت، بے شمار عُمرے اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو نو سے زیادہ حج کر چکی ہیں۔ جو بارہ اوصاف ابھی میں نے گنوائے ہیں' اُن میں سے ایک بھی عاجز کی ذات بے صفات میں نہیں پایا جاتا۔ گمانِ غالب ہے کہ صرف اور صرف اسی مُنفرد و منفی کوالیفیکیشن کی بنا پر مجھے محترمہ کے فن و شخصیت پر اظہارِ رائے و رشک کی دعوت دی گئی ہے:

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، عبادت کیا، صدا کیا!

بشریٰ رحمٰن کا پہلوٹی کا افسانہ ''یادوں کے دیپ جلے'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تو نام خدا اُن کی عمر صرف دس برس تھی! یہ افسانہ ہم نے چالیس برس بعد پڑھا ہے۔ اتنی کچی عمر میں ایسی پکی پکی باتیں کی ہیں کہ اب کہیں جا کے کچھ کچھ ہماری عقل میں آئی ہیں۔ پر بہت دیر ہوگئی۔ ایسی دیر آشنا عقل کو مُخاطِب کر کے یہی کہہ سکتے ہیں کہ

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!

دس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو بچّہ اگر قتل بھی کر دے تو جیل میں نہیں سڑتا۔ والدین البتہ خراب و خوار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کیا ہے کہ میں بارہ برس کی عمر سے اپنی شادی تک باقاعدہ ڈائری لکھتی رہی۔ ہم نے اس ڈائری کے اقتباسات بھی لطف، حیرت اور رشک کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ پڑھے ہیں۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں جادو رقم قلم پکڑنا تو دور کی بات ہے، ہمیں تو ڈھنگ سے غُلیل پکڑنی بھی نہیں آتی تھی۔ چُلبلی چڑیا پر کبھی ٹھیک نشانہ نہیں لگا۔ نشانہ آج بھی

خطا ہوتا ہے۔ ہاں، چڑیا خود ہی ترس کھا کہ ہمارے قدموں پہ آن کے خودکشی کر لے تو کریڈٹ اسی کو جاتا ہے۔

ہم پیرومرشد حضرت ممتاز مفتی کی ہیرا تراش خاکہ نگاری کے دل سے قائل وقتیل ہیں۔ مرزا انہیں ''گرینڈ اولڈ مین آف اردو لٹریچر'' کہتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے، قلم اور زیادہ جوان بلکہ نوجوان ہوتا جا رہا ہے۔ ہم انہیں یکے از صاحبانِ کیف وحال سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا کے سب سے زیادہ تُند و تیز نشے کے عادی ہیں۔ وہ نابوکوف کی طرح لفظ کا نشہ کرتے ہیں، جس کا کوئی اُتار نہیں۔ ایسے ہی کسی نشے کے بارے میں اُستاد ذوقؔ کہہ گئے ہیں:

پیر مُغاں کے پاس وہ دارُو ہے جس سے ذوقؔ
نامَرد مرد، مرد جواں مرد ہو گیا!

مفتی صاحب نے ایک دلچسپ تکنیک ایجاد کی ہے۔ انہوں نے ہر شخص کے باطن میں ایک طوائف دریافت کی ہے۔ اسی کلیدی استعارے کے حوالے سے وہ اپنے ہر ممدوح و ممدوحہ کی شخصیت کا تجزیہ اور بعض اوقات تیا پانچا کر دیتے ہیں۔ اپنے رفیق دیرینہ محبی اشفاق احمد خاں کے اندر بیٹھی ہوئی طوائف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''طوائف کی پشواز کبھی کبھی کُھلنے لگتی۔ اس لیے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نمایاں تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بھڑکیلی تھی۔ ہر فن کار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں ننگی، کسی میں اَدھ کُھلی۔ کسی میں مستور۔ مثلاً ابوالاثر (حفیظ جالندھری) میں بالکل ننگی تھی۔ محمد طفیل میں مستور ہے۔ انتظار میں اَدھ کُھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگٹ نکال کے سامنے بیٹھی رہتی ہے۔''

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کے پوچھیں تو سہی کہ تمہارے اندر جو ڈیرے دار طوائف تمہارے نام پر بیٹھی ہے، وہ کس حال میں ہے۔ اندر سے جواب آیا کہ طوائف لفظ کے جال، جی کے جنجال میں ہے۔ تماش بینوں اور اجنبیوں کے سامنے مُجرا نہیں کرتی۔ صرف اپنی ہم پلّہ طوائفوں کے سامنے فُولز کیپ (fool's cap) اور پرانی داستانوں کے زرد اتے، پپڑاتے اوراق سے بنی کاغذی پشواز پہن کر ناچتی گاتی اور رنرت بھاؤ بتاتی ہے۔ اس کی مصیبت یہ ہے کہ ناچتے میں ہنستی بہت ہے۔ گھنگھروؤں کی چھما چھم اس کی بے تحاشہ ہنسی کی کَھل کَھل میں سنائی نہیں دیتی۔ ہنسی سے اپنے ہُنر اور ناچ کا خود ہی ناس مار دیتی ہے!

وہ عفیفہ فرشی سلام کرتی ہوئی رخصت ہوئی تو ہمیں کُرید ہوئی کہ ذرا سُراغ تو لگائیں کہ بشریٰ رحمٰن

کے اندر کون براجمان ہے۔ کہیں ان کے اسم با مُسمّیٰ میاں، میاں عبدالرحمٰن تو ادیبوں کی ڈیرہ دارنیوں کا مجمع لگائے، پشواز پہنے اور آداب بجالانے پر لیکچر نہ دے رہے ہوں۔ مگر خدشہ غلط نکلا۔ پتا چلا کہ بشریٰ بی بی کے اندر تو مذکورہ بالا بارہ صفات والی بارہ بُشرائیں بیٹھی ہیں اور بارہ کی بارہ میاں عبدالرحمٰن کے حبالۂ نکاح میں ہیں۔ سب بارہ دری میں چادر کا بُکل مارے، دوزانو بیٹھی میاں کی مالا جپتی اور جھوم جھوم کے خواجہ فرید کے ابیات پڑھتی ہیں۔ بارہ دری کا ہر در دِلکشا ایک حجرۂ ہفت بلا میں کھلتا ہے، جہاں اُس نے طَربِ زیست اور کربِ آگہی، دونوں کا ذائقہ چکھا اور بے مزہ نہ ہوئی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ مانگے تانگے کے اس استعارے سے ہمارا عجزِ فکر و بیان جھلکتا ہے۔ دراصل ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ خدا اس جوڑے کو نظرِ بد سے بچائے، ان کی آسودہ ازدواجی زندگی کو وہ لوگ بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنھیں پڑوسی کا لان زیادہ سبز اور اس پر کھلے عارض کے گلاب زیادہ سُرخ نظر آتے ہیں۔ سہرے کے پھول مرجھانے سے پہلے ہی دولہا سبز سے سبز تر اور سرخ سے سُرخ تر کی تلاش میں دائیں بائیں کنکھیوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ قصور آنکھ کا نہیں دل کا ہے۔ کسی دانائے رازِ دُرونِ خانہ کا قول ہے کہ شادی ایک ایسی رومینٹک کہانی ہے جس میں ہیرو پہلے ہی باب میں فوت ہو جاتا ہے! مگر ان دونوں کے کیس میں ایسا نہیں ہوا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس کہتے ہیں کہ ان کے اِزدواجی رومانس نے آبِ حیات نہ صرف پیا ہے، بلکہ غُسل بھی اسی سے فرمایا جاتا ہے! دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی وجہ شہرت بھی ہیں۔ فقیر تو اس بی بی کو بس یہی دعا دے سکتا ہے کہ

؎ شوہر نامدار کو اور بھی نامدار کر

بشریٰ بیگم کی ذہانت، فقرہ طرازی اور قلم کاٹ سے بڑے بڑوں کا ناطقہ بند ہوتے دیکھا ہے۔ اگر اُن کے قلمِ مردافگن سے امان پاؤں تو ایک مرتبہ پھر حضرت ممتاز مفتی کا قول نقل کرنے کی جسارت کروں گا۔ نقلِ کُفر کا شمار کفر میں نہیں ہوتا۔ چالاکی اور بُزدلانہ دلیری میں ہوتا ہے!

''بشریٰ رحمٰن جاگیردارنی تھی۔ رحمٰن نو دولتہ تھا۔ یہ رکھ رکھاؤ کی گود میں پلی تھی۔ وہ ''ٹپر واسیا'' (پنجابی میں خانہ بدوش کو کہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ رحم وہ مرد ہوتے ہیں جو اہلخانہ بدوش پھرتے ہیں۔) تھا۔ یہ کومل تھی، وہ تیور تھا۔ یہ بھیرویں تھی، وہ دیپک تھا۔ شبنم اور شعلے کا میل دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں نے رحمٰن سے پوچھا، یہ سبز پری کہاں سے اٹھا لایا ہے۔ تو بولا، ہمارے نصیب میں سبز پریاں ہی لکھی ہیں۔ میں نے کہا، اب کیا ہوگا؟ بولا، اب ہم اس کی رکشا کریں گے۔ میاں بیوی کے تعلق

کے اسرار سمجھنا میرے جیسے کتابی آدمی کے بس کی بات نہیں۔ تخلیے کے بھید کس نے جانے ہیں...... پتا نہیں کون کس کی رکشا کر رہا ہے۔ رحمٰن کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ بشریٰ کی رکشا کر رہا ہے۔ بشریٰ کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ رحمٰن کی رکشا کر رہی ہے۔ شاید دونوں ہی ایک دوسرے کی رکشا کر رہے ہوں۔''

ہم تو اس کا یہ مطلب سمجھے کہ میاں عبدالرحمٰن، بشریٰ کے محافظِ خصوصی اور بشریٰ میاں صاحب کا بازوئے شمشیر زن ہیں۔

بشریٰ رحمٰن اپنے سفر کے کسی مرحلے میں بھی حفاظتی بیلٹ کی محتاج نہیں رہیں۔ نہ ایسے شوہر کی دستِ نگر جو اپنی انٹلکچویل بیوی کی اس طرح پاسبانی کرے جیسے وکٹ کیپر ہمہ وقت وکٹ کے پیچھے بحالتِ رکوع چوکس کھڑا رہتا ہے۔ وہ ہر حیثیت اور ہر میدان میں اپنی خود اعتمادی، ایک دلآویز ریاستی تمکنت، ذہانت وطلاقت اور بے خوفی کا لوہا منوا چکی ہیں۔ وہ سوچتی مردوں کی طرح ہیں، محسوس عورت کی طرح کرتی ہیں اور لکھتی اپنی ہی طرح ہیں۔ عورت کا سب سے بڑا مسئلہ مرد ہے، جو بیک وقت اُس کا بہترین دوست اور بدترین دشمن ہے۔

ے چمکارے، چمکار کے مارے
مارے، مار کے پھر چمکارے

لُغت میں بھی خصم کے معنی شوہر اور دشمن ہیں! کسی نہ کسی نہج اور عنوان سے یہی دوست نما دشمن اور حریف نما حلیف ان کی تحریروں، بالخصوص فکشن کا موضوع رہا ہے۔ اسی لیے مرد، ان کے کالم شوق، بے صبری اور اندیشے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی شریر لڑکا اپنے بارے میں تازہ ترین اسکول رپورٹ پڑھ کر اور اپنے والد کو پڑھوا کر یہ کہے کہ ابّو، اگر آپ ہماری کلاس میں ہوتے تو یہ مِس آپ کو اس سے بھی خراب رپورٹ دیتی!

دیکھیے، رکشا اور حفاظت والی بات ادھوری رہی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں خواتین فکشن نگاروں اور شاعرات کو جن مشکلات، خطرات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان سب کا سبب اور سر چشمہ مرد حضرات ہیں۔ ادیبہ یا شاعرہ اگر خوش شکل بھی ہو تو ان خطرات کو آپ سو سے ضرب دے سکتے ہیں۔ سو سے ہماری مراد سو مرد ہیں۔ بشریٰ ایک جگہ لکھتی ہیں ''عورت کی زندگی کا کوئی حصہ نہ اسکنڈل سے محفوظ ہے، نہ الزامات سے۔'' وہ غریب اگر اسے مذہبی فریضہ سمجھ کر بیمار پُرسی بھی کرے تو عیادت کو affair سمجھا جاتا ہے۔ رونا اس کا ہے کہ کم بخت بیمار خود بھی یہی سمجھتا ہے! اُس بچاری کو بچاؤ کے لیے اپنے گرد

تند جبینی، ترش رُوئی اور تنو مند محرموں کا حِصار کھینچنا پڑتا ہے۔ صورت کچھ اسی سے ملتی جُلتی ہے جس کی تصویر امیر خسرو نے کچھ یوں کھینچی تھی کہ جب بادشاہِ حُسن نکلتا ہے تو چہار سُو عاشقوں کا اژدحام ہوتا ہے۔ ایک طرف چابک سوار ہوتے ہیں اور دوسری طرف مسکین گدا۔

سلطان خوباں می رود، ہر سُو ہجومِ عاشقاں
چابک سواراں یک طرف، مسکین گدارا یک طرف

چابک، غالباً کیا یقیناً، گھوڑوں کے بجائے مستحقین یعنی عُشاق کی پیٹھ کی تواضع کے لیے ہوتے ہیں۔ اس شعر میں مسکین کا مطلب مسکین ہی ہے۔ یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ دُبئی میں ہمیں ایک دوست نے بتایا کہ یہاں ایک بیوی والے شخص کو مسکین کہتے ہیں!

بعد میں خیال آیا کہ جس دُکھیارے کو ایک بھی نصیب نہ ہو، اللہ جانے اُسے یہ خدا و نا کتخدا ترس لوگ کیا کہتے ہوں گے۔

کراچی کی ایک نامور شاعرہ نے اپنے شوہرِ نامدار کی موجودگی میں ہمیں بتایا کہ مشاعرے میں ان کے شوہران کو ڈائس پر نہیں بیٹھنے دیتے۔ بلکہ بالکل آخری صف میں اپنے پہلو میں بٹھا کر خود خزانے کے سانپ کی طرح رکھوالی کرتے ہیں۔ جب نام سے پکارا جاتا ہے تو وہ ڈائس تک خدا حافظ کہنے جاتے ہیں۔ شعر کی داد کے جواب میں جُھک جُھک کے ''آداب، آداب'' کہنے سے بھی سختی سے منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، بعضا بعضا اس سے بھی excite ہو جاتا ہے۔ تم نہیں جانتیں ہم مرد کتنے حرامی ہوتے ہیں! کلام سنا کر وہ واپس حصارِ زوجیت میں آجاتی ہیں تو سُوں سُوں کرتے ہوئے سونگھتے ہیں کہ کپڑوں سے دیووں اور پریوں کی داستانوں والی مانس گند (آدم بُو) تو نہیں آرہی!

موصوفہ نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ اپنی تازہ غزل کسی رسالے کے ایڈیٹر کے نام پوسٹ کرنے کے لیے میاں کو دیتی ہیں تو وہ لفافہ کھول کر کلام کی اصلاح کرتے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے یہ بھی کہا کہ میرے اشعار میں جتنے بھی سکتے ہیں وہ سب شوہرانہ اصلاح کے باعث ہیں۔ ہجر و فراق سے متعلق جتنے بھی اشعار ہوتے ہیں، ان پر سیاہ مار کر پھیر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب میں چوبیس گھنٹے تمہارے کولھے سے لگا بیٹھا رہتا ہوں تو پھر دُوری و مہجوری کا رانڈ رونا کاہے کو؟

وہ جب یہ بیان کر چکیں تو شوہر نے فرمایا ''بخدا، مجھے تمہاری پاکدامنی میں ذرہ برابر شبہ نہیں، مگر تمہاری حماقت پر کامل یقین ہے!''

حرفِ مُدّعا تک آنے سے پہلے ایک وارداتِ قلبی اور بیان کرتا چلوں۔ اس واردات کا تعلق

میرے بائی پاس شدہ قلب سے نہیں ہے۔ سیکڑوں آبگینوں کو ٹھیس لگی۔ ہوا یہ کہ ایک شاعرہ جن کی شکل ماشاء اللہ اُن کے کلام سے بدرجہا بہتر ہے...... یعنی چشم مستِ عجبے، زلف درازِ عجبے ...... بیرون ملک مشاعرہ پڑھنے گئیں۔ لوگ شعر کا مطلب و مفہوم اُن کی شکل دیکھ دیکھ کر سمجھتے اور خوب داد دیتے تھے۔ پھر ایک متموّل اَدا شناس نے تالی بجاتے بجاتے اُسے شادی کی انگوٹھی پہنا دی۔ یوں کہیے کہ اُس نے انگوٹھی اُس کی انگلی میں نہیں پہنائی، بلکہ ایک جلاّد نے مداحوں اور آرزومندوں کے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ شادی کی خبر ملتے ہی ان حلقوں میں ایسی صفِ ماتم بچھی کہ اس کا ایک سرا پشاور میں اور دوسرا کراچی میں تھا۔ بعضوں نے بقیہ عمر رائگاں مردانہ عدّت میں گزارنے کا عہد اور اعلان کیا۔ وہ سکتہ جو اُن کے اشعار میں پڑتا تھا اب خود اُن پر پڑا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس دِلا سا دیتے دیتے اور نعم البدل کی امید دلاتے دلاتے ایسے مایوس ہوئے کہ تھک ہار کے اسی صفِ عدت گزاراں میں جا بیٹھے۔ کرنا خدا کا اور خاتون کے خدائے مجازی کا ایسا ہوا کہ وہ چند ماہ بعد پاکستان واپس آگئیں۔ سوکھے دھانوں پر پانی پڑا۔ سُوکھے دھانوں سے ہماری کیا مراد ہے یا بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس مشبّہ کون ہے اور مشبّہ بہ کون...... وہ تو جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی ہمارے ذہین و باخبر سامعین و قارئین نے بھانپ لیا ہوگا۔ موصوفہ کی مبیّنہ طلاق کا مبیّنہ مژدہ سُن کر ایسی خوشیاں اور جشن منائے گئے کہ کسی شہزادی کی شادی میں بھی فرطِ مسرّت و شادمانی کا ایسا سماں چشمِ فلک نے نہ دیکھا ہوگا۔ امیدیں مر کے جی اٹھیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ چشم فلک کے علاوہ ہم نے بھی دیکھا کہ جب بھی کسی حسین ایکٹرس کی شادی ہوتی ہے تو اُس کے لاکھوں بلکہ کروڑوں فین اور پرستار غم و غصّے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک محسوس کرتا ہے کہ اُس کی ذاتی حق تلفی ہوئی ہے۔ دل ہی دل میں کہتا ہے ''بھلا اس بھڑ وے، اس بھڑ بھونجے، اس کلاؤن میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہے۔ میں تو جانوں جھک ماری ہے۔ پچھتائے گی۔''

(نوٹ: جو صاحب/صاحبہ متذکرہ صدر شاعرہ کا صحیح نام بتائیں گے انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔)

یہ تمہیدِ دلپذیر و غیبت آثار ہم نے اس لیے باندھی کہ بشریٰ رحمٰن کا طرزِ تپاک و تکلم بالکل مختلف ہے۔ وہ مردوں کو عورت سمجھ کر گفتگو کرتی ہیں اور مرد اسے ''کمپلی منٹ'' سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ مردوں سے مرعوب ہوتی ہیں، نہ خوف زدہ۔ وہ بے خوف و خطر اندرون و بیرون ملک جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں اور جدھر جاتی ہیں مردانہ ہجوم کائی کی طرح پھٹ کر انہیں راستہ دیتا ہے۔ انہوں نے اسمبلی کے الیکشن بھی لڑے ہیں۔ اور ایک الیکشن میں ہاری بھی ہیں۔ ہارنے کے تقریباً فوراً بعد ان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے اشارتاً ہمدردی کی تو ''نہ اُن کی جیت نئی ہے نہ اپنی ہار نئی'' کہہ کر اپنی نثر کی طرح مسکرا دیں۔ ان کی شگفتہ نثر پسلیوں میں انگلیوں سے گدگدی کر کے نہیں ہنساتی۔ بس

آپ ہی آپ ہنستی رہتی ہے:

کبھی آپ ہنسے، کبھی نین ہنسے، کبھی نین بیچ ہنسے کجرا

قبیلۂ شگفتہ نگاراں کے سرخیل حضرت ضمیر جعفری نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ بشریٰ رحمٰن کو مزاح نگاری کا ''ہلالِ جرأت، ملنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس کی نثر کا جادو جرأت، مسرت اور حیرت کے اجزا سے ترتیب پاتا ہے۔ جرأت جیسے چاند بی بی دروازے پر تلوار تانے کھڑی ہو۔ مسرّت جیسے کھِلی ہوئی کپاس کا کھیت ہنس رہا ہے اور حیرت جیسے گھوڑی نے زیبرا جنم دیا ہو۔''

ہم مرشدی ضمیر جعفری سے نہ صرف کُلّی طور پر متفق ہیں بلکہ بصد ادب اتنا اضافہ کریں گے کہ گھوڑی کے ہاں زیبرا پیدا ہونے پر دیکھنے والوں اور خود گھوڑی کو تعجب ہوگا ہی، لیکن سب سے زیادہ تعجب گھوڑے کو ہوگا!

پنجاب اسمبلی نے بشریٰ رحمٰن کو باقاعدہ ایک قرارداد کے ذریعے ''بُلبُلِ پاکستان'' کے خطاب سے نوازا۔ اسمبلی میں ان کی تصویر بھی بہترین پارلیمنٹرین کے عنوان کے ساتھ آویزاں ہے۔ ان کی کچھ فی البدیہہ تقریریں ہم نے بھی گوشِ نصیحت نیوش سے سنی ہیں۔ اور تقریر کی داد اس طرح ملتے دیکھی جیسے خوش ذوق سامعین مرصّع غزل کے ایک ایک شعر پر واہ واہ کر رہے ہوں۔ بذلہ سنج، حاضر جواب اور حاضر دماغ ایسی کہ اگر آپ انہیں گہری نیند سے جگا کر کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ تقریر کرنے کو کھڑا کر دیں تو نیم غنودگی کے عالم میں بھی ایسی پُر مغز اور شگفتہ تقریر کریں گی کہ خود ان کی نیم وا، نیند بھری آنکھیں سامعین کی پُر شور تالیوں سے کھلیں گی۔

اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ ایک سے ایک پھکڑ اور پھبتی باز، بڑے بڑے شیر دلیر جو اپنی مونچھیں اور دُمیں سُوئے فلک اُٹھائے دھاڑتے ڈکارتے پھرتے ہیں، ان کے سامنے چُوں نہیں کرتے، مگر دُم پھر بھی سوالیہ نشان کی طرح بلند رکھتے ہیں، اس لیے کہ وہ اسی حالت میں اکڑ کے رہ گئی ہے:

ٹک ٹک دیدم، دُم نہ کشیدم

نمونے کے طور پر اور ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے صرف دو مثالیں کافی ہیں:

فضل حسین راہی، ممبر پنجاب اسمبلی، اپنی تُرش و تیز فقرہ بازی کے لیے ایک زمانے میں بہت مشہور تھے۔ ایک دفعہ تڑپ کے بولے ''بیگم بشریٰ رحمٰن نے میری بات کو غلط سمجھا ہے۔ میں تو انہیں اپنی ماں

سمجھتا ہوں۔''

بشریٰ رحمٰن نے فوراً کھڑے ہو کر بڑی رسان سے جواب دیا ''میں فضل حسین راہی کی بے حد ممنون ہوں کہ وہ مجھے اپنی ماں سمجھتے ہیں۔ اس رشتے سے میں اُن کی خدمت میں التماس کروں گی کہ کسی روز گھر آ کر اپنے والد کو بھی دیکھ جاؤ۔''

فِقرہ اس خاتون کا زیور نہیں، زِرہ بکتر ہے۔

ایک دفعہ ناسازی طبیعت کے باعث بشریٰ کچھ دن اسمبلی سے غیر حاضر رہیں۔ اور اسمبلی سے وہ رونق اور چونچالی بھی غائب رہی جو ان کی بذلہ سنجی سے عبارت تھی۔ جب وہ صحت یاب ہو کر لوٹیں تو وزیر معدنیات غلام حیدر وائیں نے اسمبلی میں بڑی گرمجوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ''محترمہ کی صحت یابی کی خوشی میں میں ایک شعر ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔'' پھر انہوں نے ایک فلمی غزل کے شعر کو مزید بگاڑ کے اس طرح پڑھا کہ مطلب ضرورت سے زیادہ واضح ہو گیا:

آج کے روز وہ آئے ہیں بڑی دیر کے بعد
آج کا روز بڑی دیر کے بعد آیا ہے

جواب آں غزل کے طور پر بشریٰ بولیں ''جناب اسپیکر، جناب غلام حیدر وائیں بڑے اچھے سیاسی کارکن ہیں۔ آپ کے توسط سے بندی اُن کی خدمت میں التماس کرتی ہے کہ آئندہ بسوں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوئے شعر نہ پڑھا کریں، ورنہ پنجابی فلموں والے ان کو پکڑ کے لے جائیں گے، کیوں کہ پنجابی فلموں میں ابھی تک ان کی عمر اور ان کے سے تن و توش کے ہیرو آ رہے ہیں۔''

محبی و مخدومی کرنل محمد خاں صاحب نے بشریٰ رحمٰن کے سفرنامے ''براہ راست'' کے فلیپ پر ان کی طرز تحریر کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے ''کاش یہ کتاب میں نے لکھی ہوتی۔ میں چاہوں بھی تو بشریٰ رحمٰن جیسا شگفتہ نہیں لکھ سکتا۔'' ہم تو کرنل صاحب جیسا شگفتہ بھی نہیں لکھ سکتے۔ لہٰذا بشریٰ رحمٰن کے نقشِ قلم پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب اپنی اور کرنل صاحب کی مبیّنہ کوتاہ قلمی پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ بشریٰ رحمٰن کی طرح لکھنے کے لیے دو الیکشنوں اور چار زچگیوں سے گزرنا اور میاں عبدالرحمٰن کی زوجیت میں ہونا اَزبس ضروری ہے، جس سے کم از کم میں قاصر ہوں۔ کرنل صاحب کی خداداد صلاحیتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اپنے ایک انٹرویو میں بُشریٰ نے کہا تھا ''عورت کو خاک کرنے کے لیے صرف ایک بچہ ہی کافی ہے۔'' لیکن چار پیارے پیارے بچوں کے بعد خواجہ غلام فرید کی یہ دیوانی اس طور خاک ہوئی کہ سرمۂ چشمِ دانشوراں بن گئی۔

میں نے بُشریٰ رحمٰن کے سفرنامے ''ٹک ٹک دیدم نو کیو'' اور ''براہ راست'' بڑے شوق سے پڑھے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والے سفرناموں میں یہ تنہا سفرنامے ہیں جن میں سڑک پر چلتی خوش شکل خواتین کا ذکر اُنہیں فی الفور اپنے عقد نکاح یا غُرفۂ عشرت میں لانے کی نہفتہ خواہش کے بغیر کیا گیا ہے! یہ خوبی بیگم اختر ریاض الدین کے سفرناموں میں بھی تھی۔ مگر انہوں نے تو بیچ مُچ قلم توڑ دیا اور اپنی زندگی سماجی بہبود اور رفاہی کاموں کے لیے وقف کردی۔ انہیں خواتین کا مولانا ایدھی کہنا چاہیے۔ سفرناموں کا ذکر کرنل محمد خاں کے سفرنامے ''بسلامت روی'' کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے ہر تیسرے صفحے پر ایک نئی حسینہ عزیز از جان اور دشمن ہوش وکیش (cash) نمودار ہوتی ہے۔ ابھی وہ ٹھیک سے آنکھ سے اوجھل اور دل سے دور نہیں ہو پاتی کہ ایک اور قتّالہ مُسافر کے ایمان کی آزمائشِ جاریہ کے لیے نقاب و ورق اُلٹتی ہے۔ کرنل صاحب نے اتنی ساری میمیں قاری پر بیک وقت چھوڑ دی ہیں کہ ہم جیسے آدمی کا کمزور دل پیہم نسوانی تجلّیات کی تاب نہیں لاسکتا۔

الحمدللہ، بشریٰ رحمٰن کے سفرنامے زبان واملا کی غلطیوں، مردانہ لغزشوں اور ایسی ویسی عورتوں کے ذکر سے پاک ہیں۔ یادش بخیر ہم نے بھی ایک طویل سفرنامے کا ڈول ڈالا تھا۔ ملکوں ملکوں گھومے، لیکن چونکہ بیگم ہمراہ تھیں، لہٰذا ہمارا سفرنامہ کسی پہنچے ہوئے سادھو اور سنیاسی کی تیرتھ یاترا معلوم ہوتا تھا۔ پہنچے ہوئے سے ہماری مراد بیوی تک پہنچے ہوئے سے ہے۔ پکّی عمر کے لوگ...... پکّی عمر سے ہماری مراد ہے عمرِ یاس وبَر اس کو پہنچے ہوئے سادہ دل بندے......کبھی کبھار ہماری طرح تنِ تنہا نکل بھی جاتے تو

سوادِ رومتہ الکبریٰ میں بیوی یاد آتی ہے

دیکھیے، عالی جی بھی ہماری طرح جہاں بھی جاتے ہیں اپنی بیگم کو کیسی محبت، کیسی للک سے یاد کرکے اپنے شہباز کو چیلوں اور چڑیلوں سے لڑا دیتے ہیں:

کئی بار کیے ہیں ہم نے سات سمندر پار
گھر والی سی کوئی نہیں تھی، ناریں ملیں ہزار

ہمارا پسندیدہ یہ نظر وز وجہ فریب دوہا اس لائق ہے کہ ہوشمند مرد جو یکّہ وتنہا بلکہ ہکّا بکّا وتنہا یورپ اور امریکہ میں منزل بہ منزل اور ہر منزل پر شب خون مار کے گھر لوٹے تو اپنی بھولی بیگم کو سُنائے اور اپنی نیک چلنی اور نابینا ہونے کے ۱۰۰ میں سے ۱۰۵ نمبر حاصل کرے...... پانچ زائد نمبر ترنم سے سنانے کے! ماننا پڑے گا کہ عالی جی نے بات خدا اور جی کو لگتی کہی ہے۔ عالی جی کی طرح ہم نے بھی سارا یورپ مردانہ

نظر کی چھلنی سے سو بار چھان مارا، لیکن صاحب، توبہ کیجئے۔ ہماری coloured بیگم کا مقابلہ وہ colourless چڑیلیں کیا خاک کریں گی۔ خالی پھیکے سفید رنگ کو لے کر کوئی کیا چاٹے؟ سفید تو مُولی، سنکھیا اور لیئی بھی ہوتی ہے۔ سفید رنگ تو پھوڑے پر باندھنے والی پلاسٹر اور پٹی کا بھی ہوتا ہے۔ کسرِ نفسی برطرف، ہمیں تو اپنے جیسے ناک نقشے اور پختہ رنگ کا کوئی native مرد سارے یورپ میں ایک بھی نظر نہ آیا۔ ستی سُندر نار تو دور کی بات ہے، ہماری خیر و عافیت تو کسی بُری عورت نے بھی نہ پوچھی کہ "پردیسی! ٹریولرز چیک سینے سے لگائے بولائے بولائے کاہے کو پھر رہے ہو؟ میں تو صرف ۲۵ پونڈ کی دوری پر ہوں۔" قصہ دراصل یہ تھا کہ اُتر جائیں کہ دکھن، سنگ وہی ایک سدا سہاگن۔ حد تو یہ کہ بُری عورت ہمیں کشور ناہید کی "ایک بُری عورت کی کتھا" میں بھی ڈھونڈے سے نہ ملی۔ اس کتاب کو ہم نے بڑی بے صبری سے ایک ہی رات میں پڑھ ڈالا۔ اس میں بُرے مردوں کی جھلک البتہ نظر آئی، لیکن بُرے مردوں کو دیکھنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کر کے کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا تو جب بھی کسی جیتے جاگتے گنہ گار آدمی کو جی دیکھنے کو چاہتا ہے تو کتاب پھینک کر، آئینے کے سامنے جا کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور استغفرُ اللہ، استغفرُ اللہ کرتے واپس آتے ہیں!

سفر کے دوران اس بی بی نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور آئینۂ تحریر میں ہمیں بھی بہت کچھ دکھایا۔ دیس دیس گئی اور نگر نگر گھومی، پر اپنے وطن کے موتیا اور صحرائے چولستان پر اُترتی خُنک چاندنی کو نہیں بھولی۔ لندن دیکھا، پیرس دیکھا، امریکہ اور کینیڈا کے سبھی شہر دیکھنے کی طرح دیکھ ڈالے۔ پر وہ جو عالم میں انتخاب ایک شہر ہے وہ ان کے وجود میں خوشبو کی مانند بسا ہے۔ سب کچھ دیکھنے اور ایک ایک منظر دکھانے کے بعد انہیں

ستلج پر اپنا وہ شہر پُرانا اچھا لگتا ہے

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، باؤلی بھکارن اور نسیما جانبِ بطحیٰ، حج اور عمرے کی روداد ہیں۔ ان سے سفرناموں کی سب سے بڑی خوبی وہی ہے جو کسی بھی کتاب کی ہونی چاہیئے، یعنی readability۔ جس کتاب میں یہ خوبی نہ ہو اُسے یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر لینا چاہیئے تا کہ پروفیسروں کو عبرت اور وسیلۂ معاش کا سامان مُیسّر ہو۔ readability کا ترجمہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس تشویقِ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں واقعی ترجمے کی خوبی و خصوصیت پائی جاتی ہے۔ یعنی اصل سے زیادہ مشکل، گنجلک اور اسطوخودُوس! (اب ہم آخری لفظ کا املا اور تلفظ اسطوقدُوس کرنے لگے ہیں! وجہ ظاہر ہے۔)

بشریٰ pen and ink والی دیدہ ریز باریکیوں سے تصویر کو گرانبار نہیں کرتیں۔ وہ دھیمے دھیمے

پیسٹل رنگوں سے اپنے قاری کو ہر ملک سے قریہ بہ قریہ، کوچہ بہ کوچہ، چہرہ بہ چہرہ رُوشناس کرتی ہیں:

؎ نہ آئی فقط کر کے درشن میں تنہا
اُٹھا لائی آنکھوں میں ساری نگریا

(حقّی صاحب سے معذرت کے ساتھ)

اپنی خطابت کے حوالے سے وہ بلاشبہ طوطیِ پاکستان ہیں۔ سفر اور سفرناموں کے حوالے سے ابن بطوطہ بہت مشہور ہے۔ ایک مدّاح کی تجویز ہے کہ بشریٰ رحمٰن کو طوطی کے علاوہ بنت بطوطی کا خطاب بھی دیا جائے کہ ان دونوں میدانوں میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

انہیں نازک مقامات سے آسان گزرنے کا فن آتا ہے۔ اچھا ناول یا افسانہ نگار جو چاہِ یوسف دوسروں یعنی اپنے کرداروں کے لیے ضرور تا کھودتا ہے، اُس میں گرنے سے اپنے فن کو......اور خود کو بھی ......صاف بچالے جاتا ہے۔ اپنے مخصوص euphemislic تکنیک (خوش لفظی۔ سخت، تلخ، ناگفتنی یا نیچے دُردوں نیچے بُروں کیفیت کو ملائم اور گوارا پیرایے میں بیان کرنا) کو انہوں نے جا بجا ایسی خوبصورتی اور مہارت سے برتا ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ بعض inhibitions کو بڑی دلیری اور چابکدستی سے، کبھی اپنے ہیرا تراش فقرے سے اور کبھی حُسنِ بیان کے مخملی پیرایے سے توڑتی چلی جاتی ہیں۔ عزیزی یونس بٹ ایک صاحب اُسلوب، ذہین وطنّاز مزاح نگار ہیں۔ ہم نے جب اُن کے ایک مضمون میں یہ پڑھا کہ بشریٰ رحمٰن کی کہانیاں پڑھ کر ''بندہ متاثر ہو نہ ہو، بالغ ضرور ہو جاتا ہے'' تو یہ عُقدہ کُھلا کہ نورِ چشمی یونس سلمہ، کے معصوم سے چہرے پر راتوں رات گھنی گھنی مونچھیں کیسے نکل آئیں۔

؎ یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ چہرے پہ جنگل کھڑا ہو گیا!

یہاں یہ اعتراف لازم ہے کہ یونس بٹ کا معنی خیز جملہ بھی ''یوفیمزم'' کی دلچسپ مثال ہے۔

مرزا ایک زمانے میں بکری کے گوشت کے بغیر لقمہ منہ تک نہیں لاتے تھے۔ تنجن یعنی وہ میٹھے چاول جن میں گوشت ڈالا جاتا ہے، زندگی میں پہلی اور آخری بار انہیں کے ہاں چکھا، جس کی کراہت آج بھی ذہن و زبان پر باقی ہے۔ پھر ایک دن سنا کہ امتحان میں ڈرامہ کے پرچے میں فیل ہونے کے باوجود برنرڈ شا کی تعلیمات سے ان کا قلب ایسا گداز ہوا کہ یکایک ویجی ٹیرین ہو گئے۔ اور مظلومہ یعنی بکری کو ایسی شفقت اور پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگے کہ اگر کوئی بکرا دیکھ لیتا تو وہیں سینگ گھونپ کے خون

کر دیتا! یہ سب کچھ ہوا مگر گوشت کی طلب اور بُھوک نہیں گئی۔ idealist یعنی آدرش پسند آدمی ہیں۔ وہ کوئی ایسی طلسماتی ترکیب دریافت کرنا چاہتے تھے جس کی مدد سے وہ بکری کی جان لیے بغیر اُس کے سری پائے کھا سکیں! یہ بُھولا بسرا واقعہ ہمیں بشریٰ رحمٰن کی انتہائی محبت' عقیدت اور ہُنر مندی سے لکھی obituaries (وفیات) پڑھ کر یاد آیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر کرم حیدری پر ان کے دل گُداز تعزیتی مضمون پڑھ کر مرزا کہنے لگے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میرے فوت ہوئے بغیر بشریٰ مجھ پر بھی کالم لکھ دیں۔

اس پر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔اے، بی ٹی اپنی مُنشیانہ زبان میں بولے کہ برادرِ من، فوتیدگی کے بغیر آبدیدگی ممکن نہیں!

بشریٰ نے اپنے مرحوم خُسر کا لازوال خاکہ جس محبت اور دردمندی سے لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ساس سسر، موسم اور حکومت کے خلاف لکھنے کے لیے دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا پڑتا۔ ہاں، ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنے کے لیے بڑی کشادہ دلی، ذہنی دیانت اور بعض اوقات موٹی کھال اور اتنی ہی موٹی نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی محبت اور سعادت مندی کا ثبوت ہی نہیں، قلم کا بھی اعجاز ہے کہ ایک مرحوم بزرگ کو زندہ لا کھڑا کر دیا! دیکھنے والے اس تصویر پر ستایش کے پھول نچھاور کرتے رہیں گے۔

ایک دن ہم نے اپنی بہُو کو یہ خاکہ پڑھوایا۔ بہت پسند آیا۔ ہم نے کہا، دیکھو، ایسی بھی بہویں ہوتی ہیں جو اپنے خُسر کی ایسی تعریف کرتی ہیں!

بولیں' مگر اُن کا تو انتقال ہو چکا ہے!

ناول ہو یا افسانہ، سیاسی تقریر ہو یا شعر یا اخباری کالم، ان کی تحریروں میں فیَمی نزم (feminism) کی بتلی زیریں لہر صاف نظر آتی ہے۔ ہمیں فیمی نزم سے کوئی کد یا چڑ نہیں۔ لیکن فیمی نسٹ خواتین اور ان کی خطابت سے ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ کہ اُن سے اختلاف کیا جائے تو خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم متفق ہو جائیں تو اور زیادہ خفا ہوتی ہیں۔ خاموش رہیں تو اسے شاوِنزم کا عیارانہ کیموفلاژ اور مردانہ ڈھٹائی سمجھ کر اس انداز سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں کہ بالکل نارمل لگتا ہے۔ نارمل سے ہماری مراد ہے کہ میاں بیوی کا سا ڈائلاگ لگتا ہے۔ میاں بیوی کی گھمسان کی جنگ یا اتفاقیہ جھڑپ میں فتح ہمیشہ اُس کی ہوتی ہے جو پہلے رو دے! یہ اور بات کہ حق بھی اُسی کے پلّے اور آنسوؤں سے تر پلّو میں ہوتا ہے۔

یہ وہ آنسو نہیں جن کے بارے میں شاعر نے کہا تھا:

Tears, idle tears, I know not what they mean.

رونے اور رُلانے والا دونوں جانتے ہیں کہ آنسو بے وجہ نہیں۔ میری کوریلی ایک پُر جوش اور نامور فیمی نسٹ ہو گزری ہے۔ اُس کا قولِ فیصل روایتی آبِ زر کے بجائے مردوں کے آنسوؤں سے لکھنے کے لائق ہے۔ اُس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس تین Pets (پالتو جانور) ہیں جو شوہر کا مکمل نعم البدل ہیں! ایک کتا ہے جو صبح سویرے سے غُرانا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا، طوطا ہے جو سہ پہر ہوتے ہی رٹی رٹائی گالیاں بکنے لگتا ہے۔ تیسرا، ایک بلا ہے جو رات کو دیر سے گھر آتا ہے!

یہ پشو پنچھی پالک ★ خاتون ہمارے سامنے یہ بات کہتی تو ہم اپنے جسدِ نامکمل میں بالترتیب چار ٹانگیں، چونچ اور دُم نہ ہونے کی ہا حسرت و یاس معافی مانگنے کے بعد عرض کرتے کہ آپ نے شوہر کے نعم البدل کے طور پر جانور بھی پالے تو ایکوں ایک بدذات نر! اس پر طرّہ یہ کہ تینوں کے تینوں کھاؤ اُڑاؤ اور سدا کے نکھٹو ٹھہرے! کماؤ ایک بھی نہیں۔ ان سے بہتر تو گدھا ہے کہ کتنا ہی بوجھ لاد دو، شکایت نہیں کرتا۔ دوسرا، بکرا ہے کہ جب جی چاہے ٹھنڈا پانی پلا کے گلے پہ چُھری پھیر دی۔ اور میڈم، بندر کیا بُرا ہے۔ طرح طرح کے منہ بنا کر ہم مردوں کی نقلیں اتارے گا۔ آپ کا جی بہلائے گا اور...... آخر کو مرد ذات ہے، یہی کرتب تماشائیوں کو دکھا کر تھوڑا بہت کما بھی لائے گا جس سے آپ کی اور آپ کے منہ بولے شوہر کی غریبا مئو گزر بسر ہو سکے گی۔

بشریٰ رحمٰن اپنے فیمی نزم کو جارحانہ لہجے اور رویے یا صنفی آویزش سے مختلط اور آلودہ نہیں ہونے دیتیں۔ طوطے کی طوطا چشمی اور بلّے کی شب خرامی کی تصویر تو کھینچتی ہیں، مگر نہ ٹانگ توڑنے کی دھمکی دیتی ہیں، نہ گلے میں گھنٹی باندھتی ہیں۔ مرد نے جو دبیز چادر مرد ہی سے محفوظ رکھنے کے لیے عورت کو اُڑھا کر چار دیواری کا جو مردانہ حصارِ عافیت و ملکیت اُس کے گرد کھینچ دیا ہے، اُس کے تِل برابر روزن سے چشمِ حیراں کو مردوں کی بنائی ہوئی دنیا کیسی دکھائی دیتی ہے، اس کا کچھ اندازہ اس مجموعے میں شامل تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔

مولانا نعیم صدیقی کی کتاب ''عورت معرضِ کشمکش میں'' کے مقدمے میں عورت کے فرائض اور مرد کے شدائدِ منصبی کے بارے لکھتی ہیں:

''گویا اصل اور حقیقی عورت اس عورت کے اندر ہوتی ہے جو بظاہر مشین نظر آتی ہے۔ اور دنیا کے ہر مرد کو وہی اصلی عورت درکار ہے، جو باورچی خانے میں ہو تو رسوئی سے اُس کے ہاتھوں کی خوشبو نکل

★ پشو پنچھی پالک (ہندی) مویشی اور پرند پالنے والا۔

رہی ہو۔ ڈرائنگ روم میں ہو تو اس کی خوبصورت گفتگو ماحول میں دھنک رنگ پتیاں برسا رہی ہو......
اور اگر بے ہنگمی کے لمحے میں ہو تو گویا الف لیلوی رات آسمان سے اُتر کر بستر پر بکھر جائے۔ خود سے الجھتا ہوا، زمانے سے لڑتا ہوا، طوفان کی طرح بپھرتا ہوا اور چٹان کی طرح چٹختا ہوا مرد ایسی عورت کے آنچل کی مہک سے ہر صبح صحیح سلامت نکل کر روزگار کے سمندر میں کود جاتا ہے۔ اور ہر شام چہرے پر نئی خراشیں لیے پھر اُسی کا سہارا لیتا ہے۔"

وہ بار بار نئے رُخ اور مختلف پینترے سے اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹتی ہیں۔ رقص کی ایک قدیم اصطلاح ہے تیرہ تالی۔ وہ باکمال رقاصہ جو تیرہ تالوں پر ناچ سکتی تھی تیرہ تالی کہلاتی۔ بشریٰ کی کہانیوں میں ایسی گرہستی عورت نظر آتی ہے جو اپنے خدائے مجازی کے سامنے تیرہ سے بھی زیادہ تالوں پر تھیا تھیا ناچ کے بے وجہ روٹھے ساجن کو سانجھ سویرے مناتی ہے۔ پاؤں کے چھالوں کی تپک کے باعث منہ سے نکلتی سسکیوں کو پائل کی جھنکار، چی تکار★ اور گرہست سنگیت میں سمونے اور سُر سے سُر ملانے کا ہُنر ایسے ستم زدگان کو زندگی خود سکھا دیتی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ ایک عام گرہستی عورت کی کہانی چادر، چار دیواری اور چاندنی پر ختم نہیں ہوتی۔ اس میں ایک اور چ کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ یعنی وہ ٹوٹی پھوٹی چارپائی جس پر آنسوؤں سے تر دوپٹے سے منہ لپیٹے وہ غریب اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہتی ہے۔

بھلے وقتوں میں کالم نگاری ہمارے ہاں محض مشغلۂ شوق اور ذریعۂ عزت ہوا کرتی تھی۔ اب ماشاءاللہ حیلۂ معاش، وجہ شہرت اور کُل وقتی وسیلۂ رسوائی بھی ہے۔

کالم تمام حلقۂ دام عیاں ہے!

کالم نگاروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روز کنواں کھودتے اور روز پانی نکالتے اور سبیل لگاتے ہیں۔ لیکن جب سے سیاسی polarization (قطبینی محاذ آرائی) نے شدت اختیار کی ہے، کالم نگاروں کے مزاج و بیان میں بلا کی تلخی و برہمی در آئی ہے۔ صفحہ صفحہ روتا ہوں، کالم کالم وحشت ہے۔ یہ یک رُخی و جنبہ داری اپنی منہ مانگی قیمت فی کالم وصول کرنا بھی جانتی ہے۔ بعضوں کا تو یہ احوال ہوا کہ روز کنواں کھودتے اور روز اس میں سے یوسفِ بے کارواں برآمد کرتے ہیں۔ اور یہ وہ یوسف ہوتا ہے جس کو انہوں نے کل صبح ہی دستِ خاص سے کنویں میں دھکا دیا تھا! بشریٰ کنویں سے خوابِ زلیخا برآمد نہیں کرتیں۔ وہ اپنے ڈول سے سادہ پانی ہی نکالتی ہیں۔ ٹھنڈا میٹھا تازہ پانی۔ اس پانی کے سوتے

★ تِتکار: نایک، گائیک یا استاد کے وہ بلند بول جن پر نرتکی ناچتی اور نرت بھاؤ بتاتی ہے۔

آبِ آہن تاب سے جا ملتے ہیں جس میں لوہا لال انگارہ کر کے چھَن سے بُجھایا جاتا ہے۔ اس دورِ زریاب میں سیاست اور اخلاقی وسماجی اقدار کے درمیان ایک آدمی ڈباؤ خلیج ہوسِ اقتدار حائل ہوگئی ہے۔ بشریٰ نے اس خلیج کو بہت قریب سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ سیاست کو بوالعجبیوں اور ریشہ دوانیوں کو وہ اپنی سیاسی وابستگیوں سے ہٹ کر بھی دیکھتی ہیں۔ نیرنگیٔ سیاست اور طرزِ تپاکِ دنیا پر اپنے ایک حالیہ کالم میں لکھتی ہیں کہ وہی لوگ جو الیکشن سے پہلے عجز وانکسار کا پیکر ہوتے ہیں، ووٹ لینے اور وزیر بننے کے بعد اُن کی گردن میں سَریا لگ جاتا ہے! ہم اسی مفہوم کو علامہ اقبال کے شعر میں ادنیٰ تصرف کے ساتھ یوں بیان کریں گے:

بندہ و صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے

اُن کی سرکار میں پہنچے تو سبھی شیر ہوئے

اپنے کالموں کے مجموعے ''چادر، چاردیواری اور چاندنی'' کی باقاعدہ تقریب رونمائی پر وہ آمادہ نہ ہوئیں۔ لہٰذا ان کے احباب اور مدّاحوں نے آج شام کی غیر رسمی محفل کے انعقاد پر انہیں رضامند کیا۔ ہم مصنفہ سے متفق ہیں۔ رسمِ اجراء کے دھوم دھڑکّے کے زور سے ہم نے تو آج تک کسی کتاب کو بیسٹ سیلر بنتے نہیں دیکھا۔ بلکہ بعض کتابوں کی رسومِ اجراء پر تو آخری رسوم کا گمان ہوتا ہے۔ تقریبِ رُونمائی آخری دیدار ثابت ہوتی ہے۔

کراچی آج کل فتنہ وفساد کے خون آشام دور سے گزر رہا ہے۔ اس جلسے کی کارروائی شروع ہونے سے دومنٹ پہلے اسٹیج کی عقبی سمت سے آنے والی فائرنگ کی آواز ہم سب نے سنی۔ ہم تو ایسی ٹھاں ٹھاں، دھائیں دھائیں کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا۔ میں نے تو اس آواز کو تقریب کے آغاز میں توپ کی سلامی تصور کیا۔ ہم محترمہ کے ممنون ہیں کہ وہ ایسے پُرآشوب زمانے میں اس اداس شہر میں تشریف لائیں جب حال یہ ہے کہ کرکٹ میچ کے دوران کوئی پوچھتا ہے کہ آج کا اسکور کیا ہے تو لوگ اسے گرنے والی وکٹوں کی تعداد بتانے کے بجائے مقتولین کے میزانِ کُل اور تاریخِ قتل بتا کر سر جھکا لیتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ پوچھنے والوں نے ہم سے جس انداز سے کراچی کا حال پوچھا، اُس میں پُرسشِ احوال یا پُرسے سے زیادہ بازپُرس کا رنگ تھا! جو سوال بھی وہ کرتے اُس میں اُن کے اپنے جواب کی آمیزش تھی۔ اور لہجے میں جھنجلاہٹ۔ کوئی ڈیڑھ سو برس قبل غالب نے ایسی پُرسشِ حال کے بارے میں کہا تھا:

؎ نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ

لیکن جواب پر بہت اصرار ہے تو فیض صاحب کی زبانی عرض ہے:

؎ یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

ایسے بھی سُراغ رساں ہیں جنہیں مقتول کے قتل میں خود مقتول ہی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ گویا

؎ وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے قصاص اُلٹا

آپ نے ملاحظہ فرمایا، ایک بظاہر سیدھے سادے سوال کے جواب میں عاجز کو ایک منٹ اور ایک سانس میں ایک شعر اور دو مصرعے پڑھنا پڑے! جب کوئی شخص اس طرح شعر پڑھنے پر اُتر آئے تو اس کی تین وجہیں ہوسکتی ہیں۔ اوّل، ہو نہ ہو، وہ بے محل اشعار خود اُسی کے ہیں! خراب شعر کہنے اور ان پر داد طلب کرنے کا شمار ہمارے ہاں Human Rights (انسانی حقوق) میں ہوتا ہے! دوم، وہ کسی کے عشق میں مبتلا ہے اور جو بات محبوبہ سے خلوت میں نثر میں کہنے کی جرأت نہیں رکھتا وہ اب بھری محفل میں ہم سے بزبانِ شاعر کہلوا رہا ہے! تیسری وجہ یہ کہ کلمۂ اعلائے حق یعنی سچ بولنا اس کا ایمان ضرور ہے، لیکن وہ پولیس کو خواہ مخواہ پکڑائی نہیں دینا چاہتا!

یوں کہنے کو تو ہر شخص اس خواہش اور عزم کا اظہار و اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ کراچی شہر کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے۔ اگر اسی کو امن کہتے ہیں تو ہم ایسے امن سے درگزرے۔ امن کے گہوارے کی رٹ سے کان پک گئے تو ایک دن خیال آیا کہ ذرا ڈکشنری میں گہوارے کے معنی تو دیکھیں۔ اردو لغت سے رجوع کیا تو یہ موتی برآمد ہوئے:

"۱۔ جُھولے نما کھٹولا جس میں شیر خوار بچوں کو جُھلاتے اور سُلاتے ہیں۔

۲۔ وہ چارپائی جس پر محراب نما لکڑیاں باندھ کر عورتوں کا جنازہ لے جاتے ہیں۔"

ہم ان معنوں سے ایسے دہل گئے کہ پھر "امن" کے معنی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اِن لغت نویسوں کا کوئی بھروسا نہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب سچ ہے، مگر ان باتوں کا آج کی شام سے کیا تعلق؟ تو صاحبو، سچ بات یہ ہے کہ میں نے موقع غنیمت جانا۔ سوچا، کیوں نہ اپنے شہر کراچی ۱۹۹۵ء کی ذرا سی جھلک انہیں دکھلا دوں۔ اس شہر کے ادیب، دانشور اور ادب دوست آج شام ان کے لیے گُل بداماں ہیں۔ صاحبِ طرز ادیبہ اور جدید نسائی حسیت کی ترجمان ہونے کے علاوہ، وہ ایک زیرک وصاف گو اور بے حد

مقبول کالم نگار بھی ہیں۔ امید ہے کراچی میں ایک مدت بعد ان کا ورود و قیام موجودہ تشویشناک صورتِ حال کا معروضی تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مولانا گرامی جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حفیظ ہوشیار پوری نے ایک یادگار فارسی شعر کہا تھا، جس کا مطلب کچھ یوں ہے کہ اے صبا، حضرت اقبال سے جا کہیو کہ تمہارا گرامی جان سے گزر گیا اور تم ابھی تک خاموش ہو۔ اس شعر کے صرف تین لفظ بدل کر میں بشریٰ رحمٰن کے ہمدردانہ توسط سے لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو شہرِ قائد کا یہ پیغام پہنچانا چاہوں گا:

صبا، بہ خطۂ لاہور ایں پیام دہ
برفت جانِ کراچی و تو ہنوز خموش

یادِ یارِ طرحدار

خُطبۂ صدارت

جلسہ بیادِ ابنِ حسن برنی مرحوم

(اس کے بیشتر حصے اردو مرکز، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن کے آڈیٹوریم میں پڑھے گئے)

گرامی قدر جناب آغا حسن عابدی، محترم ایم۔ آر پیر بھائی صاحب، جناب الطاف گوہر صاحب، معزز خواتین و حضرات،

یہ تقریب مُحبانِ برنی نے ان کی یاد میں مُنعقد کی ہے۔ وہ ایک باغ و بہار انسان تھے۔ اداس کر دینے والی باتوں اور عادی سوگوار لہجے سے بہت گھبراتے تھے۔ دو سال کی اذیت ناک علالت اور معذوری کے باوجود، جس کا ذکر کرنا یا پُرسش انہیں گوارا نہ تھی، انہوں نے حُزن و ملال کو خود پر کبھی طاری نہ ہونے دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے باہمت اور شکست نہ ماننے والے انسان کی یاد میں جو تقریب ہو اُس کا مقصد ازسرِ نو سوگ منانا اور ایک دوسرے کو پُرسا دینا نہیں ہوسکتا۔ آج جہاں ہم ایک عزیز و دیرینہ رفیقِ کار، ایک ادب دوست اور ادیب نواز سینئر بینکر، ایک دردمند اور غمگسار ساتھی کی جدائی پر اپنے تاثرات کا اظہار کرنے جمع ہوئے ہیں، وہاں ہم ان کی بھرپور زندگی، شاداب شخصیت، یکسُو و پُر طمانیت اُسلوبِ حیات، اندازِ دل آسائی اور شیوۂ دوستداری کی کھل کر "joyous celebration" (پُرمسرّت و پُرتشکّر جشنِ ہم پیشگی و ہمدمی) بھی کرنا چاہیں گے۔ ہم بہت خوش نصیب ہیں اور ہم پر شکر و تحدیثِ نعمتِ ربِّ جلیل لازم ہے کہ اُس نے ہمیں ان کی صحبت، رفاقت اور لطف و رافت سے نوازا۔ اَلحَمدُ لِلّٰہِ۔

(۱)

ابنِ حَسن برنی مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء میں ہوئی جب میں سولا (Sola) ہیٹ، کتھئی رنگ کی کھادی کی شیروانی کے نیچے سفید وائل کا کرتا اور ملگجی زین کی پتلون پہنے، سستے کیپسٹن سگرٹ کا دھواں چھوڑتا علی گڑھ میں وارد ہوا۔ وہ ایک خوش پوش، خوش باش اور خوش گفتار

جوانِ رعنا تھے۔ میں ان گھڑ اور ناتجربہ کار تھا۔ مطلب یہ کہ ہنوز بڑھاپے کا ذاتی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ہم دونوں کی خوش نصیبی تھی کہ ملاقات بہترین زمانے میں ہوئی۔ سچی، گہری، پائدار اور قابلِ اعتبار دوستی کی بنیاد درحقیقت ناسمجھی، بے خبری اور ناتجربہ کاری کی عمر ہی میں پڑتی ہے، کیوں کہ عمر کے ساتھ ساتھ سیان پَت اور فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔

جب پہلے پہل مجھے دیکھا تھا

دل کتنے زور سے دھڑکا تھا! صاحبو، میرا اشارہ اپنے ہی دل کی طرف ہے! انہوں نے مجھے سولا ہیٹ سے حیدرآبادی طرز کی کھدّر کی شیروانی کے آخری بٹن تک مسکرائے بغیر دیکھا کہ اس زمانے میں کھدّر علی گڑھ یونیورسٹی کے فیشن سے بوجوہ وبکراہت خارج ہو چکا تھا! تاہم پہلی نگاہِ معترضہ کے بعد بہت تپاک سے ملے۔ کنور فراست علی خان (پرنس آف پرتاب پور★) سے بھی تعارف کرایا جو اس وقت ہاسٹل کے ڈبل رُوم میں سِتار پر نند کلّیان بجا رہے تھے اور اپنے کمالِ فن پر خود وجد کر رہے تھے۔ نو دس فٹ دور جُڑواں ''بیک روم'' میں ان کا رُوم میٹ اُردو ایم۔ اے فائنل کے امتحان کی زور شور سے تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس طرح کہ باآوازِ بلند حالؔی کی ''مناجاتِ بیوہ'' لہک لہک کے پڑھ بلکہ سوگوار ترنم سے رَٹ رہا تھا:

ے ریت کی سی دیوار ہے دُنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا
بجلی جیسی چمک ہے اس کی
پل دو پل کی جھلک ہے اس کی

انصاف اور وثوق سے یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کو ''ڈسٹرب'' کر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو ڈسٹرب کرنے میں قطعاً ناکام تھے۔ اس لیے کہ دونوں ہی کامل یکسوئی اور دلجمعی سے اپنے اپنے شغل میں محو تھے۔ پرنس آف پرتاب پور نے میرے سلام کا علامتی جواب ستار کو سرو قامت کھڑا کر کے دیا جو قد میں مجھ سے بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پھر اسے لِٹا کر خود ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے ''آپ کو طبلہ بجانا آتا ہے؟''

''نہیں تو۔ کیوں؟''

''آپ کی صورت، خصوصاً ناک، اُستاد عبدالرحیم خاں مرحوم سے ملتی ہے! نند کلّیان کا رنگ تین تال میں جمتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ طبلہ، راگداری کی گریمر ہے۔ وہ بھی ایسے ہی میل خورے

★ نام و مقام بدل دیے ہیں۔ لیکن ''پرنس'' کا ریاستی ورجوازی طنطنہ جوں کا توں ہے۔

کھدر کی کانگریسی شیروانی پہنتے تھے۔ ململ کے کُرتے کی آستین شیروانی کی آستین سے باہر نکلی پڑتی تھی۔ اسی سے ناک اور پسینہ پونچھتے رہتے، مگر طبلہ ہمیشہ صاف کپڑے سے صاف کرتے تھے۔ سنا ہے کہ کسی گستاخ نے آستین کی لمبائی پر اعتراض کیا تو استاد نے یہ کہہ کر اُس کا منہ بند کر دیا کہ سلاطین تُرکی کی آستین ڈیڑھ بالشت باہر نکلی ہوتی تھی۔ میری بات پہ یقین نہ آئے تو قسطنطنیہ جا کے عجائب گھر میں جھک مار کے دیکھ لو! اُن پر کوئی چُھری کٹاری سے حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ سب ڈرتے تھے کہ بے تحاشا لمبی آستین کے اندر خنجر، پیش قبض، یا تمنچہ ضرور چھپا ہوگا۔''

کھدر کی شیروانی باعث پریشانی

اگر برنی صاحب اُٹھ کر جانے نہ لگتے تو اللہ جانے مدح و قدحِ استاد کب تک جاری رہتی۔ کہنے لگے ''کل آپ کو ان کے بڑے بھائی سے ملواؤں گا۔ وہ بالکل مختلف مزاج و مسلک کے آدمی ہیں۔''

میں نے کہا ''معاف رکھیے۔ میرا دھڑن تختہ کرنے کے لیے تو برادرِ خُرد ہی کافی ہے!''

''آپ صحیح کہتے ہیں۔ آپ کو شاید اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ سارا طومار آپ کی کھدر کی شیروانی سے مشتعل ہو کر باندھا گیا! یہ کانگریس کی یونیفارم تصور کی جاتی ہے! It's a red rag in Aligarh۔ صاحبزادے کی باتوں کا بُرا نہ مانیے گا۔'' وہ خود نہیں بول رہے تھے، سارا ریاستی دربار بول رہا تھا! زرّین پٹکے سے اپنی کمر کسے مصاحب بول رہے تھے، جن کے منہ سے گھڑے گھڑائے فقرے ایسے نکل رہے تھے جیسے شعبدہ بازوں اور بازی گروں کے منہ سے گولے! ریاست تو اب سُکڑ کے اقلیدس کے نقطے کی مانند رہ گئی ہے۔ یعنی وجود تو ہے، طول و عرض ندارد۔ صاحبزادے کا شمار علی گڑھ کے ''لارڈز'' اور grandees میں ہوتا ہے، جو بہر صورت dandies سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی جتانا چاہتے تھے کہ آپ سیدھے جے پور، راجستھان سے چلے آرہے ہیں۔ یہ علی گڑھ ہے! مسلم لیگ کا گڑھ۔ پاکستان کا گہوارہ۔ دو تین دن بعد آپ کو اپنے ٹیلر ماسٹر کے پاس لے چلوں گا۔ کیا بتاؤں۔ فقط نظر سے ناپ لے کر ایسی دستانے کی طرح فِٹ ہونے والی شیروانی سیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے گویا شیروانی ہی نہیں، سموچے آدمی کو سانچے میں ڈھال دیا ہے!''

وہ خود جامہ زیب تھے۔ کچھ بھی پہنے ہوں، ڈھلے ڈھلائے لگتے تھے۔ دوسروں کو اچھا لباس پہنے دیکھ کر ایسے خوش ہوتے گویا خود زیبِ تن کر رکھا ہے!

(۲)

پیشانی پر واپیر

مجتبیٰ ایم۔ آر پیر بھائی اور میں گزشتہ آٹھ برسوں سے برنی صاحب کی میز پر دوپہر کا کھانا

کھایا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ تحلیلِ غذا اور تحلیل شدہ غذا کو جزو بدن بنانے کا عمل بھی ایک دوسرے کی نگرانی میں سرانجام پاتا تھا۔ ایک روشن روشن سے کونے میں برنی صاحب مسکراتے رہتے۔ وقفے وقفے سے اپنے دائیں ابرو پر دایاں انگوٹھا اور بائیں پر بایاں بالکل اسی طرح پھیرتے جیسے کار کے ونڈ اسکرین پر ہر دو جانب وائپر چلتے ہیں۔ کبھی کوئی اسکنڈل یا مردانہ لطیفہ گفتگو کو گرما دیتا تو یہ وائپر زیادہ تیزی سے چلنے لگتے تھے۔ انہیں جدا ہوئے چھ ماہ ہو گئے، لیکن ابھی تو اتنا بھی صبر نہیں آیا کہ ان کی کرسی پر کسی اور کو بیٹھا دیکھ سکیں۔ وہ خالی رہتی ہے۔ خالی ہی رہے گی۔ لیکن خانۂ دل کی وہ منزلِ ارفع جس میں یادِ یارِ مونس و غمگسار جاگزیں ہے، آج بھی بھری پُری لگتی ہے۔ وہ کبھی اپنے دیرینہ مکین اور رفیق صادق الولا سے خالی نہ رہے گی۔

میرے لیے ہنوز ممکن نہیں کہ یادوں اور باتوں کے امنڈتے سیلاب کو ایک مختصر سے مضمون کے کُوزے میں سمیٹ لوں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی پیاسا سیکڑوں فٹ کی بلندی سے قیامت خیز مقدار و رفتار سے گرتے ہوئے آبشار نیاگرا (Niagra) کے نیچے کھڑا ہو کے اپنا گلاس بھرنے کی کوشش کرتے ہوئے خود بھی گلاس، پیاس، اخلاصِ عمل اور اپنے low IQ سمیت اِس یقینِ محکم کے ساتھ غرقاب ہو جائے کہ بہت جلد پانی خود اُچھالا دے گا:

ع ڈوبے ہیں ہم جہاں پر، اُبھریں گے پھر وہیں سے

اہلِ سُوپ و سلاد!

ہم تینوں باقاعدہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر کراچی سے لندن آئے تھے، جہاں ہمارا شمار بزرگ بینکرز میں ہونے لگا۔ مجھے بزرگ کہلانے سے صرف اس لیے چڑ ہے کہ جو عزت محض بزرگ اور بوڑھا ہونے کے سبب کی جائے وہ عزت کی ذلیل ترین صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ بوڑھا ہونے کے لیے ذاتی ذہانت یا جدوجہد درکار نہیں ہوتی۔ برنی صاحب کی میز پر روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے دنیا جہان کی باتیں ہوتی تھیں۔ برنی صاحب کو غیبتِ عزیزاں سے سخت نفرت تھی، جب کہ بے خبری کے سبب ہم دونوں کی رسائی ان راز کی باتوں اور حسد کی ملاوٹ والے خام مواد تک نہ تھی جس کے بغیر تسلی بخش غیبت نہیں ہو سکتی۔ میں نے ایک دن برنی صاحب سے کہا کہ یہ لنچ ٹیبل نہیں، اصحابِ کہف کا دسترخوان ہے! کہنے لگے، اوّل تو اصحابِ کہف تین سے زیادہ تھے۔ دوم، روایتوں میں کہیں نہیں آیا کہ انہیں لنچ میں پاپڑ، مونگ کی دال کا دھووَن، امپورٹڈ خربوزے کی ایک ہیرا تراش پھانک اور روٹھی کبوتری کے انڈے کے برابر آئس کریم کی ایک گولی ملتی تھی! پاپڑ سے برنی صاحب کو چڑ تھی۔ البتہ خربوزہ بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ جب کہ سود ہم تینوں اتنی ہی رغبت سے

ابتدائے ملازمت سے کھاتے اور کھلاتے آئے تھے۔ مذکورہ بالا اشیاء ہمیں ایگزیکٹو لنچ روم کے افتتاح کے بعد مفت ملنے لگی تھیں۔ صدیقی اینڈ کمپنی (انکم ٹیکس ایڈوائزر) نے ہمیں آگاہ کر دیا تھا کہ ان اشیائے ناخوردنی کی مجموعی لاگت آپ کی سالانہ آمدنی میں جمع و شامل متصور ہوگی، جس پر آخری پاپڑ اور پنس تک ٹیکس دھروالیں گے!

ہر میجسٹی ملکہ برطانیہ کی حکومت کے لیے تو یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرہ ہوگی۔ دراصل Inland Revenue کو محض ہمیں رگیدنا اور ذلیل کرنا مقصود ہے!

ایگزیکٹو لنچ روم کے افتتاح سے پہلے ہم اسی میز پر کھیرے اور ککڑی کی سینڈوچ، سلاد اور ذبیحہ سُوپ سے بھوک کو بہلاتے تھے۔ ہر چند کہ دال، مشروم اور ٹماٹر کو ذبح نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہاں لینٹل اور ویجی ٹیبل سُوپ اور گھاس پھوس کا شمار ذبیحہ ڈش میں ہوتا ہے! ماجد علی صاحب مہینے میں دو تین بار ہماری دعوتِ شیراز میں شریک ہوتے تھے۔ حقارتاً نہیں، مذاقاً وہ ہم تینوں کو اہلِ سُوپ و سلاد کہتے تھے! یہ بھی فرماتے تھے کہ "پاپڑ کھا کھا کے آپ حضرات کی شخصیت پپڑا گئی ہے! آپ لوگوں نے انگریز افسروں اور بینک میں ملازم میموں کو بھی مرچوں بھرے سموسوں، پاپاڈم اور مَلّی گٹانی (سُوپ) کا، جو دراوڑی زبان کے لفظ ہیں، چسکا لگا دیا ہے۔ چنانچہ دکھیارے دن بھر اپنے اپھرے ہوئے پیٹ سہلاتے اور ایک دوسرے کے منہ پر، پنجابی محاورے کے مطابق، ڈکاریں مارتے پھرتے ہیں!"

مرزا کہتے ہیں کہ جو شخص روزانہ رغبت سے بدمزہ کھانا کھائے یا کسی بدصورت پہ جی جان سے عاشق ہو جائے، اُس سے ڈرنا چاہیے۔ ایسے سے کچھ بھی بعید نہیں!

اُن دنوں ہم تینوں کوکا کولا پینے سے تائب ہو گئے تھے۔ ہوا یہ کہ پیر بھائی صاحب اور برنی صاحب نے کئی ہفتوں پر محیط ریسرچ اور متعدد خطوط کے تبادلے کے بعد کوکا کولا کمپنی سے تحریراً یہ قبولوا لیا تھا کہ کوک میں جو خفیف سی خوشبو ڈالی جاتی ہے اس میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے! اس مقدار کو جو essence میں اندازاً 1/100 ہوگی، یہ دونوں حضرات حُرمت کوک کے لیے کافی سمجھتے تھے! یہ بتاتا چلوں کہ ان دونوں نے اس سلسلے میں تمام تر تحقیق اور فقہی کھکھیڑ، صرف مجھے قائل معقول کرنے کے لیے اٹھائی تھی، جو بقول مرزا ایک قابلِ قدر دینی جذبہ تھا۔ ورنہ جہاں تک حرام و حلال سے متعلق ان کی اپنی ریسرچ کا تعلق تھا تو انہوں نے لندن کے تمام لذائذ کے علاوہ دیگر اشیاء بھی چُن چُن کر خود پر حرام کر لی تھیں۔ انہیں چاکلیٹ سے لے کر ڈبل روٹی، بسکٹ، کیک، جُوس، پرفیوم، اسٹارچ (کلف)، کھانسی کے شربت، شُو پالش، سیب کو چمکانے والے پالش، کار کی سیٹ، لیدر کے صوفہ سیٹ، کاغذی گلاس، گھڑی کے اسٹریپ غرضیکہ انگریزی محاورے کے مطابق You name it ہر چیز میں کسی نہ کسی بلکہ اُسی حرام شئے کی آمیزش نظر آتی تھی۔ برنی صاحب بے حد شائستہ اور

نفاست پسند شخص تھے۔ انہوں نے سوّر کو کبھی سوّر نہیں کہا۔ بد جانور کہتے تھے۔ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ غصے میں ایک کٹّر racist اور پاکستان دشمن انگریز لیڈر کا ذکر آیا تو عالمِ طیش میں اسے بد جانور نہیں کہا۔ انگریزی محاورے کے مطابق spade (پھاوڑے) کو spade ہی کہا۔

(۳)

بوڑھا برگد

کراچی بھی عجیب دو رُخا، دو دھارا شہر ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ جو شخص کراچی میں رہتے ہوئے کراچی کی برائی نہ کرے اُس کی بینائی اور گویائی دونوں میں شبہ ہے اور جو کراچی چھوڑنے کے بعد اُسے بے طرح یاد نہ کرے اس کی معقولیت اور احسان مندی میں کلام ہے۔ لندن جانے کے بعد مجھے اپنی بینائی اور مرزا کی دانائی، دونوں پر یقین آ گیا۔ بعض رابطے اور رشتے ناتے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے درکنے اور ٹوٹنے کے بعد منکشف ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں تو وجود کی پاتالی گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔

کیسے اور کس دل سے کہوں کراچی کیوں چھوڑا، کیسے چھوڑا:

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

لندن میں برنی صاحب کے ساتھ دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ کسی دوست کو اُداس اور ملول نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اُس کے درد کا مداوا اور دکھ کا درماں دسترس میں نہ ہو تو اس کی دلجوئی کی کوئی سبیل نکالتے۔ بہلاوے اور تفریح کے سامان بہم پہنچاتے۔ لندن میں ابتدائی تین چار ہفتوں کے بعد میں نے کہا کہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے بوڑھے برگد کو جڑ سے اُکھاڑ کے ہائیڈ پارک (Hyde Park) کے اجنبی درختوں کے بیچوں بیچ کھڑا کر دیا ہو اور نہ صرف زمین بلکہ وہ خود بھی جڑ پکڑنے سے انکاری ہو!

چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پر دُکھ کے آثار نمایاں ہوئے۔ پھر چہکنے لگے: ''معاف کیجئے، مجھے تو برگد اور آپ میں کوئی botanical (نباتاتی) مشابہت نظر نہیں آتی! برگد کی چوٹی تو ہرے بھرے پتّوں سے ڈھکی رہتی ہے اور تنے کے ساتھ لپٹی سادھوؤں کی سی جٹائیں بدلتے موسموں سے بے نیازی کا پتہ دیتی ہیں۔ ڈال ڈال پہ طوطوں، چڑیوں اور تلیروں کے رین بسیرے! میں کراچی میں ۲۵ برس رہا ہوں۔ میں نے تو وہاں کسی گھر کے اندر یا باہر بوڑھا یا جوان برگد نہیں دیکھا۔ خیر، بوڑھے برگد کو تلیروں، طوطوں اور ہریلوں کے رین بسیرے کے لیے چھوڑ دیجئے۔ آج بدھ ہے۔ ہیرڈز (Harrods) دیر تک کُھلا رہے گا۔ وہاں سے Mont Blanc کا پین اور آپ کے لیے 4B کی ڈھیر ساری پنسلیں خریدیں گے۔ وہیں سے سیدھے اگاتھا کرسٹی (Agatha Christie) کا

چلے Mouse Trap دیکھنے چلیں گے۔ تیس پینتیس برس سے چل رہا ہے۔ بھابھی کو فون کر دیجئے گا کہ وہیں پہنچ جائیں۔ ہاں، خوب یاد آیا۔ ہیرڈز نے کتابوں کا سیکشن بھی کھولا ہے۔ آپ ہی کے بقول، آپ اپنی کاغذی جنت میں چند لمحے گزار کے، خوش خرید کتابوں کا خلاصہ ہمیں بھی سنائیں۔ میں اتنی دیر اور اتنے پیسوں، میرا مطلب ہے پاؤنڈز میں Lalique کا Crystal خرید لوں گا!''

میچور میمیں اور میں

نیا نیا لندن پہنچا تو میں نے دیکھا کہ B.C.C.I کے ہیڈ آفس میں، سوائے آغا حسن عابدی کے تمام ایگزیکٹوز کی سیکریٹری، بلحاظ عمر بیس سے پچیس کے بریکٹ میں گلوں میں رنگ بھر رہی ہیں! میں نے پرسونیل ڈیپارٹمنٹ کے انگریز منیجر سے قدرے طعن آمیز تفاخر سے کہا کہ مجھے تو mature سیکریٹری چاہیئے۔ اُس نے کہا No problem۔ دوسرے ہی دن اُس نے ایک temporary (عارضی) تعینات کر دی، جس نے درخواست میں اپنی عمر ۵۴ برس لکھی تھی۔ وہ دو ماہ بعد بسبب osteoporosis (بڑھاپے کی گٹھیا) گھر بیٹھ گئی۔ اس کی جگہ نو ماہ کی مدّت میں تین میچور سیکریٹری آئیں۔ تیسری مجھ سے عمر میں ایک دو سال چھوٹی ہی ہوگی، مگر نگاہِ بدبیں کو دس گیارہ برس بڑی نظر آتی تھی۔ اسے ڈکٹیشن دیتے ہوئے اگر میں پاکستان میں ہوتا تو قابل اعتراض حالت میں رنگے ہونٹوں دھر لیا جاتا! تفصیل اس اجمالِ پُر ملال کی یہ کہ موصوفہ کے ثقلِ سماعت کے باعث مجھے اپنے ہونٹ اس کے کان سے بھڑا کر ڈکٹیٹ کرنا پڑتا تھا۔ وہ خود اتنا آہستہ بولتی تھی کہ مجھے کبھی اس کان پر کبھی اُس کان پر ہاتھ کا کپ بنا کر سننا پڑتا تھا۔ وہ تو وہ، خود مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہرا سمجھ کے خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔ ویسے شاکی ایک میں ہی نہیں، وہ غریب بھی عاجز تھی۔ ایک دن میں نے اُس کے کام میں کچھ زیادہ ہی غلطیاں نکالیں تو جھنجھلا کر کہنے لگی کہ آپ اس طرح ڈکٹیشن دیتے ہیں جیسے مجھے English spelling سکھا رہے ہیں! I find it very distracting, Sir!

Sir کے یہ معنی و مفہوم و لہجہ میرے لئے نئے تھے!

وہ روٹھ کر چلی گئی تو اس کے بعد میرا ستارہ کچھ ایسی گردش میں آیا کہ لندن میں جتنی بھی اور جہاں بھی میری ہم عمر ایسی ضعیفائیں تھیں جو keyboard پر اپنی rheumatic انگلیوں کو زور سے کراہے بغیر حرکت دے سکیں، ان سب کو پرسونیل ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈ ڈھونڈ کے یکے بعد دیگرے میری سیکریٹری مقرر کرتا چلا گیا، یہاں تک کہ انگریزی لفظ mature کے لغوی، اطلاقی، تعزیری اور secretarial معانی و مہلکات میری ناقص سمجھ میں اچھی طرح آ گئے۔

ایک زمانے میں سوکھے، کُھرِ یائے، کھٹّے اور چرخ سے آدمی کو اچور یعنی کیری کی سوکھی کھڑنک پھانک سے تشبیہہ دی جاتی تھی جسے سالن میں تُرشی کے لیے ڈالتے تھے۔ لندن آ کے کُھلا کہ انگریز اپنے تلفظ میں لکنت یا بگاڑ کے سبب اچور کو میچور کہتے ہیں! بہر حال، اب مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں رہی تھی کہ منہ پھاڑ کے کہوں کہ مجھے بھی اوروں کی طرح جوان جہان سیکریٹری چاہیے۔ dictation کے دونوں سِروں پر maturity کے سنجوگ کا انجام سب کے سامنے تھا!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان باتوں کا برنی صاحب سے کیا تعلق؟ جنابِ والا، ہے، برابر ہے! جبھی تو اتنی لمبی تمہید باندھنی پڑی۔ اس سے ان کے مزاج اور ہمارے ربط و تعلق کا اندازہ ہوگا۔

وہ یہ سب کچھ بہت قریب سے دیکھ رہے تھے اور محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ جب ایک ہم عمر ضعیفہ کا غم کدے میں نزول ہوا تو اُن کا پیمانۂ ضبط چھلک گیا۔ عجب شوخی سُوجھی۔ اب یہ وتیرا بنالیا کہ کبھی کاریڈور یا لفٹ میں کوئی بھی ضعیفہ نظر آ جاتی تو اُسے روک کر پوچھتے:

Excuse me. Are you Mr. Yousufi's secretary?

پھر اس مڈبھیڑ اور سوال و جواب کا حال مجھے مزے لے لے کر سناتے۔ لیکن میرے غیاب میں کبھی مذاق نہ اڑایا۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی سی بڑی بی کو لیے چلے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے ''معاف کیجیے، یہ مجھے اتفاقاً لفٹ میں مل گئی۔ میں نے اس سے پوچھا،

Excuse me. Are you Mr. Yousufi's secretary?

اس نے کہا: No sir, I am afraid I don't know him.

میں نے کہا:

What a pity! Would you like to meet him? He likes mature people.

یہ فوراً تیار ہوگئی۔ اور میں اسے گھسیٹ لایا۔ اپنے Cunard House والے دفتر میں Tea Lady کی آسامی کی درخواست لے کے جارہی تھی۔ میرا خیال ہے اسے یہیں اپنے فلور پر ٹی لیڈی کے طور پر رکھ لیں۔''

پھر اسے مخاطب کر کے فرمایا:

I think you should join us instead. And make tea for Mr. Yousufi. He likes mature people, black tea, tuna fish sandwiches, grey suits and grey hair.

اُس ضعیفہ نے جواب دیا:

He looks so frail and anaemic. He should take at least two litres of milk every day after his black tea. I'll give him Seven Seas capsules. My late husband took them daily. They are particularly good for geriatrics.

(۴)

یہ مسائلِ تذبذب!

مذہبی مسائل پر بحث میں انہیں بہت لطف آتا تھا۔ لنچ اور فراواں فرصت کے اوقات میں وہ اور پیر بھائی صاحب تاریخی، دینی اور فقہی مسائل پر گھسان کی بحثا بحثی کرتے تو میں بھی شیشے کی دیواروں والے اپنے کُلبۂ احزاں سے نکل کر داخلِ حسنات ہو جاتا۔ مسائل میں مزید پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی اس لیے بھی پیدا ہوتی کہ پیر بھائی صاحب کا مسلک جعفریہ ہے، جب کہ برنی صاحب کے عقائد بنیادی طور پر بریلوی تھے۔ رہا میں تو غالباً میری آشفتہ بیانی کے سبب الطاف گوہر صاحب مجھے وہابی سمجھتے ہیں! برنی صاحب مجھے غیر مُقلّد سمجھتے اور کہتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا، یہ کیا بلا ہوتی ہے؟ کہنے لگے، وہی جو آپ ہیں! میں نے کہا، پھر تو واجب التعظیم ٹھہرے!

ہم تینوں میں، بقول مرزا، واحد نقطۂ اتفاق اور مشترک مشغلہ درحقیقت حالاتِ حاضرہ اور اخلاق و اقدارِ غیر حاضرہ پر تبصرہ اور عین بڑھاپے میں، بطور سزا، حسینانِ لندن (جنہیں پروفیسر قاضی عبدالقدوس لولیانِ لندن ★[1] کہتے ہیں) کا جلوۂ طُور تھا۔ نہ کچھ لینا نہ کچھ دینا۔ مگر نتیجے میں طُور ہی کو جل بُھن کر بُھسم اشنان کرنا پڑتا ہے! برنی صاحب اور پیر بھائی صاحب کی آواز ماشاء اللہ کبھی مائک کی محتاج نہیں رہی۔ یوں تو دُور میرے کمرے میں بھی ان کی سرگوشیاں تک صاف سنائی دیتی تھیں، لیکن مجھے اپنا کمرہ اس لیے چھوڑ کر آنا پڑتا تھا کہ وہاں سے ان دونوں کو میری داد سنائی نہیں دے سکتی تھی، خصوصاً پیر بھائی صاحب کو جنھوں نے ایک نئی ہیئرنگ ایڈ بصرفِ کثیر امریکہ سے منگوائی تھی، جس کی خصوصیت یہ تھی کہ انہیں بحث کے دوران اپنی آواز تو سنائی دیتی تھی، دوسرا بولتا تو

★[1] لولی: مدتوں ہم اس کو ایک علامت اور استعارہ یعنی دیدنی و چشیدنی lollipop کا مخفف سمجھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہے۔ کنایتہً اس سے لبِ لعلیں بھی تو مراد ہو سکتا ہے! لیکن چند روز قبل مرزا نے یہ وضاحت کر کے سارا مزہ خاک فرنگ و فرہنگ میں ملا دیا کہ یہ تو اصلاً فارسی لفظ ہے جس کے معنی کنچنی: ناچنے گانے والی ہیں۔ یہ صفت لول سے منسوب ہے، جس کے معنی بے شرمی، بے حیائی اور لونے کی لونئی ہیں!

بھوں بھوں کی آوازیں آتیں۔ لہٰذا کاٹ کھانے کا انتظار کیے بغیر فوراً لاحول پڑھ کے قیمتی آلہ کان سے نکال دیتے تھے۔ بیشتر زیرِ کج بحثی مسائل میرے علم، بساط، تُوتے اور برداشت سے باہر ہوتے تھے۔ مثلاً حکیم لقمان کس شہر کا رہنے والا تھا؟ کیا وہ یونانی طب کا بانی تھا؟ کیا یونان میں عرقِ مکو و بادیان، خمیرہ گاؤ زبان، شربتِ عنّاب، بنفشہ اور عرق نعناع کبھی دستیاب، پیدا یا استعمال ہوتے تھے۔ ★[1]

قارون کے والد کا کیا نام تھا؟ ارے صاحب، کیا ڈیڑھ فی صد سُود بھی حرام ہے؟ مدینے میں عام حجروں کے حدودِ اربعہ کیا تھے؟ کھجور کے درخت کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ کیا سؤر کا نام لینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ نیز یہ کہ مٹّی کے بدھنے میں کتنے لیٹر پانی آتا ہے؟ ہیکلِ سلیمانی کا نقشہ کیسا تھا؟ انجیل میں آیا ہے کہ ملکہ سبا کی پنڈلی پر بال تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ براؤن تھے یا سیاہ؟ کیا ان کا شیڈ اُس کی پُتلی سے میچ کرتا تھا؟ میری حیثیت ان تحقیقی اور عِلمناک مباحثوں میں محض ہُد ہُد کی سی ہو کر رہ گئی تھی، جس کا کام ملکہ سبا کی خبر لانا اور اِدھر کی اُدھر لگانا تھا! دورانِ حج برنی صاحب مجھ سے بار بار پوچھتے ''بھائی صاحب، یہ جنّت البقیع میں تالا کیوں لگا رکھا ہے؟ اس کی تالی، معاف کیجئے، چابی کس کے پاس ہے؟ ظالم فاتحہ تک نہیں پڑھنے دیتے!'' وہ مجھ سے اس طرح پوچھتے جیسے تالا میرے ذاتی حکم سے لگایا گیا ہے اور میں وہابیوں کا امام ہوں جس کی پیروی و اطاعت شاہ فہد پر واجب ہے!

اگر کوئی ہَپٹ جاہل بھی یہ محققانہ اور عالمانہ بحث مباحثہ چند روز سُن لیتا تو فارغ التحصیل ہو جاتا۔ ایک زمانے میں تو مرزا کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں کوئی اُتاؤلی باؤلی خوبصورت انگریز سیکریٹری گڑبڑا کے مسلمان نہ ہو جائے اور حجاب نہ پہننے لگے! پھر تو سارا dictation بے معنی ہو کے رہ جائے گا!

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ابھی کچھ دیر پہلے حج کا ذکر آیا تو ایصالِ ثواب واجب ہو گیا۔ برنی صاحب ہی کے طفیل مدینے میں قیام نیشنل بینک کے نہایت آرام دہ ریسٹ ہاؤس میں رہا۔ مکّے اور مدینے میں پُر تکلف کھانے کا اہتمام بھی نیشنل بینک کے سعودی عرب میں سربراہ اطہر حسین صاحب کرتے تھے۔ ان کے گھر سے دونوں وقت جمبو سائز کا ٹفن کیریر آتا تھا۔ ایک دن میں نے برنی صاحب سے کہا کہ ہم

★[1] اس مرحلے پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنی علمی پیاس بُجھانے کے لیے استفسار کیا، آیا سکندرِ اعظم نے یونانی معجون کھا کر ہندوستان پر حملہ کیا تھا؟ اور کیا یہ صحیح ہے کہ وہ مقامی آب و ہوا سے عاجز آ گیا تھا اور دشمنوں پر فتوحات حاصل کرنے کے بعد خود بخود پسپا ہو کر مع اپنی فوج کے واپس چلا گیا۔ البتہ چند satraps اور یونانی معجون کا نسخہ چھوڑ گیا جسے حکیموں نے اپنا ورثہ جان کر اُچک لیا۔ اس کے اجزاء کی مدد سے انہوں نے کوشش کی کہ مردانہ فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جو ہنوز جاری ہے۔

پر تو دوسرا حج واجب ہو گیا۔ اس لیے کے حج کے دوران ایسے پرتعیش انتظامات اور مرغن غذائیں، مناسک حج کی روح اور غرض و غایت کے منافی ہیں۔ اگر ایسے حج کا کوئی ثواب ہے بھی تو وہ سارا کا سارا اطہر حسین صاحب کے اکاؤنٹ میں جائے گا اور ہم دونوں میدان حشر میں بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ اور دائیں میں خالی ٹفن کیریئر لٹکائے داورِ حشر کے حضور پیش ہوں گے!

فرمایا ''جناب، آپ اس وقت احرام باندھے ہوئے ہیں، حالانکہ تہمد والا حصّہ ڈھنگ سے باندھنا آپ کو اب تک نہ آیا۔ ایسی باتوں سے سارا ثواب زائل ہونے کا قوی احتمال ہے۔ کفارہ اور دَم★[1] لازم آتا ہے۔ بھیڑ بکری ذبح کرائیے۔ مگر ٹفن کیریر کے ساتھ زندہ بکری، میرا مطلب ہے ممیاتی بکری لانے کا ذمّہ اطہر حسین نے نہیں لیا ہے۔ ان کی داد و دہش مسلّم ران اور سری پایوں تک محدود ہے۔ ایسی باتوں کے نتیجے میں کفاروں کا سلسلہ جاری رہا تو Samsonite کی جو منی بیلٹ آپ پیٹ پہ باندھے دن بھر طواف کرتے ہیں اور اس میں جو سعودی ریال آپ نے سونے کی چوڑیاں خریدنے کے لیے الگ رکھ چھوڑے ہیں وہ بیوی کے بجائے بکریوں کی نذر ہو جائیں گے! لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی کیسی باتیں کرنے لگا۔ (کان کی لویں دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے) مجھ پر بھی توبہ و استغفار لازم ہیں۔ بات یہ ہے کہ احرام باندھنے کے بعد بعض حلال چیزیں اور باتیں بھی قطعاً حرام ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے اسے احرام کہتے ہیں۔ لیجئے، انگور کھائیے۔ seedless ہیں۔ اطہر لائے تھے۔ اور یہ امریکن سیب ہیں۔ یہاں ہر پھل، ہر میوہ ہر موسم میں ملتا ہے۔ کیلا تو آپ نے کل کھایا تھا۔ ایک فٹ لمبا! مگر منشی گنج (بنگلہ دیش) کے کیلے کا جواب نہیں۔ مصری کی ڈلی کہیئے۔ حالانکہ چھنگلیا کے برابر ہوتا ہے۔ اور ہاں، آپ کی پسندیدہ سبزی یعنی بھنڈی اب عرب شیوخ بھی بڑے شوق و رغبت سے کھانے لگے ہیں۔ مگر اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ کفارے اور دَم کے ڈر سے وہ خاصیت حالتِ احرام میں بیان نہیں کر سکتا۔ سَوری! (توقف کے بعد) اگر ہم ایامِ حج کے دوران اسی طرح ڈائلاگ بولتے رہے تو بکریوں کے ریوڑ کے ریوڑ بھی ناکافی ہوں گے۔ بطور دم اونٹ ذبح کرنے پڑیں گے!''

''سالم اونٹ!؟'' میں نے حیرت سے وضاحت چاہی۔ ''پھر تو سارا فارن ایکسچینج اونٹوں کی نذر ہو جائے گا!''

انہوں نے احرام کا پلّو منہ پر رکھ لیا تاکہ ہنسی دکھائی اور سنائی نہ دے۔ وہ اس عمل سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا ''ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں کا ہمراہ آنے کا مقصدِ اولیٰ ایک دوسرے کے حج

★[1] دَم: مناسکِ حج کی ادائیگی میں کسی خطا کے سرزد ہونے پر بھیڑ، بکری ذبح کرنا یا گائے اور اونٹ کا ساتواں حصّہ۔

کے ثواب میں کھنڈت ڈالنا ہے۔ جزاک اللہ۔"

نظر اور نظریہ کا دھوکا!

کبھی میں سنجیدگی سے یا ازراہِ تفنن B.C.C.I یا ان کے بعض عقائد پر کوئی فقرہ کس دیتا تو وہ صاف طرح دے جاتے۔ بے شمار ایسے دینی، دنیاوی، سیاسی اور پیشہ ورانہ مسائل تھے جن پر بیّن اختلاف رائے تھا۔ میرے اور ان کے بعض معتقدات، ترجیحات، تفریحات، اندازِ فکر، پسند و ناپسند، مرغوب و نامرغوب میں بُعد المشرقین تھا، مگر وہ دوستی اور مہر و محبت کی راہ میں کبھی حائل و حارج نہ ہوا اور اس کا بیش از بیش کریڈٹ ان کی رواداری، کشادہ دلی اور بُردباری کو جاتا ہے۔ کھرا کھلا، اصولی اور صحت مند اختلاف رائے جتنا آزاد معاشرے کے لیے ضروری ہے، اتنا ہی باہمی ربط و تعلق کے لیے باعثِ تقویت و زیبائی ہے۔ آپ نے ٹیوب اسٹیشنوں پر نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے والے سو سو سیڑھیوں کے ایس کے لیٹرز (escalators) برابر برابر بیک وقت چڑھتے اور اترتے دیکھے ہوں گے۔ ان دونوں پر جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اتنے ٹیڑھے کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں کہ لگتا ہے اب گرے، اب گرے۔ حالاں کہ دونوں اپنے اپنے مقام پر الف (ا) کی مانند بالکل سیدھے کھڑے ہوتے ہیں! کچھ ایسا ہی احوال معتقدات و مسلّمات، نظریات و زاویہ ہائے نگاہ کا ہوتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعضوں کے زاویۂ نگاہ میں نرا زاویہ ہوتا ہے۔ نگاہ نہ ہونے کے برابر۔

موت اور بُوٹ پالش

میں نے ایک بے تکلف محفل میں کہا "مغرب میں موت کا ذکر taboo (ممنوع) ہے۔ دور پرے کا اشارہ اور حوالہ بھی بدمذاقی اور نظامِ ہضم میں باعث خلل تصور کیا جاتا ہے۔ کوئی شدید بیمار ہو تو اسپتال میں رُوپوش ہو جاتا ہے، جہاں اُس کی جانکنی صرف ڈاکٹر، نرسیں اور مانیٹرنگ مشینیں دیکھ سکتی ہیں۔ بعد از مرگ mortician اس کے جسم میں فارملین پمپ کر کے اور میّت کا میک اپ کر کے ایسا کر دیتا ہے کہ مردہ مردہ معلوم نہیں ہوتا۔ مادام تساؤ کا مومی مجسمہ لگتا ہے جو بالعموم اصل سے بہتر ہوتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان کو اس پر پختہ یقین نہ ہو کہ دوسرا سانس آنے سے پہلے موت آسکتی ہے، اُس پر نشاطِ کار اور عرفانِ حیات کے در وا نہیں ہوتے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ "جب میں رات کو سوتا ہوں تو یہ سمجھ کر سوتا ہوں کہ شاید صبح زندہ نہ اٹھایا جاؤں۔"

برنی صاحب یہ گھور گمبھیر مونولاگ بالکل عیاں تکدّر کے ساتھ سنتے رہے۔ میرے فُل اسٹاپ

کے بعد بولے کہ امام غزالی تو بالکل درست فرماتے ہیں، مگر آپ سونے سے پہلے، کل کے لیے اپنے جوتے کیوں پالش کرتے ہیں؟ میں نے کبھی اتنے پرانے جوتوں کو ایسا لشکارا مارتے نہیں دیکھا! ڈیڑھ ماہ بعد اٹالین جوتوں کی سیل ہے۔ میرے ساتھ چلیے گا۔

(۵)

جامِ دوجہاں نما جامعہ علی گڑھ

برنی صاحب کے مزاج کے رچاؤ، رکھ رکھاؤ اور گفتار و کردار کے رنگ اور نکھار میں سب سے نمایاں اثر جامعہ علی گڑھ کا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا کہ ان کی شخصیت پر علی گڑھ کی چھاپ تھی، یقیناً under-statement (کسر بیانی) ہوگا۔ اس لیے کہ اس بابِ خاص میں وہ والہانہ شیفتگی اور جاں سپاری کی اس منزل سے گزر چکے تھے، جہاں خسروؔ کے الفاظ میں انسان ''چھاپ تِلک'' اور سب کچھ وار کے کسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اپنی مادر درس گاہ سے جو لگاؤ، محبت اور عقیدت ان کو تھی اور اس کی روایات و اقدار کی پاسداری جس درجہ ان کو عزیز تھی، اس کا اندازہ کچھ وہی دوست لگا سکتے ہیں جنھوں نے اُن کو اور اُن کے کنعان کو قریب، اتنے قریب سے دیکھا ہو کہ ہنگامِ قُرب سے نظارہ محال ہو جائے۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے اور سراہنے سے پہلے ان کے مرجع، علی گڑھ، پر ایک نگاہ ڈالنی ضروری ہے کہ یہ ان کی ذات و صفات کا سب سے نمایاں اور معتبر حوالہ ہے۔ علیگ برادری کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ہر مسئلے اور معرکے کو اسی حوالے سے دیکھتی، سمجھتی اور پرکھتی ہے۔ علی گڑھ ہی اس کے لیے عالمِ صغیر و کبیر ہے۔ یہی خلاصۂ کائنات، یہی کلیدِ حیاتِ جاوید اور یہی نویدِ نشاۃِ ثانیہ۔ تختِ سلیماں اور جامِ دو جہاں نما بھی یہی!

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

اپنے عظیم ثقافتی، وَرثے، سلطنت اور شکوہِ سلطنت سے محروم، وہ ماضی زدہ اور فرنگزیدہ نسل جس نے ۱۹۴۷ء میں ایک آزاد مملکت میں آنکھیں کھولیں، بھلا کیسے ایک صدی کے اُس کرب و درماندگی، اُس کھسیانی اور خجل خیرگی کا اندازہ کرسکتی ہے جس سے وہ اگلی نسل گزری جس نے کم و بیش ایک ہزار سال کے حاکمانہ تسلّط اور جاہ و حشم کے بعد خود کو یکا یک ۱۸۵۷ء کے مسخ آئینے (distorting mirror) میں ایک شکست خوردہ اور معتوب و مقہور اقلیت کی شکل میں دیکھا۔ پہلے پہل دیکھا اور بڑی مشکل اور کراہت سے اپنی شکل پہچاننے کے بعد امیر تیمور صاحبقراں

کی خون آشام تلوار کے جواہر نگار قبضے پر ماتھے کا گفا ٹیک کے مُراقبے میں چلی گئی!

ع یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا!

ایک منارۂ نور

اب اسے سیّد احمد خاں کی کرامات کہیے یا لارڈ میکالے کی حکمت عملی کا غیر متوقع شاخسانہ، کہ سفینہ ڈوب گیا تو بپھرا سمندر ایکا ایکی شانت ہو گیا۔ طوفان، سونامی اور زیرِ آب زلزلے جب سمندر کو متھ کے رکھ دیتے ہیں تو کبھی کبھار وہ مائل بہ کرم بھی ہو جاتا ہے اور اپنی پاتالی تہ سے کوئی کورا، اچھوتا جزیرہ، کوئی کٹیلے کناروں والا، ترشا ترشایا تاپو بیچ بھنور میں اُچھال دیتا ہے۔ علی گڑھ ایک ایسا ہی جزیرہ تھا جس پر سیّد احمد خاں منارۂ نور بن کر نمودار ہوئے۔ جو تلوار پلاسی اور سرنگا پٹم میں ٹوٹی تھی اس کی کرچیوں کو اس بزرگ سپید ریش نے اپنی پلکوں سے چُن چُن کر قلم میں ڈھالا اور اس قلم سے تلوار کا کام لیا۔ تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں۔ دو مختصر سے اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ آج سے سو برس قبل سیّد احمد خاں کا قلم اس دیوار پر کیا کچھ لکھ رہا تھا، جس پر لکھنے والی خونچکاں انگلیاں لکھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔ سمجھے یا نہ سمجھے۔

''میری ہڈیوں کو اس غم نے پگھلا دیا تھا کہ میں دیکھتا تھا کہ وقت کا قافلہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ خوابِ گراں سے بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے برسوں لگاتار تمھیں جگانے کی جدّ وجہد کی۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم واندوہ پر بے قراری سے کروٹیں نہ بدلی ہوں۔''

''آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے داور و ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں چھوڑے (چوڑے)، چمار۔۔۔ بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ کبھی اس مسجد کو منہدم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت مشقت سے اپنے گھر کو بسنے دیجیے۔''

سیّد احمد خاں نے ایک مایوس، مضمحل اور منفعل قوم کو جو جنگ ہی نہیں، ہمت بھی ہار چکی تھی ایک ولولۂ تازہ اور امید کا پیغام دیا۔ اُس زمانے میں ہندوستانی جوان ''ولایت'' بیرسٹری کی سند یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے آتے تھے اور کچھ، بقول ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے، جو خود بھی علیگ تھے، میموں سے اپنی جھجک نکالنے کے لیے ولایت آتے تھے! اس میں اتنا اضافہ کرنے کی

اجازت دیجیے کہ اکثر و بیشتر ڈگری کے دستاویزی ثبوت کے ساتھ نتھی کیا ہوا اس کا زندہ و سیم تن ضمیمہ یعنی میم بھی بطور سوغات لے جاتے تھے۔ بہر صورت مقصود و مطلوب ذاتی مفاد و نشاط ٹھہرے۔ سیّد احمد خاں پیرانہ سالی میں خالصتاً قومی و علمی مفاد و مقصد کے لیے انگلستان کے سفر پر نکلے تا کہ اس کے طرزِ تمدن، طریقِ بود و باش اور نظامِ تعلیم سے براہِ راست واقفیت پیدا کر سکیں۔ انگریزی میں شُد بُد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر نوشتۂ دیوار کی زبان اور خطِ مرموز پڑھنا اور لکھنا اچھی طرح سیکھ کر گئے۔ اپنے تاثرات، مشاہدات اور ان پر مبنی خیالات و افکار کا اظہار جس طور پر پورے خلوص اور بے خوفی سے کیا اور ہزار مخالفتوں اور فتوؤں کے باوجود اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنا کر دکھایا اُس کی نظیر اور مثال، ماضی و حال میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ اور یہ کارنامہ اُس زمانے میں انجام دیا جب ہمارے بعض جید علماء اس قسم کی بحثوں اور مجادلوں میں اُلجھتے اور جُوجھتے رہتے تھے کہ چھری کانٹے سے کھانے اور ٹائی لگانے سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے! مغربی تہذیب اور بُود و باش سے الرجی کی مثال، شاذ و نادر ہی سہی، ہندوؤں میں بھی مل جاتی ہے۔ لگ بھگ اس زمانے میں جے پور ریاست کا مہاراجہ بھی بڑے کرّ و فر سے اسٹیمر سے لندن گیا۔ رام نواس باغ کے شاہی کنویں کے پانی سے بھرے ڈرم اور چاندی کے کلسوں کے علاوہ جے پور کی مٹی کی بوریاں بھی زادِ سفر میں ڈھو کے ساتھ لے گیا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ جنم بھوم کے پوتر جل سے آبدست لینے کے بعد ولایت کی مٹی سے رگڑ کے ہاتھ دھونے سے ہاتھ اپوتر یعنی پلید اور دھرم بھرشٹ ہو جائے گا!

سیاہ شیروانی

علی گڑھ تحریک نے ایک نشاۃ ثانیہ اور نژادِ نو کی طرح ڈالی۔ سیزر (Caesar) کا حق سیزر کو دینے اور اپنا حق لڑ کر لینے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اپنی بات بے درنگ کہنے اور جم کر کہنے کی راہ دکھائی۔ خود اعتمادی، حسنِ سلوک، روشن خیالی، وسیع المشربی اور شائستگی۔۔ یہ وہ اوصاف و اقدار ہیں جن کی پرورش و ترویج اس تحریک کا مقصود و مدعا تھا۔ جیسا کہ کچھ دیر پہلے عرض کر چکا ہوں، برنی صاحب اپنے مزاج و افتادِ طبع، وضعداری، ایثار اور برتاؤ کے اعتبار سے ٹھیٹ علیگ تھے۔ ان کی دردمندی، پاسِ خاطرِ احباب، خوشدلی، خوش لباسی، بذلہ سنجی اور ذوقِ بزم آرائی علی گڑھ کی دین تھی۔ وہ علی گڑھ کے شیدائی و فدائی تھے اور اس کی ہر ادا کے قتیل۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے چالیس برس بعد بھی انہوں نے اسی درزی کی دکان سے سیاہ شیروانی سِلوا کر منگوائی جہاں زمانۂ طالبِ علمی میں سِلواتے تھے۔ ایک دفعہ جمعہ کو یہ شیروانی پہن کر آئے اور مجھ سے داد چاہی تو مجھے اقرار کرنا پڑا کہ

بالکل ویسی ہی لگتی ہے جیسے واقعی چالیس برس قبل کی سلی ہوئی ہے۔

ان کا وائپر چلنے لگا۔

میں نے یہ بھی کہا کہ شیروانی شمسی صاحب پر بھی جچتی ہے۔ وہ درزی سے بطور خاص نو بٹن لگواتے ہیں!

کہنے لگے، بڑا لونڈہار پن ہے! سینے پہ کنکھجورا سا بٹھائے پھرتے ہیں!

کیفے ڈی پھونس، قورمہ اور شاہی ٹکڑے

علی گڑھ کا نام آتے ہی برنی صاحب پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی اور لہجے میں ایک ہمہمہ۔ اس کے ذکر اذکار سے ان کی کبھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اپنے دور کا ہر واقعہ، بالخصوص چھوٹا اور غیر اہم واقعہ ان کے ذہن پر نقش تھا۔ پھونس کی چھت والا ٹی ہاؤس جو کیفے ڈی پھونس کہلاتا تھا، اُس کا ہر بیرا، ہر تڑخی ہوئی پلیٹ اور chipped (جھڑے ہوئے کناروں والا) کپ انہیں یاد تھا۔ کہتے تھے، ایسے کرارے نمک پارے کہیں اور نہیں دیکھے۔ ارے! آپ مسکرا رہے ہیں۔ کیا آپ کو دو جوانوں کے لئے چھ آنے میں ایسے پھُولے پھُولے سے نمک پارے، برفی اور چائے کہیں اور مل سکتی ہے؟

''کہیں اور کا کیا ذکر۔ مجھے تو وہاں بھی ایسی برفی نہیں ملی!'' میں نے کہا

''یہ کیوں؟''

''میرے پاس اُس زمانے میں چھ آنے اور انہیں اس مَد میں ٹھکانے لگانے کے لیے فالتو وقت نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے سارے مُدمّغ سینیئرز، کٹ کھنے bullies اور ٹھَلوے grandees کا وہاں جماؤ ہوتا تھا!''

''آپ کے منہ سے ٹھَلوا بہت اچھا لگا۔ ۴۵ برس بعد سنا ہے۔ واللہ! ٹھَلوا دراصل بیکار اور ٹھالی سے آگے کی چیز ہے۔ اب نہ اِس لفظ کے نکھٹو پن کی داد دینے والے رہے اور نہ وہ ٹھَلوے!''

''میں نے یہ لفظ کل ہی سیکھا ہے!'' میں نے کہا۔

''کس سے؟ اُس بزرگ کے ہاتھ چُومنے کو جی چاہتا ہے۔''

''گھر جا کے آپ کی طرف سے اُردو لغت، جلد شَشُم چوم لوں گا! کل ورق گردانی کرتے ہوئے اچانک اس پر نظر پڑ گئی! بس ٹانک لیا۔''

''تو کیا ٹانک لیا، بھی جلد شَشُم کے تبرکات میں سے ہے؟''

اُن کا وائپر چلنے لگا۔

برنی ہماری قسمت میں نہیں تھی اور نمک پاروں کی قسمت میں ہم نہیں لکھے تھے۔ البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ڈائننگ ہال میں جو قورمے کا لنگر تقسیم ہوتا تھا، اُس کا اشتہا کش، بھوک مار اور بے حد مرچیلا نسخہ سیّد احمد خاں کے وقتوں سے سینہ بہ سینہ اور پسینہ بہ پسینہ چلا آرہا تھا! ہم نے دیکھا کہ چالیس پچاس برس قبل کے (very) اولڈ بوائز کو بھی ناسٹلجیا ڈائننگ ہال میں کھینچ بلاتا تو وہ تصدیق کرتے تھے کہ بخدا پلیٹ میں قورمے کی مقدار، بھبکا، مزہ، پانی میں شوربے کا تناسب اور مرچوں میں شوربے کی ملاوٹ بالکل وہی اور ویسی ہی ہے جیسی کہ ہمارے زمانے میں ہوا کرتی تھی! اس کی ایک وجہ تو یہ بتائی جاتی تھی کہ جن دیگوں میں یہ قورمہ پکتا ہے، وہ سیّد احمد خاں کی وفات کے بعد کبھی نہیں دُھلیں! البتہ تیزابی سے شوربے سے دیگیں جتنی اور جیسی کچھ آپی آپ دھل جائیں وہ حفظانِ دیگ کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا سبب یہ کہ نسخے کا جزوِ اعظم تیز جَوا مرچیں تھیں جنہیں نلکے کے پانی سے معتدل کیا جاتا تھا۔ شوربے اور رَبر سے بنی دو بوٹیوں کو پلیٹ میں سجانے کے بعد عملِ تقاطر روغن یعنی آئی ڈراپر سے گھی کے تار کے، گن کے تین مساوی قطرے ٹپکا دیے جاتے تھے جن کے دیکھے سے منہ پہ رونق آجاتی تھی!

برنی صاحب کو تو وہ دَم پُخت مکھیاں اور مُسلّم کاکروچ بھی فرداً فرداً یاد تھے جن کی باقیات سے یہ ماء اللحم سہ آتشہ تیار کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں یہ خیال بلکہ عقیدہ بہت عام تھا کہ اگر منہ پھیر کر مکھی کو شوربے میں سے نکال کر اُسے دوبارہ اسی میں غوطہ دیں تو اس کے مضر اثرات زائل ہو جاتے ہیں! برنی صاحب اپنے لیے روزانہ ایک اسپیشل سویٹ ڈش بصرفِ زرِ کثیر علاحدہ سے منگواتے اور قورمے کی زہرناکی کو شاہی ٹکڑوں سے مارتے تھے۔ زرِ کثیر سے ہماری مراد پانچ روپے ماہانہ ہیں جو اس زمانے میں طالب علم کے لیے خاصی خطیر رقم ہوتی تھی۔ اس سے قطع نظر، ان شاہی ٹکڑوں سے ''شاہی'' کم اور ٹکڑا پن زیادہ ٹپکتا تھا! ڈائننگ ہال اور مطبخ کے نگراں ایک پروفیسر نئے نئے تعینات ہوئے تھے۔ اپنی پھوہڑ زبانی کے لیے مشہور تھے۔ بڑے فخر سے فرماتے تھے کہ ''میرے چارج لینے سے پہلے معصوم بچوں کو جو شاہی ٹکڑا زہر مار کرایا جاتا تھا وہ مزے اور سائز میں مرغی کی بیٹ کے برابر ہوتا تھا۔ میں نے آتے ہی اس کو چوگنا کر دیا! بچے نہال ہو گئے۔''

یہاں بلیہ کے لڑکے نہیں رہتے

ان کی زبانی علی گڑھ کا ہر واقعہ، قصہ بن جاتا اور ہر قصہ ایک قصیدہ جو عجیب لذّت رکھتا تھا کہ اس سے عہدِ جوانی کی حیرت، حسرت، سرخوشی، پاکیزگی اور بے زری ٹپکی پڑتی تھی۔

چاند چُھو لینے کا قصہ بھول پی جانے کی بات

ایک دن جوش میں آئے تو کہنے لگے کہ علی گڑھ میں فیل ہونے میں بھی ایک طنطنہ، ایک نرالی بلکہ نوابی شان ہوتی تھی!

میں ہنس دیا تو کہنے لگے کہ بنگال کی ریاست دربھنگا کا ایک لڑکا چار سال سے خود کو بی۔ اے میں متواتر فیل کروا رہا تھا کہ خدانخواستہ پاس ہوگیا تو یونیورسٹی کو الوداع کہنا پڑے گا۔ گھر جانا پڑے گا۔ پھر نوکری اور شادی کا کھڑاگ! جب کہ وہ صدقِ دل سے گپ، رمی، کرکٹ اور کیفے ڈی پھونس کو گھر، نوکری اور بیوی پر ترجیح دیتا تھا! اُسے ہزاروں اشعار یاد تھے اور چاندنی رات میں جب گالیوں کا سالانہ میچ ہوتا تو ہمیشہ اول آتا تھا۔ کہتا تھا، میں چاہوں تو بڑی آسانی سے اچھے شعر کہہ سکتا ہوں۔ مگر شعرگوئی سے محض اس لیے پرہیز کرتا ہوں کہ تخلّص کے ساتھ دربھنگوی لکھ کر دُر دُر کروانا اور اپنی بھد اُڑوانا نہیں چاہتا۔ علی گڑھ والے ہم پوربیوں، بہاریوں، بالخصوص بلیہ والوں کو سادہ لوح اور گھامڑ سمجھتے ہیں اور ہمارا مذاق اُڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حالاں کہ کچھ دن قبل بچارے بلیہ کے لڑکوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ہاسٹل کے "Baliatic Wing" پر ایک بینر لگا دیا تھا:

"یہاں بلیہ کے لڑکے نہیں رہتے"

السلام علیکم کا جواب

سلام کرنے کا انداز بھی وہی تھا جو علیگ برادری سے خاص ہے۔ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے اور اس گرمجوشی اور تپاک سے اپنی گونجیلی آواز میں السلام علیکم کہتے کہ محسوس ہوتا نہ جانے کب سے ہماری آمد کے منتظر بیٹھے ہیں۔ یہ بھی علی گڑھ کے آداب میں داخل تھا کہ اگر کوئی سلام کرنے میں سبقت لے جائے تو جواب میں السّلام علیکم ہی کہا جائے۔ وعلیکم السلام نہیں! اس سے بھی اس اخلاص و انکسار کا اظہار مقصود تھا کہ 'برادرِ من' سلام تو مجھ پر واجب تھا، تم نے وفورِ شوق میں پہل کردی۔ اُس زمانے کے جکڑ بند فیوڈل آدابِ بندگی میں یہ ایک برادرانہ بدعت تھی۔ سجدۂ تعظیم سے درباری ماتھوں پر پڑے فدویانہ گٹوں اور بحالتِ رکوع فرشی سلام اور کورنش سے چٹختے گھٹنوں کی تصویر ابھی حافظے سے محو نہیں ہوئی تھی۔ نواب، جاگیردار، زمیندار اور امرا اور روسا سلام کرنے کے نہیں، سلام اور سلامی لینے کے عادی تھے۔ وہ بھی نذرانے کی اشرفی کے ساتھ جو کھوٹی ہوتے ہوتے کلدار روپیہ بن گئی تھی! علی گڑھ نے فیوڈل بُت کو توڑا تو نہیں، البتہ اسے ادب آداب اور ڈھنگ سے سلام کرنا سکھا دیا۔ اس تناظر میں پُرتمکنت "وعلیکم" کے بجائے "السلام علیکم" تازہ ہوا کا ایک جھونکا تھا جو سیّد احمد خاں کے چمنِ مساوات سے ہمیشہ آتا اور دلوں کو سرور بخشتا رہے گا۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اپنے دفتری fish-bowl میں، جس کی دیواریں شیشے کی تھیں،

ٹڑوں ٹڑوں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرائی تو میں برنی صاحب کی طرف چلا گیا اور صرف ان کا وفورِ شوق و اخلاص سے معمور السلام علیکم سن کر اُلٹے پیروں اس طرح واپس آیا گویا یکایک کوئی کام یاد آ گیا۔ میرے اس بھُلکڑ پن یا تلون پر حیران تو ہوئے ہوں گے، مگر انہیں یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ بندہ تو محض اپنی طبیعت کا تکدّر اور زنگ اُن کے السلام علیکم سے اتارنے کی غرض سے ادھر آ نکلا تھا!

مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ رکھ نیچی نظر اپنی

محفل کیسی بھی ہو، کسی کی یا کہیں بھی ہو، وہ اپنی گفتگو کی سطح اور کرارا لہجہ برقرار رکھتے۔ صحبت کتنی ہی دوستانہ اور بے تکلف کیوں نہ ہو، یا محفلِ یاراں یکایک رنگ پہ آ جائے، ان کی زبان پر کبھی کوئی غیر ثقہ فقرہ یا کثیفہ نہیں آیا جو دراصل مڈل ایجڈ لہو کو گرم رکھنے کا مجلسی بہانہ ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایسا ویسا فقرہ یا shaggy dog story اخلاقاً سننی پڑتی۔ یعنی مارے باندھے تو چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ ہونٹ مضبوطی سے بھینچ کر سر جھکا لیتے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میرا ان کا چوالیس برس کا ساتھ تھا۔ میں نے کبھی انہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یا آنکھ اونچی کر کے بات کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ میں نے ان کی آنکھیں کبھی پوری کھلی ہوئی نہیں دیکھیں۔ میں نہیں بتا سکتا کہ ان کی پتلیاں چھوٹی تھیں یا بڑی۔ کرنجی یا گہری سیاہ یا ہلکی براؤن۔ اس ہال میں ان کے دیرینہ رفقاء اور نیازمند اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ذرا آپ بھی ذہن اور حافظے پر زور دے کر غور کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ بھی یہ بتانے سے خود کو قاصر پائیں گے۔ نگاہ نیچی رکھنے کا یہ شرمیلا سا انداز ان کی شخصیت اور شائستگی کا ایک دل آویز حصّہ تھا۔ مرزا ان کی اس ادا پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ بار بار تلقین کرنے لگے کہ لندن میں تم بھی اسی طرح نظریں نیچی رکھا کرو۔ بے نیازانہ گزر جانے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ اس سے روحانی ترفّع اور بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے حواریوں نے بھی اس کی پرزور تائید کی۔ اخلاقی دباؤ اتنا بڑھا کہ ہم بھی قائل ہو چلے کہ روحانی تطہیر و پاکیزگی کی راہ میں بینائی سب سے بڑی رکاوٹ ہے! چنانچہ ہم نے جی کڑا کر کے ایک ہفتے تک نظریں اتنی نیچی رکھیں کہ خواتین کو فقط اُن کے جُوتوں سے پہچاننے لگے! اب اسے ستم ظریفی نہیں تو اور کیا کہیں کہ ہماری نیچی نظر کی focal line یعنی خود کشیدہ خطِ عصمتِ نگاہ کے اُس پار اِس ایک ہفتے میں کھلی آنکھوں والوں نے جو کچھ دیکھا، اُس کا لذّت بھرا احوال خود مرزا نے ہمیں جلانے اور تپانے کی غرض سے غمزہ بہ غمزہ، چہرہ بہ چہرہ، مُو بہ مو بلکہ منہ در منہ سنایا تو ایسا لگا کہ لندن میں دیدنی و نادیدنی جلوہ آرائیاں اور غمزہ طرازیاں یعنی سبھی کچھ ان سات دنوں میں ہماری

میش چشمی ★ کے دوران ہو گیا۔ ظالموں نے ہماری آنکھوں پر تو blinkers (اندھیری۔ کھوپے) چڑھا دیئے، لیکن جلوہ گری اور عشوہ طرازی پر کوئی قدغن نہیں:

کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر!

(۶)

قبل از U.B.L بینکوں کا نقشہ

علی گڑھ کے بعد اُن کی شخصیت پر سب سے گہرا، مُثبت اور دور رس اثر یونائیٹڈ بینک اور B.C.C.I کے ''corporate culture'' کا نظر آتا ہے۔ ان دونوں بینکوں نے بینکاری کے مزاج، طریق کار، بیوپار اور وژن کو منقلب کر دیا۔ یو۔ بی۔ ایل پاکستان میں پہلا بینک تھا جس نے ''کسٹمر''، خصوصاً oil-rich عرب شیوخ کے مزاج، ضرورت اور اہمیت کو پیشہ ورانہ سطح پر سمجھا۔ جودتِ طبع اور تجربے سے اسے بیوروکریسی کے پھنپھناتے ناگ اور سو سر والے اژدہے کو رام کرنے کا گُر بھی سکھا دیا۔ حاسدوں اور ''rat race'' میں پیچھے رہ جانے والوں کی زبان اُن کی ٹانگوں سے زیادہ چلتی ہے۔ چنانچہ ایک جلے تن نے فقرہ کسا کہ ہُنرمندوں نے بینکاری کو بین کاری بنا کر کمالِ فن کے درجے تک پہنچا دیا! لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۹۵۹ء میں یو۔ بی۔ ایل معرضِ وجود میں نہ آتا تو بینکوں کا آج بھی وہی نقشہ ہوتا جو پوسٹ آفس میں دیکھنے میں آتا ہے۔ تفصیل کا نہ محل ہے، نہ وقت، مختصراً اتنا عرض کرتا چلوں کہ مسلم کمرشل بینک کا جہاں میں نے اپنے بینکنگ کیریر کا آغاز کیا، انگریز جنرل منیجر بے بی آسٹن میں دفتر آتا تھا۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے چیف کنٹرولر آف فارن ایکسچینج جن کا سینیارٹی اور منصب کے لحاظ سے گورنر کے بعد نمبر آتا تھا (اور جو کچھ عرصے بعد فنانس منسٹر بھی مقرر ہوئے) وہ نہ صرف اپنی پرانی دُھرانی سائیکل پر دفتر آتے تھے، بلکہ سائیکل کو تالا لگا کے میز کی دائیں طرف نظروں کے سامنے پارک کرتے تھے۔ ایک کِلپ اپنی پتلون کے پائینچے کو کٹ کھنی چین میں اُلجھنے سے باز رکھنے کے لیے لگاتے تھے اور خود دن بھر اپنے ماتحتوں سے الجھتے رہتے تھے۔ صبح کا لگایا ہوا کلپ شام کو گھر لوٹ کر ہی نکالتے تھے۔ ایک دن ہم فاروقی لیجر کیپر سے مانگے کی سائیکل اور کلپ لے کر اُن کے حضور اِنگل روڈ کے صدر دفتر میں پیش

★ میش چشم: بھیڑ کی سی آنکھوں والی۔ شرمیلی، نیچی نظروں والی حسینہ۔ فارسی زبان میں یہ کلمۂ تحسین ہے! لیکن کسی سے بڑے پیار سے سلیس اردو میں یہ کہا جائے کہ ''جانِ من، تمہاری آنکھیں بھیڑ جیسی ہیں'' تو اگر وہ اس کلمۂ توصیف و تحسین کا جواب اپنا پرس مداح کے سر پر مار کر نہ دے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دُکھیا اُس کی اپنی صابر و بے زبان زوجہ ہے! بھیڑیے کو بھیڑ کی آنکھ سے دیکھنے کی عادی ہو گئی ہے!

ہوئے تو انہوں نے ہمیں جُوتے سے پائینچے تک دیکھا۔ چونکے۔ فوراً بائیں طرف جھک کر اپنا کلپ ہاتھ سے ٹٹول کر چیک کیا۔ پھر "وعلیکم" کہا! ہمارے اپنے بینک کے چیف اکاؤنٹنٹ اکثر اپنی گھسی ہوئی پنسل کے ڈیڑھ انچ ٹوٹے پر کاغذ کی نلکی سی چڑھا کر ہمارا کام چیک کرتے اور غلطیاں نکالتے تھے۔ ہم اسے غنیمت جانتے، اس لیے کہ پنسل اگر سالم اور دراز قامت ہوتی تو زیادہ غلطیاں نکالتے۔ اگر کام میں کوئی غلطی نہ نکلے تو اپنی چیکنگ کی رائیگانی پر جھنجلاتے تھے! بار بار اپنی ٹائی سے عینک کے شیشے صاف کر کے دیکھتے کہ ہم نے کوئی ہندسہ erase تو نہیں کیا ہے۔ یعنی ربر یا بلیڈ سے بڑی کاریگری سے کھرچ کر over-writing تو نہیں کی۔ کہتے تھے، بینکنگ کے پیشے میں erasure سے زیادہ سنگین اور کوئی جرم نہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، کیوں کہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ چارٹرڈ بینک میں ابتدائے ملازمت کے دوران ایک شام 9 پائی زیادہ نکلنے کے باعث کم بخت لیجر کسی طرح "بیلنس" ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ تھک ہار کے انہوں نے اسے 7 O'CLOCK کے بلیڈ سے بیلنس کر دیا! انگریز منیجر نے صرف erasure ہی نہیں، انہیں بھی پکڑ لیا اور پکڑ کے نکال باہر کیا۔ اُس کا الوداعی ریمارک تھا: تم بلاشبہ erasure کے ماہر اور ماسٹر ہو۔ تم نے لیجر پر قلم کے بجائے سیفٹی ریزر چلایا ہے۔ جو شخص ۹ پائی کی بے ایمانی کر سکتا ہے، وہ ۹ ہزار اور ۹ ملین کا غبن کرنے سے نہیں چُوکے گا۔ یہ بینک تمہاری مخفی صلاحیتوں کے لیے بہت چھوٹا ہے! گُڈ بائی۔

جونخریل افسر بینک کے فراہم کردہ چوبی ہولڈر اور دوات کی بجائے ذاتی فاؤنٹین پین استعمال کرتے، اُن کو چیف اکاؤنٹنٹ یعسوب الحسن غوری کے حکم کے مطابق Swan Ink گھر سے لانا پڑتی تھی۔ اسے مقفل دراز میں رکھنا پڑتا تھا، کیوں کہ اکثر چوری ہو جاتی تھی! اُس زمانے میں بال پوائنٹ قلم بازار میں نئے نئے آئے تھے۔ سخت ہدایت تھی کہ انہیں کسی مرحلے اور کسی صورت استعمال نہ کیا جائے۔ جو چیک بال پوائنٹ سے لکھا جائے یا جس پر اس سے دستخط کیے جائیں اُسے ہرگز "پاس" نہ کرو۔ سختی کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان دنوں نامور صحافی زیڈ۔ اے سلیری تازہ تازہ لندن سے وارد ہوئے تھے۔ میں نے ایک دن ان کا کرنٹ اکاؤنٹ کھول دیا۔ چار بجے میری پیشی ہوئی۔ جنرل منیجر اینڈرسن نے پوچھا "تم نے ایک جرنلسٹ کا اکاؤنٹ کیوں کھولا؟ تمہیں اس بینک میں ملازمت کرتے ہوئے تین دن نہیں، پورے تین ماہ ہونے کو آئے! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ سمجھدار بینکرز کبھی بھی جرنلسٹوں اور وکیلوں کے اکاؤنٹ نہیں کھولتے۔" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو کہنے لگا کہ "اس کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں اس ممانعت کی وجہ بھی معلوم نہیں!" میں نے اقرار کیا کہ میری مزید لاعلمی کے بارے میں جناب کے شبہات درست ہیں۔

''اور تم کہتے ہو کہ تم LL.B بھی ہو!'' اُس نے حسبِ معمول طعنہ دیا۔ میری یہ ڈگری اُس پر بہت گرانی کرتی تھی۔

پھر اُس نے لہجہ بدل کر اس کی وجہ بتائی ''کسٹمر اگر وکیل یا جرنلسٹ ہے تو اس سے اختلاف یا جھگڑے نمٹنے کی صورت میں جیت ہمیشہ اُسی باسٹرڈ کی ہوگی۔ وہ اسے حق کی فتح کہے گا۔ ہارنے کے علاوہ تمہاری بھد اُڑے گی سو الگ! اخباروں میں کیچڑ اُچھلے گا۔ کورٹ کچہری میں مُچلکے اور ضمانتیں کرواتے پھرو گے۔ اُس .S.O.B کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ دانا آدمی کھلی آنکھوں سے کسی ایسی relationship کو قبول نہیں کرتا جس میں ہر صورت میں ہار اسی کی ہو۔ سوائے رشتۂ ازدواج کے!''

مرزا تک یہ قول زرّیں پہنچا تو کہنے لگے کہ اپنا اپنا زاویۂ نکاح ہے! انہیں معلوم تھا کہ کچھ عرصے پہلے اینڈرسن کو ایک وکیل کی معرفت بیوی کی جانب سے طلاق کا نوٹس ملا تھا۔

میں کمرے سے منہ لٹکائے نکل رہا تھا کہ اینڈرسن کہنے لگا ''بائی دی وے، تم بیلٹ کیوں نہیں لگاتے؟ یہ پتلون اب لٹک کر میری نظروں کے سامنے تمہارے قدموں پہ گرا چاہتی ہے!

''It can't resist the gravitational pull.''

یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں اور بھی لکھا ہے کہ بینک کی کسی برانچ میں ٹائلٹ نہیں تھا۔ صرف ہیڈ آفس میں تھا جو اکثر و بیشتر اینڈرسن کے مالکانہ و عاجلانہ تصرف میں رہتا تھا۔ وہاں وہ پتلون سے شیشی نکال کر وہسکی کی چُسکی لیتا اور واپس آ کر ہمارے کام میں غلطیاں اس طرح نکالتا جیسے دیہات میں عورتیں ایک دوسرے کے سر کی جوئیں نکالتی ہیں۔ کبھی کوئی موٹی غلطی پکڑتا تو کہتا: ?Were you drunk۔ صبح نو بجے اُس کے منہ سے وہسکی کا اتنے زور کا بھبکا آتا تھا کہ ہمارے دیرینہ ساتھی عالم حسین کہتے تھے کہ رمضان شریف میں اینڈرسن کی بات یا ڈانٹ قریب سے سننے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے! میں اس زمانے میں روزہ نہیں رکھتا تھا اور عالم حسین باس کے بھبکے اور بھبکی سے افطار کرتے تھے! ذرا آگے پیچھے، اسی زمانے کا ذکر ہے، مجھے سخت جاڑے میں اِنسپکشن کے لیے منٹگمری (ساہیوال) جانے کا اتفاق ہوا۔ مقامی خاطر مدارات کا یہ انداز اور بینک کے قرضداروں کے تپاک کا یہ عالم کہ جس دکاندار یا بزنس مین کا گودام چیک کرنے جاتا وہ بالٹی کے برابر ایک گلاس میں مجھے مالٹے کا رس بالاصرار پلاتا۔ متواتر تواضع کے باعث مجھے ہر بالٹی کے بعد ٹائلٹ کی ضرورت پڑتی جو کہیں نہیں تھا! میں نے شکایت کی تو منیجر نے بیچ بازار میں ایک خالی دکان میں جس کا دوالہ نکل گیا تھا، بارہ آنے یومیہ کرائے پر ایک خالی گھڑا رکھوا دیا! اسی طرح ۱۹۵۵ء میں جب ہیڈ آفس، میری ویدر ٹاور (Merewether Tower) برانچ کی عمارت میں منتقل ہوا تو سابقہ

پنجاب بینک (آف انڈیا) کے ریکارڈ روم کو ''کنورٹ'' کر کے پہلا باتھ روم بنایا گیا جس میں ٹائلٹ رول کے بجائے استعمال شدہ بلانٹنگ پیپر رکھ دیئے جاتے تھے جو سُو دآلودہ سرخ اور بلو بلیک روشنائی پی پی کے اتنے حساس ہو گئے تھے کہ نسیمِ صبح جو چھو جائے تو رنگ چھوٹنے لگے! ہمارے ایک ساتھی بہت نستعلیق تھے۔ نفاست اور پاکیزگی پر بہت زور تھا۔ چنانچہ وہ اپنا ہی بلانٹنگ پیپر جوان کے اپنے ہولڈر کی تازہ تازہ روشنائی میں تربتر بلکہ تر بہ ستر ہوتا، استعمال کرتے تھے!

من قبلہ راست کردم بر سمتِ کج کلاہے

تفصیل قدرے طویل ہوگئی۔ مقصد صرف بینکوں کا وہ نقشہ دکھانا تھا جسے آغا حسن عابدی نے یکا یک، یکسر و بیک جنبشِ جدت پسندانہ تبدیل کر دیا! جیسا کہ ابھی عرض کیا، ان کا اپنا وژن، کارپوریٹ فلسفہ اور طریقِ کار تھا جسے برنی صاحب نے صدقِ دل سے اپنایا۔ وہ اس کی حکمت، جارحانہ توانائی، ہمہ گیری اور کارآفرینی پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی گفتار و کردار اور کارکردگی پر اس کے نہایت واضح، مثبت اور صحت مند اثرات مرتب ہوئے۔ طریقِ کار سے زیادہ انجامِ کار اور راستوں سے زیادہ منزلِ مقصود کی اوّلیت و اہمیت پر زور اور ہر تغیر و تبدیلی کو بہتری کا پیش خیمہ جان کر اسے اپنے مقصد اور کاربرآری کے لیے مفید طلب بنانا اس کارپوریٹ فلسفے کی اساس تھی۔ درحقیقت یہ فلسفہ و حکمت کم اور حکمتِ عملی زیادہ تھی۔ بہرکیف ان کے اندازِ فکر میں جو وسعت اور توانا لچک پیدا ہوئی وہ اسی کا فیضان تھا۔ ان دونوں بینکوں کے بانی و سربراہ آغا حسن عابدی صاحب سے جو والہانہ شیفتگی اور عقیدت وہ رکھتے تھے، وہ جتنی شدید اور مثالی تھی اتنی ہی مخلصانہ بھی تھی۔ ان کے ساتھ برنی صاحب کا پیمانِ وفا مکمل، محکم اور غیر مشروط تھا۔ اس کے پیچھے ربع صدی کی محبتیں، رفاقتیں اور نہ جانے کتنے مرحلے اور آزمائشیں تھیں جن سے دونوں ساتھ گزرے تھے۔ غالبؔ کے الفاظ میں برنی صاحب ان کے ''ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز'' ہی نہیں جانثار و سپاس گزار بھی تھے۔ B.C.C.I. یا آغا حسن عابدی صاحب پر محض ٹیکنیکل یا خفیف سی نکتہ چینی کو وہ خود پر ذاتی حملہ جان کر بپھر جاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مہر و محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ بقول مرزا، عابدی صاحب ان کے واجب التعظیم پیر بھی تھے اور بے تکلّف ہم پیشہ و ہمدم peer بھی!

برنی صاحب نہ صرف کاروباری اور پیشہ ورانہ بلکہ خالصتاً نجی اور دیگر دنیاوی معاملات و مسائل میں بھی آغا صاحب کو اپنا رہنما، چارہ گر اور مرشد جانتے، مانتے اور کہتے تھے ایسی بیعت نما عقیدت میں، ہمیشہ نہ سہی، کبھی کبھار ایک قباحت پیش آنے کا امکان رہتا ہے۔ مرشد سینے سے لگاتا ہے تو انشراحِ قلب اور شرحِ صدر یعنی سینہ تو کھل جاتا ہے لیکن تعقل، غور و تامّل اور نقد و نظر کا دروازہ ہی

نہیں، کھڑکیاں تک بند ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ برنی صاحب اس pitfall (گُپت گڑھا) سے واقف تھے۔

کھڑکیوں پر یاد آیا، برنی صاحب کھڑکی کو ہمیشہ دریچہ کہتے تھے۔ ایک دفعہ خود بیان کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلے کے دوسرے یا تیسرے روز میں نے چابی کو تالی کہا تو لڑکوں نے مذاق اُڑایا۔ حالاں کہ بلند شہر میں ہم سب بچپن سے بولتے آئے تھے۔

ہم نے برنی صاحب سے تو نہیں کہا، لیکن ہمارا ووٹ لڑکوں کے حق میں تھا۔ ذرا غور کیجئے۔ تالی تو تالے کا صیغۂ تانیث ہوئی۔ جب کہ کسی بھی اعتبار سے کلید اور چابی کو تالے کی مادہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اتنا تو ہمیں بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ راجستھان میں بھی ہمارے تمام ہندو دوست اور شناسا چابی کو تالی ہی کہتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ چابی کو تالی صرف اسی صورت میں کہا جاسکتا ہے جب وہ کثرتِ استعمال کے باعث ناقص العمل ہو جائے اور تالا کھولنے کے لائق نہ رہے۔ ایسی تالی کا صحیح مقام نالی ہے!

(۷)

دوسروں کو خوش لباس دیکھنے اور نماز پڑھوانے والا

برنی صاحب نہ صرف خود بڑھیا سوٹ پہنتے بلکہ دوستوں کو بھی مِل ہِل (Mill Hill) کی دکان Euro Suits سے اسپیشل ڈسکاؤنٹ پر سُوٹ خریدواتے۔ اُن کی پتلون کے پائینچوں اور جیکٹ کی آستینوں کی لمبائی اور کمر کے ناپ کا فیصلہ خود کرتے اور alteration یعنی مناسب کاٹ چھانٹ کی ہدایات بھی پروٹوکال ڈیپارٹمنٹ کے ایک ہندو ڈرائیور کو نوٹ کرواتے، جسے ڈرائیونگ ٹیسٹ کے بغیر محض اس کوالی فیکیشن کی بناء پر رکھا گیا تھا کہ اُس کا باپ درزی تھا! لیکن اس میں شک نہیں کہ، بقول بشیر صدیقی، جو پروٹوکال ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے، کانٹ چھانٹ کے بعد سُوٹ بالکل موزے کی طرح فِٹ آتا تھا!

صدّیقی صاحب کی بیشتر تشبیہات موزوں ہی سے کشید کی گئی تھیں۔ مثلاً

۱۔ میں نے اُسے موزے کی طرح اُلٹ کے رکھ دیا۔ ایسوں کو تو میں اپنے نیفے اور موزے میں رکھتا ہوں۔

۲۔ زرق برق پشواز کے نیچے نیلوفر طوائف کا چوڑی دار (پاجامہ) پنڈلی اور زانو پر موزے کی طرح اتنا چُست کہ آپ چٹکی نہیں لے سکتے۔ وہ خود بھی بیٹھ نہیں سکتی تھی۔

۳۔ خلیل ترمذی عیار اور دھوکے باز ہے۔ مسکراہٹ کا Balaclava منہ پر چڑھا کے وار کرتا

ہے۔ ایک دن اُس کا یہ موزہ اُتار کے ہتھیلی پہ رکھ دوں گا۔

۴۔ ایک دفعہ لڑکپن میں دوسرے محلے کے لونڈوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اپنی اسکاوٹ یونیفارم کا لمبا موزہ اُتارا اور اُس میں ڈھیلا رکھ کے بنوٹ کے ایسے ہاتھ دکھائے کہ بیسیوں کے سر پھوٹے۔ منہ دکھانے کے لائق نہ رہے۔

مرزا اپنی ہنسی ضبط کیے بیٹھے تھے، مگر فقرہ ضبط نہ کر سکے! فرمایا، تو یوں کہیے کہ بیسیوں لونڈے سر تڑوا کر منہ دکھانے کے لائق نہ رہے! اور ڈھیلا بھی اپنے روایتی اور طہارتی مصرف کے لائق نہ رہا! ایسی ہی باتوں سے صدیقی صاحب برنی صاحب کی محفلوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ وہ بھی ادبدا کے اُکساتے اور بڑھاوا دیتے! اُن کی بیگم سے زردہ پکوا کر ہمیں کھلاتے۔

اس میں شک نہیں کہ بڑھاپے میں دوسری شادی کے دن (جس میں برنی صاحب دُلہن کے اور میں دُولہا کا گواہ تھا) صدیقی صاحب نے Austin Reed کا جو سِلا سلایا سوٹ زیبِ تن کیا وہ واقعی ہمارے موزے کی طرح فٹ آیا!

میں یکم جنوری ۱۹۷۹ء کو ایچ غلام محمد اینڈ سنز، جنرل مرچنٹس اینڈ ٹیلرز، کراچی سے تازہ تازہ سلوایا ہوا سُوٹ اور فیشن سے اُترتے ہوئے چوڑی toe والے جوتے پہنے B.C.C.I لندن کے ہیڈ آفس پہنچا، جس کا مخفف نام ہی مجھے چکرا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس لیے کہ جس علاقے (راجستھان) سے میں پاکستان آیا تھا وہاں BB&CI سے مُراد Bombay Baroda and Central India ریلوے ہوتی تھی! یہاں میں نے دیکھا کہ اٹالین سوٹ، میچنگ سلک ٹائی اور رومال، Van Heusen کی شرٹ، Bally کے جوتے اور Mont Blanc پین B.C.C.I کے ایگزیکٹوز کی یونیفارم کا لازمی حصہ ہیں۔ کسی دل جلے نے کیا خوب لطیفہ گھڑا تھا کہ اتوار کی صبح اگر کوئی ایشین اس لباس میں سڑک پر نظر آجائے تو انگریز ٹیکسی ڈرائیورز رُک کر یہ ضرور پوچھتے ہیں: کیا آپ کو B.C.C.I، ۱۰۰ لیڈن ہال اسٹریٹ کی بینک منیجرز کانفرنس میں جانا ہے؟

لندن میں میرے ورودِ روستائی کے ڈیڑھ دو ہفتے بعد برنی صاحب کہنے لگے کہ آپ کی جیکٹ کے کالر، بالخصوص پتلون کے پائینچے سے قدامت پسندی ٹپکتی ہے۔ معاف کیجیے، میرا مطلب ہے، ظاہر ہوتی ہے۔ نئے فیشن کی خبر غالباً پاکستان کے ٹیلرز کو نہیں پہنچی۔ آپ دیکھیں گے کہ ضعیف پنشنرز سنڈے کے سنڈے تیس پینتیس برس پرانے سُوٹ پہن کر ہائیڈ پارک میں دھوپ کھانے اور سج دھج دکھانے نکلتے ہیں۔ اتوار کے انتظار میں ہفتے بھر سوٹ پر استری کرتے رہتے ہیں۔ سات دن بعد منہ اندھیرے شیو کرتے ہیں۔ پھر بالوں میں چُلّو بھر کریم اور جوتوں پر سیاہ Kiwi پالش لگاتے ہیں۔ اگر مقامات کی ترتیب بدل کر لگائیں تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں! انہیں چھوڑیے۔ آج سہ پہر میرے

ساتھ Euro Suits چلیے اور شاندار سوٹ خریدیے۔ عرض کیا، چلیے، یہ پوستین تو اتار دوں گا، لیکن بُندکیوں والے ڈیزائن (Bird's Eye) کا ایسا سوٹ نہیں خریدوں گا جو بینک میں ہر چھوٹا بڑا افسر درباری خِلعت کی طرح ڈاٹے پھرتا ہے۔

دونوں طرف برابر اوس پڑ چکی تھی۔ اُن کا وائپر چلنے لگا۔

اُس دن وہ مجھے یورو سوٹس نہیں لے گئے۔

وہ خود ہر سال پانچ چھ سوٹ ہیرڈز وغیرہ کی سیل سے اس لیے بھی خرید لیتے تھے کہ ان کے خیال میں تقریباً مفت یعنی آدھے داموں مِل رہے تھے!

دسمبر ۱۹۸۳ء میں ایک دن کہنے لگے ''آج مدّت بعد بڑی شاندار دھوپ نکلی ہے۔ آیئے، اسے celebrate کریں۔ ایسے میں آپ کو ایک نیا سوٹ خریدنا چاہیئے۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسے میں وہ خود دو سوٹ خریدنا چاہتے ہیں اور اسراف میں دُسرات مطلوب ہے! بقول مرزا، غلط کام ہو یا گناہ، دُسرات سے moral support ملتی ہے۔ تقویت ہوتی ہے۔ اور لذتِ گناہ دگنی ہو جاتی ہے۔ نیکی کرنے والے کو مورل سپورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ہیرڈز (Harrods) پہنچے تو کہنے لگے کہ ''آلِ حسن بلند شہر سے آئے ہوئے ہیں۔ کل میں نے پندرہ عدد سُوٹ جو ایک دفعہ بھی ڈرائی کلین نہیں ہوئے تھے، ان کی نذر کر دیئے۔''

''کیا اُن کو فِٹ آ جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''فِٹ کیسے نہیں آئیں گے۔ برادرِ خُرد جو ٹھہرے۔'' ان کا جواب تھا۔

تجھے کیا ملے گا نماز میں

جس دن لندن میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی یونیفارم یعنی سیاہ شیروانی اور تنگ موری کا پاجامہ پہن کر بینک آتے تو سب کو یاد آ جاتا کہ آج جمعہ ہے۔ ہم تو ان کے علی گڑھ کٹ پاجامے سے کیلنڈر کا کام لیتے تھے۔ ٹھیک ایک بجے تین چار دوستوں کے ہمراہ برک لین (ایسٹ لندن) میں بنگلہ دیشیوں کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے۔ میں معدے کی تکلیف (Reflux Oesophagitis) کے باعث سجدہ نہیں کر سکتا۔ جھکنا منع ہے۔ لہٰذا بیٹھ کر نماز پڑھتا ہوں۔ ایک جمعہ کا ذکر ہے۔ جماعت کھڑی ہو گئی۔ میں صف کے آخری سِرے پر دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ میں نے بھی نیت اور ہاتھ باندھ لیے۔ ابھی قرأت شروع ہی ہوئی تھی کہ پچھلی صف میں ٹھیک میرے پیچھے کھڑے ایک اَن پڑھ بنگالی نے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کے یعنی پیچھے سے کولی بھر کے یہ کہتے ہوئے کھڑا کر دیا:

"You are destroying our Namaz"

یہی نہیں، اُس نے میری پتلون کے پائینچے بھی الٹ کر ٹخنے سے اتنے اُونچے کر دیئے کہ مانگے تانگے کا نیکر معلوم ہونے لگی!

اس واقعے کے بعد برنی صاحب مجھے اس طرح نماز پڑھواتے کہ مجھے درمیان میں بٹھا کر دائیں طرف خود کھڑے ہو جاتے اور بائیں طرف فخرالدین برنی کو کھڑا کر دیتے۔ عین پیچھے کھڑے پروٹوکال افسر اسحٰق کو دوران قیام وسجود ہوشیار، خبردار رہنے کی تلقین کرتے! جمعہ کو ٹھیک ایک بجے اسحٰق کو فون کرتے کہ آیئے یوسفی صاحب کو جمعہ پڑھوانے چلیں۔

جس دن سے برنی صاحب صاحبِ فراش ہوئے، میں نے اُس مسجد میں جانا ترک کر دیا۔

(۸)

یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں

نئے لوگ، نئے لینڈ اسکیپ، نئی چیزیں اور نوادرات انہیں بے طرح fascinate کرتے تھے۔ جیسا کہ ذرا دیر پہلے عرض کیا، Harrods اور Selfridges کی سیل میں (جس کے لیے شائقین بارہ تیرہ گھنٹوں سے کیؤ میں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوتے تھے) پہلے دن ضرور جاتے۔ ہیرڈز سے ڈیڑھ دو درجن ٹائیاں خرید کر دوستوں میں تقسیم کرتے۔ ان کے علاوہ ہر وہ ضروری یا غیر ضروری چیز جو ان کے نزدیک آدھے سے بھی کم داموں میں مل رہی ہو، لپک کر خرید لیتے مبادا کوئی لالچی جھپٹ لے اور وہ تاپتے رہ جائیں۔ انہوں نے میری گرومنگ کایا پلٹ اور تلبیسِ لباس[★1] کا بھی ذمہ لے رکھا تھا۔ Bally کی سیل میں انہیں ایک جوتا بے حد پسند آیا۔ فوراً خرید کر دوسرے دن میری نذر کیا۔ اس کی ایک خوبی ہو تو گناؤں۔ ڈسکاؤنٹ توقع سے کہیں زیادہ۔ جوتا دکھانے والی لڑکی ایسی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا اُسے دیکھیں یا جوتے کو! جوتوں کے صوفیانہ رنگ یعنی burgundy کی (جو شوخ ہوتے شرما سا گیا تھا) میری طبیعت سے مبینہ مناسبت، انالین لیدر کی گداز دبازت، تازہ بتازہ ڈیزائن کی toe، ایڑی کی بناوٹ اور اندرونِ پاپوش کے استر اور نرمی پر ایسے لہلوٹ ہوئے کہ سائز کا خیال دل میں لانا، بقول مرزا، irrelevant، جوش و جذبۂ خریداری بلکہ جوتوں کی توہین معلوم ہوئی! اب آٹھ برس بعد[★2] یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ جوتا دو نمبر بڑا

★1 تلبیس لباس: دھوکا دینے کے واسطے سرکاری وردی پہننا۔

★2 اب ۳۰ برس ہونے کو آئے، یہ جوتا ابھی تک اسی ڈبے میں رکھا ہے۔ رکھے رکھے کھڑنک ہو کر ایک نمبر چھوٹا ہو گیا ہے بعض ظالموں کو اپنی یاد دلاتے رہنے کے نرالے ڈھنگ آتے ہیں!

نکلا۔ چنانچہ محبت سے دیا ہوا تحفہ آج بھی اسی ڈبے میں رکھا اس دوست کی یاد دِلاتا ہے جس نے بڑی دُور بستی بسائی۔ خدانخواستہ فِٹ آ جاتا تو کبھی کا گھِس گھِسا کے بلکہ بالکل لیترا بن کے کسی کچرے کے ڈھیر میں پڑا سڑ رہا ہوتا! یا Sea View کے ساحل پر ہزاروں جوتوں کے ساتھ تیرتا پھرتا!

ونس مور

ایک دفعہ ہیرڈز کی کرسمس سیل میں مجھے Royal Doulton کی چائے دانی دلانے لے گئے جو بقول ان کے dirt cheap مل سکتی تھی بشرطیکہ آپ بھیڑ کے دھکّے بخوشی کھا سکیں! وہاں اتنا اژدِحام ہوتا ہے کہ مطلوبہ شے تک پہنچنے کے لیے ہاکی کے کھلاڑی کی سی برق رفتاری، پُرفریب dodge، چوکنا پن اور چابکدستی درکار ہے۔

یہ وارننگ بروقت تھی۔ اس لیے کہ چینی کے برتنوں کی سیل میں، بقول مرزا، حدِ بدنظری تک میمیں ہی میمیں تھیں۔ مرد تعداد کے لحاظ سے برائے نام اور دوسرے لحاظ سے بھی! بہرحال برنی صاحب کی بتائی ہوئی چالوں اور پینتروں کو کام میں لاتے ہوئے میں نے چائے دانی حاصل کرلی۔ اس کامیابی پر خود کو داد دینے کے لیے الفاظ کم پڑ رہے تھے۔ میں اس چائے دانی کو، بالکل اسی طرح حاصل کی ہوئی ٹرے میں رکھے، ایک میچنگ شکردان کو شکاری شِکرے کی سی آنکھ سے تاکنے میں محو تھا کہ دو میموں نے پیچھے سے دھکا دیا اور تیسری حرّافہ میری ناک تلے، بلکہ شکاری آنکھ تلے سے چائے دانی جھپٹ کر یہ جا وہ جا۔ میں خالی ٹرے دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے کھڑا رہ گیا۔

ع ہاتھ میرے دونوں نکلے نام کے!

ایک سال بعد دسمبر پھر لُوٹ کا پیامبر بن کر آیا تو برنی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ اب کی دفعہ آپ پہلے چھ کپ جمع کریں گے۔ رہی چائے دانی تو وہ میں اُسی میم کی ٹرے پر چیل جھپٹا مار کر کے اُٹھا لاؤں گا! وہ بھی کیا یاد کرے گی۔

عرض کیا ”نا بابا، نا۔ اب مجھ میں چھین جھپٹ کی سکت نہیں رہی۔ اِن میموں کے گُداز دھکّے کھا کھا کے میرا تو قلب جاری ہوگیا ہے!“

”ارے! تم تو تصوّف پہ اُتر آئے! تو کیا نیم نرم گرم، ہوا و ہوس بھرے غباروں کے دھکّے ناگوار گزرتے ہیں؟“ مرزا کو بیچ بیچ میں بولنے کا ہوکا ہے۔ ”توبہ کیجیے۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ ناگوار ہوں وہ! بلکہ Thank you. Once more کہنے کو جی ہوتا ہے!“ عاجز کا جواب تھا۔

برنی صاحب نے رومال منہ پر رکھ لیا۔ قیاس کہتا ہے اس کے نیچے مہذب سی مسکراہٹ ہوگی۔ وہ ہٹا تو کہنے لگے ”Once more پچاس برس بعد سنا ہے! واللہ! تھیٹر کے فرشی کلاس کے

ناظرینِ باتمکین کی فرمائش کی یاد آپ نے کہاں لا کے تازہ کی ہے! زندہ باد۔''

پیرس میں میرے کمرے میں دھماکا

دس سال کے عرصے میں کوئی ایسی سالانہ یا ششماہی سیل نہیں گزری جس میں انہوں نے سوٹ، ٹائی، جوتے، crystal اور ''تازہ ترین ایجادات'' نہ خریدی ہوں۔ ایک سیل سے عجیب وغریب دُخانی استری خرید کر مجھے تحفتاً دی۔ انہیں اس کی خوبی یہ بتائی گئی تھی کہ لٹکے ہوئے کپڑے سے اسے چھ انچ دور رکھ کر اوپر نیچے یا دائیں بائیں گھمایا جائے تو اس کی بھاپ سے کپڑے کی سلوٹیں خودبخود نکل جائیں گی۔ سیلز گرل نے لٹکے ہوئے پردے کی سلوٹیں دور سے نکال کر دکھائیں اور کہا کہ میری بدقسمتی سے آپ حضرات اس وقت کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ اشیاء کھونٹی یا الگنی پر لٹکی ہوتیں تو ایک ایک شکن اسی طرح ایک سیکنڈ میں دور کر کے دکھا دیتی!

تین چار دن بعد مجھے بینک کے کام سے پیرس جانا پڑا جہاں میرے قیام کا انتظام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا جو ایفل ٹاور سے بمشکل دو فرلانگ دور ہوگا۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے ٹاور کی ہر چیز صاف نظر آتی تھی۔ رات کو میں اسے دیکھتا ہوا سو گیا۔ علی الصبح اس جادوئی استری کو باتھ روم کے شیور والے ساکٹ میں لگایا تو ایک زبردست دھماکا ہوا، جس کی بھیانک آواز دور دور تک سنی گئی ہوگی، اس لیے ہوٹل کے تمام فائر الارم اور سائرن بجنے لگے۔ بجلی اُڑ گئی۔ ہوٹل میں بھگدڑ مچ گئی۔ میں نے کمرے سے باہر نکل کے جو منظر دیکھا وہ کبھی نہیں بھولوں گا۔ جو جس حال میں تھا اپنے کمرے سے نکل کے غل مچاتا بھاگ رہا تھا۔ تیس چالیس رولا مچاتے مردوں کے غول میں ایک عورت کی چیخیں بالکل الگ سے سنائی دے رہی تھیں۔ ایک گورا دائیں ہاتھ میں ریزر پکڑے، آدھے چہرے پر شیونگ کریم تھوپے، کمر پہ تولیہ لپیٹے اور اس کے دونوں بے کہے سِروں کو بائیں ہاتھ سے تھامے، مینڈک کی طرح پھدک پھدک کے دوڑ رہا تھا۔ ایک عورت برا کی کٹوریوں کی بجائے دونوں ہاتھوں کے کپ بنائے، ننگے پیر زینے کی طرف جارہی تھی۔ ایک کیم شحیم کالا صبح کی تازہ خبروں سے ستر ڈھانکے Caribbean گالیاں بکتا سامنے سے گزرا۔ ایک گراں ڈیل جاپانی اپنی برہنہ فرنچ گرل فرینڈ کو پردہ دری سے بچانے کے لئے چڈھی چڑھائے یعنی اپنی پیٹھ پر چڑھائے اور چمٹائے ہوئے زینے کی ریلنگ پکڑ پکڑ کے اتر رہا تھا۔ سوار کو جب، جیسے اور جہاں اتارا ہوگا تو ایک عالم ہوگا! ہر طرف ایک غدر سا مچا ہوا تھا۔ سب خوفزدہ ہو کر بگٹٹ بھاگ رہے تھے۔ میں یہ دھماکا کرنے سے پہلے بنیان پہنے شیو کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب جو اچھے اچھوں کو ان حالوں دیکھا تو جھٹ بنیان اتار کے میں بھی اس بھگدڑ اور چیخم دھاڑ میں شامل ہوگیا تاکہ مجھ پر

شک و شبہ نہ کیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ ان گورے خوفزدگان کی بہ نسبت میں عالمِ مُشبتگی میں زیادہ تیز اور جوش وخروش سے دوڑ رہا ہوں؟ واضح ہو کہ میں دوڑ رہا تھا، وہ بھاگ رہے تھے۔

شور وغوغا تھا تو میں نے سب سے پہلے جادوئی استری کو سوٹ کیس میں چھپایا اور ناشتہ کیے بغیر اس ہوٹل سے چیک آؤٹ کر گیا۔ وہ لدو اور باربردار جاپانی مجھ سے پہلے چیک آؤٹ کر چکا تھا!

بڑی مشکل سے ناک چھڑائی

''نئی ایجادات'' سے شغف اور شغل کا بیان ایک واقعے کے بغیر ادھورا رہ جائے گا۔ ایک دن دیکھا کہ حضرت ناک پہ رومال رکھے، سرنہوڑائے دل گرفتہ سے بیٹھے ہیں۔ معاً خیال آیا کہ زکام ہو گیا ہے۔ لیکن چھینک، ریزش، حرارت اور سُوں سُوں سُڑسُڑ کی علامتیں نظر نہ آئیں۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا، کیا بدبُو آ رہی ہے؟ بولے، نہیں۔ ہوا یہ کہ کل سیل میں ایک انوکھا آلہ nose and ear trimmer ایک چوتھائی قیمت میں مل رہا تھا! موٹائی میں موم بتی کے برابر۔ لمبائی میں اس کا آدھا۔ سیلز گرل نے بتایا کہ ناک اور کان کے بال دس سیکنڈ میں کاٹ دیتا ہے۔ گھر پہنچ کر میں نے اسے دائیں نتھنے میں insert کر کے سُوئچ آن کیا تو جانو قیامت آگئی۔ ارے صاحب، وہ تو ناک کے بال پکڑ کے بُلاق[★1] کی مانند لٹک گیا۔ نہ بال کاٹتا ہے، نہ ناک چھوڑتا ہے، بلکہ اندر گھستا چلا جا رہا ہے! غنیمت ہوئی کہ میں نے کان کے بال کاٹنے کی کوشش نہیں کی، ورنہ یہ شیطانی مشین تو کاسۂ سر میں دخول کر کے مغز کُترتی چلی جاتی! بڑی مشکل سے ناک چھُڑائی! اندر زخم ہو گئے ہیں۔

نفاست ختم ہے ان پر

اُنہیں نستعلیق کہنا کافی نہیں ہوگا۔ طبیعت میں بعض اوقات دوسروں کو چُبھنے اور کھلنے والی حد تک نفاست اور چُھوا چُھوت[★2] تھی۔ ہفتے میں کبھی کبھار ہی سُوٹ یا ٹائی دُہراتے دیکھا۔ شریعت مانع نہ ہوتی تو دورانِ حج احرام بھی دن میں دو تین دفعہ ضرور تبدیل کرتے! کہیں نلکا نظر آ جاتا تو رُک کر ہاتھ ضرور دھو لیتے۔ ایک عرصے تک دفتر میں ظہر کی نماز محض اس لیے نہیں پڑھی کہ ٹائلٹ کے واش بیسن میں وضو کرنے سے کراہت آتی تھی۔ مرزا کہتے تھے کہ واش بیسن میں گورے اور میمیں جس طرح ہاتھ منہ دھوتے ہیں، اُس میں وضو کرنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے! برنی صاحب کو

★1 بُلاق: نتھ سے ملتا جلتا قدیم زیور جو دونوں نتھنوں کی درمیانی ہڈی میں سوراخ کر کے پہنایا جاتا تھا۔ یہ وہی سلوک تھا جو بے تھے بیل کے ساتھ کیا جاتا ہے! خدا خدا کر کے یہ نقرئی وطلائی علامتِ غلامی ختم ہوئی۔ نتھ کہ عورت کا آرائشی اعلانِ محکومیت و ''دوشیزگی بحق حقدار محفوظ'' ہے، ہنوز باقی ہے۔

★2 چُھوا چُھوت: وہمی لوگوں کا چُھوت اور پاکی ناپاکی کے خیال سے دوسروں سے دور رہنا اور احتیاطاً بار بار دھونا دھلانا!

کبھی مجبوراً ہاتھ دھونے پڑتے تو اس کے بعد Wet Ones اور scented tissuse سے رگڑ رگڑ کے انہیں پاک کرتے۔ ایک دفعہ اسی طرح ہاتھ پاک کر رہے تھے تو میں نے یاد دلایا کہ حضرت، یہ ٹشوز تو اسپرٹ اور الکحل میں شرابور ہوتے ہیں۔ کوئی سینٹ الکحل کے بغیر خوشبو نہیں دیتا۔ یہ بات کچھ عرصے پہلے خود انہوں نے ہمیں بتائی تھی۔ ٹشو کی گولی سی بنا کر ڈسٹ بن میں پھینکی۔ فوراً واپس ٹائلٹ گئے اور اُسی واش بیسن میں شُست وشُو★ کر کے شاد کام لوٹے! اکثر ایسا ہوا کہ صبح گھر سے وضو کر کے آئے تو اس سے ظہر اور پھر عصر کی نماز پڑھی اور سلام پھیرتے ہی ڈگڈگا کے پانی پیا۔ ایک دن مجھے بھی تلقین کی کہ آپ بھی یہی کیا کیجئے۔ میں نے کہا، حضرت، میں کمزور اعصاب کا آدمی ہوں۔ دن بھر حالتِ ضبط میں نہیں رہ سکتا۔ ایمان کی آزمائش میں تو شاید پورا اُتر جاؤں، لیکن ثواب کی خاطر مثانے کو آزمائش میں مُبتلا نہیں کرنا چاہتا۔

جھٹ فون کا ریسیور اُٹھاتے ہوئے کہنے لگے کہ ''میں ابھی ڈاکٹر خالد حمید کو کہتا ہوں کہ کراموِیل اسپتال میں آپ کا IVP ٹیسٹ کرائیں وہ تو آپ کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔''

''میں اپنے گُردے ڈاکٹر حمید سے چھپائے پھرتا ہوں۔ ان کا ریکارڈ ہے کہ بزرگوں کے جس عُضو پر بھی ان کی نظر پڑ جائے اُسے نکلوا دیتے ہیں! پھر اسے اسپرٹ کی بوتل میں ڈال کے سب کو دکھاتے ہیں کہ ملاحظہ فرمایئے، بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ اسے لیے پھر رہے تھے!''

(۹)

ایک پاکستانی عرب کا دسترخوان

تواضع اور مدارات کا یہ عالم کہ انگریزی محاورے کے مطابق میز کھانوں کے بوجھ سے چرچراتی رہتی۔ خود کہتے تھے کہ کھانے کی میز کا اگر ذرا سا حصّہ بھی خالی نظر آئے تو عرب اسے میزبانی میں صریحاً کوتاہی تصور کرتے ہیں! اُن کی ڈنر ٹیبل اَٹا اَٹ بھری ہوتی ہے۔ اس پر نیپکن یا خِلال تک رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اُن کے دل کی طرح اُن کا دسترخوان بھی وسیع تھا۔ جس ڈش کی خود کو سخت ممانعت ہوتی، اسے دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے۔ آخری ایام میں ان کی غذا، پرہیزی اور برائے نام رہ گئی تھی، تاہم ان کی ڈنر ٹیبل پر انواع و اقسام کے اتنے لذیذ کھانے ہوتے کہ مجھے تو ایک منہ اور ایک معدہ ہمیشہ

★ شُست وشُو: پاک کرنا۔

مرزا کہتے ہیں کہ انگلش میڈیم اسکولوں سے نکلے ہوئے بیشتر حضرات شُست وشُو کے معنی نہیں جانتے۔ ان کی واقفیت، ذاتی تجربہ اور یادداشت صرف بچپن کی ''شُوشُو'' تک محدود ہوتی ہے!

نا کافی معلوم ہوا۔ ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا، کمال ہے! آپ کو ان کھانوں کی مکمل فہرست کہاں سے مل گئی جو ڈاکٹروں نے عاجز پر حرام کر رکھے ہیں؟

دھیرے سے مسکرا دیے۔ کہنے لگے، اگر عام دعوت میں بھی صرف آپ کے معدے کی نزاکتوں کا لحاظ رکھوں تو میز پر صرف بڈّھے مرغے کا سُوپ، بھُسلایا بینگن، سُوجی کا پتلا دلیا اور سویٹ ڈش میں اُبلی شکر قندی نظر آئے گی! خود آپ فقیر کے ان تکلفات کو قبول کرنے سے احتراز کریں گے۔ مجھے آپ پر عائد کردہ پرہیز کا علم ہے۔ لیکن آپ کی دلی خواہش و رغبت کے مطابق، آپ کی بد پرہیزیوں کو cater کرنا میرا اخلاقی فرض ہے! انگریزی کہاوت ہے کہ مرد کے دل کا راستہ اُس کے معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔

''اس میں میری طرف سے یہ اضافہ کر لیجیے کہ عورت کے دل کی راہ مرد کی زبان کے حُسنِ بیاں اور بیانِ حسن سے ہو کر گزرتی ہے۔

سامان لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا''

انہوں نے غلط نہیں کہا۔ اپنے ہر مہمانِ عزیز کے شوق و رغبت کا اس درجہ خیال رکھتے کہ محسوس ہوتا وہی آج شام کا مہمانِ خصوصی ہے! میں نے دیکھا کہ بڑی اور پُرتکلف دعوتوں میں بھی میرے گنوارُو چٹورپن کو نہ بھولتے۔ مثلاً دعوت آلِ احمد سرور کے اعزاز میں ہے اور وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے یہ کہتے ہوئے لے جا رہے ہیں کہ آپ کی بھنڈی اور ماش کی دال ادھر ہے۔ گوار کی پھلی آج نہیں ملی۔ یا آج کی مہمانِ خصوصی قراۃ العین حیدر ہیں جو سب کی توجہ کا مرکز ہیں۔ محمود کاظمی کو بریانی کی طرف راغب کرنے کے بعد مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ڈیوڑھی شکر والا آپ کا زردہ اُدھر ہے جہاں مسز بشیر صدیقی کھڑی ہیں۔ انہیں سے پکوا کر منگایا ہے۔ انبالہ والے کی دکان سے پاؤ بھر جلیبی صرف آپ کے لیے منگوائی ہے۔ افتخار عارف بھی میٹھے کے رسیا ہیں۔ کیسا بھی ہو۔ انہیں بھی جا کے بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا، گوار کی پھلی، ماش کی دال، باجرے کی روٹی اور سنہری شیرے سے لش لش کرتی لچھے دار جلیبی۔۔ یہ ٹھیٹ پینڈو[1] کی پٹینٹ پہچان ہیں۔ بولے، ان کے قدردان اور بھی ہیں۔ مگر وہ بھی آپ ہی کے گرائیں نکلیں گے!

یاد نہیں کس کی فرمائش تھی۔ ایک شاندار ڈنر میں (جو قدرت اللہ شہاب کے اعزاز میں تھا) دیکھا کہ بھابی ایک قاب میں اروی کے پتوں کا کھنڈوی[2] کی طرز پر پکا ہوا سالن لا رہی ہیں۔

---

[1] پینڈو: گنوار۔ اُجڈ۔ دیہقانی۔

[2] کھنڈوی: سالن جو بیسن کو پانی میں گھول کر بھاپ پر پکانے کے بعد سینی میں جمایا جاتا ہے۔ پھر مستطیل لوزات کی شکل میں کاٹ کر گاڑھا شوربے دار سالن بناتے ہیں، جس پر چٹورے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

پھڑک اٹھا۔ میں نے کہا، یہ rare delicacy کوئی چالیس برس بعد نصیب ہو رہی ہے! بولیں، بھائی صاحب، پہلے کیوں نہ بتایا؟ میں نے کہا، کسی طرح سمجھ میں نہیں آ رہا کہ لندن میں اروی کا پتا کہاں سے اور کیسے آن ٹپکا! بولیں، بھائی صاحب، یہ ہمارا kitchen secret ہے!

اسپین کے شریفے اور غزال چشماں

کراموپل اسپتال میں بھی جہاں وہ شدید فالج کے بعد زیرِ علاج تھے، انہوں نے اپنے VIP رُوم میں خاطر مدارات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اِس محفل میں کافی دوست ایسے ہوں گے جو اسپتال کے کمرہ نمبر ۲۰۳ میں چائے، بسکٹ اور کیک سے اپنی تواضع کروا چکے ہیں۔ ایک دن انہوں نے اسی کمرے میں اسپین کے شریفے کھلائے۔ سب کو تعجب ہوا کہ یہ پھل دیارِ غیر میں بھی ہوتا ہے اور اپنے شریفے سے دگنا بڑا اور میٹھا! ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ یہ انڈیا کا خاص پھل ہے جسے وہاں سیتا پھل کہتے ہیں۔ سرخی مائل ہو تو رام پھل کہلاتا ہے، اس لیے کہ رام چندر جی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ دیر تک قیاس آرائی ہوتی رہی کہ شریفہ اسپین میں کیسے پہنچا۔ کسی نے کچھ تاویل کی، کسی نے کچھ۔ مرزا کہنے لگے کہ عربوں نے اُندلس کو بڑے نادر و نایاب تحفے دیئے اور صلے میں اہانت آمیز ملک بدری پائی! ایک ہو تو گنواؤں: چشمِ غزالیں وغمزہ ''جس میں شوخی ہو بہت اور حیا تھوڑی سی۔'' کھجور کا درخت۔ دوپہر کا siesta (قیلولہ)، تپاک اور گرمجوشی، موسیقی و رقص کا کھڑتالی (Castanet) آہنگ اور ہمہاتی گمک جو Flamenco میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ Arabesque، جیومیٹریکل وضع کے نقش و نگار، نام سے پہلے بکثرت Al کا سابقہ، شریفہ اور اس کی شیرینی اور اللہ اُن کا بھلا کرے، انگلینڈ پر آرمیڈا سے حملہ کرنے کا ہُنر اور حوصلہ بخشا۔

آخری تحفے کی حاضرین نے کُھل کر داد دی۔

میں نے کہا، اپنی طرف کا شریفہ بھی میٹھا تو ہوتا ہے، لیکن قباحت یہ ہے کہ گودے کی بس ایک مہین سے جھلّی ہوتی ہے، باقی بیج ہی بیج اور بیج بھی کاغذی بادام کے برابر! یہ پھل مُقفّی و مسجّع نثر کی مانند ہوتا ہے۔ گودا نہ ہونے کے برابر۔ اس کی خاطر دیر تلک بیجوں کو چوستے اور چھوڑتے رہیئے۔

منجن، نثری نظم اور چُستہ

میں نے جان بوجھ کر شریفوں کی کُھل کر تعریف نہیں کی۔ اندیشہ تھا کہ دو تین شریفے بالاصرار بریف کیس میں رکھوا دیں گے جس سے بعد میں آنے والے ملاقاتیوں کی حق تلفی ہو گی۔ بالی کے جوتوں (جو بینک کے اعلا افسروں کی یونیفارم کا حصہ تھے)، امرود کے جوس، Van Heusen کی

قیمص، Harrods کی سیل، خربوزے کی آئس کریم، برطانیہ کے پہاڑی بوک بکروں کے بھبکے دار گوشت، Chelsea Flower Show، بریلوی عقائد اور قراۃ العین حیدر نے لندن میں انہیں باقاعدہ متعارف کرایا! میں نے ان کی ایک ڈنر پارٹی میں کہا کہ ''مجھے تو حیرت ہوتی ہے، بلکہ اس خیال ہی سے جُھرجُھری آتی ہے کہ بظاہر باذوق لوگ بڑے شوق سے مُتنجن کھاتے تھے جس میں چاول، گوشت، شکر اور نیبُو کی تُرشی ڈال کر میٹھا پلاؤ بناتے تھے! آج اس ملغوبے کو کوئی نوش جان کرے تو میں اسے نابینا تصور کروں گا اور جو کھا کے قے نہ کرے اُس کے چہرے پر غالباً ناک تو ہے مگر اُس کا فنکشن اور حیثیت سانس لینے کے دو سوراخوں سے زیادہ نہیں! اسی طرح میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خربوزہ جسے سنا ہے گیدڑ بڑے شوق سے کھاتے ہیں، اُس کی آئس کریم جو ہم نے ابھی کھائی ہے اتنی مزیدار ہوسکتی ہے کہ ایک اسکوپ کھایا، دوسرے کی طلب باقی رہی!''

اُن کے لکھنوی مہمان کو کیا دوش دوں، خود برنی صاحب بھی میری باتوں سے بیّن طور پر بدحَظ ہوئے۔ ان کی پیشانی پر وہی دستی وائپر چلنے لگا۔ میں نے تلافیٔ مکالمات کے طور پر خود پر اسی نوع کی تھوڑی سے پیشگی لعن طعن ضروری سمجھی کہ دوسروں کی لعن طعن کا وار خالی دینے اور اسے بالکل غیر ضروری بنانے کا یہ استادانہ، شاطرانہ اور بُزدلانہ کارگر پینترا ہے! جو آپ ہی خودکُشی کرنے جارہا ہے، اس پر حملہ کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کہا، مُتنجن سے میرا استفراغِ اِمتلائی یعنی وہ قے★ جو بھرے ہوئے پیٹ سے ہو، بالکل ذاتی الرجی ہوسکتی ہے۔ کسی کی دل آزاری نہیں، فقط اپنی بیزاری کا اظہار مقصود تھا، جس میں پھوہڑپن کے باعث نیبُو کی تُرشی زیادہ پڑ گئی! ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں لڑکپن میں بُھنا چُستہ بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ حکیم بھی چُستے اور اوجھڑی کو معدے کے مریضوں کے لیے نسخے میں لکھ دیتے تھے۔ ٹونک میں جہاں میرا ابتدائی لڑکپن گزرا، چُستے کا شمار رئیسانہ delicacies میں ہوتا تھا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ چُستہ وہ جُھری دار تھیلی ہوتی ہے جو بکرے کی آنتوں کے آخری حصے پر مشتمل ہوتی ہے جس میں چارہ اور دانہ معدے میں تحلیل ہوکر اور بدبُودار فضلہ بن کر اس سرے سے خارج ہونے کے لیے جمع ہوتا ہے (colon)۔ اسے تیز چُونے سے دھو کر پاک کیا جاتا تھا۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ بہت مزیدار لگتا تھا لیکن اب اگر کوئی کھائے تو چالیس دن تک اُس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا! اور prose poems لکھنے والے سے بھی!!

عُذرِ گناہ کا اُلٹا اثر ہوا۔ برنی صاحب کی طبیعت تو خیر مُنغض ہوئی سو ہوئی، لیکن وہ لکھنوی

★ قے: مرزا ایسی قے کا املا اور تلفظ قیء کرتے ہیں، جس سے بُو کے علاوہ اخراج کی آواز بھی سنائی دیتی ہے!

بزرگ تو ایسے برہم ہوئے کہ کھانستے کھانستے انڈیل چائے اپنے پاجامے پر گرانے کے بعد اور زیادہ کھانسنے لگے! میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ prose poems کہتے یا لکھتے ہیں اور اپنی بیاض ساتھ لائے ہیں اور بیتابی سے منتظر ہیں کہ ڈنر اور میری چُستہ سرائی کسی طرح ختم ہو تو اپنی نثری نظمیں راگ مال کھانس کھونس میں سنائیں!

خدا گواہ ہے کہ prose poems والے فقرے کا مقصد حاضرین کو صرف اپنی دوسری الرجی سے مطلع کرنا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میرا تیر بے کماں انجانے ہدف چھیدتا ایسے آر پار ہو گا کہ واہ وا!!

آنولے کا مُربّا

اوکسفرڈ اسٹریٹ اور پکاڈلی کی ہر دکان انہوں نے کم از کم ایک دفعہ اندر جا کر ضرور کھنگالی تھی۔ ذوقِ تجسس انہیں ایک دن کشاں کشاں سوہو (Soho) کی ایک چائنیز دکان میں لے گیا۔ وہاں سیب کا چینی مُربّا نظر آ گیا۔ کئی کارٹن خرید ڈالے۔ ایک مجھے دیا۔ ایک پیر بھائی صاحب کو بھی پیش کیا جو انہیں پسند نہیں آیا ہو گا، اس لیے کہ وہ شکر میں کسی قسم کی ملاوٹ پسند نہیں کرتے۔ ان کی شکر پسندی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ گزشتہ دسمبر میں انہوں نے مطلع کیا کہ میرے ایک دانت کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ Swiss چاکلیٹ، جو وہ ڈنر کے بعد روزانہ کھاتے ہیں، دسمبر کی سردی اور ڈیپ فریز میں رکھے رکھے پتھر ہو گئی تھی۔ اس پتھر کو انہوں نے ڈینچر سے توڑنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں ان کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ ڈینٹسٹ نے 100£ دھروا لیے۔ اس رقم سے وہ سُوِس چاکلیٹ کے کم از کم دس ڈبّے خرید کر ڈیپ فریز میں محفوظ کر سکتے تھے!

مرزا نے مسٹر پیر بھائی کے قانونی بیک گراؤنڈ کے پیشِ نظر مشورہ دیا!

"We should sue the Swiss Company. Drag them literally to a competent Swiss Court."

پھر خود ہی یہ کہتے ہوئے تجویز واپس لے لی کہ B.C.C.I کی ایک کماؤ برانچ جنیوا میں ہے۔ مزید برآں، ہماری دنداں شکن کارروائی سے Pak-Swiss تعلقات دیرپا شکر رنجی کا شکار ہو سکتے ہیں!

برنی صاحب کہنے لگے کہ "sweet tooth محاورتاً ایسے ہی دانت کو کہتے ہیں۔" بہر حال، محاورہ کچھ بھی کہے، مجھے یہ کہنا پڑا کہ سیب کا مُربّا مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ میں نے کُھل کر تعریف کی اور کہا کہ بائی دی وے، آنولے کا مُربّا کھائے پچاس برس ہو گئے! بولے "یہ تو بڑا ظلم ہے! واللہ۔ اس کی تو نصف صدی بنتی ہے!" میں نے کہا "نئی نسل کی آنولے سے واقفیت صرف آنولے کے تیل

تک محدود ہے، جسے اب صرف بڑی بوڑھیاں بڑی امیدوں سے سر میں ڈالتی اور بالوں میں خوب رماتی ہیں۔ تکیے کالے سیاہ ہو جاتے ہیں!''

ڈیڑھ دو ماہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ برنی صاحب آنولے کے مُربّے کی برنی (چھوٹا مرتبان) شاپر میں لٹکائے چلے آرہے ہیں جو انہوں نے بلند شہر سے اپنے برادرِ خُرد آل حسن کے ذریعہ منگوایا تھا۔ بولے ''جب یہ ختم ہو جائے تو بلا تکلف مجھے بتا دیجئے۔'' لیکن اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی ایک اور برنی لے آئے۔ کہنے لگے ''Southall میں ایک دکان ڈسکور کی ہے۔ یہ آنولے اُن سے بھی بڑے ہیں۔ آپ کے فیورٹ موتی چُور لڈو کے برابر! ایک اور دکان میں بٹیر بھی مل رہے تھے۔ زندہ! ایک ایک برٹش بٹیرا اپنے کبوتر کے برابر! مگر میں نے سوچا، پہلے آپ سے دریافت کرلوں آیا اتنا بڑا بٹیر کھا بھی سکیں گے یا نہیں۔''

میں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''شیرہ پی پی کے ایک ایک آنولہ آپ کے بٹیر کے برابر ہو گیا ہے۔ آنولے کھانے سے میرا وزن چار پونڈ بڑھ گیا ہے۔ پتلون کمر پر سے تنگ ہو گئی ہے۔''

دولہا کی طرح رومال منہ پہ رکھ کے ہنسے۔ کہنے لگے ''پیٹ واقعی بڑھ گیا ہے۔ بہت obvious ہے۔ میں نے تو اسی لیے چکھا تک نہیں۔ ہمارے ہاں تو آنولے کا مربا چلّہ نہانے کے بعد زچہ کو کھلایا جاتا ہے تاکہ دوسری دفعہ گود ہری اور چاند سا بیٹا پیدا ہو! اور آپ نے تو ماشاء اللہ دو لبالب برنیاں کھائی ہیں!''

میں نے عرض کیا ''حضرت، میں تو پہلے ہی برنیوں کا مارا ہوا ہوں۔ ابن حسن برنی، مظفر برنی، حیدر مہدی برنی، فخر الدین برنی۔ چار برنیوں کے درمیان میرا تو مربا بن گیا ہے۔''

ع کھائے جاتے ہیں مجھ کو برخوردار
میں مُربّی نہیں، مربا ہوں!

(۱۰)

دوستداری بشرطِ اُستواری

ان کے احباب کا حلقہ جتنا وسیع تھا اتنا ہی متنوع بھی۔ پرانے ساتھیوں سے وہ ہمیشہ احترام و محبت سے پیش آتے۔ وہ کہتے تھے کہ دوست کتنا ہی آزردہ یا برہم و بیزار ہو، اُسے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ مطلب یہ کہ آواز لگاتے رہو۔ صبح کا بھٹکا کبوتر شام کو چھتری پر ضرور آئے گا۔ ایک جملہ وہ اکثر دہراتے تھے:

I can't write off a friend.

لطف و مدارات سے روٹھے کو منانا اور اپنے تپاک و تواضع سے تالیف قلوب کرنا بھی آتا تھا۔ ایک

دن ہنسنے ہنسانے کے مُوڈ میں تھے۔ کہنے لگے کہ نمک کھانے اور کھلانے سے تلخیاں کم ہوتی ہیں۔ خاطر تواضع اور لذیذ غذا سے غلط فہمیاں اور رنجشیں دور ہوتی ہیں۔

میں نے پُر زور تائید کی ''شاہی ٹکڑوں اور شکر قندی سے باہمی شکر رنجی کا ازالہ ہوتا ہے۔''

ان کا وائپر چلنے لگا۔

اپنے دوست ۔۔ کسی بھی نئے یا پرانے، زندہ یا مرحوم دوست کی برائی یا غیبت نہ خود کرتے، نہ سننے کے روادار تھے۔ ان کے ایک دوست کی تحریروں کو اُس کے دشمن اور مخالفین بے ربط، بور، بقراطی اور ''میں میں'' سے مملو قرار دیتے ہیں۔ بہت پرانی بات نہیں، انتقال سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے، کسی نے برنی صاحب سے شرارتاً پوچھا کہ موصوف کی نگارشات و شذرات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

برنی صاحب نے ذرا دیر سکوت کیا۔ پھر فرمایا ''وہ میرے دوست ہیں۔ میں ان کی تحریریں نہیں پڑھتا!''

انہوں نے اس کوزے میں دریائے شور بند کر دیا!

قدرت اللہ شہاب کی کرامات

اسی سے ملتا جلتا دوستداری اور پاسِ وفا سے متعلق ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا ذکر شاید بے محل نہ ہو۔

ان دنوں قدرت اللہ شہاب صاحب اپنی بیگم کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ لندن آئے تھے۔ وہ برنی صاحب سے ملنے آئے تو ایسا لگا کہ پچھلے دو تین برسوں میں تیزی سے بُڑھا گئے ہیں۔ بیس پچیس برس پرانا گرم سوٹ پہنے تھے، جس سے ایک ناخوشگوار بُو آ رہی تھی۔ اُن کا یہ دورۂ لندن کچھ اس لحاظ سے بھی تاریخی تھا کہ وہ جب وارِدِ لندن ہوئے تو کلین شیو تھے اور جب رخصت ہوئے تو چہرے پر ایک نورانی سی ریشِ سفید کے ساتھ! بینک کے ہیڈ آفس سے سات آٹھ میل دور مضافات میں اپنے کسی عزیز کے ہاں مقیم تھے۔ ایک دن برنی صاحب نے انہیں لنچ پر ایک بجے مدعو کیا۔ وہ سوا بجے تک نہ آئے تو ہم تینوں کو تشویش ہونے لگی۔ ڈیڑھ بجے پہنچے تو ان سے سببِ تاخیر دریافت کیا گیا۔ کہنے لگے، ٹیوب کا سفر تو پندرہ بیس منٹ کا تھا، مگر وجہ تاخیر ایک نہیں، تین کارہائے خیر ہیں۔

عناں گیر ہونے والی نیکیوں کی جو تفصیلات انہوں نے بیان کیں، وہ جہاں تک یادداشت ساتھ دیتی ہیں، مِن وعَن نقل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو آپ بھی سُنیے:

''ٹرین میں میرے سامنے دو لڑکیاں اور ان کے دو بوائے فرینڈز بیٹھے تھے۔ ذرا دیر بعد ایک

لڑکا مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا:

'You should carry an air-freshner with you.'

میں نے جواب دیا: 'I'll do that. Thank you'

دو ٹیوب اسٹیشن بعد اُس کی گرل فرینڈ میرے پاس آئی اور بولی:

'You are a remarkable man. You didn't react when my friend insulted you without any provocation. May I know who you are?'

میں نے کہا 'میں مسلمان ہوں۔ میرا مذہب اسلام یہی سکھاتا ہے۔'

اُس نے کہا 'Tell me more about your religion.'

میں نے مختصراً اسلام کے بنیادی عقائد بیان کیے جن سے وہ بے حد متاثر ہوئی۔ کہنے لگی، کیا میں مسلمان ہو سکتی ہوں؟

میں نے کہا، کیوں نہیں۔ بہت آسان ہے۔

اس نے پوچھا، بھلا کیسے؟

میں نے شرلک ہومز کے لہجے میں کہا۔ Elementary. Very simple. بینک اسٹیشن آنے دو۔ وہاں اُتر جاؤ تو میں تمہیں دو منٹ میں convert کر سکتا ہوں۔

چند منٹ بعد اسٹیشن آ گیا۔ میں نے وہیں پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر اسے بٹھایا اور اس کے بوائے فرینڈ کی موجودگی میں، کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا۔ اسلامی نام فاطمہ رکھا اور مبارکباد دی۔

اُس نے پوچھا، اس نام کا مطلب کیا ہے؟

میں نے جواب دیا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی انتہائی نیک صاحبزادی کا نام ہے جو ایک عظیم خاتون تھیں۔

اُس نے کہا، میں ایسا مقدس نام کیسے رکھ سکتی ہوں؟

I have been living in sin with this boy-friend of mine.

میں نے کہا، اللہ معاف کرنے والا بے حد مہربان ہے۔ تم دونوں باقاعدہ نکاح کر لو۔

اُس نے پوچھا، یہ کیسے ہوتا ہے؟

میں نے پھر اُسی لہجے میں کہا Very simple۔ اسلام بہت آسان اور پریکٹیکل مذہب ہے میں تم دونوں کا نکاح پڑھا سکتا ہوں، بشرطیکہ تمہارا بوائے فرینڈ پہلے کلمہ گو مسلمان بن جائے۔ لڑکا فوراً تیار ہو گیا۔ میں نے اسے بھی مسلمان کیا اور باقاعدہ دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ سیدھا وہیں سے

آ رہا ہوں۔ ہاں، یاد آیا۔ دولہا نے چلتے چلتے پوچھا، کیا ہم اپنی اسلامک میرج کو شمپین سے celebrate کر سکتے ہیں؟

بہر حال، تاخیر سے آنے کی معذرت۔

(شہاب صاحب کا بیان ختم ہوا۔)

لنچ کے بعد برنی صاحب، شہاب صاحب کو کار پارک میں اپنی کار تک چھوڑنے گئے۔ لوٹے تو مجھ سے وہ جملہ ضبط نہ ہو سکا جو لنچ کے دوران بھی ذہن سے زبان تک آنے کے لیے بڑے زور سے کُھد بُد ار ہا تھا:

And all this happened in just 30 minutes!

نہ جانے میں نے یہ کہنا بھی کیوں ضروری سمجھا کہ لفظ نکاح کبھی تنہا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ عقدِ نکاح کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ نکاح کے لغوی معنی مجامعت اور مباشرت ہیں!

برنی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا، مگر ان کی پیشانی پر آزردگی کی شکنیں دیکھیں تو پیر بھائی اٹھ کر ٹائلٹ چلے گئے۔ میں بھی اپنا سا منہ اور اپنے سے ہی دونوں جملے لے کر شیشے کی دیواروں والے حجرے میں، جسے میں fish bowl کہتا ہوں، اپنی دانست میں روپوش ہو گیا۔

انگریزی میں میرے مختصر اور مخملیں کمنٹ کا پس منظر یہ تھا کہ کسی دانا کا قول ہے کہ فکشن نگار کو کبھی آٹو بایوگرافی یا کسی واقعہ کی روداد نہیں لکھنی چاہیے۔ وجہ یہ کہ اس کا خلاّق قلم تو حاشیہ آرائی، پیوند کاری، رنگ آمیزی، فسانہ آفرینی اور حک و اضافے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی اُپج کو دخل در اصلیت و حقیقت سے کسی طرح باز نہیں رکھ سکتا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کرامات کی سچائی پر یقین رکھتے تھے یا نہیں۔ تاہم یہ بالکل عیاں تھا کہ ان کے آبگینۂ دوستداری کو ٹھیس لگی ہے۔

کچھ دن بعد شہاب صاحب پاکستان واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد برنی صاحب نے آغا حسن عابدی صاحب سے اپنی اس تجویز کی منظوری حاصل کر لی کہ شہاب صاحب کو B.C.C.I فاؤنڈیشن کی جانب سے ساڑھے چار ہزار روپے ماہوار وظیفے کے علاوہ ایک کار مع پٹرول اور ڈرائیور اُن کے اُردَل میں تعینات کر دی جائے۔ اس کی اطلاع شہاب صاحب کو بذریعہ خط دی گئی، جس کا تُرنت جواب آیا کہ کرم گستری کا شکریہ۔ صورتِ احوال یہ ہے کہ سرکاری پنشن گو قلیل ہے، مگر میری ضروریات قلیل تر ہیں۔ رہی کار، تو میں صرف اپنی بہن کے گھر آتا جاتا ہوں جس کے لیے کار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قطع نظر ان مراعات کے جن سے مستفید نہیں ہو سکتا، اگر B.C.C.I کو کسی کام کے سلسلے میں میری خدمات درکار ہوں تو ہمہ وقت حاضر ہوں۔ بغیر کسی

مشاہرے، وظیفے یا اعزازیے کے۔

ذرا غور کیجئے۔ ہمارے ہاں ایسے کتنے لوگ ہیں جو ریٹائرمنٹ کے بعد ایسے غیر مشروط وظیفے اور بن مانگی مراعات کو ایسی بے نیازی سے رد کر دیں۔

یاد رہے کہ اس وظیفے کی رقم وہی تھی جو ہمارے زمانے میں نیشنلائزڈ بینک کے پریسیڈنٹ کی تنخواہ ہوا کرتی تھی۔ ★[1]

غبی آدمی غبن نہیں کر سکتا؟

کوئی اپنا دُکھ یا تکلیف بیان کرتا تو برنی صاحب بے قرار ہو جاتے اور جو کچھ ان سے بن پڑتا، اس سے دریغ نہ کرتے۔ ایک واقعہ یاد آیا جو شاید دلچسپی کا باعث ہو۔ ایک جونیئر افسر ایک چھوٹی سی رقم کے گھپلے میں برخاست کر دیا گیا۔ برنی صاحب سے فریاد کی۔ ہرچند کہ ان کا اس افسر یا اس محکمے سے دور کا بھی سروکار نہیں تھا، تاہم فوراً اس کی وکالت و حمایت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ محکمہ متعلقہ بضد تھا کہ ہم نے پوری چھان بین اور باقاعدہ تحقیقات کے بعد اس افسر کو ڈسمس کیا ہے۔ اس کی اپیل کے بعد دوبارہ تحقیقات کی گئی۔ اس کی رُو سے بھی وہ قصوروار گردانا گیا۔ برنی صاحب کا یہ موقف تھا کہ اس حُلیے بُشرے کا آدمی غبن کر ہی نہیں سکتا! غبن کے ارتکاب کے لیے تو ذہانت درکار ہوتی ہے جو اس کی شکل و صورت سے آشکار نہیں۔ آخر قیافہ بھی کچھ معنی رکھتا ہے۔

ڈیڑھ سال تک وہ اس کیس کی پیروی کرتے رہے۔ ایک دن مجھ سے بر سبیل تذکرہ کہنے لگے کہ دیکھیے، کیسے نامعقول لوگ ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت و شکل کا آدمی غبن نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، صاحب، کسی دن کورٹ یا جیل جا کر دیکھئے۔ کسی قاتل کی شکل سے نہیں لگتا کہ وہ قتل کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ یہ تو کوئی معقول دلیل نہیں۔ یہ تو اس کی بریت کے لیے ناکافی ہے۔

پہلی بار مسکرائے۔ کہنے لگے، سرِ دست، میرے پاس تو یہی ایک دلیل ہے!

بالآخر اسی قیافہ شناسی اور دلیل کے زور اور نتیجے میں وہ شخص جو قصوروار ہونے کے علاوہ صورت سے کُند ذہن، بے گناہ، عیالدار اور مفلوک الحال بھی لگتا تھا، اپنی ملازمت پر بحال کر دیا گیا۔ غبن کے بعد اتنی رسوائی نہیں ہوئی تھی جتنی کے بحال ہونے کے بعد ہوئی! بہرحال، برنی صاحب چھوٹے بڑے سات بچوں اور ان کی ماں کو فاقہ کشی اور دربدری سے بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

★[1] اور آج کل ''جھاڑو پونچھے والی'' ماسی کی پکار ہے!

بعد ازاں اسی تنخواہ پر کام کرنے والے تین پریسیڈنٹس نے بھی اپنے اپنے بینک پر جھاڑو پھیر دی! مگر پولیس نے ''پونچا لگانے'' کی مہلت نہ دی۔

(۱۱)

جوش صاحب کے نونواسے

برنی صاحب کی ادب دوستی بینک میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ادیبوں اور شاعروں کے ناز اٹھانے میں انہیں مزہ آتا تھا۔ ایک واقعہ ہو تو بیان کروں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے (بوجوہ) کہ جب وہ یو بی ایل سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر یہاں (لندن) آگئے تو ایک دن جوش صاحب ایک نوجوان کے ہمراہ، جسے وہ اپنا نواسہ بتاتے تھے، مجھ سے ملنے اسلام آباد سے یو بی ایل کے ہیڈ آفس، کراچی تشریف لائے۔ وہ مجھے ایک مدت تک گجراتی اسپیکنگ میمن سمجھتے رہے۔ میں نے کبھی اس کی تردید کرنی ضروری نہ سمجھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے مبینہ نواسے سے اپنی پان کی ڈبیا چھین کر دُرشت الفاظ مگر اپنائیت بھرے لہجے میں کہا "مرذود، تم ہمیں شہر شہر، قریہ قریہ، دربدر بلکہ دفتر بدفتر ذلیل کرواتے پھرتے ہو! بڑے صاحب کو سلام کرو۔" اُس نے تعمیل کی تو فرمایا "لڑکے، ایسے نہیں کھڑے ہو کر۔ ساری تربیت خاک میں ملادی۔" پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "صاحب، ان نواسوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے نہیں، سر پہ اوڑھے پھرتا ہوں! چنا جور گرم! اس بینک میں بس ایک ہی صاحبِ ذوق، علم دوست، اور جوہر شناس آدمی تھا۔ برنی۔ ابنِ حسن برنی۔ ہائے! وہ لندن سدھار گیا۔ اُس نے میرے آٹھ نواسوں کو ملازمت دی اور کبھی احسان نہیں جتایا۔ جی ہاں، آٹھ۔ مگر عجیب شریف النفس انسان تھا۔ اوروں کی طرح تسبیح کے دانوں پر میرے نواسوں اور اپنی نوازشوں کی گنتی نہیں رکھی! اس بدنصیب کے لیے آپ کو دسیوں دفعہ فون کر کے اپنی اوقات خراب کروا چکا ہوں۔ ایک خط بھی لکھا۔ آپ نے اردو کا خط کاہے کو پڑھا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں، آپ کے بینک میں بڑی میمن گردی ہے۔"

"میں میمن نہیں ہوں۔ لیبل ہی لگانا ہے تو مارواڑی کہہ سکتے ہیں۔" مجھے کہنا پڑا۔

"جی ہاں۔ بڑی مارواڑی گردی ہے۔" انہوں نے گیئر بدلا۔

"سوائے میرے یہاں کوئی مارواڑی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

جوش صاحب یہ سن کر چکرا سے گئے۔ پھر سنبھل کر بولے۔ "مگر ان منحوسوں کی شکلیں تو آپ سے ملتی ہیں!"

مجھے خاموش دیکھا تو ایک پان اور کھایا۔ اس عمل کے دوران انگلی جو کتھے چونے میں لتھڑ گئی تھی اسے منہ میں رکھا اور تین چار دفعہ لولی پاپ کی طرح چوس کر صاف کیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو فرمایا "اگر آپ نے اس بچے کو ملازمت نہ دی تو میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ شرم کے

مارے انتقال کر جاؤں گا۔ آپ کا خدا اور عدالت آپ کو ہرگز معاف نہیں کریں گے آپ دونوں جگہ کھنچے کھنچے پھریں گے اور یہ جنازۂ رواں۔۔ مسمّی شبیر حسن خان جوشؔ آپ کے گریبان سے لٹکا ہو گا! آپ سمجھ رہے ہیں؟ لٹکا ہو گا__ لٹکا! برنی، ابن حسن برنی ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔''

میں نے عرض کیا ''فی الحال مجھی کو حکم دیجیے۔ تابعدار ہوں۔''

یکلخت نرم پڑ گئے۔ نواسے سے کہا ''مرڈود چچا کو آداب کرو۔''

میں نے جوش صاحب سے پوچھا ''صاحبزادے کا کیا نام ہے؟''

جوش صاحب نے ذہن پر بہتیرا زور دیا۔ نام یاد نہ آیا۔ جھنجھلا کر کہنے لگے ''مرڈود، اب تمہارا نام بھی میں ہی بتاؤں؟''

اُس نے اپنا نام بتایا۔ میں نے پوچھا '' آپ کہاں رہتے ہیں؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا تو جوش صاحب نے پھر ڈانٹا۔ ''بتاتے کیوں نہیں؟ اگر اقامت گاہ اور جائے سکونت کو رہائش گاہ کہنے کے عادی ہو تو اس وقت وہ بھی چلے گی۔ منہ سے پھوٹو تو سہی۔''

نواسے نے جوش صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''انکل! سَر کو لاہور کا پتہ بتاؤں یا جہلم کا؟''

''پتہ جہنم کا، جہاں ہم دونوں سکونت پذیر ہوں گے۔'' انکل جوش ثُم نانا جان نے طیش کے عالم میں جائے قرار و قیام کا پوسٹل ایڈریس فراہم کیا!

میں نے چچا بھتیجے میں بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے پوچھا '' آپ کس جگہ مستقل پوسٹنگ کرانی پسند کریں گے؟''

کیسے نانا اور کہاں کا نواسا! میں جانتا تھا کہ جوش صاحب ہر کسی بے روزگار اور غرض مند کی سفارش کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔

میں انہیں لفٹ تک چھوڑنے گیا۔ اس میں داخل ہونے کے فوراً بعد وہ باہر نکل آئے۔ کچھ یاد آ گیا۔ فرمایا ''ہائے! جوش مرحوم کا جنازۂ خودکار و خود رواں اب زینۂ رواں سے روانہ ہوا چاہتا ہے۔ ہائے ہائے۔ نہ ہوا برنی۔ ابنِ حسن برنی۔ دس منزلیں، جی ہاں دس بارہ فلور نیچے کار پارک تک ہمیں چھوڑنے، مشایعت کرنے جاتا تھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ نئی ڈائری اور پارکر قلم کے تحفے کے بغیر رخصت کیا ہو۔ ایک مرتبہ مجلّد بیاض بھی دی۔ اس کی کرم گستری جرح و تفتیش کی تابع نہ تھی۔ نہ کبھی کُریدکُرید کے سائل کا نام، جائے قیام اور وجہ ولادت دریافت کرتا تھا! آمد کی خبر پاتے ہی ایک موٹر کار ہماری اقامت گاہ بھیج دیتا تھا۔ جی ہاں، اقامت گاہ۔ رہائش گاہ نہیں۔ آپ ابھی جس سفید کرسی پر براجمان تھے، اس پر آپ سے پہلے جو عالی ظرف اور فیض رساں شخص (آغا حسن عابدی)

متمکن تھا، اُس نے بکمال قدر دانی فقیر کو ایک موٹر کار نذر کی تھی۔ ڈرائیور اور پٹرول اس کے علاوہ۔ اور اب یہ دن بھی دیکھنے تھے کہ اسلام آباد میں آپ کا گماشتہ مظفر زیدی ہمیں دو گیلن پٹرول تک دینے میں Banks Nationalisation Act کے دھمکی آمیز حوالے دیتا ہے۔ گویا یہ منحوس قانون فقط شبیر حسن خاں کی سرکوبی کے لیے نافذ کیا گیا ہے! افسوس اب اس بینک میں شعر و ادب کا کوئی قدر داں نہ رہا۔ کل واپس اسلام آباد جا رہا ہوں۔ وہاں آپ کے فنانس منسٹر مبشر حسن سے کہوں گا کہ اے نبیرۂ حالی پانی پتی، تو نے بینکوں پر جھاڑو پھیر دی! سُود خوری میں جِنسِ خبیثہ کا اضافہ کر دیا!''

آخری معاشقے میں عاجز کا دخل در مواصلت

اس ملاقات کے کچھ دن بعد ایک صبح ساڑھے نو بجے چپراسی ایک ملاقاتی پرچی لایا جس پر ''جوش مرحوم'' بقلم خود مرقوم تھا۔ اب ان کے رقعوں اور پرچوں پر میرا القاب ''یوسفِ کنعانِ ادب'' ہوتا تھا۔ بیٹھنے سے پہلے جوش صاحب بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ کھڑکی کھلوا دیجیے۔

''سڑک کی طرف کھلنے والی سب کھڑکیوں کو seal کر کے آغا حسن عابدی صاحب نے ان پر یہ سفید سِلک کے بھاری پردے ڈال دیئے۔'' میں نے کہا۔

فرمایا ''پردے اُتار کر کھڑکی توڑ دیجیے۔''

پوچھا ''خیریت؟ آخر کیوں؟''

فرمایا ''میں یہاں سے کُودنا چاہتا ہوں!''

''آٹھویں منزل سے؟''

''جی ہاں۔ دسویں ہوتی تو دسویں سے بھی چھلانگ لگا دیتا تاکہ خونِ ناحق آپ کی گردن پر ہو!''

''آپ نے خودکشی کے لیے عاجز کے دفتر کا انتخاب کیوں فرمایا؟''

''اس لیے کہ مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کا اختیار صرف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ عاجز نہیں، مُعجز نما ہو سکتے ہیں!''

''کیا وظیفہ ناکافی ہے؟''

''ناکافی ہونے میں کس بھڑ بھونجے کو شک ہے۔ لیکن اس پر تو خود بینک کو شرم آنی چاہیئے! روپے پیسے کی خاطر جان دینا یا لینا بنیوں، بقالوں اور بینکاروں کا وتیرہ ہے۔ میری جان بچانا آپ کے اختیار میں ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' میں نے کہا۔

''میں لاہور کی ایک حسینہ کے عشق میں مبتلا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ مگر اس مقدّس رشتے میں اس کا ناہنجار باپ حائل ہے! قیامت شعر کہتی اور سمن تخلص کرتی ہے......''

یہاں جوش صاحب نے سمن کا ایک شعر سنایا جس کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا:

''تمہارے قُرب کے صدمے اٹھائے ہیں میں نے''

اس پر میں نے کہا ''مگر جوش صاحب، اس میں تو بیزاری کا پہلو نکلتا ہے!''

''باریک مال آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس میں بلا کی نُدرت ہے۔ لیکن میں محاسنِ کلامِ سمن پر گفتگو کرنے حاضر نہیں ہوا۔ اگر آپ نے بروقت اعانت نہ کی تو میں اسی لمحے کھڑکی توڑ کر کُود جاؤں گا۔ قرائن اور شواہد سے معلوم ہو گا کہ آپ نے مجھے دھکّا دیا تھا! کھنچے کھنچے پھریں گے۔''

''حکم''

''اُس نے اسی سال بی۔اے کیا ہے۔ بے حد ذہین ہے۔ آپ اسے لاہور برانچ میں ملازم رکھ لیں تو ایک انسانی جان بچ جائے گی۔ روزانہ نہ سہی گاہے ماہے ملاقات کی صورت نکل آئے گی۔ دن میں دو تین دفعہ فون پر بات بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا ناہنجار باپ بہت شکّی اور سڑ بلّا ہے۔ فون اُسے دینے کی بجائے گھامڑ خود مجھ سے دن میں دو تین دفعہ کلام کرنا چاہتا ہے! مجھے تو لُوطی لگتا ہے!''

''حکم کی تعمیل ہو گی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

ان کے رُخصت ہونے کے بعد میں نے لاہور زون کے چیف منیجر سلیم ملک کو فون کیا کہ ''ایک لڑکی کی سفارش آئی ہے۔ اسے Officers' Gr. III میں کھپانے پر ہمدردانہ غور فرمائیے گا۔ فون نمبر یہ ہے......''

چار پانچ دن بعد سلیم ملک کا فون آیا کہ سر، وہ لڑکی تو بہت اسمارٹ ہے۔ اس قابل ہے کہ گریڈ II میں بلا تامّل رکھ سکتے ہیں۔

شاید وہ کچھ اور سمجھا۔ بہرحال میں اس دام میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے کہا ''گریڈ III ہی ٹھیک رہے گی۔''

ایک ہفتے بعد سلیم ملک نے بینک کے فارم پر اس کی درخواست مع تصویر ارسال کی جن کی فوٹو اسٹیٹ نقول آج بھی میرے کاغذات میں تبرکاً موجود ہیں۔

کوئی تین ماہ بعد جوش صاحب تشریف لائے۔ برہم برہم سے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کی اردلی میں جو صاحب پان کی ڈبیا اور بٹوہ اٹھائے پھر رہے تھے، جوش صاحب انہیں ڈھال ڈھال

کر بُرا کہنے لگے، جب کہ طعن و تشنیع کا اصل ہدف اور مخاطب میں تھا! ''میرا حال تمہیں نظر نہیں آتا۔ کبھی تو کوئی کام کر دیا کرو یا چھالیا ہی کترتے رہو گے؟''

میں نے ادائے آداب کے بعد عرض کیا'' کیسے تکلیف فرمائی؟''

فرمایا'' تکلیف ہی کا حال گوش گزار کرنے آیا ہوں۔ لاہور میں آپ کے نابکار کارندے میری آواز پہچاننے لگے ہیں۔ فون نہیں ملاتے۔ آپ کے گُرگے تو اُس کے باپ سے بھی زیادہ خبیث نکلے! ہم دونوں جدائی کی آگ میں جل رہے ہیں۔ موسم الگ ستم ڈھا رہا ہے۔ اسلام آباد اور دامن کوہ میں گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ بجلیاں چمکتی کڑکتی ہیں، لیکن

جوشؔ کے پہلو میں جب تم ہی تڑپ سکتے نہیں
پھر گھٹا کے دامنوں میں برق لہرائی تو کیا

میں نے داد دی تو بُرا سا منہ بنایا۔ پھر کہنے لگے'' آپ کی کوٹھی میں سرونٹ کوارٹر تو ہوگا۔ لق و دق لان تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ آپ کے مچھر تو مہمانوں کا خون پی پی کر اُنہیں کے کان میں بھنبھناتے ہیں! میری خواہش ہے کہ آپ سمن کا تبادلہ کراچی کر دیں اور اپنے سرونٹ کوارٹر میں اس کی سکونت کا باقاعدہ انتظام کر دیں تاکہ میں بھی وہاں چندے قیام پذیر رہوں۔''

میں نے عرض کیا'' میرے گھر میں تو ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے، جس میں ڈرائیور رہتا ہے۔''

''ہائے! نہ ہوا برنی۔ کیسی شاندار کوٹھی تھی اُس کی! میں اس سے جھوٹوں بھی ذکر کرتا تو فوراً اپنا ماسٹر بیڈ روم ہمارے لیے خالی کر کے خود صوفے پر منتقل ہو جاتا! اب کون رہتا ہے اس کوٹھی میں؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

''تو پھر یہ کھڑکی کھلوا دیجیے تاکہ......''

جوش صاحب بہت آزردہ ہوئے۔ اپنے ایک خط میں جو راغب مراد آبادی نے خطوط کے مجموعے میں شامل کر کے چھاپ دیا ہے، جوش صاحب نے میرے رَوَیّے اور عدم تعاون کی شکایت کی ہے۔

اب وہ شریر بچّی ماشاءاللہ بچّوں والی ہے اور اسلام آباد میں بفضلہٖ شاد و آباد ہے۔

لیجیے، یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ جوش صاحب اپنے ذاتی غم اور مصائب کے ذکر سے محفل کو کبھی افسردہ نہیں کرتے تھے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں ان کی بیگم انگیٹھی کی چنگاریوں سے لحاف اور کپڑوں میں آگ لگنے سے جاں بحق ہو گئیں۔ اس المناک حادثے کے کچھ عرصے بعد ایک مشاعرے کے سلسلے میں جوش صاحب کو کراچی آنا پڑا۔ حسبِ معمول بینک بھی تشریف لائے۔ میں

نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس عمر میں آپ پر تو قیامت گزر گئی۔
فرمایا، اُمّ الشعراء اگر پچیس تیس برس قبل یہی کچھ کر گزرتیں تو جوش مرحوم کی زندگی سنور جاتی!
یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مجھے تو وہ غم زدہ نظر آئے۔
محفل کو چونکا اور گرما دینے والا چٹکیلا اور پھڑکتا ہوا فقرہ ذہن میں آتے ہی زبان پر لے آنا بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ وہ مچلتا بہت ہے! لیکن اُسے ضبط کرنے اور ذرا روکے رکھنے کے لیے پاسِ خاطر، تحمّل اور مُنکسر مزاجی درکار ہیں۔ بے حد ذہین و فطین، بذلہ سنج اور حساس طبع ان محلّہ دارانہ اوصاف کی تاب نہیں لاسکتیں!

(۱۲)

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

دوستداری اور انجمن آرائی کا سلیقہ اور قرینہ تمام و کمال ان پر ختم تھا۔ ملتان ہو یا بورے والہ، لاہور ہو یا لندن، وہ جہاں بھی تعینات ہوئے، روزِ اول سے اسے دیارِ یاراں جانا اور بزم آرائی کا ایک قابلِ رشک نمونہ اور معیار قائم کر کے دکھایا۔ وہ اُس فرق سے بخوبی واقف تھے جس کی طرف حالّی نے اشارہ کیا ہے:

ؔ اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

جہاں ان کے دوستوں اور رفقاء میں قدرت اللہ شہاب، شیخ منظور الٰہی، نور الحسن جعفری، قراۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی اور سید حامد نمایاں حیثیت کے حامل تھے وہاں ان کے نیازمندوں کے حلقے میں مجھ جیسے لوگ اور ملتان کے منشی عبدالرحمٰن اور وہ بزرگ بھی شامل تھے جنہیں وہ ''دھاڑ دھاڑ شاہ'' کہتے تھے۔ برنی صاحب گفتگو کا آغاز توجہ کو کھینچنے والے انترے سے کرتے۔ ان کا انداز بنیادی طور پر narrative یعنی بیانیہ تھا، جس میں جابجا چٹخارے دار مقام آتے تھے، لیکن گھٹا ٹوپ فلسفے، طنز و استہزا اور حاشیہ آرائی کے کلی پھُندنے نہ ہوتے۔ البتہ بعض نازک مقامات پر محض اپنے لہجے اور لبوں کی چِپ چِپی سی جُنبش یا خفیف سی سِسکی سے وہ کیفیت پیدا کر دیتے جسے غلط العام میں ''چسکے دار'' کہتے ہیں۔ مثلاً پندرہ برس قبل وہ بھائی مختار مسعود کے ساتھ EPIDC (ایسٹ پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن) کی بوٹ میں سُندر بن کی سیر کرنے گئے تھے۔ واپس آئے تو ہمارے لیے سارا سُندر بن اُنہی شرمیلی آنکھوں میں بھر کے لے

آئے۔ کبھی اسنیپ شاٹ دکھاتے اور کبھی ٹیپ سناتے: رات کے سنّاٹے میں دور کہیں over-loaded اسٹیمر اپنے بیٹھے ہوئے گلے سے سیٹی بجا رہا ہے۔ دریا کنارے سپاری کے بے حد لمبے درخت اس وقت خاموش کھڑے ہیں۔ سائیکلون اور ٹارنیڈو کے دوران لچکیلے تنے والے یہ درخت دائیں بائیں، آگے پیچھے کیسے جھومتے اور دُہرے ہو ہو جاتے ہیں، اس کا نقشہ مختار مسعود خود دائیں بائیں، آگے پیچھے طوفانی انداز سے جھوم جھوم کر ایسا کھینچتے کہ کشتی ڈبکوں ڈبکوں کرنے لگتی۔ مختصر یہ کہ خود مجسم سپاری کا چھالیا سے لدا پھندا جھومتا جھامتا پیڑ بن جاتے جسے دیکھ کر پان کھانے والوں کے منہ رال سے بھر بھر جاتے! (رومال سے اپنی باچھوں کی فرضی رال پونچھتے ہوئے) معاف کیجئے، محاکات اور منظر کشی میں کوئی ادیب ___ زندہ یا مرحوم ___ مختار مسعود کا ہمسر و ثانی نہیں۔

بیان جاری رکھتے ہوئے برنی صاحب کہتے کہ گھنے درختوں میں بندروں کو ایک ڈال سے دوسری ڈال اور ایک گُدّے سے تیسرے گُدّے تک جُھولواں جاتے یا چھلانگ لگاتے دیکھ کر مختار مسعود کا ان سے بھی زیادہ اُچھلنا، کودنا، کُدکنا اب تک یاد ہے۔ بلا کے mimic ہیں۔ وقفے وقفے سے اس طرح خوخیاتے، بندروں کا منہ چڑاتے اور ایسی شکلیں بناتے کہ اگر ذرا قریب ہوتے تو بندریاں ان کے ساتھ زلیخا والا سلوک کر بیٹھتیں۔ مجھے سب یاد ہے۔ ہرنوں کی ڈار کا یک لخت چمک کر قُلانچیں بھرنا اور مختار مسعود کا اپنی لمبی صراحی دار گردن اُٹھا اُٹھا کر بے تابی سے پوچھنا کہ بنگال ٹائیگر کب آئے گا؟ انہیں کب کھائے گا؟

برنی صاحب کو یہ تک یاد تھا کہ اس رات بوٹ میں ڈنر کا مینو کیا تھا! اور اس سفر میں جو تلی ہوئی بلسا مچھلی کھائی وہ کُھلنا کی راکٹ بوٹ کی مچھلی اور دریائے سندھ کی پلّہ مچھلی سے ذائقے اور بو باس میں کتنی اور کیسے مختلف تھی۔ یہ انہوں نے ہی بتایا کہ Cox's Bazar کی مچھلی میں کانٹا بہت اور پلّہ میں چربی بہت ہوتی ہے۔ ایک دن پوچھنے لگے کہ آپ کبھی رانگا ماٹی بھی گئے ہیں؟ وہاں کی مٹی سرخی مائل سنہری ہے! دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

عرض کیا ''حضرت، اصل ٹورسٹ اٹرکشن سرخی مائل سنہری مٹی نہیں ہے۔ وہاں قبائلی عورتیں، بالائی دھڑ اور ان قدرتی آرائشوں کو جن پر وہ مشتمل ہے، بالکل کھلا رکھتی ہیں۔ اس برہنگی کا انہیں قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ دیکھنے والوں کو بھی کچھ دیر بعد کثرتِ نظارہ کے باعث احساس نہیں رہتا۔ جی اُوب جاتا ہے اور لباس دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔''

ان کے چہرے کی رنگت سُرخی مائل سنہری ہوگئی۔ سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولے کہ سُندربن کے بنگال ٹائیگر کے مقابلے میں آپ کا راجستھانی شیر تو بالکل لکڑ بگھا لگتا ہے! لیکن یہاں کی گائے

بکری کے برابر ہوتی ہے! اور مُنّے مُنّے چیتل اور چکارے خرگوش کے برابر! بہت cute لگتے ہیں۔ ظالم کس دل سے ذبح کرتے ہوں گے؟

میں نے مبالغے کو آگے بڑھایا ''مگر اجگر اور اژدہے اتنے بڑے اور مردم خور کہ ان پہ بیٹھ کر دشمن کے گھر جانے کو جی چاہتا ہے!''

وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئے۔

پھر ان کا وائپر چلنے لگا۔

انہیں سُندر بن لے جانے والی بوٹ کا وہ افسر بھی یاد تھا جس نے اپنی دو بیویوں کو حلقۂ فرائض کے دونوں کناروں پر پارک کر رکھا تھا۔ یعنی ایک کھلنا میں اور دوسری نرائن گنج میں۔ مہینے بھر دونوں ازدواجی گھاٹوں اور گھاتوں کے درمیان ''شٹل'' کرتا رہتا تھا۔ دونوں کے ساتھ مساوات برتتا تھا۔ مطلب یہ کہ دائرو پلی کے دونوں کو مارتا پیٹتا تھا۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو دونوں کا باہمی تبادلہ کر دیتا تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ فقط جغرافیائی محلِ وقوع اور مقامی آب و ہوا کے باعث بدسلوکی کرتا ہے۔ سندر بن میں بدبودار ٹھرّا پی کے ویسی ہی عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا اور اس کا اوور ٹائم چارج کرتا تھا!

بس اسی طور بات سے بات نکلتی اور وہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے جاتے۔ سننے والا ان کی داستان در داستان کے عجائباتِ سندر بن میں ایسا کھو جاتا کہ باہر نکلنے کو جی نہ چاہتا۔ میں نے تو آخر آخر میں ہُنکارا تک بھرنا چھوڑ دیا تھا کہ اس سے ان کے تسلسل اور خود میرے لطفِ سماعت میں خلل آنے کا اندیشہ تھا۔

اکثر خیال آتا ہے کہ عالمِ بالا میں جب وہ اِس آب و خاک کی دنیا کی کہانیاں مزے لے کر سناتے ہوں گے تو حور و ملائک اس نووارد کے گرد حلقہ کیے کیسی حیرت و محویت سے سنتے ہوں گے۔

تازہ تریں مکاشفات معرضِ گفتگو میں ہیں ؎
ارض و سما سنو سنو گرمِ بیاں ہے آدمی!

آم، روہُو اور بچھُو

جناب صدر، اراکینِ انجمنِ ساداتِ امروہہ، خواتین و حضرات، ایک دیرینہ فرمائش کی بجا آوری میں قدرے تامّل اور خاصی تاخیر سے حاضر ہونے کی معذرت، یادآوری اور عزت افزائی کے دلی شکریے سے پہلے لازم ہے۔ میں اللہ کے بابرکت نام کے بعد عذرِ لنگ اور دوراز کار تاویل سے اپنی گفتگو کا آغاز نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے جس تامّل اور ہچکچاہٹ کی طرف ابھی اشارہ کیا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلے میں دوسری وجہ بیان کروں گا۔ اس لیے بھی کہ اگر پہلی وجہ پوری طرح کافی و شافی اور مُسکِت ہوا کرتی تو دوسری کی نوبت کاہے کو آتی۔ تو وہ دوسری وجہ یہ کہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا عزیزی ندیم حیدر نے ایسی ہی ایک تقریب میں جس کا اہتمام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا گیا تھا، مجھے دعوتِ صدارت مع طعام و کلام دی۔ میں وقت و مقام مقررہ پر ٹھیک ساڑھے سات بجے پہنچ گیا۔ آٹھ بجے تک جملہ مدعوئین جن کی تعداد سو سے کچھ اوپر ہوگی اپنی اپنی نشست پر رونق افروز ہو گئے لیکن مجھے مدعو کرنے والے اور منتظم و میزبان ندیم حیدر غائب تھے! ساڑھے آٹھ بجے۔ نو بجے۔ پھر گھڑی نے ساڑھے نو بجائے۔ اس کے بعد کیا بجا، یہ ذہین و باخبر سامعین کو بتانا چنداں ضروری نہیں۔ مگر میزبان و منتظم ندیم حیدر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے گھڑی دیکھنا چھوڑ دیا، اس لیے کہ ایسے میں، اُس مشورے کے مصداق جو حضرت نظر امروہوی نے اپنے کسی منظورِ نظر کو دیا تھا، گھڑی گھڑی نظر اٹھا کے گھڑی دیکھنا فضول ہے:

ع تمام رات بجے گی ابھی بجا کیا ہے

ساڑھے دس کے بعد مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ چونکہ میں اس تقریب کا مبینہ و علانیہ صدر ہوں اور تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہوں، نیز حواس باختگی کے باعث مجھ پر میزبان و منتظم ہونے کا بجا طور پر گمان ہو سکتا ہے، تو کہیں ہوٹل والے بارہ بجے، آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر، مجھی کو خطبۂ صدارت کے بشمول خود مسّودے سمیت نہ دھر لیں کہ سیدھی طرح بل ادا کرو ورنہ گھر والوں کو فون کر دو کہ ''آج شب میں تھانہ متعلقہ میں فروکش ہوں۔ صبح سویرے بڑے ناشتے دان کے ہمراہ دو ضمانتیوں کو ضرور بالضرور بھجوا دیں۔'' میری جیب میں اس وقت پانچ پانچ روپے کے تین نئے نوٹ اور ۱۹۷۴ء کا بنا ہوا شناختی کارڈ تھا۔ اس پر جو فوٹو تھا وہ کسی اور کا معلوم ہوتا تھا۔ پولیس اس فوٹو کو جعلی اور مجھے اصلی قرار دیتے ہوئے اپنی موبائل میں لاد کر تھانے لے جا سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد شور اٹھا ''آ گئے! آ گئے!''

آ تو گئے، مگر انہیں دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ دائیں آنکھ اور سر پر پیچدار پٹی بندھی تھی۔ یا اللہ خیر۔ محفل پر سناٹا چھا گیا۔ میں نے خطبۂ صدارت جیکٹ کی باہری جیب سے نکال کر اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ عالم کچھ قوالی کے اُس بند کا سا طاری تھا جو بچپن میں اتنا سنا تھا کہ آج بھی ''ہانٹ'' کرتا ہے۔ تھوڑی سی تحریف کے ساتھ نذر ہے:

ع آہٹ پہ گوش، در پہ نظر تھی کہ ناگہاں
جب یہ سنا کہ آنکھ پہ پٹی بندھی ہے واں
بس خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے

معلوم ہوا کہ وہ اچھے خاصے اپنی کار میں آ رہے تھے کہ گلی کے موڑ پر ناگاہ ایک کرکٹ کی گیند ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی اُن کی دائیں آنکھ پر لگی۔ اور وہ بیہوش ہو گئے۔ عینک کے شیشے کی کرچیاں آنکھ کے ڈیلے میں پیوست ہو گئیں۔ چہرہ خونم خون ہو گیا۔ لوگ انہیں اسپتال لے گئے، جہاں سے، ابتدائی مرہم پٹی کے بعد وہ سیدھے ہوٹل آئے۔ صبح ان کی آنکھ کا آپریشن ہونے والا تھا۔

فرض شناسی، وضع داری، لگن اور ضبط کی ایک حد ہوتی ہے!

آج جب میں عزیزی ندیم حیدر اور ان کے رفقائے کار (کار سے یہاں مراد وہ کار نہیں ہے) کی آراستہ کی ہوئی اس محفل کے لیے روانہ ہونے لگا تو بیگم سے کہا کہ میں دائیں آنکھ کی سمت دیکھتا ہوں، تم بائیں جانب نظر رکھنا کہ لڑکے کرکٹ تو نہیں کھیل رہے۔ اگر اس خونیں ایکٹیوٹی میں سرگرم نظر آئیں تو پہلا کام تو یہ کرنا کہ بائیں ہاتھ سے میری دائیں آنکھ ڈھانک لینا۔ پھر دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھنا اور اپنے پورے وزن اور طاقت سے مجھے دبا اور پچکا کر duck کرا دینا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اُن لونڈوں سے پوچھنا کہ ادھر سے ندیم حیدر تو نہیں گزرے؟

یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے نظروں نے اُنہیں کو ڈھونڈا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس دفعہ بھی سارا انتظام و انصرام اور ساؤنڈ سسٹم وغیرہ کی ادائیگی مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہوئے میرے ذِمّے کر کے سٹک گئے۔ یہ دیکھ کر ایک گونہ اطمینان اور خوشی ہوئی کہ وہ ماشاء اللہ چاق چوبند سرگرمِ استقبال ہیں اور دونوں ذہین آنکھیں نئی عینک تلے لشکارا مار رہی ہیں۔

یہ تو ہوئی میرے تامّل اور ہچکچاہٹ کی دوسری وجہ۔ بارے پہلی کا کچھ بیاں ہو جائے۔ بریفنگ کے دوران ندیم حیدر نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ انجمن ساداتِ امروہہ کے اراکین ہی نہیں، جُملہ سامعین بھی شائستہ ادب، نستعلیق اور بے حد و حساب باذوق و سخن فہم ہیں۔ انہیں آج تک کسی گھٹیا شعر کی داد دیتے اور

شریف آدمی کی ہوٹنگ کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ کوئی شاعر خراب غزل یا کوئی نثر نگار خراب افسانہ یا مضمون پڑھ کر جانے لگے تو زیادہ تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ اُس کے جانے کی خوشی میں ہوتی ہیں! کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا جب وہاں کوئی یادگار مشاعرہ یا ادبی محفل برپا نہ ہو۔ یہ اطلاع مجھے غالباً بصیغۂ ترغیب و تشویق دی گئی تھی، لیکن باعث تشویش ہوئی۔ مجھے تو یہ اطلاع کم اور انتباہ زیادہ معلوم ہوا جو میرے بائی پاس شدہ دل کو دہلانے کے لیے بہت کافی تھا۔ چنانچہ جب یہ تقریر لکھنے بیٹھا تو کاغذ پر قلم اور جب ہال میں داخل ہوا تو فرش پر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔ کہاں تو داد و تحسین کی طلب و تمنا ایسی کہ اگر دو تین فقروں پر تالیاں نہ بجیں تو نہ صرف منہ اُتر جاتا تھا بلکہ خود بھی اسٹیج سے اترنے کو جی چاہتا تھا۔ اور اللہ! اللہ! اب یہ عالم کہ ہر ہر فقرے پر دھڑکا لگا ہے کہ کہیں کوئی دیرینہ دوست تازہ دشمنی کی بناء پر رُخصتی تالی نہ بجادے۔

خوف بُری بلا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ”مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف خوف ہے اور دوسری طرف کُھلا خَسارہ اور خواری تو بتاؤ تم کیا choose کرو گے؟ میں ایک لمحے بھی تذبذب میں پڑے بغیر کہوں گا کہ یارا، خسارہ اور خواری مجھے منظور ہے۔ خوف تمہیں کو مبارک۔“

اس بات کا دل پر ایسا ہول بیٹھا کہ مجھے تو اب خوف سے خوف آنے لگا ہے!

مرزا کہتے ہیں کہ یہ خوف کی سب سے واہیات اور مردافگن قسم ہے۔ مردافگن کا ترجمہ وہ اکثر ”مرد پچھاڑ“ کرتے ہیں۔

روایت ہے کہ امروہہ نام اس لیے پڑا کہ وہاں کے آم بہت میٹھے اور روہُو مچھلی بہت ذائقہ دار ہوتی ہے۔ آم کو سنسکرت میں آمر اور آم کے باغ کو امرائی کہتے ہیں۔ امر اور روہُو کے سنجوگ سے امروہہ بنا۔ ہمیں تو یہ اختراعی روایت صریحاً کسی آم کے رسیا اور چٹورے کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اصل وجہ تسمیہ کچھ اور ہوگی۔ آم اور روہو مچھلی تو قصبہ پھپھوند (یوپی) اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی ناپید نہیں۔ امروہہ کی بنائے شہرت، آم اور مچھلی کی کسی دور میں اور کسی طور محتاج نہیں رہی کہ وہ سدا سے ایک مردم خیز خطہ اور علم و ادب میں اعتبار اور استناد کا درجہ رکھنے والا مرکز و مرجع رہا ہے۔ اگلے وقتوں کے بے بدل علما و فضلا، مشائخ، کاملینِ فن اور شُعرا و اُدبا کے ذکر اذکار کا یہ محل اس لیے بھی نہیں کہ ہمارے درمیان حضرت جون ایلیا بنفسِ نفیس و ناطق موجود ہیں، جن کے دم سے امروہے کا اور امروہے سے نسبت کے باعث ان کا نام روشن ہے اور روشن رہے گا۔

امروہہ سے متعلق دوسری روایت البتہ معتبر و مستند معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہر وہ شخص جو کبھی امروہہ گیا ہے اس کا عینی شاہد ہے۔ امروہہ میں حضرت شرف الدین شاہ ولایت کا مزارِ مبارک مرجع خاص و عام ہے۔ اس کے احاطے اور اطراف و نواح میں زہریلے بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی کو ڈنک نہیں مارتے۔ اگر کوئی ان کو چُھولے یا چھیڑے یا اٹھا کر ہتھیلی پر رکھ لے تو اپنا ڈنک سکیڑ

لیتے ہیں۔ یہ حضرت شاہ ولایت کا اعجاز و فیضان ہے۔

قدیم شُعرا و اُدبا کے ذکرِ خیر کا، جیسا کہ ابھی عرض کیا، یہ موقع و محل نہیں۔ لیکن معاصرین کے بارے میں یہ کہے بن نہیں رہا جاتا کہ آج کل ہمارے ادیب اور لکھاری باہمی تضحیک و تذلیل اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں جُٹے ہوئے ہیں اور اس عمل کے دوران خود کو مُفتخر و فتح مند محسوس کرتے ہیں۔ جو علانیہ کیچڑ اُچھالنے کی جُرأت اور سکت نہیں رکھتے وہ چُپ چُپاتے ڈنک مار کے گمنامی کے بل میں چُھپ جاتے ہیں، جب کہ بچھو کبھی دوسرے بچھو کو ڈنک نہیں مارتا، نہ سانپ اپنے ہم جنس کو ڈستا ہے۔ ''فنون'' کے حالیہ شمارے میں اردو ادب کے Grand Old Man حضرت احمد ندیم قاسمی نے اپنے اداریے میں بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا ہے کہ اِس وقت ''بہتان و دُشنام کی ایک آندھی سی چل رہی ہے۔ بعض خاصے نامور لوگ بھی اِس آندھی میں تنکوں کی طرح اُڑ گئے ہیں...... آج کے شعر و ادب کی یہ صورت تشویش ناک ہے۔''

اور تو اور بعض ''ادبی اخباروں'' نے بالکل فرضی، خود ساختہ، اہانت آمیز اور بیہودہ انٹرویو چھاپنے شروع کر دیے ہیں، جو ہر اعتبار سے قابلِ نفرین و مذمت ہیں۔ ان کے علاوہ گمنام سرکلر خطوط اور گشتی مراسلے گندگی، حسد اور بُزدلی کا سڑاندا ملبا ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نیش زنی، کردار کُشی اور ادبی دہشت گردی کے انتہائی شورانگیز، زہرناک اور بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ اس کا اطلاق لیڈروں اور سیاست دانوں پر بھی ہوتا ہے!

کچھ دن ہوئے، اس ضمن میں ایک تجویز ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ ہمارے چند سیاست دانوں، شاعروں، لیکھکوں، نقادوں، اخباروں اور رسالوں کے مدیروں کو بچھوؤں کے ساتھ چند روز گزارنے کے لیے سرکاری خرچ پر امروہے بھیج دیا جائے تا کہ اُن کے فیضانِ صحبت سے یہ حضرات اپنے معاصرین کو کاٹنا اور ڈنک مارنا چھوڑ دیں۔

ہم نے اس اصلاحی تجویز کا ذکر اپنے ہمدمِ دیرینہ مرزا عبدالودود بیگ سے کیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو غضب ہو جائے گا۔ یہ خیال تک دل میں نہ لانا۔ ہمارے سیاست داں، ادیب نقاد، طنز نگار وغیرہ تو اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، اُلٹا ان بچھوؤں کو بھی اپنے آزمودہ طریقے سے کاٹنا اور ڈنک مارنا سکھا پڑھا کے جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آ جائیں گے!

میر تقی میر کوئی دو سو برس قبل ایسی ہی ایذا رسانی اور مردم آزاری کا نقشہ کھینچ گئے ہیں:

نہیں تازہ دل کی شکستگی، یہی درد تھا یہی خستگی

اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا، اِسے زخم سے سروکار تھا

سدِّ سمندری★[1]

(یہ مضمون پاک امریکن کلچرل سینٹر (PACC) میں ۱۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو پڑھا گیا۔)

خواتین و حضرات،

حفیظؔ جالندھری کا ایک شعر ہمارے حسب حال و حُلیہ ہے:

پری رُخوں کی زباں سے کلام سُن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

حفیظؔ صاحب یہ بات صریحاً گول کر گئے کہ دیکھنے کے بعد کیا ہوا؟ اگر کچھ مثبت نتائج نکلے ہوتے تو دوسرا شعر بلکہ سہ غزلہ اس موضوعِ دلپذیر پر ضرور کہتے جو کہ نہیں کہا۔ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔

میں اکثر کہتا ہوں کہ مصنّف کو صرف کتاب کے آئینے میں دیکھنا چاہیئے۔ اُس کے اور قاری کے درمیان ایک محتاط فاصلہ یعنی کتاب بھر کا فاصلہ بہت ضروری ہے۔ اور اگر قاری یا فین کوئی خاتون ہے تو اُس کے اور مصنف کے درمیان شوہر بھر کا فاصلہ رہنا چاہیئے۔ یہ اور بات کہ مرزا ایسے شوہروں کو marital obstacles یعنی قاضی کے پیدا کردہ نکاحی موانعات یا ازدواجی بمپرز سے تعبیر کرتے ہیں۔

دیکھیے، حفیظ صاحب بھی کیسی چکنی زمین میں شعر کہہ گئے ہیں کہ ہم پہلے ہی قدم پر پھسلے تو پھسلتے ہی چلے گئے۔ ہم تمہید یہ باندھ رہے تھے کہ cold print (حرفِ بارد۔ منجمد) سے پڑھنے والے کی تشفی نہیں ہوتی۔ وہ تو گوشت پوست کے آدمی یعنی خطاونسوان کے پُتلے کو دیکھنا، اُس سے مصافحہ کرنا، اس کے مزاج کی کیفیت اور خفیہ و علانیہ امراض کی نوعیت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی جتنی زیادہ بشری و غیر بشری کمزوریوں پر سے پردہ اٹھتا ہے، اُتنا ہی وہ پڑھنے والے کے دل کے قریب ہوتا جاتا ہے۔

★[1] سدِّ سمندری: بروزن سدِّ سکندری۔ کراچی میں ساحل سمندر پر واقع پُر فضا بستی Sea View کی Sea Wall یعنی ساحل کو کاٹنے سے بچاؤ کے لیے ڈیڑھ فٹ موٹی دیوار کا پُشتہ۔

بقول مرزا، فرشتوں کی آٹو بایوگرافی فرشتے ہی پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ پہلے کوئی کاتب لکھنے اور پبلشر چھاپنے پر رضا مند تو ہو۔ قاری، مصنف کی تصنیف کو اُس کی زبانی سننا اور اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھنا بھی چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ زبان و بیان کی غلطیوں کے علاوہ تلفظ کی غلطیوں اور لہجے کی لرزشوں اور لغزشوں کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر، بقول شخصے، مصنف کی صورت سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ تابش دہلوی صاحب کہ دھیمے لہجے اور ملائم طرزِ بیان کے قائل ہیں، اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ آج کل بڑے شاعروں کی صورت بھی خاص قسم کی ہو جاتی ہے! ہم نے ان کا یہ قول پڑھا تو خیال آیا کہ شاید کتابت کی غلطی سے بُرے کی بجائے بڑے چھپ گیا ہے۔ لیکن مرزا نے یقین دلایا کہ میرا خیال غلط ہے۔ میں نے مصنفوں کے چال چلن سے قریب واقفیت کا ذکر قصداً نہیں کیا۔ آرٹسٹوں، شاعروں اور ادیبوں کو، جہاں تک چال چلن کے نمبروں کا تعلق ہے "خوش خطی" میں صفر ہی ملتا آیا ہے۔ اس کے علاوہ، عملی زندگی ان سے جتنے بھی سوال کرتی ہے وہ ہر ایک کا غلط جواب دیتے ہیں۔ بھولے قارئین اور مدّاحین انہی غلط جوابوں کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب اس اتباع و کاوش کے نتیجے میں زندگی پوری طرح ناکام و نامُراد ہو جاتی ہے تو خود بھی آرٹسٹ، شاعر یا ادیب بن کر ہم جیسوں کی عاقبت سنوارنے میں جُٹ جاتے ہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ "صاحبِ ذوق و نظر قاری بننے کے لیے وسیع مطالعہ، وجدان، شعر و ادب کی پرکھ اور ایک عمر کی تپسّیا درکار ہے، جب کہ اس سے آدھی مشقت میں آدمی تم جیسا مصنف بن جاتا ہے!" غور طلب یہ امر ہے کہ جب دونوں ہی صورتوں میں کھکھیڑ اٹھانی پڑتی ہے تو پھر ہمیں سمجھ داری سے کام لینا چاہیے جیسا کہ اُس شخص نے کیا جو ایک پہنچے ہوئے گرو جی کے پاس ناریل، لڈو، سیندور اور گرو دکشنا (نذرانہ) لے کر گیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ گُرو دیو! مجھے اپنا چیلا بنا لیجیے۔ گرو جی نے کہا کہ بچّہ، چیلا بننا تو بہوت کٹھن کام ہے۔ بَس پر اُس نے کہا کہ تو پھر مجھے گُرو ہی بنا لیجیے۔

اس کے بعد شاید یہ وضاحت اتنی ضروری نہ ہو کہ عاجز نے اسی بنا پر مصنف بننے کو ترجیح دی۔

ہمیں تو صاحبانِ نظر و خبر نے یقین دلایا تھا کہ شاعری اور ادبِ عالیہ کی تصنیف و تالیف سراسر ایک وہبی و الہامی عمل ہے جس میں معمول کو کوئی محنت یا کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ شاعروں کو تو اسی لیے تلامیذ الرحمٰن یعنی خدا کے شاگرد کہا جاتا ہے' جس پر مولویوں تک نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ایک محفل میں مُنشی احسان اللہ خویشگی نے کلام کے الہامی ہونے کے ثبوت میں اپنی تازہ غزل ترنّم سے پڑھی۔ یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ کلام زیادہ خراب ہے یا ترنّم۔ ہمیں تو دونوں ایک دوسرے سے زیادہ خراب لگے! مقطع کے بعد بطور تائید و تصدیق، غالبؔ کا یہ شعر تحت اللفظ سنایا۔ کُھلا کہ ان کا تحت اللفظ تو ترنّم سے بھی

زیادہ خراب ہے:

؎ شعر غالبؔ نبود وحی و نگوئیم ولے
تو و یزداں، نتواں گفت کہ اِلہامے است

مفہوم یہ کہ غالب کے شعر وحی نہیں ہیں اور ہم یہ کہاں کہتے ہیں کہ وحی ہیں۔ لیکن تم اور یزداں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ وحی نہیں ہیں۔ گویا سارا کام مُلہمِ غیبی کرتا ہے۔ آپ کا کام تو الہام والقا کے دوران حرف بحرف ڈِکٹیشن لینا اور بعد ازاں کمالِ فن کی داد سمیٹنا ہوگا۔ بس antenna کی مانند منہ سُوئے فلک اور کان بھی اسی جانب ٹیون کر کے ''آرام آرام'' سے کھڑے ہو جائیے۔ پھر دیکھیے غیب سے مضامینِ نو کا آپ ہی آپ کیسے نزول ہوتا ہے۔

سو اس کا انتظار کرتے کرتے شام کا جُھٹ پُٹا سا ہو چلا! اُدھر سے نہ کچھ آنا تھا نہ آیا۔ انٹینا کبھی کا زنگ آلود ہو چکا۔ تیز ہواؤں نے اس کا قبلہ تک بدل دیا۔ اب اس پر صرف دوسروں کے اعلیٰ نسل کے کبوتر آن بیٹھتے ہیں اور کچھ دیر غُٹرغُوں کر کے اُڑ جاتے ہیں۔ بالفرضِ محال، ہم انہیں پکڑ کے اپنے کابک میں بند کرنا چاہیں بھی تو خود سرقے کے جرم میں پکڑے جائیں گے۔ آخر آخر benefit of doubt (ملزم کو حقِ شبہ کا فائدہ) اور حُسنِ توارد کی بنا پر بعد از رسوائی بسیار، بری کر دیے جائیں گے۔

شگفتہ و شاداب ناول Three Musketeers کے مصنف Alexander Dumas کا ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک ڈنر میں اسے ایک جنرل کے پہلو میں بٹھایا گیا، جس کا تعلق توپ خانے سے تھا۔ اُسے اس بات سے بڑی مایوسی ہوئی کہ اتنے طولِ طعام کے باوجود ڈُوما نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس پر پیٹ پکڑ کر ہنسنا تو در کنار، دھیرے سے مسکرایا بھی جا سکے۔ جنرل نے کہا، اتنی دیر ہو گئی۔ آپ نے ایک لطیفہ بھی نہیں سنایا۔ اس پر ڈوما نے کہا کہ جنرل صاحب، میں نے تو آپ سے ایک دفعہ بھی توپ چلانے کو نہیں کہا۔ پھر آپ مجھ سے لطیفے داغنے کی توقع کیوں رکھتے ہیں؟

شگفتہ نگار کے کچھ اور بھی ہینڈی کیپ ہیں۔ اس سے توقع کی جاتی ہیں کہ گمبھیر سے گمبھیر موضوع پر بھی مزاحیہ انداز سے گفتگو کرے گا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مجھے ایک نہایت معتبر ادارے کی طرف سے اسلامی بینکاری پر مزاحیہ گفتگو کرنے کی دعوت دی گئی۔ مگر میں نے اس موضوع پر اپنی دانست میں نہایت سنجیدہ تنقیدی مضمون پڑھا جسے مزاحیہ سمجھ کر سامعین نے خوب تالیاں بجائیں۔ اسی طرح دو تعزیتی ریفرینسز کی صدارت کے لیے قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ منتظمین جلسہ اور احباب کے پُر زور اصرار پر وہاں بھی مجھے اپنے مخصوص انداز میں سوگ منانا پڑا، جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ مرحومین کی روح پر کیا گزری، اس کا علم صرف اللہ کو ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ شیکسپیئر کا fool اگر سر پہ تاجِ شاہی یا غالب والی

کلاہ پاپاخ بھی پہن کے آجائے، تب بھی دیکھنے والوں کو اُس کے سر پر مرغے کی کلغی والی fool's cap ہی نظر آئے گی۔ بلکہ اُس میں لٹکی ہوئی گھنٹیاں بھی سنائی دیں گی!

بس کچھ ایسے تاملات اور اندیشہ ہائے دور دراز ہیں جو اب میرے اور ایسی تقریبوں کے درمیان حائل رہنے لگے ہیں۔ پروفیسر ہارون رشید کا اصرار میرے تامل و تذبذب کو اپنی گرم جوشی کی رَو میں بہا لے گیا۔ میں اس عزّت افزائی کے لیے پاک امریکن کلچرل سینٹر، اس کے ارکین اور اس محفل کو رونق اور وقار بخشنے والے معزز سامعین کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ پروفیسر ہارون رشید اتنے انکسار، اخلاق اور تپاک سے پیش آئے کہ مجھے یقین ہو چلا کہ اس الیکشن میں قومی اسمبلی کی سیٹ کے لیے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو رہے ہیں۔ میں ممنون ہوں کہ انہوں نے میری اس گزارش پر عمل کیا کہ اس تقریب میں مجھ پر کوئی تعارفی یا تعریفی مضمون نہیں پڑھا جائے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ بچت کے اشتہاروں سے اتنے متاثر ہو گئے ہیں کہ تعریف میں بھی، بلکہ صرف تعریف میں، کفایت شعاری اور کنجوسی سے کام لینے لگے ہیں۔ چنانچہ جتنی تعریف مجھے درکار ہے وہ میں حیلے بہانے سے خود کر لیتا ہوں۔

جواباً ہارون رشید صاحب نے پروفیسرانہ یعنی مشفقانہ مگر قاطعِ حیل و حجت انداز سے یہ شرط لگا دی کہ حالاتِ حاضرہ پر کوئی تازہ مضمون ضرور سنایئے گا، خواہ دو صفحے کا ہی کیوں نہ ہو۔ خواتین و حضرات، مجھ پر تو یہ دو صفحے بھی بھاری ہیں۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ میرے نزدیک شائستہ آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ پر دو منٹ فی البدیہہ گفتگو گالی دیئے بغیر کر سکے! دوسری خصوصیت ہمارے حالاتِ حاضرہ ماجعہ کی یہ ہے کہ پچیس تیس برس سے ویسے ہی چلے آ رہے ہیں اور آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے جیسے کہ ہیں۔ یعنی ویسے کے ویسے ہی!

پچھلے دنوں نواب اکبر بگٹی نے حالاتِ حاضرہ کی منہ بولتی تصویر ایک لفظ میں کھینچ دی۔ فرمایا کہ پاکستان میں بڑی دَبڑ گھُونس مچی ہے۔ ہمیں یہ لفظ کسی بھی ڈکشنری میں نہیں ملا۔ مگر کیا کہنے! سبحان اللہ! واہ واہ! یہ اس لائق ہے کہ اس کا شمار اُن بلیغ onomalopoec الفاظ میں کیا جائے، جن کی صوتی وضع یعنی فقط آواز ہی سے سارا مفہوم پھٹا پڑتا ہے! ۴۲ سیاسی پارٹیوں نے الیکشن میں حصہ لیا۔ اکابرین نے ایسے بلند بانگ اور اُسطوخودّوس (نظر بددور۔ یہ بھی اسی قبیل کا لفظ ہے) منشور نشر کیے کہ دیکھتے دیکھتے اور سنتے سنتے آنکھیں اور کان دُکھنے لگے۔ بُہتوں کے سیاسی ضمیر پر وَرم آ گیا۔ عوام نیا ضابطۂ اخلاق، نئی لگن اور نئے چہرے دیکھنے کے متمنی تھے۔ الیکشن سے کیسی کیسی امیدیں وابستہ تھیں۔

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا

لیکن نہ تو موتی بھری سیپیوں سے ہمارا دامن بھرا۔ نہ طوفانی سمندر نے کوئی ہرا بھرا جزیرہ

اُچھالا۔ کسے معلوم تھا کہ اس بحر کی تہ سے خود لیڈر صاحبان ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہوئے برآمد ہوں گے! مقصد سب کا ایک ہے۔ ان میں پھٹیچر سے پھٹیچر لیڈر بھی پرائم منسٹر سے کم بننے کے لیے بظاہر تیار نہیں۔

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے تاج
کیسی انوکھی بات رے

الحمدللہ، نگراں حکومت سرخرو ہو کر رخصت ہوئی۔ نگراں وزیر اعظم جناب معین قریشی جہاں سے شاداں و فرحاں آئے تھے، وہیں نالاں و گریاں واپس چلے گئے۔ الیکشن کے دوران ہم نعروں، وعدوں اور ''بڑھکوں'' سے ایسے بدحظ ہوئے کہ ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا۔ ریڈیو سننے لگے، اس لیے کہ اور کچھ نہ ہو، کم از کم ان صورتوں کو تو نہیں دیکھنا پڑتا جن کے دیکھنے سے منہ پہ رونق کی بجائے کچھ اور ایکسپریشن آتا ہے جسے دوبارہ اپنے چہرے پر لا کر آپ کی طبیعت کو مکدر کرنا میرے صدارتی فرائض میں شامل نہیں۔ شام کے اخبارات میں البتہ دل پشوری کرنے والی خبر کے منتظر رہے۔ بالآخر، الیکشن سے ایک ہفتے قبل ایک چھوٹی سی مگر چٹخارے دار خبر دیکھی کہ سابق چیف منسٹر جام صادق علی مرحوم کے فرزندِ دلبند جام معشوق علی نے اپنے الیکشن کیمپین کے لیے بطور خاص پری چہرہ ایکٹرس ریما کو ٹنڈو آدم بُلایا تھا، مگر راولپنڈی کے شیخ رشید نے بیچ میں ٹنگڑی★ مار کے سارا مزہ خاک میں ملا دیا۔ ہمیں بھی قلق ہوا حالانکہ

ہم سخن فہم ہیں، ریما کے طرف دار نہیں

ہم تو اس الیکشن میں اس حد تک غیر جانبدار رہے کہ اگر ہمارا نام متعلقہ حلقے کے ووٹروں کی فہرست میں ہوتا تو ہم اپنا قیمتی ووٹ نہ جام معشوق علی کو دیتے، نہ اُن کے مخالف کو۔ بلکہ دھڑلے سے ریما کو دیتے۔ ریما کو ووٹ دینے کی ایک خاص اور معقول وجہ ہے وہ یہ کہ جام معشوق علی کو دیکھا ہے۔ ریما کو نہیں دیکھا۔ مگر نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہم عمر اور فتنۂ نظر کے اُس نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں، جب سبھی ایک جیسی لگتی ہیں! مطلب یہ کہ اچھی لگتی ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ ریما جی کا کمال یہ ہے کہ جب وہ ایکٹنگ کرتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کچھ اور بھی کر رہی ہیں! ہمارے خیال میں شو بزنس اور سیاست میں فرق یہ ہے کہ سیاست داں بہتر ایکٹنگ کرتے ہیں!

اتنا لکھنے کے بعد ڈان اخبار کے ایک اشتہار سے ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ریما بھی وہی صابن استعمال کرنے لگی ہیں جو نصف صدی سے ہماری جلد اور رنگ کی موجودہ صورت حال کا ذمہ دار ہے۔ ہم اس صابن کا نام بوجہ خوف قانون و عدالت نہیں بتا سکتے۔ اگر جوش خطابت یا بے دھیانی میں اُس

★ ٹنگڑی مارنا: کشتی میں ٹانگ کا داؤ لگا کر گرانا، ٹانگ مار کر گرا دینا۔

کا نام زبان پر آ جائے تو اس کے بنانے والے یعنی لیور برادرز جھٹ ہم پر libel (بدنام کرنے) اور ہرجانے کا مقدمہ دائر کردیں گے کہ ہم اپنی صورت کو مشتہر کر کے لکس صابن کو بدنام کرنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں!

دوسری خبر جس نے توجہ کو گُدگُدایا اور ہماری محفل کو گرمایا یہ تھی کہ تہمینہ درّانی نے اپنے شوہرِ نامدار و آقائے سابق الانعام مصطفیٰ کھر (ہم نے My Feudal Lord کا آزاد ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے) کے خلاف تھانے میں FIR کٹوائی ہے کہ شخص مذکور نے ان کا بیڈرُوم اجازت کے بغیر استعمال کیا۔ ہم نے FIR نہیں دیکھی۔ ہمارا خیال ہے کہ رپورٹر نے "The aforesaid misused my bathroom." کا ہماری ہی طرح آزاد ترجمہ کردیا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ڈرائنگ روم کا صحیح استعمال یہ ہے کہ وہاں پیارے ملاقاتی سے گلے ملیں اور اس کے جانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر اس کی غیبت کریں۔ کچن میں چٹور پن کی تسکین اور امراضِ معدہ کے فروغ کا سامان ہوتا ہے۔ باتھ روم کی غرض و غایت مفصّل تشریح کی محتاج نہیں۔ اب رہا بیڈروم، وہ اسمبلی کی طرح ایک کثیر المقاصد و مفاسِد ★ مقام ہے۔ جہاں اگلا جس طرح چاہے عیش کرے یا طیش میں گزار دے۔ چپکا بیٹھا رہے یا جو بات ذہن سے پہلے زبان پر آجائے وہ بھڑ سے کہہ دے اور اپنی اوقات خراب کرائے۔ اخبار کی رپورٹنگ سے پتہ نہیں چلتا آیا موصوف گھر میں باقاعدہ اجازت لے کر داخل ہوئے یا صرف بیڈروم میں بلا اجازت چوری چُھپے گھسے اور بعد میں سٹک گئے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ بیڈرُوم کے کس مخصوص حصے کو کیسے استعمال کیا۔ کیوں کیا۔ کیا کیا۔ کیوں کر کیا۔ مختصر یہ کہ رپورٹ اس باب میں خاموش ہے کہ آخر موصوف وہاں کیا کرنے گئے تھے!

اس پر ہمیں ماجد علی صاحب بہت یاد آئے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن وہ اپنی بیگم نامور شاعرہ زہرا نگاہ کے ہمراہ ایک اردو فلم دیکھ رہے تھے اور رومینٹک لیکن مضحکہ خیز ڈائلاگ پر رننگ کمنٹری (تبصرۂ رواں) کرتے جاتے تھے۔ بیگم نے ٹہوکا دے کے کہا بھی کہ لوگ ڈسٹرب ہورہے ہیں، مگر وہ اپنی ہنسی اور فقرے ضبط نہ کرسکے۔ کچھ دیر بعد ایک سین میں ہیروئن کے ستر نما شُتر غمزے پر انہوں نے زور دار قہقہہ لگایا اور بآوازِ بلند فقرہ کسا تو پچھلی صف سے کسی دل جلے نے بڑے غصّے میں ڈانٹا "تُسی ......"

ماجد صاحب نے پلٹ کر جواب دیا، ہم تو "کی کرنے" آئے ہیں!

یہ سبق آموز حکایت ہم نے یہ دکھلانے کے لیے نقل کی ہے کہ ہماری اسمبلیوں میں بھی ممبروں کی خاصی تعداد فقط "کی کرنے" جاتی ہے۔

★ مفاسد: مفسدہ کی جمع۔ فساد۔ جھگڑا

میں سمجھتا ہوں کہ نگراں حکومت اور معین قریشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بینک کے بڑے defaulters (نادہندگان) کی مکمل فہرست بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، لیکن پوری چھان بین کے بعد، بصد سامانِ رسوائی و روسیاہی شائع کر دی۔ اور یہ ساری کارروائی نوے دن کے اندر اندر تکمیل کو پہنچی! بزنس کی دنیا کے ان اکابرین و عمائدین کی فہرستوں کی لمبائی اُن نامہ ہائے اعمال کے برابر ہے جو بروزِ محشر بینکروں کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ ان کی روشنائی ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوئی۔ لوگ ہنوز ان کا مطالعہ غم و غصہ اور رشک و حسد کے ساتھ کر رہے ہیں۔ رشک و حسد کا اضافہ ہمیں مرزا عبدالودود بیگ کی وجہ سے کرنا پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ بینکوں میں ہمارے بیسیوں دوست، ہمدرد اور بہی خواہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ مگر صاحب، یہ کیسی دوستی اور کہاں کا اخلاص ہے کہ کسی ایک نے بھی اشارتاً کنایتاً نہیں بتایا کہ لُٹس مچی ہے۔ بارہ پہ آئی گنگا میں تم بھی ہاتھ دھو لو۔ مطلب یہ کہ قرضہ لے لو۔ مگر دس کروڑ سے کم نہ ہو۔ اس سے کم رقم کو بینک بٹے کھاتے میں write-off کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں! پاکستان کے کم و بیش ۳/۲ معززین اور متمول ترین حضرات کے اسمائے گرامی اس فہرست کی زینت تھے۔ اتنی طویل فہرست میں اپنا نام نہ پا کر اوّل اوّل مرزا کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ دشمن کہیں گے کہ لو انہیں کسی بینک نے نادہندگان کی فہرست تک کے لائق نہ سمجھا! نادہندگان کے ذکر پر یاد آیا کہ بیشتر پارٹی مینی فیسٹوز میں کیے گئے وعدے اردو غزلوں سے سرقہ کیے گئے تھے۔ مطلب یہ کہ غزل کے وصل نادہندہ معشوق کے وعدۂ وصل کی طرح ناقابلِ ایفا اور ناقابلِ بیان۔ پارٹی مینوفیسٹو، مقروض اور معشوق کا وعدہ کبھی وفا نہیں ہوتا! عرفیؔ نے اپنے ایک مشہور شعر میں کہا ہے کہ اگر گریہ سے وصلِ یار میسّر آ جائے تو میں اس کی تمنا میں سو برس تک لگا تار رو سکتا ہوں۔ فارسی میں ڈینگیں مارتے وقت عرفیؔ، استاد ذوقؔ کی طرح ''نشہ، شعر میں سرمستِ غرور و نخوت'' ہوگا۔ اُسے ذرا خیال نہ آیا کہ سو برس تک بلک بلک کر اِس طرح رونے کے بعد جیسے بچہ دوسرے کے کھلونے کے لیے مچل مچل کے روتا، رو رو کے مچلتا اور پٹ پٹ کے چُپکا ہوتا ہے یا مکّاروں کی طرح ٹسوے بہانے کے بعد، اُس کے اپنے ''حالاتِ حاضرہ'' یعنی ہوش و حواسِ غیر حاضرہ کا حال کیا ہوگا؟ ذرا ملاحظہ ہو۔ گردن مسلسل بصورتِ انکار ہل رہی ہے۔ دانت ایک ایک کر کے گر چکے۔ ایک آدھ جو فقط ایذا رسانی کے لیے باقی ہے وہ بری طرح ہل رہا ہے۔ اتفاقاً گنا یا رس بھری گنڈیری مل بھی گئی تو خاک چوس پائیں گے! گودے والے نلی یا پُر گوشت چانپ اور چکن لیگ کو صرف چچوڑتے اور پوپلے منہ پپولتے ہی رہ جائیں گے! ادھر ہاتھوں کا رعشہ ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ اگر چُھری سے نیبو کاٹنے کو کہا جائے تو زُلیخا کی سہیلیوں کی طرح اپنا ہی ہاتھ کاٹ بیٹھیں گے۔ اور شگاف بھی ایسا گویا کسی نے پھوہڑ پنے سے اُوبڑ کھابڑ دانتوں جیسے

شلنگے (دور دور موٹے ٹانکے) بھرے ہوں۔ البتہ چند اعضاء ایسے بھی ہیں جن میں رعشہ نہیں ہے۔ یہ وہ ہیں جو فالج کے سبب سُن ہو گئے ہیں۔ خود اپنے حافظے کا یہ عالم کہ وعدہ فراموش معشوق کو یہ تک یاد نہ دلا پائیں گے کہ

؎ وہی وعدہ یعنی نکاح کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

صاحبو، ہر حکومت کی مدّت ختم ہوتے ہوتے، وعدوں پر جینے والوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ دراصل الیکشن کے عہد و پیماں اور وعدے وعید، رات گئی بات گئی کے ذیل میں آتے ہیں۔ خروشیف نے غلط نہیں کہا تھا کہ سیاست داں کسی بھی ملک کے ہوں، اُن کا طریقۂ واردات یکساں ہوتا ہے۔ وہ اُس جگہ بھی پُل بنانے کا وعدہ کرتے ہیں جہاں کوئی ندی نالا نہیں ہوتا! بعض لیڈروں اور امیدواروں کی تقریریں اور خطبات تو اس لائق تھے کہ انہیں جوں کا توں مزاحیہ کالموں کی جگہ چھاپ دیا جاتا۔ مزاح کی کاٹ دار مار سے جنرل ضیاء الحق بھی بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ہمارے دوست بریگیڈیر صدیق سالک مرحوم کے فوجی فرائض میں جنرل صاحب کی گھور گمبھیر تقریر میں مزاح ڈالنا بھی شامل تھا:

؎ مزاحِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقریریں

یہ اور بات کہ جنرل صاحب اپنی چنگیزی طرزِ ادا سے مزاح کا ناس مار دیتے تھے! کیوں کہ مزاح ان کے مزاج، منصب، مونچھ، بری جیسی اُبلواں آنکھوں اور وردی سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ لیکن تالی پھر بھی بجتی، سبحان اللہ، واہ واہ پھر بھی ہوتی تھی۔ بقول جون ایلیا:

؎ بول کر داد کے فقط دو بول
خون تھکوا لو شعبدہ گر سے

اس الیکشن نے کچھ نئی، مزیدار اور نیم مُغلّظاتی اصطلاحات بھی بخشی ہیں مثلاً بارس ٹریڈنگ، ڈارک ہارس، لفافے، لوٹے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جب سے سیاستدان میدان میں اترے ہیں گھوڑوں کی خرید و فروخت ختم ہو گئی ہے۔ جہاں تک مال و دولت کی بار برداری، دُلتی، سیاسی جست، شہ براہی اور گھڑ دوڑ کا تعلق ہے، اسپ تازی کی جگہ خَر اور خَرکاروں نے لے لی ہے۔ رہا لوٹا تو ہم اسے کافی کارآمد شے سمجھتے آئے ہیں۔ تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ گھوڑے اور بے جان و بے ضرر لوٹے کو انسانی صفات سے متصف کر کے ذلیل کیا گیا ہے۔ ایک دن ہم نے مرزا سے فرمائش کی کہ ہمیں کسی لوٹے کے درشن کراؤ۔ انہوں نے دوسرے ہی دن ایک نقشین لوٹے سے تعارف کرایا تو ہمیں تعجب ہوا اور اس پر ترس بھی آیا۔

؎ لوٹا لوٹا لوگ کہیں ہیں لوٹا کیا ایسا ہوگا

مرزا: تم نے اس سے ملنے میں بڑی دیر کردی۔ اب تو اس کی ٹونٹی جھڑ چکی ہے۔

راقم: یہ تو بُرا ہوا۔ ٹونٹی کا کام تو لوٹے کو کفایت شعاری سکھانا ہے۔ مگر یہ ہوا کیسے؟

مرزا: اس کی ٹونٹی کثرتِ misuse سے جھڑی ہے۔

راقم: بھلا وہ کیسے؟

مرزا: الیکشن سے پہلے متحارب گروپوں نے ٹونٹی پکڑ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا تاکہ ان کی گنتی میں شامل ہو جائے۔

راقم: لوٹوں کو گِنا کرتے ہیں' توڑا نہیں کرتے۔

مرزا: جب پکڑائی دینے کے لیے ٹونٹی نہ رہی تو گمنامی کی ڈسٹ بن میں پھینک دیا گیا۔

راقم: پشیمان پشیمان لگتا ہے۔

مرزا: تم اسے تین ماہ پیشتر دیکھتے! پہلے اس میں لچک کم کم اور لٹک زیادہ تھی۔ اب فقط لٹکن رہ گئی ہے! چار الیکشن اور چار پارٹیاں بھگتا چکا ہے۔ چار پر شاید اس لیے رُک گیا ہے کہ شرعی ممانعت کا خیال آ گیا ہوگا۔

میں روزانہ طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے Sea View کمپلیکس کے سامنے ساحلِ سمندر پر چہل قدمی کرنے، جسے انگریز constitutional کہتے ہیں، جاتا ہوں۔ اُس وقت سمندر کنارے سورج نکلنے کا سماں دیکھنے والے پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ایک گھنٹے بعد لوٹتا ہوں تو تعداد بارہ تیرہ ہو جاتی ہے۔ بابر نے اپنی تو زک میں بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا ہے کہ ہماری ہندوستانی فوج جب دریا کنارے خیمہ زن ہوتی ہے تو پُشت دریا کی طرف کر لیتی ہے! مطلب یہ کہ خیمے ایسے رُخ پر لگاتے ہیں کہ دریا نظر نہ آئے! کچھ ایسا ہی رویّہ ہم ساکنانِ شہرِ کراچی کا ہے۔ ہم نے سُنّتِ افواجِ بابری پر عمل کرتے ہوئے اپنی پیٹھ سمندر کی طرف کر لی ہے۔ سمندر کو ہم ایک bottomless dust-bin (بے پیندے کا کوڑے دان) کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جس میں عرصۂ دراز سے سارے شہر کا "میلا"، کوڑا کچرا، غلاظت، فیکٹریوں کا فُضلہ اور زہراب پھینکتے رہے ہیں۔ وہ خوبصورت سمندر، وہ شیتل شانت ساگر جسے خوشابۂ خوش گزراں ہونا چاہئے تھا، اُسے ہم نے گندآبۂ شہرِ ناپُرساں میں تبدیل کر دیا۔

میں صبح اس ساحل پر چہل قدمی کے لیے جاتا ہوں۔ چہل قدمی یعنی چالیس قدم جس [illegible] میری مُراد چار میل ہیں لیکن بعض خواتین جس انداز سے چہل قدمی کرتی ہیں، اُسے چُہل قدمی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ شام کو بعض اہلِ نظر نہ تو شفق کا منظر دیکھنے جاتے ہیں، نہ سمندری ozone کو [illegible]

میں پمپ کرنے کے لیے یہ کشٹ اٹھاتے ہیں، بلکہ وہ اندازِ خرام بچشم خود و بچشمۂ سیاہ ملاحظہ فرمانے جاتے ہیں جس کی طرف ابھی ہم نے اپنے آنکھ مارتے فقرے میں اشارہ کیا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ چال کی خوبی سے ہی چال چلن کی خرابی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اندازہ اس سے نہیں کیا جاسکتا کہ کس رفتار سے کتنا فاصلہ کیا۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ فاصلہ طے نہ کرنے کے دوران، یعنی ہر دو قدم کے بیچ کیا قیامت ڈھائی! اس قیامت کا نظارہ کسی کو سامنے سے آتا دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ بھرا بھرا پچھایا پیچھے سے دیکھ کر ہی کھلتا ہے کہ چال کی چاپ، اور چھب چھاپ کیسی ہے۔ ایک خوبی ہو تو بیان کریں: لٹک، مٹک، ٹھمک، لپک جھپک، سُرین کا سی سا (see-saw) یا پنڈولم کی مانند دائیں بائیں اس ادا سے wiggle کرنا اور دائیں بائیں لہرا کے چلنا کہ بالکل اسی انداز و رفتار سے دلوں پر آری سی چل جائے۔ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ بقول شاعر، کوئی چھڑے کو کڑے سے بجاتی، قیامت ڈھاتی سامنے سے گزر جائے۔ تاہم اس زیوراتی اور پازیبی موسیقی کے بغیر بھی خرامِ ناز سے قیامت ڈھانے کے اَن گنت انداز ہیں: لچکتی، مچلتی، لہراتی، لجاتی، جھجکتی، جھومتی، گج گامنی، اِترونی نخرہائی، پنگ پانگ کی گیند کی مانند ہر قدم پہ ٹپا کھاتی، پیچھے مُڑ مُڑ کے یہ دیکھتی چال کہ اب بھی کوئی گھور رہا ہے یا سبھی مر گئے؟ لیکن پیچھے مڑ کے دیکھنا ضروری تو نہیں۔ اس لیے کہ جوان اور خوبصورت عورت کی گُدی میں نہایت حساس اور نظر شناس نسائی رادار (radar) ہوتا ہے۔ اُسے صاف نظر آتا ہے کہ پیچھے کون کیسی نظر سے دیکھتا آ رہا ہے۔ یہی نہیں، پچھائے پر اُس کی نظر کی آر پار تاب و تپش سے آگا اور اس پر کھینچی کمانیں تک جل اُٹھتی ہیں! نظیر اکبر آبادی نے کیا خوب تصویر کھینچی تھی:

آگا بھی کُھل رہا ہے، پیچھا بھی کُھل رہا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے

''کُھل رہا ہے'' کی بجائے ''جل رہا ہے'' پڑھا جائے تو اس شعلہ بدنی پر لفظ بہ لفظ اور نظر بہ نظر صادق آئے گا! لیکن ہم اس پرواہ وانہیں کریں گے۔ واہ واہ تو ہم ''وُوں'' کے استعمال پر کریں گے جس کو ظالموں نے متروک تو قرار دے دیا، لیکن لاکھ سر ماریں اس کا متبادل نہ لا سکیں گے۔ ہم تو ابھی ''تئیں'' اور ''تِس پر'' ہی کے ماتم سے پوری طرح فارغ نہیں ہوئے! ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے۔

مرزا نے ہمیں ''عزادارِ archaic'' (پرانے الفاظ) اور ''سجادہ نشین درگاہِ متقدمین و محافظ و متوَلّیِ متروکات'' کے ناقابلِ رشک لقب سے یونہی تو سرفراز نہیں فرمایا۔

ایک دن میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا کہ مرزا! لفظ کی ناقدری اور مزاج ناشناسی کی حد ہوتی ہے! اگر تم میری عبارت میں کسی بھی متروک یا قدیم لفظ کی جگہ کوئی بہتر لفظ لا کے دکھا دو تو میں ازالۂ

حیثیتِ عُرفی وحرفی کا تاوان ایک ہزار روپے فی لفظ کے حساب سے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر ایک شرط ہے۔ اگر تم متبادل نگینہ لانے سے قاصر رہے، جس کا توی امکان وامید ہے تو یا استاد! کہہ کے دونوں کان (اپنے) پکڑو گے اور بعد قلم بوسی، دو سو روپے فی لفظ میری نذر کرو گے۔

اپنے ہی دونوں گھٹنے چھو کر فرمایا ''بجا۔ مگر ایک بات ہے۔ بلکہ دو۔ اوّل یہ کہ میں تمہاری نثر کی پلی پلائی جوئیں اُجرتاً بھی نہیں نکالوں گا۔ اتنی جیوہتیا کا پاپ میں اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔ دوم، شرط لگا کر میں فنّی عیب جوئی میں جُوئے اور اردو تنقید میں قمار بازی کی بدعت کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔''

ہم تو اپنا شمار اُن لوگوں میں کرتے ہیں جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

ع ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

ممکن کیا، اغلب ہے کہ ہماری چال ہمارے طرزِ نگارش سے بھی گئی گزری ہو۔ ہم تو سیدھے سُبھاؤ ''واک'' کرنے جاتے ہیں۔ افسوس کہ walking کا کوئی موزوں اور ڈھنگ کا مترادف کم از کم میری قلمی دسترس میں نہیں۔ ''ٹہلنا'' کے معنی ''علمی لغت'' مولفہ وارث سرہندی میں ''آہستہ آہستہ تفریح کے واسطے پھرنا۔ جُدا ہونا۔ مرجانا'' بتائے گئے ہیں۔ امید ہے ہمارے ذہین ومعزز سامعین اس نتیجے پر تو آسانی سے پہنچ گئے ہوں گے کہ ہم نے یہ لفظ ساحل پر اپنے مرجانے کے بارے میں استعمال نہیں کیا۔ سب سے مستند بائیس جلدوں پر مشتمل ''اردو لغت'' مرتبہ ترقی اردو بورڈ میں ٹہلنے کے معنی ''آہستہ آہستہ چلنا پھرنا۔ مٹرگشت کرنا'' درج ہیں۔ اور سند میں یہ معتبر عبارت نقل کر کے دادِ استناد دی گئی ہے:

''استنجا کرتے ہوئے ٹہلتے اور کُھلے بازاروں میں چکر لگاتے پھرتے ہیں۔''

ایک بار پھر یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم نہ تو مٹرگشت کرتے ہیں، نہ اس طرح سترگشت۔ اور نہ انگریزی محاورے کے مصداق کُھلے ساحل پر ایک ڈھیلے سے دو چڑیاں مارتے پھرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ٹہلتے ضرور ہیں، مگر ہیئت وہیبت کذائی وہ نہیں ہوتی جس کی منقولہ بالا سند میں ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ اشاعت تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔ برسرِ عام یہ مجہول عمل اور اس کی آئینہ دار سند کے معنی ومافیہ تینوں کے تینوں بظاہر ناقابلِ معافی لگتے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ ٹہلنے تفریح اور طریقۂ طہارت کا یہ ناقابلِ تقلید سنجوگ کچھ اگلے وقتوں کے لوگوں ہی کو زیب دیتا تھا۔ چشمِ تصور کے سامنے جو منظر ہویدا ہوتا ہے اس کے بارے میں مختصراً اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں:

ع آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں!

اس کے علاوہ، ہمیں تو اس سند میں کتابت کی ایک فاش غلطی بھی نظر آئی۔ کاتب نے سہواً یا ازراہِ چشم وازار پوشی کُھلے ازار بندوں کی جگہ کُھلے بازاروں لکھ دیا! خدا رحمت کند ایں کاتبانِ پاک طینت را۔

میں ''واکنگ'' کا ترجمہ ''سیر یا ہوا خوری'' کرنے کے بھی حق میں نہیں۔ اس لیے کہ ان سے آہستہ خرامی بلکہ ''مخرامی'' کی تصویر سامنے آتی ہے اور وہ عہد یاد آتا ہے جب امراء، رؤسا اور شرفاء پالکی، فینس، ہوادار، تام جھام میں یا خود سے بھی بہتر نسل کے گھوڑے پر سوار، ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے۔ امراء اور رؤسا زندگی میں ذاتی ٹانگیں صرف بیت الخلا تک جانے یا '' آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ فرار'' تو میدانِ جنگ سے بگٹٹ بھاگنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہوا خوری کی اصطلاح مجھے اس لیے بھی نہیں بھاتی کہ ذہن معاً ''خوری'' اور ''خور'' کی دوسری صورتوں اور قسموں کی طرف جاتا ہے جو سب کی سب واہیات ہیں۔ مثلاً رشوت خور، چغل خور، آدم خور، شراب خور، سُود خور، مُردار خور، حرام خور۔ حلال خور کا ذکر میں نے قصداً نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس سے مراد ایک بے حد محنتی، تابعدار، خدمتی اور مسکین طبقہ ہے۔ یعنی مہتر اور بھنگی۔

کبھی آپ نے غور کیا کہ ہمارے یہاں کسی اور professional (پیشہ ور) کو حلال خور یعنی حق حلال کی روزی کمانے اور حلال کر کے کھانے والا ہرگز نہیں کہتے! واہ! کیا بات دھیان میں آئی!

اس تفریحی ساحل پر قدم رکھتے ہی کتے 'جن کے غول کے غول جُھنڈے پھرتے ہیں، مجھے انتہائی شور و شرانگیز، غوغائی اور غُلغُلا تا گارڈ آف آنر پیش کرتے ہیں۔ بیشتر کتے نسلاً اصیل اور خالص ہیں۔ یعنی سو پشت سے street dogs (بازاری۔ لینڈی) ہیں۔ شکلاً اور خصائل و خبائث کے اعتبار سے بھی۔ سو پشت سے مشغلۂ آبا پہلے کاٹنا پھر بھونکنا، بھنبھوڑنا، چچوڑنا، راستہ چلتے کو کھدیڑنا، بھبکی دینا وغیرہ۔ دیگر خصائص: پنڈلی کے گوشت سے رغبت۔ روٹی کا ٹکڑا دینے والا ہاتھ، دوسری گلی کے کتے کی آمد اور بجلی کا کھمبا دیکھ کر اسی ترتیب سے دُم، سر اور ٹانگ اٹھانا! آوارہ کتے کا خود سے بھی زیادہ آوارہ لونڈوں کے ہاتھ میں پتھر یا بزرگ کے ہاتھ میں ڈنڈا یا کسی خونخوار رقیب کتے کو دیکھ کر دم دبا کر بھاگ جانا:

نلی تم نے کہا تھا ہم تو دنیا چھوڑے جاتے ہیں ★[1]

ان کے علاوہ کچھ کتے ایسے بھی ہیں جو دیکھنے میں تو رُؤسا اور شرفاء کے pedigree یعنی اعلانسل کے کتے لگتے ہیں۔ لیکن یہ اگر سو ڈیڑھ سو برس قبل نوابی عہدی اور فیوڈل معاشرے میں انسان کی جُون میں پیدا ہوئے ہوتے تو بازاری زبان میں رنڈی بچے اور لونڈی زادے کہلاتے اور گالی گلوچ، جُوتم بیزار کے دوران حرام پلے! گویا صرف پِلّا ہونا کافی نہیں! امید ہے اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہی کہ ہمارا اشارہ صریحاً دوغلے کتوں کی طرف ہے۔

میری چال کے انداز، رفتار اور وقار کا انحصار کلیتاً اس پر ہوتا ہے کہ کتوں کے کمانڈوز کیسے رزمیہ کورس

★[1] تحریف: گلی تم نے کہا تھا ہم تو دنیا چھوڑے جاتے ہیں۔

کی تال پر کس رفتار سے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ میں ان کی تال سے چال اور چال سے چال ملاتا کبھی ڈلکی★[1]، کبھی سرپٹ★[2] اور کبھی شہ گام چلتا ہوں۔★[3] مگر کہنا پڑتا ہے کہ یہ کتے بہت تمیز دار ہیں۔ گندے بھی نہیں۔ اور نہ لاغر و خارشی۔ تمیز دار اس وجہ سے کہا کہ کاٹنے سے پہلے خواہ مخواہ نہیں بھونکتے۔ بلکہ نہایت ادب سے، پیچھے سے پنجوں کے بل آکر پنڈلی پکڑ لیتے ہیں۔ گندے اور خارشی اس لیے نہیں کہ دن میں دو تین دفعہ سمندر میں غسل کر لیتے ہیں۔ پھر جب پُھریری لے لے کر جسم سے پانی جھٹکتے اور جُھرجُھراتے ہیں تو اس کا اسپرے سیدھا تفریح اور جاگنگ کرنے والوں کے منہ تک پہنچتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ سمندر کا پانی بیحد نمکین اور بدبودار ہے۔ یہ کتے فربہ اس وجہ سے ہیں کہ شام کو تفریح کے لیے آنے والے، ریستورانوں اور خوانچے والوں کے گاہک جو بچا ہوا کھانا ساحل اور گھوروں پر پھینک دیتے ہیں، اُسے یہ کتے کھاتے ہیں۔ کتّوں سے جو کچھ بچ رہتا ہے اُسے دن چڑھے بلیاں اور وہ بچے اور بوڑھی عورتیں کھاتی ہیں جو کوڑے کے ڈھیروں میں کہنی تک ہاتھ ڈال ڈال کے وہ رزق تلاش کرتی ہیں جو اُن کی قوم نے ان پر اتارا ہے۔ ریستورانوں میں کھانے والوں کو اکثر food-poisoning کی شکایت ہو جاتی ہے، لیکن ان بلیوں، بُڑھیوں اور بچوں کو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بلا ناغہ آتے اور چھیچھڑا ملبہ نوشِ جان کر کے رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی یہ کتے بھی اتنے شائستہ ہو گئے ہیں کہ ساحل پر غلاظت نہیں پھیلاتے بلکہ بے گھر لوگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ یعنی ساحل کے اُس حصّے کو open-air latrine کے طور پر استعمال کرتے ہیں جہاں سے جوار بھاٹے کی لہریں اسے بہا کر لے جاتی ہیں اور سمندر کے سینے میں پر تراتی رہتی ہیں۔ ہر قدم پر ایک مختلف بدبُو سیر کرنے والوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کئی بار لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا گیا کہ اگلے اتوار کتے مار مہم کا بڑے زوروں سے آغاز ہوگا۔ کتّوں کو زہر کھلایا جائے گا۔ لہٰذا آپ اپنے domestic pets کو باندھ کر رکھیں۔ بہت سی بیویاں اپنے شوہروں کو اس دن گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتیں۔ ساری پبلسٹی کے باوجود ہم نے آج تک کوئی مُردہ کتا نہیں دیکھا۔ زندۂ جاوید کتوں کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہی دیکھا۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان کتّوں کو جو زہر دیا جاتا ہے اُس میں آبِ حیات کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

کتے کسی اور نو وارد کے گارڈ آف آنر کے لیے چلے جاتے ہیں تو نظر اُبھرتے سورج کی زرد سی روشنی میں کنٹونمنٹ کے لگائے ہوئے سائن بورڈ پر پڑتی ہے، جس پر برائے انتباہ و اطلاع لکھا ہے:

"سمندر میں نہانے سے احتراز کریں۔"

★[1] ڈلکی: "گھوڑے اور کتے کی ایک چال جس میں اُچھل اُچھل کر چلتا ہے اور ایک وقت میں تین پاؤں اٹھتے ہیں۔"

★[2] سرپٹ: "گھوڑے کی ایک تیز رفتار چال جس میں وہ سر اوپر اٹھا کر پیر ایک ساتھ اوپر اٹھا کر دوڑتا ہے۔"

★[3] شہ گام: "شاہانہ انداز۔ گھوڑے کی عمدہ چال جو عام چال سے تیز ہوتی ہے مگر دوڑنے سے کم۔"

ہم کسی کو اس کا یہ مطلب سمجھنے سے کیسے باز رکھ سکتے ہیں کہ سمندر میں تیرنے، تفریحاً دور تک جانے، سرفنگ، واٹر اسپورٹس اور آبی کبڈّی کھیلنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بس نہانا منع ہے! ہمارا خیال ہے کہ ''احتراز'' کا متبادل یا ترجمہ بھی دینا چاہیے تاکہ کل کلاں کو لوگ کچھ کا کچھ سمجھ کر کچھ اور نہ کرنے لگیں۔ اگر ہم سے بروقت مشورہ کرلیا جاتا تو ہم یہ سائن بورڈ نصب کروا دیتے:

''یہاں بعض جگہ گٹر کے پانی میں تھوڑے سے سمندری پانی کی ملاوٹ ہوگئی ہے، جس کے لیے ہم شائقین سے معذرت خواہ ہیں۔''

پشتے کی دیوار پر تقریباً ہر تیس قدم بعد سیاہ پینٹ سے لکھی یہ بے محل فلسفیانہ سی عبارت دعوت فکر و فقرہ بازی دیتی ہے:

''آگ اور پانی کا کوئی بھروسا نہیں۔''

بھائی میرے، سمندر کنارے آگ کہاں سے آگئی؟ اگر تمہارے کارپرداز اور انشاء طراز ہمارے اسلوب کی پیروڈی کرنا چاہتے ہیں تو ہاکس بے، سینڈس پٹ اور فرنچ بیچ کے پرائیوٹ، porch اور exclusive ساحلوں پر خواص اور فارینرز یعنی غیر ملکیوں کو اس طرح خبردار اور متنبہ کرنا چاہیے:

تو برائے غسل کردن آمدی
نہ برائے وصل کردن آمدی

ٹہلنے والوں کے ہاتھ میں بالعموم چھڑی ہوتی ہے۔ البتہ خواتین میں ایک نیا فیشن چل نکلا ہے۔ وہ ہاتھ میں تسبیح لے کر چہل قدمی کرتی ہیں۔ ذرا غور کیا تو معلوم ہوا ہے کہ مرد تو کتوں کو ڈرانے، ہنکانے اور دور رکھنے کے لیے ہاتھ میں چھڑی رکھتے ہیں، جب کہ خواتین، مردوں کو پرے ہٹانے اور دانوں پر ''دُر دُر، ہُش ہُش'' پڑھنے کی غرض سے تسبیح ہاتھ میں لٹکائے گھومتی ہیں! جو دُکھیا تسبیح افورڈ نہیں کرسکتی یا جس نازک اندام کو بارِ تسبیح سے کمر دُہری اور چال بے ڈھنگی ہونے کا اندیشہ ہو، وہ اپنے شوہر کو ساتھ رکھتی ہے!

ایک گدلی، دھندلی سی صبح کا ذکر ہے۔ ایک خاتون نے جن سے میرا تعارف نہیں تھا، اچانک آگے آکے مجھے روکا اور بولیں ''سر، یہ آپ سن رائز سے گھنٹوں پہلے سَن گلاسز لگا کے کیوں آتے ہیں؟'' میں ہکّابکّا رہ گیا۔ جواب نہ بن پڑا۔ تین دن بعد اُس نے مجھے پھر روکا اور وہی سوال دُہرایا، مگر ''سر'' نہیں کہا ''آپ سن رائز سے پہلے ڈارک گلاسز لگا کے کیوں آتے ہیں؟'' اب کی بار میرا بیاؤ★ کُھل گیا۔ ڈارک گلاسز اتار کر جواب دیا ''جو وجہ آپ سمجھ رہی ہیں وہ صحیح ہے!''

★ بیاؤ کھلنا: ہمت پڑنا۔ دل کا ڈر جاتے رہنا۔ جھجک مٹ جانا۔
یہ سب درست۔ مگر وہ بیاؤ کھلنے والی بات کہاں! آپ خود ہی کڑا کر کے انصاف کریں۔ دل صاحب اولاد سے فولاد طلب ہے۔

دوسرے دن سے یہ فرق پڑا کہ وہ میرے سامنے سے گزرتیں تو پلّو سے سر وغیرہ اچھی طرح ڈھک ڈھانک کے گزرنے لگیں۔ کچھ دن بعد نہ جانے کیا دل میں آئی کہ ڈارک گلاسز لگا کے آنے لگیں۔ جی تو بہتیرا چاہا کہ...... مگر خیر۔

اسے واقعہ کہیے، مُچیٹا کہیے یا مکالمہ...... غرض کہ جو کچھ بھی تھا، اس کے دو ماہ بعد اس خاتون کو اسی جگہ ایک کتّے نے کاٹا (کتّے سے یہاں مراد کتّا ہی ہے۔) تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ میں انہیں اپنی کار میں گھر چھوڑنے گیا۔ ان کا شوہر تو زخم دیکھتے ہی پاگل ہوگیا۔ اور بہ آواز بلند کتّے کی عزیزاؤں کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کرنے لگا انہیں نیک خواہشات نہیں کہا جاسکتا۔ سننے میں آیا کہ اس نے رینجرز سے، جو ساحل پر تعینات تھے، کہا کہ میں اس کتّے کو اپنے پستول سے شُوٹ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہاں فائرنگ کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ کتّے مار کارروائی اتنی ہی ضروری ہے تو کلفٹن کنٹونمنٹ بورڈ سے رجوع کریں۔ اسے فون کیا تو جواب ملا کہ آپ کلفٹن تھانے سے اجازت لیں۔ کلفٹن تھانے نے کہا ''جنابِ عالیٰ' آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ڈیفنس کے جس فیز (Phase) میں سگِ آوارہ اور آپ، یعنی کہ دونوں مبینہ طور پر رہائش پذیر ہیں وہ علاقہ درخشاں پولیس اسٹیشن میں لگتا ہے۔'' مطلب یہ کہ عالی جناب وہیں متّھا پھوڑی کریں۔

اُس پولیس اسٹیشن کو فون کیا تو ایک ہیڈ کانسٹیبل ڈپٹ کے بولا ''آپ ڈپٹی کمشنر ساؤتھ کو 'شریعہ عام' پر فائر کھولنے کی درخواست دیں۔ اور کل صبح سوا گیارہ بجے تھانے بالمواجہ تشریف لا کر اپنے پستول کا بور (bore) اور لائسنس چیک کرائیں۔''

یہ سننا تھا کہ موصوف کا سارا غصہ ہرن ہوگیا۔ خونریزی کے اقدام سے باز آئے۔ انہیں معاً یاد آیا کہ عرصہ پانچ سال سے لائسنس renew (تجدید) نہیں کرایا! کہیں کاغذات میں گم ہوگیا ہے۔

بوکھلاہٹ میں پوچھنے لگے کہ اگر میں کتّا نہ ماروں، تب بھی کیا سوا گیارہ بجے تھانے میں لائسنس چیک کرانا ہوگا؟

صاحبو، قصّہ ذرا لمبا ہوگیا۔ مگر اس سے سبق ملتا ہے کہ پاگل کتّا مارنا کیسی جوکھم میں پھنسنا ہے۔ ہر قانون نافذ کرنے والا اہلکار کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے!

بات طرزِ خرام کی ہورہی تھی جو اُس health-conscious (صحت بنانے کا شوق رکھنے والے) بزرگ کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی جو انوکھے انداز سے ٹہلتے تھے۔ وہ اس طرح کہ بیس قدم آگے جانے کے بعد اُلٹے پاؤں یعنی منہ موڑے بغیر، پیٹھ کے رُخ، پچیس قدم مخالف سمت یعنی پیچھے

جاتے تھے۔ کئی بار فٹ پاتھ سے پیٹھ ہی کے بل گر چکے تھے۔ کئی خواتین بھی ان کے پچھلے بمپر سے ٹکرا کے تسبیح سمیت گر چکی تھیں۔ میں نے یونہی بیٹھے بیٹھے رَف یعنی موٹا سا حساب لگایا کہ اگر وہ بالکل اسی طرح مغرب کی طرف منہ کر کے احرام باندھے حج کے لیے اُلٹے پاؤں روانہ ہوں اور برابر چلتے رہیں چلتے رہیں تو پایانِ کار دیوارِ چین پہ جا کے رُکیں گے!

ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ وہ حسبِ عادت یعنی خلافِ وضعِ فطری ساحل پر shunting کرر ہے تھے۔ میں نے ان کے پچھلے بمپر سے بمپر ٹکرا کر اُنہیں روکا اور پلٹ کر پوچھا، قبلہ، آپ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد ریورس گیئر کیوں لگا دیتے ہیں؟

بولے، اس سے کولھوں کے وہ پٹھے مضبوط ہوتے ہیں جو سیدھا چلنے میں استعمال ہی نہیں ہوتے۔

عرض کیا، بالفرضِ محال وہ مضبوط ہو بھی گئے تو فائدہ؟

فرمایا، پھر اس سے دُگنی رفتار سے اُلٹا چل سکوں گا!

یہ خالی خولی شیخی نہیں تھی۔ دو سال بعد میں نے بچشم خود دیکھا کہ واقعی دُگنی رفتار سے فٹ پاتھ پر پچھاڑ کھانے لگے!

اکثر خیال آتا ہے کہ قومی پلاننگ اور سیاست میں بھی ہم بالکل ایسے ہی پیش و پس انداز و رفتار سے اپنی منزلِ مقصود اور قبلے کی طرف جانے کی پُر جوش کوشش کرتے رہے ہیں۔ اور اُس سے اور دُور، اور دُور ہوتے جا رہے ہیں۔

اگلے وقتوں میں اس قہقہہ انگیز عمل کے لیے ایک لفظ رائج تھا...... رجعتِ قہقری (قہقہہ اس کا مادّہ نہیں، لازمی نتیجہ تھا)

میں نے ساحل ساحل دس بارہ میل کا چکر لگایا ہے۔ کہیں کوئی درخت نہیں دیکھا۔ نہ کوئی مرغابی یا کوئی اور آبی پرند۔ مرزا کہتے ہیں کہ ایسی آب و ہوا اور حالات میں صرف تاجر، مہاجر، مچھر اور مگرمچھ ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ خیر، پیڑ پودے، پنچھی پکھیرو تو نہ ملنا تھے نہ ملے، مگر دو سندھی مچھیروں سے ہماری دوستی ہو گئی۔ اَسّی پچاسی سالہ ابراہیم اور ساٹھ سالہ موسیٰ سے۔ ابراہیم کہتا ہے کہ ''بوٹنگ بیسن میں جہاں آپ لوگ تِکّے اور کباب کھاتے ہیں، وہاں انگریز کے جانے اور آپ کے آنے سے پہلے ہم کشتی میں آیا جایا کرتے تھے۔ جال ڈالنے کے بعد بس نکالنے کی دیر تھی۔ سائیں، سب انگریز کا اقبال تھا۔ آدھ گھنٹے میں چاندی جیسے پیٹ والی اتنی مچھلیاں پکڑ لیتے تھے کہ دو تین دن کا خرچ نکل آتا تھا۔'' ایک دن وہ اپنا پھٹا جال دکھا کر کہنے لگا کہ ''اسے دیکھو۔ اسے کھینچنے کے لیے باؤلے اونٹ کی طاگت چاہئے!'' میں نے

دیکھا کہ اس جال میں بے شمار چھوٹی چھوٹی سمندری بٹیاں، ٹین اور گتے کے ڈبے، پلاسٹک کے تھیلے، مذہبی کتابوں کے اوراق، کانچ کی ٹوٹی بوتلیں، Diet Coke کی نمکین سمندری پانی سے بھری بوتلیں، پھٹے پرانے بے جوڑ جوتے اور چپلیں، خربوزے کے چھلکے اور ڈیڑھ دو کلو انگلی برابر مچھلیاں تھیں۔ جال روز پھٹ جاتا تھا۔ دو گھنٹے اس سے مچھلی پکڑتے اور بارہ گھنٹے اس کی مرمت کرتے۔ میں نے پوچھا، بابا، یہ کتنے میں بکیں گی؟ بولا، سائیں، بیس تیس روپے میں۔ اس علاقے میں اتنے ہی دام لگتے ہیں۔ ان بیمار مچھلیوں کو آپ لوگ نہیں کھاتے۔ بڑی مچھلیوں کو تو فشنگ ٹرالر اور گندگی کھا گئی۔ باقی مچھلیاں پلاسٹک کے تھیلوں سے دم گھٹنے سے مر گئیں۔

وہ دونوں ضعیف مچھیرے اپنا تازہ تازہ پھٹا اور بھیگا جال اور ٹوکریاں سمیٹ کر جانے لگے تو میں نے حیرت سے پوچھا کہ اس عمر میں تم یہ سارا سامان لاد کر سات آٹھ میل دور اپنے گوٹھ پیدل کیسے جاؤ گے؟ موسیٰ کہنے لگا ''سائیں، ہمیں کوئی بس کی چھت پر بھی نہیں بیٹھنے دیتا۔'' میں نے کہا ''تعجب ہے لوگ مچھلی گپا گپ کھاتے ہیں اور مچھلی کی بُو پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں!'' وہ بولا ''نہیں جی، کنڈکٹر کہتے ہیں تمہارے بدن سے بدبو آتی ہے۔ ساری بس کا محول خراب کر دیتے ہو۔''

چلنے لگے تو ابراہیم بولا ''گوٹھ کے لوگ کہتے ہیں میں اَسّی سے اوپر ہوں۔ سب کچھ دیکھا بھالا۔ بھوگا، بھگتا۔ بس ایک ہی فکر ستاتی ہے۔ اگر آپ کی کسی وزیر یا ممبر اسمبلی تک پہنچ ہو تو ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کے اُس سے عرض کریں کہ ہمارے گوٹھ کے لیے قبرستان کا بندوبست کریں۔ شہر والوں کے قبرستانوں میں ہمارے جنازے کو گھسنے نہیں دیتے۔ ہم اپنی میت کو ایک قبرستان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے، چوتھے کاندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے بے عزتی کراتے پھرتے ہیں۔ دن بھر سخت دھوپ میں پڑے رہنے کے بعد ہماری میت سے خوشبو تو آنے سے رہی۔ مردے کی مٹی خراب ہوتی ہے۔ محول الگ خراب ہوتا ہے۔ سائیں، کچھ کرو۔ رات کو فکر سے نیند نہیں آتی۔ اَسّی سے اوپر ہوں۔''

دیکھیے، خامۂ سُبک سیر چُہل قلمی کرتا کہاں سے کہاں جا نکلا۔ صبح دم واپس ساحل پر چلتے ہیں۔ طلوعِ آفتاب سے کوئی آدھ گھنٹے قبل تیس چالیس خاکروبوں کا، سائیکلوں پر سوار، ایک قافلۂ غُل مچاتا نمودار ہوتا ہے۔ اور ساحل کے کوڑے کچرے، کوّوں، کتوں اور ٹھیلے والوں پر جھاڑوؤں سے بلّا بول دیتا ہے:

ان میں لاغر بھی ہیں، بیمار بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
اور کچھ ہیں کہ ہر اک کام سے بیزار بھی ہیں

کچھ خاکروب ساری عمر اسی ساحل پر جھاڑو دیتے دیتے اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں کہ اب جھاڑو دیتے وقت جھکنا نہیں پڑتا۔ یہ سب سینک کی لمبی لمبی جھاڑوؤں سے ایک میل لمبے promenade کی

صفائی میں جُت جاتے ہیں۔ اس پر ادھ کھائے بھٹوں، گنڈیریوں، کیلے، کینو اور مونگ پھلی کے چھلکوں، سگرٹ کی ڈبیوں، پلاسٹک کے تھیلوں، آم کی گٹھلیوں اور دوسری فصلی کثافتوں اور شبینہ غلاظتوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ ٹہلنے والے کا پیر ہفتے میں ایک دوبار اُس شے پر بھی پڑ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب لوگ فیملی پلاننگ کے مشوروں پر گھر اور ازدواجی حدود کے باہر بھی عمل و حمل پیرا ہیں۔ ہر گینگ کچرے کو سمیٹ سمات کے دس دس قدم کے فاصلے پر ڈھیریاں بناتا جاتا ہے۔ پھر ان ڈھیریوں کو ڈیڑھ فٹ چوڑی دیوار کے اُس طرف پھینک دیتا ہے جدھر سمندر کی لہریں جوار بھاٹے کے دوران دیوار سے ٹکراتی ہیں۔ یہ دیوار بحیرۂ عرب اور کراچی کے درمیان حدِ وسدِ فاصل کا کام کرتی ہے۔ صفائی کے عملے کا کام بس اتنا ہے کہ ڈیڑھ فٹ چوڑی دیوار کے اِس طرف پڑی ہوئی غلاظت کو اُس طرف پھینک دے۔ باقی کام، یعنی سارا کام، سمندر کی آتی جاتی لہریں انجام دیتی ہیں۔ سوچتا ہوں اگر یہ دیوار نہ ہوتی تو سارا عملہ، مع اپنے افسران، بیکار و بے روزگار ہو جاتا۔

دیوار کے اُس طرف ٹھاٹھیں مارتا جھاگ بھرا سمندر ہے، جو اس غلاظت کو برسا برس سے انگیز کر رہا ہے۔ سمندر میں گرتے نابدانوں اور نالیوں کے علاوہ دن میں کئی بار سیورج کی غلاظت سے بھرے ٹینکر یہاں آتے ہیں اور فضلہ سمندر میں پھینک پھانک کر پریشر ہارن بجاتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا وہ تیز نمک جو لکڑی اور لوہے تک کو گلا کر بُرادے اور زنگار میں تبدیل کر دیتا ہے، غلاظتوں کے اس ڈھیر سے ہار مان جائے۔ میلوں تک کوئی بگلا نظر نہیں آتا، اس لیے کہ اُس کے کھانے کے لیے کوئی مچھلی زندہ نہیں رہی۔ سمندر کو اب سانس لینا دشوار ہو گیا ہے۔ پھر بھی اس کے اتھاہ سینے میں بڑی سمائی ہے۔ آج بھی چاندنی راتوں میں اُس کی لہریں اسی طرح اشرفیاں لُٹاتی ہیں۔

یہ لوک ساگر ہے، جو سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ سب کچھ سہج سہج سہتا اور سہارتا ہے کہ شیتل شانت رہنا اس کی سرشت میں ہے۔ پر جب اس لوک ساگر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو اپنے اندر پھینکی ہوئی غلاظت کا تھوڑا سا حصّہ، بطور نمونہ، اپنے کنارے پر دیوار تلے واپس پھینک دیتا ہے کہ اگر تمہاری آنکھیں ہیں اور آنکھوں میں ہنوز بینائی باقی ہے تو دیکھو تم مجھے کیا دیتے رہے ہو۔

یہ ڈیڑھ فٹ چوڑی دیوار وہ نوشتۂ دیوار والی لوحِ غیر محفوظ ہے جس پر لکھنے والی انگلی لکھتی چلی جاتی ہے۔ اس دیوار نے بھی کیسے کیسے سفینے غرقاب ہوتے دیکھے ہیں۔ اس دیوار پہ چڑھتے ہی فیلڈ مارشل ایوب خان کو خیال آیا کہ یہ نادان جس کو بے کنار اور اتھاہ لوک ساگر سمجھ بیٹھے ہیں، وہ تو گدلا اُتھلا جوہڑ ہے جس کا پانی بس میرے بُوٹ تک آتا ہے۔ دس سال بعد ایک کڑک اور کڑا کے ساتھ دیوار میں آمر بھر شگاف پڑا اور لوک ساگر اُسے بُوٹ سمیت نگل گیا۔ اُس کے بعد ایک غرقِ مئے ناب اولیٰ یعنی یحییٰ خان

اس دیوارِ عبرت نشان پہ مع لوٹ اور بوتل کے چڑھ گیا۔ اور نیرو والی بانسری پر سمپورن ٹھاٹھ کا راگ دُلاری بلہاری بجانے لگا۔ حُکم رانی کا شوقین تو تھا ہی، مگر اس لفظ کے دوسرے حصّے یعنی رانی کا والہ وشیدا نکلا۔ چناں چہ اب حکم، رانی ہی کا چلنے لگا! اُس نے دیکھتے دیکھتے اولوالامر ★[1] کو الوالخمر بنا دیا۔ ★[2] لیکن دورِ جام بہت مختصر نکلا۔ یکا یک

ع چلی سمتِ شرق سے اک ہوا کہ چمن سرور کا مِٹ گیا

ایسا طوفان اٹھا کہ دیوار دولخت ہوگئی اور لوک ساگر کی میلی مَیالی چادر نے آمر جابر کو ڈھانک لیا۔

چھ سال نہیں گزرے تھے کہ ایک تقدیر اور تقریر کا سکندر ردینِ مُلّا کی سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اُس کی دھاک اور دہشت دلوں میں ایسی بیٹھی کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنا سیاسی قبلہ بدلا سو بدلا، اپنا املا بھی بدل دیا۔ اور ذیابطیس کو، ذ کی بجائے ض سے لکھنے لگے یعنی ضیابطیس جو ملک میں تیزی سے پھیل رہی تھی! ضیاء الحق نے اسلام آباد میں ادیبوں اور شاعروں کے ایک کنونشن میں پیغمبروں کی زبان اور فرعون کے لہجے میں دھمکی دی جس کا مطلب مندوبین یہی سمجھے کہ جس نے دستِ آہن پوش پر بیعت نہ کی اُس پر اس زمین کا رزق، چاندنی اور چھاؤں حرام ہے۔

ع اک انساں تھا کہ اوڑھے تھا خدائی ساری
اک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا

یہ دیوار چپکی کھڑی سنتی رہی۔ اچانک کسی اَن دیکھے ہاتھ نے سیڑھی کھینچ لی اور اُس کا بھی وہی حشر ہوا جو Humpty Dumpty کا دیوار سے گرنے کے بعد ہوا تھا:

And all the king's men and all the king's horses could not
put Humpty Dumpty together again

جب کوئی موسیٰ طلسمِ سامری توڑتا ہے اور کسی فرعونِ وقت کی لاش بحرِ جمہور میں غرق ہوتی ہے تو سمندر کی تہ میں سیدھی اس کوڑے اور غلاظت پہ جا کے ٹکتی ہے جو اس نے پھینکا یا پھینکنے دیا تھا۔ پھر جب چودھویں کا چاند کھیت کرتا ہے تو بپھرا ہوا سمندر اُس لاش کو اُچھالا دے کر ساحلِ عبرت پر پھینک دیتا ہے اور ڈیڑھ فٹ چوڑی دیوار پوچھتی ہے:

★[1] اولوالامر: صاحبانِ حکم۔ حاکم

★[2] اولوالخمر: شرابی۔ متوالے۔ ممکن ہے میری وضع کردہ یہ اصطلاح قواعد کی رُو سے غلط ہو۔ لیکن اس سے مطلب، مزے اور مذمت میں فرق نہیں پڑتا۔

ہرا سمندر، میرے اندر
بول میری مچھلی کتنا پانی
اتنا پانی
ہرا سمندر، میرے اندر
بول میری مچھلی کتنا پانی
(ڈوبتے ہوئے) ...... پانی ہی پانی!

پروفیسر ہارون رشید نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کے لیے دو صفحوں کی فرمایش کی تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ روا روی میں دس صفحے سیاہ کر ڈالے۔ دو صفحوں میں بات کہنے کے لیے بہت وقت اور سلیقہ درکار ہے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی ہے حُکم رانی تک★[1]

میں نہیں کہہ سکتا کہ جن واقعات و کوائف پر میں نے گفتگو کی ہے انہیں آپ حالاتِ حاضرہ کے زُمرے میں شمار کریں گے یا نہیں۔ بہرکیف

یہی کچھ ہے قاری متاعِ فقیر
اب کچھ اور باتیں ہو جائیں۔

★[1] ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک
غالبؔ

حکم میں ک ساکن ہے۔ بعض لوگ شاید کچھ زیادہ ہی تابعداری دکھانے کی غرض سے ک پر ضمہ (پیش) لگا دیتے ہیں۔ مثلاً کیا حکم ہے؟ حکم کرو۔ حکم کا غلام۔

ضمیرِ واحد مُتکلّم

غالب کا ایک بہت مشہور مصرع ہے جو پورے شعر پر بھاری ہے:

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

گزشتہ پچاس برسوں سے اس مصرع کو ہر اچھا آدمی اور بُری حکومت اپنی مدح ملیح اور دفاع کی دلیل وصفائی کے طور پر استعمال کر کے غالب کی دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرتے رہے ہیں۔

شعر کا اگر پہلا مصرع نہ پڑھا جائے تو پہلی نظر میں یہ مصرع سوالیہ معلوم ہو گا۔ مگر درحقیقت ہے استفہامِ انکاری۔ اس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ نے کوئی ایسا بھلا مانس دیکھا ہے جسے سبھی اچھا کہیں تو آپ کے ذہن میں کوئی نام نہ آئے۔ اب ذرا دیر کو اس کے نقیض یعنی اُلٹ پر بھی غور فرمایئے۔ فرض کیجئے کہ میں وَرڈلی وِزڈم (فراستِ دُنیوی) سے لبریز اور بحر سے خارج مصرع اس طرح کہتا:

ایسا بھی کوئی ہے کہ بُرا جس کو سب کہیں

تو ذہن میں ایسے ایسے اور اتنے سارے نام آئیں گے کہ انہیں لب پر لانے سے پہلے اپنے معصوم بال بچوں کا خیال کرنا پڑے گا۔ مطلب یہ کہ دوسروں کے بارے میں پبلک کی اچھی بُری رائے کا سروے کرنے کے شوق اور ہَو کے میں ساری دُنیا سے ''پنگا'' لینا اور ہر مرکھنے بیل کو ادبدا کے سینگ مارنے کی دعوت دینا، موجودہ حالات اور اِس عمر میں کہاں کی دانائی ہے۔ روایت ہے کہ شہرہ آفاق عقلیت پسند فرنچ فلسفی اور ادیب والٹیئر پر نزع کا عالم طاری ہوا تو پادری نے کہا کہ شیطان پر لعنت اور تبرّا بھیجو۔

والٹیئر نے جواب دیا ''یہ وقت نئے دشمن بنانے کا نہیں ہے۔''

یہ تو ہوا غالب کے مصرعے کا الٹا سیدھا۔ لیکن مجھے تو اس مصرعے میں استفہامِ اقراری واستثنائی بھی نظر آتا ہے۔ میں اپنے دل اور اپنی چاروں غیر الہامی کتابوں پہ ہاتھ رکھ کے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں، جسے کسی اعتبار سے مختصر نہیں کہا جا سکتا، ایک ایسا بھی خدا کا بندہ دیکھا جسے اُس کی زندگی میں اور اس کے رخصت ہونے کے بعد بھی، کبھی کسی نے بُرا نہیں کہا۔ یہ فوزِ عظیم اور

رُتبۂ بلند جسے ملا، اُسے سب کچھ مل گیا۔ سیّد ضمیر جعفری مرحوم و مغفور کو سب نے اچھا اس لیے کہا کہ وہ واقعی اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ کسی کو برا نہیں کہا۔ بُرے کی بُرائی میں نہ تھے اور ایسا کسی مصلحت اندیشی، عافیت بینی اور صُلح جوئی کی پالیسی کے تحت نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے واقعی سب سے محبت کی، جو بے لاگ، بے غرض، غیر مشروط اور غیر منقطع تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ ڈنر یا محفل ختم ہونے کے بعد بھی اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اُنہیں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر ہم اپنے حصّے کی قرار واقعی غیبت کر کے چلے گئے تو عزیز ترین دوست ہماری بھی قرار واقعی غیبت شروع کر دیں گے۔ مگر اللہ کے ایسے بھی منتخب بندے ہیں جن کے نام اور کام کا غُلغلہ اُن کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اور زیادہ بلند ہوتا ہے۔ ضمیر جعفری اُنہیں نیک نام و نایاب و مُنتخبِ روزگار بندوں میں سے تھے۔

مجھے ان سے قربت، گاڑھی دوستی یا گستاخانہ بے تکلفی کا دعویٰ نہیں۔ میری نیاز مندی کی مدّت کم و بیش وہی ہے جس کا چرچا ہم حفیظ جالندھری کے زباں زد عام مصرع میں نصف صدی سے سُنتے آئے ہیں۔ یعنی پچاس برس۔ میں نے یہ وضاحت آغازِ گفتگو میں کرنا اس لیے بھی مناسب جانا کہ میری ارادت اور تعلقِ خاطر کی مدّت کے تعیّن کے ساتھ ساتھ معزز سامعین کو دونوں کے درجات کا اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ ہماری عمروں میں اتنا زیادہ تفاوت نہیں تھا کہ وہ مجھے ''جیتے رہو۔ لکھتے رہو'' کہہ کر بالوں سے بے نیاز میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیریں اور نہ یہ فرق اتنا کم تھا کہ میں اُن کے ہاتھ یا زانو پر ہاتھ مار کے ہر تین منٹ بعد اُن کے چٹخارے دار فقرے کی داد دوں۔ تین منٹ کی وقفہ بندی اس لیے کہ پیر و مرشد کے ملفوظات، گُل افشانیٔ گفتار اور تازہ کاری کی رفتار کا یہی عالم تھا!

حفظِ مراتبِ عُمر کے باب میں مرزا کا قول تعویذ کر کے گلے میں ڈالنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ مِدحت، مذمّت، مذاق، مسابقت اور معاشقے میں جو بے ادب بدتہذیب عُمر کا لحاظ نہ رکھے، اُس کو فرشتے لنگوٹ بندھوا کر خوردوں سے کوڑے لگوائیں گے!

''یہ تو خوردوں کو سزا دینے کے مترادف ہوگا!'' میں نے ٹوکا۔

بولے ''نہیں تو۔ وہ بھی برابر انجوائے کریں گی! جہاں تک سزا و تعزیر میں بھی پاسِ مراتب اور نزاکتِ احساسات کا تعلق ہے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ بعض مدرسوں کے دہشت پسند مولویوں کو کوڑے غِلمان لگائیں گے۔ لیکن کوڑے مارنے سے پہلے عام مجرموں کی طرح اُن کے کپڑے نہیں اُتروائیں گے۔ بلکہ احتراماً اپنے ہی کپڑے اُتار کے کوڑے لگانا شروع کریں گے!''

نصف صدی کی طویل مدت بالعموم ایک دوسرے سے بیزار ہونے کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اتنے عرصے میں گلاب کی خوشبو مانوسیت کے باعث باسی باسی سی لگتی ہے مگر وہی بے ضرر سے کانٹے اب بہت چُبھنے لگتے ہیں۔ امریکہ میں ایک حالیہ سروے سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا ہے کہ پچاس فی صد جوڑوں کی طلاق شادی کے تین سال کے اندر ہو جاتی ہے، اس لیے وہ ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں تھے! بقیہ پچاس فی صد جوڑوں کی طلاق چالیس سال بعد ہوتی ہے، اس لیے کہ اس اثنا میں وہ ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں! پچاس سال میں دوستانہ تعلق کا وہی حال ہو جاتا ہے جس کی تصویر غالب نے مرزا تفتہ کے نام اپنے خط میں کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں ''جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔'' یوں تو غالب کا ہر قول حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے، تاہم مجھے اس میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی اجازت ہو تو عرض کروں گا کہ تعلقات میں مزید پیچیدگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دونوں فریق خود کو مظلوم زوجہ سمجھ کر اپنا سُہاگ اُجڑنے کی دعا کرنے لگیں! مگر ضمیر جعفری کے کیس میں ایسا بجوگ نہیں پڑتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ان کے خلوص کی گہرائی اور شفافیت زیادہ واضح اور آشکارا ہوتی جاتی۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا، میں نے انہیں کبھی کسی کی برائی، غیبت یا مذمت کرتے نہیں دیکھا۔ دوستانہ ملاقاتوں میں کبھی اپنے اشعار سناتے نہیں دیکھا۔ اپنے کسی دُکھ، تکلیف، پریشانی یا اُلجھن کا ذکر کر کے دوسروں کو مغموم کرنا ان کے مسلک میں روا نہ تھا۔ ہمیشہ مسکراہٹیں اور خوشیاں بانٹتے رہے۔ اپنے دُکھ درد میں کسی کو شریک نہیں کیا۔

جیسے ہی میں اسلام آباد میں اپنی اچانک آمد و فراغت کی اطلاع دیتا، وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کے ہوٹل آ جاتے۔ دیرینہ تعلقِ خاطر کے پیشِ نظر وہ کرنل محمد خاں کو (متروک روزمرہ کے مطابق) ساتھ لوا لاتے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے چقماق کا درجہ رکھتے تھے۔ نئی نسل کے جن پڑھنے اور سننے والوں نے چقماق نہیں دیکھی، ان کی آسانی کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی ماچس رگڑ کر پُھلجھڑیاں چھوڑتے تھے۔

شروعات ضمیر جعفری کرتے۔ وہ شوشہ چھوڑنا جانتے تھے اور کرنل محمد خاں کو اس پر شگوفہ کھلانا آتا تھا۔ ضمیر جعفری کی چٹکی سے چُبھن کی بجائے گُدگدی ہوتی تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھے بُشکارا کہ آج کل کرنل صاحب اپنی کتاب ''بجنگ آمد'' میں سے اپنے فیورٹ الفاظ چُن چُن کر نکال رہے ہیں۔ آج صبح سویرے سے اسی عملِ جراحی میں جُتے ہیں۔ آپ ذرا گھما پھرا کر چھیڑیے گا۔

میں نے کرنل صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ایک کرم فرما نے مجھے مطلع کیا ہے کہ میں نے ''بجنگ آمد'' میں لفظ دھڑتے ۳۷ مرتبہ استعمال کیا ہے! صبح سے ۲۵ دھڑتے نکال چکا ہوں۔

اسی طرح جب کرنل صاحب کا سفرنامہ ''بسلامت روی'' شائع ہوا تو ضمیر بھائی نے مجھ سے کہا کہ ''اس کے ہر تیسرے صفحے پر ایک نئی حسینہ ایمان، فارن ایکسچینج اور بڑھاپے کی آزمائش کے لیے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ ان حسیناؤں کی مجموعی تعداد ''دھڑلوں'' سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ برطانیہ کا نام آتے ہی اُن کا وہی حال ہوتا ہے جو غالبؔ کا کلکتے کے ذکر سے ہوتا تھا: اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے! لندن تو ایک طرف رہا، اگر میں کوہاٹ یا ڈیرہ غازی خاں کے سفر کا بھی ذکر کر دوں تو سارا پری خانہ مجھ پر چھوڑ دیتے ہیں! وہ نازنیں بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے! خیر گزری، برطانیہ میں کُل تین مہینے قیام کیا ورنہ غضب ہو جاتا۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!''

''اگر زیادہ قیام فرماتے اور اسی رفتار سے تیر اندازی جاری رہتی تو محرومانہ حسد کے مارے اپنا تو بُرا حال ہو جاتا۔ بقول شاعر 'چوٹ کھائے اژدہے کی طرح بل کھاتا ہوں میں' '' میں نے بھی درز میں پچّر ٹھونکی۔

انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''کرنل صاحب آج کل دوسرے ایڈیشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ کی بات مان جائیں گے۔ ان سے کہیئے کہ آپ نے سفرنامے میں بہت زیادہ میمیں ڈال دی ہیں۔ خدارا، دل پہ پتھر رکھ کے نفری چار سے نہ بڑھنے دیں۔''

میں سوچنے لگا کہ مرزا غالبؔ تو ڈھلتی جوانی میں کلکتے گئے اور ہائے ہائے کرتے لوٹے۔ کرنل محمد خاں کو آفریں صد آفریں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد، جب ان کا بڑھاپا شباب پر تھا، طوافِ کوئے سیاحت و ملامت اور میموں کی زیارت کو نکلے۔ بڑی ہمت اور حوصلے والے ہیں۔ ورنہ، بقول مرزا، ''اِس مرحلۂ عُمر میں بعضا بعضا تو ڈھنگ سے ہائے ہائے کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا! حسینوں کے حضور حیرت سے منہ کھولے، دُھکڑ پکڑ کرتے دل اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹکر ٹکر دیکھتا رہ جاتا ہے!''

سہ پہر کو کرنل صاحب سے ضمیر بھائی اور بریگیڈیئر صدیق سالک کی موجودگی میں ملاقات ہوئی تو میں نے جی کڑا کر کے گزارش کی ''کرنل صاحب، سفرنامے میں نازنینوں کی تعداد آپ کی ذاتی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ آخر بچارے natives یعنی مقامی گوروں کا بھی تو حق بدچلنی بنتا ہے۔ نئے ایڈیشن میں میموں کی تعداد کم از کم نصف کر دیجئے۔''

بولے ''مجھے خود بھی احساس ہے۔ مگر کیا کروں، جس کو بھی نکالتا ہوں وہ روتی بہت ہے!''

پنڈی اور اسلام آباد کی صحبتوں کو بریگیڈیر صدیق سالک بھی ایک زمانے میں باقاعدہ بے قاعدگی سے رونق بخشتے تھے۔ بعدازاں وہ جنرل ضیاء الحق کی تقریریں لکھنے پر مامور ہو گئے اور ہمیں صبر آ گیا۔ ایک نشست میں ضمیر جعفری نے وضاحت کی کہ صدیق سالک جنرل صاحب کی

تقریروں میں مزاح اس طرح ڈالتا ہے جیسے کرنل محمد خاں نے اپنے سفرنامے میں میمیں ڈالی تھیں۔
ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جنرل صاحب بھی مزاح کے اثر اور کاٹ کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔

؎ مزاجِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقریریں!

ایک دفعہ میرے پُراشتیاق بُلاوے پر ضمیر جعفری کو آنے میں دیر ہوگئی۔ میں نے دبے الفاظ میں کربِ انتظار کی شکایت کی تو کہنے لگے، ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔

باعثِ تاخیر وہ اپنے سنِ پیدائش کو گردانتے تھے۔ یہ تو نہیں کہا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ بس اتنی آگاہی بخشی کہ اب میں جوان نہیں رہا۔ میں نے کہا آپ understatement (کسر بیانی) سے کام لے رہے ہیں۔ بولے، اس سے ضعفِ پیری اور نقاہت میں افاقہ محسوس ہوتا ہے! میں نے پوچھا، ضمیر بھائی، کبھی ڈاڑھی رکھنے کا خیال آتا ہے؟ بولے، کیوں نہیں۔ دشمنوں نے بارہا suggest کیا۔ مگر میں پہلے ہی overweight ہوں۔ میرے گھٹنے مزید بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

اس پر میں نے انہیں تازہ ترین لطیفہ سنایا جو انگریزی محاورے کے مصداق مجھ تک from the horse's mouth، مطلب یہ کہ براہ راست پہنچا تھا۔ ہوا یہ کہ میرے کرم فرما میجر ابن الحسن نے جو بہت اچھے ادیب، شگفتہ کالم نگار اور بے بدل بذلہ سنج تھے دفعتہً ڈاڑھی رکھ لی۔ ان کی ملاقات مولانا شاہ احمد نورانی سے ہوئی تو انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا، ڈاڑھی رکھنے کے بعد آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

میجر ابن الحسن نے جواب دیا ''بھوک بوہت لگنے لگی ہے!''

اس مضمون کے سلسلے میں ضمیر جعفری سے نصف صدی قبل انتہائے شوق کی لمبی ملاقاتوں اور صحبتوں کی یادوں اور باتوں کو ذہن میں تازہ کرنے بیٹھا تو عجیب کیفیت سے دوچار ہوا، جس کا قطعاً اندازہ یا اندیشہ نہ تھا:

؎ ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اُڑا لے گئی ہوا اک ایک

پھر خیال آیا کہ پورٹریٹ نہ سہی، عکسِ رخِ یار سے سارا پسِ منظر بھی تو جگمگا اُٹھتا ہے تو پھر ایامِ رفتہ اور ان بزم آرائیوں کی ایک جھلک دکھانے کی سعی کیوں نہ کروں جب پہلے پہل ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔

؎ میں بعدِ مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر مری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ___ اور میرا حافظہ بہت دور تک کام کرتا ہے۔ صرف قریب کے واقعات اور باتوں کو یاد رکھنے سے انکاری ہے۔

؎ کچھ اس کا سبب ''سِن'' ہے، کچھ اس کا سبب باتیں!

تو جہاں تک یاد پڑتا ہے ضمیر جعفری سے میرا تعارف ۱۹۵۱ء کے اواخر میں میرے نہایت عزیز دوست میاں فضل حسن کے توسّل سے ہوا۔ وہ ان دنوں ایک غیر فعّال اور مجہول سے پبلسٹی ادارے میں تعینات تھے جس کے سربراہ حفیظ جالندھری تھے۔ فضل صاحب شعر و ادب، شکار، ورزش اور کلاسیکی موسیقی کے رسیا تھے۔ جامع الحیثیات شخصیت، کئی ہزار کتابوں اور ایک ٹیکسٹائل مِل کے مالک تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کو اس طرح جمع کرتے تھے جیسے بچّے ڈاک کے استعمال شدہ ٹکٹ اور بڑے خارج المیعاد یعنی پرانے سکّے جمع کرتے ہیں۔ وہ ہر اتوار کو سات آٹھ شاعروں کو گھیر گھار کر گارڈن ایسٹ میں اپنے دولت کدے پر لاتے، جہاں ایک بجے تک ان ماخوذین کے ساتھ گپ شپ اور لنچ کے بعد مشاعرے کا رنگ جمتا۔ لنچ کا ذکر اس لیے بھی کرنا پڑا کہ پُلاؤ کے علاوہ دسترخوان پر چنیوٹ کا اچار بھی ہوتا تھا، جس میں مجھ جیسے فرق ناشناس کو بس اتنا ہی فرق محسوس ہوتا کہ زیادہ کھٹا ہوتا ہے اور سرسوں کے تیل میں اٹھایا جاتا ہے جس کی بُو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ فضل صاحب کہتے تھے کہ صاحب، جس کیری پر چنیوٹ کا طوطا بیٹھ جائے وہ بڑی جلدی پکتی اور گدر ہوتی ہے! اس پر مرزا یہ اضافہ کرتے تھے کہ اگر وہ طوطا انڈسٹری پر بیٹھ جائے تو وہ بھی خوب پھل پھول دیتی ہے! ہمارے ناپسندیدہ تیل کے بارے میں فضل صاحب کا خیال تھا کہ اس میں اُن الھڑ مٹیاروں کے ہاتھوں کی مست مہک آتی ہے جو سنہرے کھلکھلاتے کھیتوں میں سرسوں چنتی اور کاٹتی ہیں! ہمیں آج بھی اس تیل کا اچار یا اس تیل میں پکی ہوئی کوئی چیز کھانا پڑے تو یہ سمجھ کر نوش جان کرتے ہیں گویا سنہرے کھیتوں میں مذکورہ بالا مٹیاروں سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ اُن کے ہاں بھینس کا گھی بھی چنیوٹ سے آتا تھا، جس کے خواص شاہی حکیموں کے نُسخوں سے کشید کیے گئے تھے۔ ہمیں تو اس کی بُو اچھی نہیں لگتی تھی، اس لیے کہ ہم سستے بناسپتی گھی کے عادی ہو چکے تھے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو تو پیاز کی بُو بھی نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ اسے یاقوتی اور کُشتہ سمجھ کر کھاتے ہیں۔ چنیوٹ کی جس بھینس کے گھی میں پُلاؤ بنتا تھا وہ ''پہلن'' بتائی جاتی تھی۔ یعنی پہلی بار بیائی ہوئی۔ اس نہلے پر ایک دفعہ ضمیر جعفری نے یہ دہلا لگایا کہ میں تو ناکتخدا یعنی کنواری بھینس کا مکھن توس پر لگا کر کھاتا ہوں۔ اس دعوے کے ثبوت میں اپنا تن و توش پیش کرتے جو ہم جیسے تین بناسپتی خوروں کے برابر تھا! مولانا ماہر القادری جو ہر ہفتے تشریف لاتے تھے، کسی ایسے میزبان کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے جس کے گھر میں کھانا بناسپتی گھی میں پکتا ہو۔ یا جہاں فرش پر بیٹھ کر کھانا پڑے۔ میرے

غریب خانے واقع پیر الٰہی بخش کالونی میں یہ دونوں فقیرانہ قباحتیں تھیں۔ لہٰذا کبھی اُن کو مدعو کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ فرماتے تھے، کبھی کوئی دھوکے سے بناسپتی گھی میں بنے سالن کا ایک لقمہ بھی کھلا دے تو دوسرے دن پتہ چل جاتا ہے۔ لاکھ سر ماروں مصرع موزوں نہیں ہوتا۔ شعر میں کبھی سکتہ پڑتا ہے اور کبھی شُتر گربہ ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں انشراح کے بجائے قبض محسوس ہوتا ہے۔ شعر رُک رُک کر آتا ہے۔ فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانے اور کھلانے کے بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ اس سے دائرۂ شکم پچک کر قعر و جوف (گڑھے) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اشتہا کند اور معدے کی مکعب انچ گنجائش آدھی رہ جاتی ہے۔ اس نامناسب آسن میں آپ صرف اُچک اُچک کے خراب شعر کی داد دے سکتے ہیں! ضمیر جعفری خوش خوراک ضرور تھے مگر رئیسانہ نفاستوں اور نخروں سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ فرشی نشست انہیں بھی ناپسند تھی، مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

جو ادیب، دانشور اور شاعر، ان ہفتہ وار محفلوں میں شریک ہوتے یا کھینچ بلائے جاتے اُن میں سیّد ضمیر جعفری سیّد محمد جعفری، ظریف جبلپوری، ادیب سہارنپوری، ماہرالقادری، اقبال صفی پوری، بہزاد لکھنوی، نیاز فتح پوری، محمد حسن عسکری، سلیم احمد اور مجتبیٰ حسین نمایاں تھے۔ عندلیب شادانی، مجنوں گورکھپوری اور نشور واحدی بھی دو تین بار ان محفلوں کو رونق بخش چکے تھے۔ بس ایک قباحت تھی۔ جو صحبت یا ملاقات آٹھ نو گھنٹے سے کم دورانیہ کی ہو، فضل صاحب اُس کا شمار حادثاتی مڈبھیڑ میں کرتے تھے! کچھ شاعر اسی لیے کتراتے تھے۔ ضمیر جعفری انہیں میں سے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ لذیذ کھانے کے بعد ہزار بار سنی ہوئی غزلوں کو پھر سننے سے ہاضمے پر بہت برا اثر پڑتا ہے، مگر نیند اچھی آتی ہے۔ دوسری وجہ جو انہوں نے ہمیں بتائی وہ یہ تھی کہ اُن کے پاس حفیظ جالندھری اپنی بیوی کے ساتھ یکجائی اور اُن (ضمیر) سے ایک گھنٹے کی بھی جدائی برداشت نہیں کر سکتے۔ متروک سے محاورے کے مصداق فضل صاحب لنچ پر جو سونے کا نوالہ ہمیں کھلاتے، اُسے وہیں اپنی کڑی نگرانی میں ہضم کرواتے تھے!

طول طویل نشست کی وجہ صرف یہ تھی کہ میاں فضل حسن خوش باش اور محفل باز تھے۔ تنہائی یعنی اپنی صحبت زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ دفتر سے تو پانچ بجے ہی اُٹھ جاتے، مگر گھر آٹھ نو بجے سے پہلے نہیں پہنچتے تھے۔ یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ صدر کی دکانوں میں 'وِنڈو شاپِنگ' کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ ہر دکان میں صدر دروازے سے داخل ہوتے۔ ہر روز ایک مختلف چیز کی قیمت دریافت کرتے پھر haggling (بھاؤ تاؤ) کرنے اور قیمت کو نصف یا ایک تہائی کم کرانے کے بعد اس میں کوئی نقص نکال کر خالی ہاتھ اور بھری جیب دوسری دکان میں داخل ہو جاتے۔

ایک دن میں نے پوچھا، آپ روزانہ دو تین گھنٹے ان دکانوں میں گزارتے ہیں۔ گھر کیوں

نہیں جاتے۔

بولے وہاں تو گھر کا سا ماحول ہوتا ہے۔

اتوار کو مسرت علی صدیقی اور میں ٹھیک نو بجے ان کے ہاں ہفتہ وار ڈیوٹی پر رپورٹ کرتے۔ ہمارے ذمّے چھ سات شاعروں کو ان کی کمین گاہوں سے جبر، مکر اور ہُنر سے نکال کر میاں فضل حسن کے گھر لاد کر لانا تھا۔ ساڑھے نو بجے فضل صاحب ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر ہانکے کے لیے نکل جاتے۔ شاعر جانتے تھے کہ اگر پکڑائی دے دی تو شام چھ بجے سے پہلے رہائی کی نوبت نہیں آئے گی۔ گھر گرہستی کے سارے کام دھرے رہ جائیں گے۔ لہٰذا اکثر ہماری بُو پاتے ہی چمک کر سٹک جاتے۔ کچھ ہانکے کے گھیرے سے صاف بچ نکلتے۔ ایسوں کے لیے جنگلی ہاتھی پکڑنے والا کھیدا کرنا[1] پڑتا جس کے مسرت علی صدیقی ماہر تھے۔ ظریف جبلپوری بڑی مشکل سے ہاتھ آتے تھے۔ ایک اتوار کو ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ اندازِ کھٹکھٹاہٹ ہی سے تاڑ گئے کہ ہوں نہ ہوں وہی خُدائی خوار آدھمکے۔ اندر سے آواز آئی ''بیگم، کہہ دو، باہر گئے ہوئے ہیں۔'' ہم بھی نفسِ مضمون اور شوہرانہ لہجے سے بھانپ گئے کہ آواز ہو بہو اُسی گھر گھسنے کی ہے! چناں چہ میاں فضل حسن نے ہانک لگائی ''ظریف صاحب، آپ اپنے اندرون کو بیرون سمجھ رہے ہیں! باہر تو یہ ہے جہاں ہم دُھوپ میں کھڑے ہیں۔''

ضمیر جعفری اتنی لمبی اور ایسی محفلوں کے عادی تھے نہ متحمل۔ وہ لنچ سے پہلے اُٹھ کھڑے ہوتے یا تین چار بجے کھڑے کھڑے آتے جسے اصطلاحاً جھانکی کہا جا سکتا ہے۔ فضل صاحب کو چھ بجے بساط، بادل ناخواستہ اس لیے لپیٹنی پڑتی تھی کہ ان کے والد حاجی احمد حسین صاحب غروبِ آفتاب کے بعد شعر سننے کو مکروہ و منحوس سمجھتے تھے۔ بیٹے سے کہتے تھے کہ ایسا ہی شوق ہے تو اس روشن چوکی[2] کو مشتاق صاحب کے گھر لے جا کر باقی ماندہ خرافات سے جی خوش کر لو۔ خراب شعر اور خراب ترنم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایسی شاعری اور ایسے ترنم سے نہ تو نفس کو شہ ملتی ہے، نہ غیر شرعی جذبات بھڑکتے ہیں۔ دن میں دھوتی تہمد اور رات کو شلوار پہننے کے خلاف تھے۔ انگریزی فلم دیکھنے کو وہ نِری بدمعاشی گردانتے تھے۔ لہٰذا جب سنیچر کو بیٹا انگلش فلم کا میٹنی شو دیکھنے جاتا تو قبلہ خود ساتھ جاتے اور ذاتی نگرانی میں مخرّبِ اخلاق فلم ملاحظہ کرواتے۔ میں اور محمد جعفری باری باری باپ اور بیٹے کے درمیان حدود سدِ ادب بن کر بیٹھتے۔ ہم دونوں کا کام پدر اور پسر کے درمیان ایک

---

[1] کھیدا: ''ہاتھیوں کو پکڑنے کا گڑھا جسے پتلی پتلی لکڑیوں اور گھاس پھونس سے پاٹ کر مٹی سے چُھپا دیتے ہیں۔''

[2] روشن چوکی: (مجازاً) نوبت نوازوں کی چوکی جو شاہی جلوس یا محرّم اور شادی کے جلوس میں کہار کندھوں پر اُٹھائے چلتے ہیں۔ اردو لغت۔

پردے کا ساتھا۔ اور پردہ بھی وہ جسے اُس زمانے میں کانا پردہ کہتے تھے۔ یعنی سب کچھ چھپا کر سب کچھ دکھانے والی تکنیک! جیسے ہی اسکرین پر کوئی ایسا ویسا سین آتا تو قبلہ پہلے اپنے صاحبزادے کی طرف دیکھتے۔ پھر میری طرف دیکھتے کہ عینک تلے میری آنکھیں کھلی ہیں یا فرطِ لذت سے بند ہوا چاہتی ہیں۔ وہ بھی صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ ان کی آنکھ three-directional تھی۔ مطلب یہ کہ بیک وقت خود وہ سین دیکھتے۔ کن انکھوں سے بیٹے کو دیکھتے اور میرے شوقِ نظارگی پر بھی نظر رکھتے! بقول مرزا، حاجی صاحب شرمندہ شرمندہ نظروں سے وہ سین ملاحظہ فرماتے اور دُزدیدہ دُزدیدہ نگاہوں سے ہماری طلبیدہ طلبیدہ نظروں کو دیکھتے جاتے! جیسے ہی کسی ایکٹرس کا نیم برہنہ لباس میں کلوز اپ آتا تو وہ صاحبزادے سے کوئی اہم کاروباری سوال پوچھنے لگتے: ''مثلاً آج جو ڈیڑھ سو گانٹھیں صادق آباد روئی کی خریدی ہیں انہیں ترپال سے ڈھک دیا ہے کہ نہیں؟ اُن پر غصہ اس لیے اور زیادہ آتا تھا کہ اُس دن روئی کی ایک گانٹھ بھی نہیں خریدی گئی تھی! اور گزشتہ سو برسوں میں اس مہینے میں کراچی میں بارش بھی نہیں ہوئی تھی! اِس مداخلتِ بیجا و بزرگانہ سے طبیعت ایسی بے مزہ ہوتی کہ ہمیں تو اسکرین پر سیم تنوں اور گُلبدنوں کی گرمئی اختلاط کی بجائے دیر تلک گانٹھیں ہی گانٹھیں گڈمڈ نظر آتیں، جن پر خاک اور ترپال ڈالنے کو جی چاہتا تھا!''

حاجی صاحب کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ نظر انگریزی سے بھی زیادہ کمزور! جوں ہی اسکرین پر کوئی پری چہرہ نمودار ہوتی تو مجھ سے پوچھتے، مشتاق صاحب، اس کی کیا عمر ہوگی؟ میں عمداً دس بارہ سال کم کر کے بتاتا تو اکثر فرماتے کہ امریکن لڑکے اور لڑکیاں اُتاؤلے باؤلے ہوتے ہیں۔ روزے فرض ہونے کی عمر سے پہلے ہی بدمعاشی شروع کر دیتے ہیں! اور امریکن مستورات شوہر کے مرنے کا انتظار نہیں کرتیں! ایک دفعہ اسکرین پر ایک انتہائی جذباتی سین آیا۔ ایسا لگا کہ اب بوس و کنار ہوا، اب ہوا۔ حاجی صاحب نے میرا جلتا ہوا ہاتھ اپنے لرزتے ہاتھ میں لے کر پوچھا، اجی یہ زنانی اتنی پریشان اور بیقرار کیوں ہے؟ میں نے کہا، محبّت ہوگئی ہے۔ بولے، تو پھر نکاح کیوں نہیں کر لیتی؟

حاجی صاحب چالیس پچاس برس کانپور میں گزار آئے تھے اور زباں دانی و زباں آوری کے کڑے ٹیسٹ پر پورے اترتے تھے۔ مطلب یہ کہ بامحاورہ اردو میں مذاق اور جگت بازی کر سکتے تھے۔ اہلِ زبان سے جھگڑنے اور جُوجھنے میں برابر چُھوٹتے تھے۔ تاہم جو مقاماتِ آہ و فغاں میں انہیں اپنی ناقص اردو میں نہیں سمجھا پاتا تھا وہ محمد جعفری ٹھیٹ پنجابی میں ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ وہ پنجابی اور فارسی بہت روانی سے کھرے اور کرارے لہجے میں بولتے تھے۔

سچ پوچھیے تو فلم دیکھنے سے کس رُوسیاہ کو غرض تھی۔ اُس زمانے میں ایئر کنڈیشننگ عام نہیں ہوئی تھی۔ صرف اسپتالوں کے آپریشن تھیٹرز اور mortuary (مردہ خانہ) ایئر کنڈیشنڈ ہوتے

تھے۔ لیکن ان سے مستفید ہونے کے لیے پہلے بے ہوش ہونا یا ایکسی ڈنٹ میں وفات پانا ضروری تھا۔ البتہ سینما ہال میں یہ شرط نہیں تھی۔ لہٰذا رمضان کے مہینے میں کوئی فلم شوقضا نہیں ہوتا تھا۔ اس عمل کو روزہ بہلانا کہتے تھے۔ محمد جعفری کہتے تھے کہ ایسے ویسے یعنی پسندیدہ سین کے بعد اگر تین دفعہ، ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے، لاحول قرأت سے پڑھ لی جائے تو معافی ومغفرت کی صورت نکل سکتی ہے۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔

ضمیر جعفری کہتے تھے کہ جتنی دیر آپ حضرات فلم دیکھ کر اس کے بنانے والے پر لعنت بھیجتے ہیں، اُتنے وقت میں تو آدمی پنڈی سے مری اور مری سے نتھیا گلی جا سکتا ہے۔ مغز ملے سری پائے کھانے اور لسی پینے کے بعد تین گھنٹے خرانٹے لے کر سو سکتا ہے۔ کسی عزیز دوست کا سچا خاکہ لکھ کر اُسے ہمیشہ کے لیے گنوا سکتا ہے۔ غرضیکہ اسی قسم کے بہت سے مفید کام کر سکتا ہے۔

حاجی صاحب سرد وگرم چشیدہ اور جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ اپنے بیٹے کے دوستوں پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ عاجز کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے۔ دراصل وہ میری قلیل تنخواہ، پیر الٰہی بخش کالونی میں غریبانہ رہائش، خراب صحت، جُوتوں اور کپڑوں سمیت ۱۲۰ پونڈ وزن کو بدچلنی کے لیے نااہلی کا سرٹیفکیٹ تصور کرتے تھے۔ بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ جو شخص بہت اچھا اور قیمتی لباس پہن کر، یا دھوپ کی عینک لگا کر آئے یا بزنس ڈیل کے دوران شعر پڑھ دے، اُسے اُدھار پر مال ہرگز نہ بیچو۔ سودا فائنل کرنے سے پہلے اس کی عینک اتروا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ اسی طرح تم سے جو شخص بے وجہ بہت اخلاق وانکسار سے پیش آئے، اُس سے ہوشیار رہو۔ وہ ایک نہ ایک دن تم سے قرض مانگے گا۔ ضمیر جعفری سے اُن کی خوب چھنتی تھی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ ضمیر زیادہ دیر نہیں بیٹھتے تھے۔ سگرٹ نہیں پیتے تھے۔ جہلم کے تھے۔ وہی جہلم جہاں کے لوگ، اُنھی کے بقول، خدا کے تصور کے لیے تھانیدار کو دیکھتے ہیں! ضمیر جعفری حاجی صاحب کو اپنے بزرگ حضرت میاں محمد بخش کا صوفیانہ کلام ترنم سے سناتے۔ حاجی صاحب ضمیر جعفری کی ''لکڑی کی ہٹ'' اور محمد جعفری کی ''بھنگیوں کی ہڑتال'' بڑے شوق اور اصرار سے سنتے۔ اکثر فرماتے کہ مزاحیہ شاعری سے چال چلن خراب نہیں ہوتا۔ اُن کے صاحبزادے میاں فضل حسن بھی ہومیو پیتھک دوائیں محض اس لیے کھاتے تھے کہ نقصان نہیں پہنچاتیں! اس کی تصدیق تو ہم بھی کریں گے کہ مریض ہی کو نہیں، مرض کے جراثیم کو بھی نقصان نہیں پہنچاتیں!

دھوپ ڈھلنے کے بعد محفل لان پر منتقل ہو جاتی جسے پروفیسر قاضی عبدالقدوس کبھی گھانس، کبھی دُوب اور چائے کے ساتھ گلاب جامن کھانے کے بعد سبزۂ نَورُستہ کہتے تھے۔ پھاٹک میں کُنڈی لگا

دی جاتی تا کہ کوئی ماخوذ دانشور آنکھ بچا کر سٹک نہ جائے۔ حاجی صاحب بھی حدِ سماعت فاصلے پر ایک آرام کُرسی پر نیم دراز، نیم غنودگی کے عالم میں آنکھیں بند اور کان کھڑے کر کے کارروائی کو مانیٹر کرتے رہتے۔ ایک اتوار کو ترقی پسند ادب پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ ایک جوان لیکن معروف اور تیکھے اسلوب والا نقاد بہت اونچی آواز سے منٹو اور عصمت پر گرج چمک کے ساتھ تقریر کر رہا تھا۔ حاجی صاحب نے مجھے اُنگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا ''یہ کون ہے؟'' میں نے کہا ''پروفیسر ہیں۔ ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتے ہیں۔''

بولے ''کیا ملتا ہے؟''

''ڈھائی تین سو روپے۔''

فرمایا ''تو پھر اتنے زور سے کیوں بول رہا ہے؟''

اس کُڈھب سوال سے میرے بھی کان ہوئے۔ اس لیے کہ اُس زمانے میں میری تنخواہ ساڑھے چار سو رُوپلی تھی۔ لہٰذا میں نے تُرنت اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ کو اپنی اوقات اور انکم بریکٹ کے مطابق کرلیا، جس سے آگے چل کر بہت فائدہ ہوا!

ضمیر جعفری ان محفلوں میں کبھی لطیفے نہیں سناتے تھے۔ انہیں بات میں بات نکالنے کا فن آتا تھا۔ ان سے مل کر آپ کو اپنی اور ان کی عمر کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک کے ہم عمر تھے۔ ہر ایک سے جُھک کر ملتے مگر بچکتے کسی سے بھی نہیں تھے۔

وہ پہلے فوجی تھے جس نے اپنی درویشی چھپانے کے لیے یونیفارم پہنی۔

جس دن ضمیر جعفری، مولانا ماہر القادری اور محمد جعفری یکجا ہوں تو کمرے کی ہر دیوار دیوارِ قہقہہ بن جاتی۔ شعر و شاعری ملتوی۔ نوک جھونک، چھیڑ چھاڑ، فقرے بازی اور قہقہوں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا۔ ''تُو را کُشتی'' تھوتھے تیروں سے نشانہ بازی اور بناوٹی مُچیٹے ہوتے رہتے۔ برابر کی ٹکر اور برابر کی چوٹ تھی۔ کوئی کسی پر حاوی یا غالب نہیں آ سکتا تھا:

ہر اک شیر افگن، ہر ایک شیر گیر
ہر اک صاحبِ نیزہ و گُرز و تیر

بعض اوقات مولانا کو اپنا مذاق اُڑوانے اور چاند ماری کا ہدف بننے میں بھی مزہ آتا تھا اور خود اس کا موقع و مواد و جواز خوشدلی سے فراہم کرتے۔ شاید یہ بھی انہوں نے اللہ کے بندوں کا دل شاد کرنے کی ایک صورت نکالی تھی۔ اتوار کے دن مولانا لباس کے باب میں خاصے لاپروا نظر آتے تھے۔ ہفتے کے بقیہ دنوں کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اُس زمانے میں اُن سے

صرف اتوار ہی کو ملاقات ہوتی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتا تا چلوں کہ وہ مجھے بھری محفل میں دو تین دفعہ ٹوک چکے تھے کہ لاپروا اور لاچاری غلط ہیں۔ صحیح بے پروا اور ناچاری ہے۔ مگر پچاس برس بعد میں آج بھی اپنی غلطی پر قائم ہوں۔ اس لیے کہ مجھے بے پروا میں وہ شانِ لاپروائی، تھوڑی سی ڈھٹائی اور مکمل بے پروائی نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ناچاری میں وہ سرتاپا بے چارگی کا عالم نظر نہیں آتا جو لاچاری سے ٹپکا پڑتا ہے۔ مجھے تو اس میں اُس بیچارے کا لُولا لنگڑا پن ہی نہیں بلکہ اُس کا توتلا پن اور لاٹھی تک نظر آتی ہے! کسی نقاد یا قواعدداں کو صحتِ ترکیب پر اتنا ہی اصرار ہے تو پھر لااُبالی پن کو بے اُبالی پن کیوں نہیں بولتے؟

مولانا اچھے اچھوں کی زبان وکلام میں غلطیاں نکالنے میں اِسم بامُسمّٰی یعنی ماہر تھے۔ اور اپنے رسالے کو اغلاط کی نشاندہی اور دشمن بنانے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ مرزا غیاب میں انہیں ماہرالقادرِ الاغلاطی کہتے تھے! یہ بھی ہوا کہ کسی نے مجھے مطّلع کیا کہ اس ماہ کے شمارے میں آپ کی کتاب (چراغ تلے) میں زبان کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن میں نے جان بُوجھ کر وہ شمارہ بازار سے نہیں خریدا، مبادا میرے احترام وتپاک میں فرق آجائے۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ پھر میں کہیں اُن جیسا ہی نہ لکھنے لگوں!

مولانا مَلمَلے کُرتے اور اُٹنگے پاجامے میں بھی بارعب نظر آتے تھے۔ ازار بند اکثر سہرے کی لڑی کی مانند لٹکا رہتا اور کُرتے کے نیچے لرزاں وجُنباں نظر آتا تھا۔ ایک دفعہ ضمیر جعفری نے ٹوکا تو فرمایا، گرہ تو مضبوط ہے۔

ضمیر بولے، آپ کے ڈِھلمِل عقیدے کی طرح!

ایک اتوار کو مولانا ذرا تاخیر سے آئے اور گھبرائے گھبرائے سیدھے باتھ روم گئے۔ وہاں سے قہقہے لگاتے لوٹے۔ کہنے لگے، بس اسٹینڈ پر بلا کی دھکم پیل تھی۔ بس میں کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ لہٰذا میں بس کے دروازے کے پاس ہی کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں ایک بڑے میاں بس میں چڑھنے لگے۔ کچھ دیر تو وہ بس کا ڈنڈا اور سہارا ڈھونڈتے ٹٹولتے رہے۔ پھر میرے ازار بند کا کِلیدی یعنی کُھل جا سم سم والا سِرا پکڑ کے پوری طاقت سے اوپر چڑھے۔ گرہ پہلے ہی جھٹکے میں کُھل گئی۔ آپ کے تو علم میں ہوگا کہ یوپی اور دکن کے شرفا میں پبلک یا بازار میں کھڑے ہو کر کھانا یا ازار بند برسرِ عام باندھنا خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا میں ازار بند کے دونوں سِروں کو دونوں ہاتھوں میں دبوچے سینے سے لگائے کھڑا رہا۔

بس اسٹینڈ سے فضل صاحب کے گھر، جو ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا، وہ اسی دبوچواں پوز میں تشریف لائے۔

ضمیر جعفری مولانا کے ازار بند کو فریادیوں کے لیے عدلِ جہانگیری والی زنجیر اور بس کے بڈھے ٹھڈّے مسافروں کے لیے عصائے پیری کہتے تھے۔

مرزا اسے رُوپ نگر کی پریوں کا جُھولا کہتے تھے۔

ضمیر جعفری جس والہانہ انداز سے اپنے چاہنے والوں سے ملتے تھے، اسے محض خلوص یا تپاک سے تعبیر کرنا کافی نہ ہوگا۔ اُن کی چھلکتی ہمکتی گرمجوشی اس سے آگے کی چیز تھی۔ ٹیلی فون پر بھی ایسا محسوس ہوتا جیسے ''جپھی'' ڈال دی ہے اور اب اپنے ۵۰ انچ چوڑے سینے سے علاحدہ نہیں ہونے دیں گے۔ جیسے ہی وہ فون اٹھاتے اور میں کہتا ''میں یوسفی بول رہا ہوں'' تو وہ نہ السلام علیکم کہتے نہ آداب۔ مزاج پوچھتے، نہ حال احوال۔ بلکہ مجھے بھی اتنا موقع نہ دیتے کہ یہ مراسم ادا کرسکوں۔ فون پر بس ایک یک لفظی نعرۂ مستانہ سنائی دیتا:

''جناب!''

نہ میں نے کسی اور کو اس طور لفظ ''جناب!'' میں اپنے مزاج کے سارے لبھاؤ، رچاؤ اور پیار کو سموتے دیکھا اور نہ میں ان کے ''جناب!'' کی نقل کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان کے چھوٹے صاحبزادے جو اپنے ابا کے دلآویز لہکتے، لہراتے ترنّم کی بڑی اچھی نقل کرتے ہیں، ان کے ''جناب'' کی گونج گمک اور للک بھی سنا سکیں۔

وہ ''جناب'' کے نا کو اپنی مخصوص لے میں اتنا کھینچتے کہ راگ دُلار کا الاپ معلوم ہوتا۔ کیسے بتاؤں کہ سننے والے کو دل کے تاروں کو چھوتی بس ایک تان میں ساری سمفنی سنائی دیتی تھی:

''کیسے ہیں آپ؟ اتنے دن کہاں انڈر گراؤنڈ رہے؟ تری آواز مکّے اور مدینے۔ میں ورزش نہیں کرتا۔ اس لیے بالکل فِٹ ہوں، جیسا کہ آپ نے آواز سے اندازہ کرلیا ہوگا۔ آپ کے ہیلو سے اپنائیت، محبت اور نقاہت ٹپک رہی تھی۔ صحت کا خیال نہیں رکھتے۔''

مختصر یہ کہ اس ایک ''جنابِ'' لاجواب میں انتظار و اشتیاقِ ملاقات، طبیعت کی چونچالی، ڈھیروں پیار اور دوطرفہ خیر و عافیت، سبھی کچھ آجاتا تھا!

ان کا ''جناب'' اگر ان کے خلوص و محبت کی صوتی شکل تھی تو ان کے مصافحے اور معانقے کو شکنجۂ شفقت و شیفتگی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن پستہ قد لوگوں سے معانقہ کرنے سے بالعموم گریز کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس میں خود کو کافی جُھکنا اور دوسرے کو پنجوں کے بل کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ کہتے تھے اُس کی ناک کی رگڑ سے میرے پیٹ میں گُدگُدی ہوتی ہے!

مجھے یقین ہے کہ جب کارِ جہاں تمام ہوگا اور عالمِ بالا میں اُن سے ملاقات ہوگی تو وہ اسی

روح کو گرما دینے والے نعرے سے خیر مقدم کریں گے:

''جناب! جنّت تو اِدھر ہے۔ آپ اُدھر کیوں چلے جا رہے ہیں؟''

عرض کروں گا ''حضرت، اُدھر کوئی جاتا نہیں۔ لے جایا جاتا ہے۔''

معانقہ نہ سہی وہ مصافحے ہی میں معانقے کی ساری اپنائیت، گرم جوشی، زنبوری بھنچاؤ اور محبّتیں بھر دیتے تھے۔ مصافحہ بہت چغل خور ہوتا ہے۔ ہاتھ ملانے کے انداز ہی سے دونوں کے اخلاق و انکسار، مزاج و منصب، تمکنت و طنطنہ، ملنساری اور snobbery کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں ایک ایسے سینئر بیوروکریٹ سے واقف ہوں جو (اُن کے) بھلے وقتوں میں مصافحے کے لیے فدویانہ خلوص میں لتھڑے ہوئے میرے ہاتھ کو اپنی انگشتِ شہادت کی پہلی پور سے بس اس طرح چُھو لیتے تھے جیسے باتھ ٹب میں انگلی ڈبو کر کھولتے پانی کا ٹمپریچر دریافت کر رہے ہوں۔ اُنہیں ریٹائر ہوئے چودہ پندرہ برس ہو گئے۔ اب کبھی ملتے ہیں تو بڑے تپاک سے اپنا خلوص میں لتھڑا ہوا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھاتے ہیں۔ میں بھی انگشت شہادت کی پہلی پور سے ٹھنڈے برف پانی کا ٹمپریچر دریافت کر لیتا ہوں!

مرزا میرے ردِّ عمل کو خود دارانہ و شریفانہ کمینگی کا مظاہرہ کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تم پہلے شخص ہو جس نے تین انچ کی اُنگلیا کو آلۂ انتقام و اِزالۂ ہتکِ عزّت کے طور پر کامیابی سے استعمال کیا ہے!

اللہ وہ وقت نہ لائے کہ آپ کسی بڑے reception (استقبالیے) میں میری ہی طرح ایک گوشۂ فِرومایگاں میں کھڑے ہو کر یہ دیکھتے چلے جائیں کہ مایا سے مایا کر کر لمبے ہاتھ کیسے مل رہی ہے۔ کون کس سے کیسے ہاتھ ملا رہا ہے۔ آپ کو بغیر کسی تعارف کے دور کھڑے کھڑے سلامِ روستائی اور کورنش بانداز جبہہ سائی سے پتہ چل جائے گا کہ صاحب اختیار و اقتدار کون ہے اور اہل غرض کون۔ حاجت روا کون ہے اور کشکول بدست کون۔ کس کی کور کس سے دبتی ہے۔ کس کا کام کہاں جا کے اٹکا ہے۔ کس کی گُڈی چڑھی ہے اور وہ جو شامیانے سے باہر قنات کے بانس سے ٹیک لگائے ایک سینئر بیوروکریٹ ہر آتے جاتے سے جُھک کر مصافحہ کر رہا ہے، وہ پرسوں ہی معتوب ہوا اور OSD (آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی) بنا دیا گیا۔ اُس کی اسپیشل ڈیوٹی یہ ٹھہری کہ دفتر میں قدم نہ رکھے۔ گھر میں منہ چھپائے ماہ بماہ تنخواہ وصول کرتا رہے۔ اب یہ بیچارہ فون پر چپراسیوں اور کلرکوں سے دن بھر دفتر کی خیر خبر پوچھتا اور سُن گُن لیتا رہتا ہے۔

ممتاز حسن مرحوم (سابق سیکریٹری فنانس اور نیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک) جب بھی اسلام آباد جاتے تو ضمیر جعفری اور لمرک (limerick)★[1] والے نذیر احمد شیخ کے ساتھ ایک بے تکلف اور پُر لطف شام ضرور گزارتے۔ ’رانڈے وُو‘ اگر واہ کینٹ یعنی شیخ صاحب کا گھر ہوتا تو فرمائش کر کے دال ضرور پکواتے جسے دری پر دسترخوان بچھا کر نوش کیا جاتا۔ باتیں ایسی چٹخارے دار کہ کھانے والے کو ہوش نہ رہتا کہ مرغ پلاؤ کھا رہا ہے یا مونگ کی دال۔ ان صحبتوں میں ممتاز حسن صاحب اپنے محبوب شاعر پنڈت ہری چند اختر کے اشعار بڑے شوق سے سناتے۔

پنڈت جی کا ذکر یہاں اس لیے بھی آیا کہ دوران گفتگو ضمیر جعفری نے بیان کیا کہ پنڈت ہری چند کی کسی سے بھی ملاقات ہوتی تو کبھی آداب عرض، بندگی، مزاج شریف، کیسی طبیعت ہے؟ یا کیسے ہو؟ نہیں کہتے تھے۔ ان سب کی بجائے، چھوٹتے ہی کہتے: ’’کیا تکلیف ہے؟‘‘ اُن کی دیکھا دیکھی اُن کے مقربین و مدّاحین بھی مزاج شریف کی بجائے کیا تکلیف ہے؟ کہنے لگے۔

مجھے یہ اندازِ مزاج پُرسی اور فقرۂ استقبالیہ بہت اچھا لگا۔ اس لیے بھی کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے پُر تکلّف و پُر تصنع طرز سے پہلے ہی جی اُوب گیا تھا۔ جیسے جیسے ایڈہاک ملازمت سے ان کی ترقی گریڈ ۱۷ میں اور ۱۷ سے ۱۸ اور ۱۹ میں ہوئی، طرز تکلّم میں لَس داری، لُعابیت اور لزوجت اُسی رفتار و تناسب سے بڑھتی گئی۔ مطلب یہ کہ کیسے ہو؟ سے کیسی طبیعت ہے؟ اس کے بعد بمدارج مزاج شریف، مزاجِ مبارک، مزاجِ اقدس، مزاجِ عالی اور اب مزاجِ معلّیٰ پر اُتر آئے تھے!

’’کیا تکلیف ہے؟‘‘ بطور کلمۂ پرسشِ حال کہیں زیادہ سچا، ہمدردانہ و حقیقت پسندانہ اور بغیر ہیر پھیر کے سیدھا سیدھا جواب طلب سوال لگتا ہے۔ اس کی تہ میں صداقت پر مبنی یہ مفروضہ ہے کہ اگلے کو تکلیف تو یقیناً ہے۔ بقول شاعر ’’آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں؟‘‘ ہمیں تو اِس وقت صرف تکلیف کی نوعیت معلوم کرنا مقصود ہے!

ہمارا بس چلے تو کیسی طبیعت ہے؟ مزاج شریف؟ وغیرہ کی بجائے کیا تکلیف ہے؟ کو National Form of Salutation Ordinance کے ذریعہ السلام علیکم کے بعد کم از کم ۹۰ دن کے لیے قانوناً لازمی قرار دے دیں۔ گزشتہ پچاس برسوں میں ہمارا جو احوال ہوا، اُس کی پرسش اور ممکنہ مداوا کے لیے اس سے بہتر کوئی کلمۂ حال پُرسی و خیراندیشی نہیں ہوسکتا۔ المیہ یہ ہے کہ انسان کے مصائب کی تمام تر ذمہ داری خود انسان ہی پر عائد ہوتی ہے جو آپ اپنا مُصبّب المصائب ہے!

★[1] limerick: ’’پانچ پانچ مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ایک مزاحیہ نظم جس میں قافیے aabba کی ترتیب سے آتے ہیں۔‘‘

کچھ عرصے بعد میں نے اس تجویز کا ذکر ضمیر جعفری سے کیا تو اپنے مخصوص انداز میں 'او ہو ہو!' کرنے کے بعد فرمایا کہ آرڈیننس کے ایک سیکشن (دفعہ) میں یہ شرط لگا دی جائے کہ اس کلمۂ خیر طلبی کے جواب میں کوئی شخص ایک سے زیادہ تکلیف بیان نہ کرے، ورنہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ لیے گھنٹوں کھڑے اپنی لاتعداد و لاعلاج تکلیفیں گنواتے رہیں گے!

۶۰ برس سے زیادہ عمر کے لوگوں سے
طبیعت کا حال نہیں پوچھنا
الحمدللہ۔
اظہارِ عقیدہ ہے۔ کیفیت حال نہیں

یوں تو ہنستی مسکراتی نظمیں ضمیر جعفری کی وجہ شہرت بنیں، لیکن میں ان کی نثر کا قتیل ہوں اور اس سے اپنے طور پر کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ شخصیت کے نمایاں contours (خطوط و پیچ وخم) ہوں یا کسی سچوایشن کے مُضحِک پہلو، فوجی یا دیہی زندگی کی عکاسی ہو یا بوالعجبیوں، تضادات و ناہمواریوں کا ذکر ___ وہ چند لفظوں میں منہ سے بولتی تصویر کھینچنے اور سماں باندھنے پر حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں۔ فضا بندی کے لیے وہ لمبے چوڑے میورل یا مرصع فریسکو نہیں بناتے، بلکہ کسی ترچھے اور تیکھے چغلخور زاویے سے لیے گئے چند اسنیپ شاٹس سے صحبت یاراں کی گُل افشانیٔ گفتار، اُسلوبِ حیات اور زندگی کرنے کے مختلف قرینوں کا ہنستا بولتا مرقّع پیش کر دیتے ہیں۔

ضمیر جعفری نے جو بات حفیظ جالندھری کی شاعری کے بارے میں کہی تھی، وہ تمام و کمال ان کی شاعری اور نثر پر بھی صادق آتی ہے:

؎ رُت جگوں کی، موسموں کی بات کرتی شاعری
گاؤں کے کچے گھروں کی بات کرتی شاعری

خاکے ہوں یا نصف صدی پر محیط ڈائری، ضمیر جعفری کی انسان دوستی، محبت، رواداری اور درگزر ایک ایک سطر سے جھلکتی ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ خاکوں پر مشتمل اُن کی پانچ کتابیں ہیں جن میں کم و بیش پچاس خاکے تو ہوں گے۔ شخصیت میں کوئی تضاد یا بوالعجبی، معاشرے کی ناہمواری اور کردار کا کمزور یا مضحک پہلو ان کی نظر سے نہیں بچتا، لیکن تصویر بناتے وقت وہ سیاہ رنگ استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ دھیمے، گاتے گُنگناتے پیسٹل رنگوں سے تصویر بناتے ہیں۔ کوئی لائن یا رنگ مِٹا کر دوبارہ بنانے یا بھرنے کی انہیں ضرورت نہیں پڑتی۔ باس اور ماتحت کا رشتہ بہت پیچیدہ، گنڈھب،

اکثر ناہموار اور بعض اوقات صبر آزما و دل آزار اور بہت جلد ٹھنڈا برف یا فی الفور آگ پکڑنے والا ہوتا ہے۔ پیار دُلار کم، ڈانٹ پھٹکار زیادہ۔ ایک لحاظ سے لاچاری و ناچاقی کا بنتا بگڑتا ناتا۔ ضمیر جعفری کا اوجِ کمال، وسیع القلبی اور مزاح کا شاہکار دیکھنا ہو تو ''حفیظ نامچہ'' پڑھیے۔ انہوں نے اپنے باس حفیظ جالندھری کو اُن کی تمام بے ضرر و دلآویز کمزوریوں کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے لا کھڑا کر دیا! یہی اعجازِ مسیحائی ''سنگاپور کا میجر حسرت'' والے چُچہاتے خاکے میں نظر آتا ہے۔ میں ان کے اندازِ بیان کو tongue-in-cheek تو نہیں کہوں گا کہ اس میں طنز کا شائبہ محسوس ہوتا ہے۔ ان کا قلم بین السطور مسکراتا رہتا ہے۔ ان کے خاکوں اور ڈائری کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ بلاشبہ ہمارے Pepys اور Boswell ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ضمیر جعفری کے ہاں تُند و تیز سیاسی کمنٹ نہیں ملتا اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ کہنے کی سب باتیں ہلکی ہنسی میں کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ محض ہنسنے ہنسانے کے لیے وہ نہ کوئی شعر کہتے ہیں نہ لطیفے سناتے۔ ان کا مزاح لفظی بازیگری اور ضلع جگت سے مُبرّا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مقصد، خیال اور معنی و مفہوم سے عاری مزاح نے، جسے آسان حوالے کی خاطر ہم مزاحِ مُعَرّا کہہ سکتے ہیں، عام ذوق اور معیار کو ناقابلِ اصلاح حد تک بگاڑا ہے۔ کچھ ایسی ہوا چلی ہے کہ بعض شاعر بڑے پھکڑ پن، جگت بازی اور ذو معنی و ذم آمیز اشعار سے اس دھڑلے سے مشاعرے لوٹتے ہیں کہ ذوقِ سلیم محوِ حیرت نہ ہو تو کیا کرے۔ نثر پارے ہوں یا شگفتہ اشعار، ضمیر جعفری کے فن میں thought content (خیال کا عنصر اور معنی و مفہوم کی تہ داری) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے حال میں ایک کتاب میں جس کا نام اس وقت ذہن سے اُتر گیا، پڑھا ہے کہ ایک اُمّی شاعر ہو گزرے ہیں جو ورؔ تخلص کرتے تھے۔ ایک محفل میں تازہ غزل سنا رہے تھے کہ ایک شاگرد نے بآوازِ بلند پوچھا کہ استاد، اس شعر کے کیا معنی ہیں؟

فرمایا، شعر سنو۔ معنی ابھی نہیں ڈالے ہیں۔

کراچی میں ضمیر جعفری سے میری ملاقات اکثر میاں فضل حسن کی معیت بلکہ اردل میں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں وہ جس ادارے سے وابستہ تھے اس کے سربراہ حفیظ جالندھری تھے۔ اس ادارے کا کام ''دیہات سُدھار'' سے متعلق گیت لکھنا تھا۔ حفیظ صاحب اس سے پہلے برٹش انڈین آرمی میں بھرتی کے لیے

میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے
میں تو ہٹلر کو آگ لگائی آئی رے

جیسے جبر جنگ گیت لکھ چکے تھے۔

دفتر کا ماحول دفتری کام کے لیے قطعاً سازگار نہ تھا۔ رونا اس بات کا تھا کہ شعر و شاعری کے لیے بھی سازگار نہ تھا۔ اس بعید از معقولیت صورتِ حال کی چار معقول وجہیں تھیں۔ اوّل، ادارے کے سربراہ بلکہ شعر براہ حفیظ صاحب تھے۔ دوم، ان کا واحد کام گیت اور نظمیں لکھنا تھا، جس کی نہ فرصت تھی نہ موڈ۔ سوم، ایسا لگتا تھا کہ ماتحتوں کا واحد کام باس کے مصرعے اٹھانا ہے اور اگر مصرع آنے میں دیر ہو تو ناز اٹھائیں جو اتنی گرانباری کا باعث نہ تھا۔ چہارم، بعض ملاقاتی دفتر کھلنے سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔ تانتا بندھا رہتا۔ ظالم سر کھجانے اور مصرع لگانے تک کی مہلت نہیں دیتے تھے۔ ملاقاتی کسی کا بھی ہو، اس کی گفتگو اور تواضع یعنی چائے پانی میں برابر کا شریک ہونا، ہر ملازم اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔ ضمیر جعفری کو باس کے کمزور مصرعے بھی ماتحتانہ تابعداری کے ساتھ اٹھانا پڑتے تھے۔ وہ اسے کارِ ثواب سمجھتے اور بڑی خوشی سے انجام دیتے۔ مطلب یہ کہ مصرع اس طرح اٹھاتے جیسے جانی دشمن کے جنازے کو خوشی خوشی کندھا دے رہے ہوں!

ضمیر جعفری کے ایک عمر رسیدہ جگری دوست عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ ان دنوں اُن کے تازہ ترین معاشقے کے بڑے چرچے تھے۔ محبوبہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کی طالب علم تھی اور اُن سے کم از کم چالیس سال چھوٹی تھی۔ اُسے روزانہ ایک خط بلکہ ضمیر جعفری کے بقول ہفتے میں آٹھ خط لکھتے تھے۔ میں اسلام آباد گیا تو ضمیر جعفری ان صاحب کی موجودگی میں کہنے لگے کہ اِنھوں نے اپنے تکیے میں روئی یا پروں کے بجائے محبوباؤں کے خط بھر رکھے ہیں۔ جب تک وہ سر کے نیچے نہ ہو نیند نہیں آتی۔ تازہ ترین محبوبہ کے خطوں کے لیے سرخ مخمل کا ایک گول تکیہ بنوایا ہے جسے بائیں گال کے نیچے رکھ کر سوتے ہیں۔ ایسے تکیے کو گل تکیہ کہتے ہیں۔

بریگیڈیر صدیق سالک کہنے لگے "اگر عمروں میں اتنا تفاوت نہ ہوتا تو معاملت میں آسانی رہتی۔"

میں نے کہا "ضروری تو نہیں۔ میرے خیال میں بڈھے عاشق میں تین خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو کسی جوان میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اوّل، بے ضرر و بے طلب ہوتا ہے۔ دوم، باوفا ہوتا ہے۔ سوم، جانتے بوجھتے جس شدت اور یکسوئی سے وہ باؤلا ہوتا ہے وہ کسی جوان کے بس کا روگ نہیں۔"

ضمیر جعفری بولے "چوتھی خوبی تو آپ بھول ہی گئے۔ جلدی مر جاتا ہے۔"

میں نے کہا "درست۔ اکبر نے بھی مرنے میں جلد بازی کرنے کی تعریف کی ہے:

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
ایک ہی شب میں پیدا ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا!"

تکیے کا ذکر آیا تو میں نے ان دوستوں سے کہا کہ کچھ دن ہوئے مجھے نوابزادہ عبدالغفور ہوتی سے مردان میں ان کے قلعہ نما محل میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ آسٹریلشیا بنک کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اہم رکن ہیں۔ بہت محبت بلکہ شفقت سے پیش آئے۔ باتوں سے بھی خوب تواضع کی۔ کہنے لگے میرے پردادا بڑے جری، جنگجو اور شیر دلیر تھے۔ جس تکیے پہ سر رکھ کے سوتے تھے اُس میں روئی کی بجائے دشمنوں کی پُر غرور مونچھیں بھری تھیں! ڈاڑھی نہیں، مونچھیں ہی مونچھیں۔ وہ تکیہ ہم نے ایک شوکیس میں محفوظ کر رکھا ہے۔ آپ دیکھنا پسند کریں گے؟

مجھے اس خیال ہی سے جُھرجُھری آگئی۔ میں نے سنبھل کر کہا ''میرے لیے تو آپ کی ٹائیوں کے درشن ہی کافی ہیں۔''

وہ ہمیشہ ہاتھ کی بنی ہوئی ٹائی، جس کے نچلے تکون پر بہت باریک کشیدے یا مہین زردوزی کا کام ہوتا، لگاتے تھے۔ میری بات پر مسکرائے۔ اٹھ کر اندر گئے اور ایک ٹائی لا کر عنایت کی۔

پہلی دفعہ یہ ٹائی لگا کر نکلا تو مرزا بولے ''بھائی میرے، بھولی فاختہ اگر مُرغ زریں یا مور کے پر لگا کر بھی نکلے تو کہلائے گی وہی فاختہ پرداختہ! اس لیے بھی کہ کُوکُو کر کے اپنی ذات بچھوانے سے باز نہیں آئے گی!''

زیادہ عرصہ نہیں ہوا، انجمن ترقی اردو، کراچی نے ان کے اعزاز میں جو یادگار تقریب منعقد کی تھی اس میں انہوں نے ایک بہت دلچسپ تقریر کی۔ اب ذرا اس کمالِ فن کی داد دیجیے کہ قلم برداشتہ گنتی کی چند سطروں میں کیسی تصویر کھینچ دی:

''مجھے اپنی پذیرائی کی تقریب پر سب سے زیادہ خوشی تین موقعوں پر ہوئی...... اوّل اُس دن جب میرے گاؤں کے مڈل اسکول کے طلبہ...... جس کے پھٹے ٹاٹوں پر بیٹھ کر میں نے ...... 'گاچنی مٹی' سے پوچی ہوئی تختی پر اپنی زندگی کا پہلا الف لکھا تھا...... میرے استقبال کے لیے ڈھول کی سنگت پر دھمال ناچتے ہوئے...... کھیتوں میں نکل آئے اور پھر ہیڈ ماسٹر کی سرپرستی میں ان بچّوں نے...... مٹّی کی چاٹیوں میں اَڑکی ہوئی گھر کی بھینسوں کی تازہ مکھن سے مالا مال لسّی کے ساتھ تازہ ہی مکھن میں گندھے گتھے شرابور اسی طرح کے سہ منزلہ پراٹھے کھلائے جیسے تقریباً ستر برس قبل میری 'بے جی'...... مدرسہ کو روانہ کرتے وقت رومال میں باندھ کر...... آدھی چھٹّی میں کھانے کے لیے دیا کرتی تھی۔''

اِس تقریر اور اُس شام کا اختتام جوان کے نام تھی، اُنہی کے اس شعر پر ہوا:

؎ کتنی تصویروں کے ساتھ آئی ہے شامِ زندگی
وقت جب کم رہ گیا تو کام یاد آئے بہت

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنے کرنے کے سب کام وہ مکمل کر گئے۔ اور ہر کام بڑی رسان سے ہنستے بولتے کیا۔ بحُسن وخوبی کیا۔ صلہ وستایش کی تمنا وطلب کے بغیر کیا اور شعروادب کا اتنا بڑا اور وقیع ونادر سرمایہ چھوڑا کہ ہم جتنا ناز کریں کم ہے۔

؎ آسماں اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مسندِ صدارت پراولتی کی ٹیاٹپ

محترم و معظم شعرائے کرام، گرامی قدر اراکین ادبی کمیٹی کراچی کلب، معزز خواتین و حضرات،

خدا جانے یا آپ جانیں کہ تقریر کے اختتام تک التفاتِ دلِ دوستاں اور میری خوش گمانی کا یہ عالم رہے نہ رہے، لہٰذا ابتدا ہی میں اس عزت افزائی اور حسن سماعت کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تہِ دل سے سپاس گزار ہوں۔ اس تقریر کی پیشگی معذرت بھی قبول کیجیے جس کا عذاب اب آپ کو اخلاقاً جھیلنا ہوگا۔ یہ ہماری مشترکہ مجبوری ہے۔ مجھے اس کا احساس اور اندازہ ہے کہ مشاعرے سے پہلے لمبا خطبۂ صدارت سامعین اور شعرائے کرام کو اتنا ہی گراں گزرتا ہے جتنا کہ بے صبر دولہا کو قاضی کا طول طویل خطبۂ نکاح! مگر ہوا یوں کہ میرے عزیز دوست اور کراچی کلب کی ادبی کمیٹی کے دو نہایت فعّال و معتبر ممبر جناب قیصر علی مرزا اور جناب محمد سلمان صالح کچھ دن قبل یہ حکم نامہ لے کر تشریف لائے کہ ''مشاعرہ بیادِ جوشؔ'' میں مجھے (نوم کی) گدّیٔ صدارت پر چھ سات گھنٹے دوزانو بیٹھنے اور ہر شعر کے بعد خود کو پہلو بدلنے اور جماہی لینے سے باز رکھنے کے علاوہ مشاعروں کی روایت اور آداب پر خطبۂ صدارت بھی پڑھنا ہوگا۔ یہ دونوں حضرات پیشے کے لحاظ سے بینکر ہیں۔ اپنی بات منوانے، قائل معقول کرنے اور ناگوار کو گوارا کر دکھانے کا ہنر انھوں نے غالباً بینک کے گھاگ ڈِفالٹرز (نادہندگان) سے سیکھا ہے! یہ دونوں حضرات نہ جانے کب سے تیسرے بینکر کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ ہاتھ نہ آیا تو ایک بے ضرر سے سابق و تائب سودخور پر اکتفا کی۔ ہم تینوں میں سودخوری کے علاوہ ایک اور قدرِ مشترک نکلی۔ وہ ہے شعر و ادب سے والہانہ شغف۔ گمان غالب ہے کہ ان کی نگاہِ انتخاب مجھ پر اس لیے بھی پڑی کی میں مقابلتاً زیادہ طویل عرصے سے ان دونوں دلگداز علتوں میں بخوشی مبتلا رہا ہوں۔ پہلی کا عذاب ثواب روزِ محشر تک موقوف۔ دوسری صریحاً روزی روزگار میں کھنڈت ڈالتی ہے۔

آدھی رات اِدھر، آدھی رات اُدھر سب کچھ روا و گوارا ہے اور بارہ کے عمل کے بعد ہر بات بجا ہے، سوائے تقریر کے! بالخصوص ایسے اجتماع میں جہاں اربابِ ذوق اشعارِ آبدار سننے کے لیے آئے

ہوں اور مشاعرے کے آغاز کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہوں۔ مگر کیا کیا جائے آپ کے اور اشعارِ آبدار کے درمیان دیوارِ نثر بن کر کھڑا ہونا میرے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ یہ دیوار خواہ سیسہ پلائی ہوئی ہو یا شیشے کی ہو، اس کی تعمیر میں خرابی کی جو ایک صورت مضمر ہے اس میں اس فقیرِ پُرتقصیر کے علاوہ منتظمین کا ہاتھ، بلکہ دونوں ہاتھ، صاف نظر آ رہے ہیں۔

لندن کے تھیٹرز کا ایک دستورِ ناظر نوازی یہ بھی ہے کہ اصل کھیل شروع ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا skit یا نکاہیہ پیش کرتے ہیں جو curtain-raiser کہلاتا ہے۔ اس کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ اوّل، ناظرین کو اصل کارروائی کے لیے نرمایا اور گرمایا جائے۔ دوم، جب تک دیر سے آنے والے تماشائی نیم تاریک ہال میں غلط سیٹ اور صحیح گود میں بیٹھنے کی دیرینہ حسرت پوری نہ کرلیں اسٹیج پر بھی کچھ نہ کچھ "بلّا گلّا" اور دِلگی ہوتی رہے۔ میری تقریر کی نوعیت بھی دراصل curtain-raiser جیسی ہی ہے! میں نے اپنے ہمدمِ دیرینہ مرزا عبدالودود بیگ سے پوچھا کہ ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ فرمایا کہ داناؤں کے نزدیک سادہ و پُر کار تقریر وہ ہے جس میں چار باتوں کا خیال رکھا جائے۔ اوّل، سنجیدہ لوگوں سے سنجیدہ گفتگو کرنے سے پرہیز کرو! دوم، اختصار سے کام لو۔ سوم، بیٹھ جاؤ، قبل اس کے کہ بٹھا دیے جاؤ! چہارم، تقریر کے دوران آنکھیں بند رکھو تا کہ سامعین کا ردِ عمل نہ دیکھ سکو۔ بعض لوگ طرح طرح کے منہ بنانے کے عادی و ماہر ہوتے ہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ صدارت کے لیے کوئی وزیرِ کبیر یا اُس کا مُشیرِ باتدبیر دستیاب نہ ہو تو مجھ جیسے ناموزوں طبع شخص کا انتخاب کرنے سے پہلے پوری تفتیش کے بعد یہ اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ اُس نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا اور آئندہ بھی اس کا احتمال نہیں۔ بلکہ اس کی ذات سے سخن فہمی کا بھی اندیشہ نہیں۔ داد کو بھی قرض سمجھتا ہے۔ مطلب یہ کہ یکے از داد نادہندگان ہے۔ ہر چند کہ عاجز ان تینوں شرائط پر پورا اُترتا ہے، تاہم معذرت پر بوجوہ مجبور تھا۔

میں نے ان عزیز فرستادگان سے عرض کیا کہ تکلّف برطرف، جس محفل میں فرشی نشست ہو، اس میں شرکت سے بوجوہ احتراز کرتا ہوں۔ فرشی نشست کا اصل لیکن مخفی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک نظر میں سب کو معلوم ہو جائے کہ کون کون گٹھیا میں مبتلا ہے۔ کس کس کے گھٹنوں، جوڑوں نے جواب دے دیا ہے!

سلمان صالح بولے، نو پرابلم۔ ہم چار پانچ کرسیاں رکھوا دیں گے۔

عرض کیا، میں ان کا حشر بھی دیکھ چکا ہوں۔ اظہر ہاشمی صاحب کے دولت کدے پر ایک فرشی نشست والے مشاعرے میں بیس کرسیاں بزرگوں اور معذورین کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ان پر پہلے ہی ہلّے میں خواتین براجمان ہوگئیں اور صرف ہم ہی دیکھتے کے دیکھتے نہیں رہ گئے، وہ بھی ہمیں دیکھتی رہیں! میں نے ہاشمی صاحب کی اجازت سے یہ اعلان کرایا کہ جو خواتین چالیس یا چالیس برس سے اُوپر کی ہیں وہ بدستور کرسیوں پر بیٹھی رہیں۔ یہ سننا تھا کہ وہ خواتین بھی جن کی عمر یقیناً ساٹھ سے متجاوز تھی، بلکہ بعض تو میری ہم عمر تھیں، فوراً کرسی چھوڑ کر فرش پر آلتی پالتی اور جی مار کے بیٹھ گئیں! دیر تلک میں اکیلا دم زائد از چالیس سالہ صف میں ٹُڑوں ٹُوں بیٹھا رہا۔

قیصر مرزا مسکرائے۔ فرمایا، تو پھر آپ بھی دوزانو کی بجائے چارزانو بیٹھ جایئے گا۔

عرض کیا، میں اپنی تکلیف کو دو سے ضرب نہیں دے سکتا۔

سلمان صالح اپنے ہاتھ کو اُونٹ کے قد تک بلند کرتے ہوئے بولے ''تو پھر آپ خود فرمایئے کس کروٹ بیٹھیے گا۔''

میں نے بیٹھ کر دکھایا تو کہنے لگے ''اس طرح بیٹھ کر تو گھریلو خواتین آٹا گوندھتی ہیں! صدارت کے لیے یہ پوز مناسب نہیں ہوگا۔''

میں نے پہلو بدل کر دکھایا کہ میں اس طرح پاؤں پھیلا کر بھی بیٹھ سکتا ہوں۔

ارشاد ہوا ''یہ آدابِ مشاعرہ کے سرتاپا خلاف ہوگا۔ وہاں حضرت تابش دہلوی بھی تشریف فرما ہوں گے۔ آپ نے سلطنتِ مُغلیہ کے چشم و چراغِ آخرِ شب شاہ عالم بادشاہ کا قصّہ 'آبِ حیات' میں ضرور پڑھا ہوگا۔ ایک دن بادشاہ سلامت خواجہ میر دردؔ کی محفلِ روحانیاں میں بے اطلاع چلے آئے۔ پاؤں میں درد تھا، اس لیے ذرا پاؤں پھیلا کر بیٹھے۔ خواجہ میر دردؔ نے کہا، یہ فقیر کے آدابِ محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا کہ معاف کیجیے، درد سے مجبور ہوں۔ انہوں نے کہا، درد ہو رہا تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی؟''

آخری عُذر جو میں نے کیا یہ تھا کہ میں ساری رات جاگ نہیں سکتا۔ اکبرالٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

وصل ہو یا فراق ہو اکبر
رات بھر جاگنا قیامت ہے

اسے اگر ذرا سی تحریف کے ساتھ یوں پڑھا جائے تو اس شب بیداری و بیکاری پر بھی صادق آئے گا:

وصل ہو یا مشاعرہ اکبر ؎
رات بھر جاگنا قیامت ہے

ممکن ہے میری غیر شاعرانہ تحریف سے مصرعے میں سکتہ پڑ رہا ہو۔ لیکن عالمِ غنودگی میں وہ بھی مزہ دیتا ہے۔ کامیاب مشاعرے میں ''جاگیں تمام رات، جگائیں تمام رات، والا نقشہ ہوتا ہے۔ وصل یا شعر و شاعر سے کس رُو سیاہ کو غرض ہے۔ بعضے بعضے کو فقط جاگنے ہی میں مزہ آ جاتا ہے!

لندن میں چھوٹے بڑے مشاعرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں مجھے ایک فرشی نشست والے مشاعرے میں تقریباً ساری رات صدارت کرنے اور جاگنے کا اتفاق ہوا۔ تقریباً میں نے اس لیے کہا کہ جب مشاعرہ ختم ہوا تو سورج نکلنے میں ابھی پورے تین منٹ باقی تھے۔ ساری رات فرش پر بیٹھے رہنے کے باعث گرم پتلون کے پائنچوں میں غلط جگہ دو نہایت سڈول گھٹنے مستقل طور پر بن گئے تھے، جنہیں کروشے کی دو چُست ٹوپیاں پہنائی جا سکتی تھیں۔ استری کے بعد یہ رسولیاں اور بھی نمایاں ہو گئیں۔ دو دن بعد میں اس پتلون کو Sketchleys ڈرائی کلینرز کے ہاں لے گیا اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو پتلون کے یہ بڑے بڑے گومڑے دکھا کر بڑی لجاجت سے کہا کہ پلیز یہ نکال دیں۔ اس نے بڑے غور سے انہیں دیکھا۔ پھر بڑی واضح کنکھیوں سے میری ٹانگیں دیکھنے کی کوشش کی جو کاؤنٹر کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ جمبو گومڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی حیرت اور ہمدردی سے میری صورت دیکھ کر کہنے لگی:

Sir, we can remove the stains, but I am afraid we cannot remove permanent marks of physical deformity!

مطلب یہ کہ ہم داغ دھبّے تو دور کر سکتے ہیں، جسمانی بد ہیئتی کے آثار نہیں مٹا سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ ''شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصّع ساز کا'' لیکن سلیقے سے داد دینا بھی ایک ہُنر ہے جو برسوں کا ریاض، مجلسی رکھ رکھاؤ اور نہ جانے کتنی شبوں کا گداز چاہتا ہے۔ بیداد یعنی بامعنی ہوٹنگ اور بھی مشکل کام ہے۔ داد سے صرف مذاقِ سخن کا پتہ چلتا ہے۔ بیداد سے سوچا آدمی پہچانا جاتا ہے۔ بعض اوقات اچھے شعر کی داد اس طرح دی جاتی ہے جیسے فُٹ بال کے کھلاڑی نے سر سے گول کر دیا

ہو۔ مطلب یہ کہ تالی بجا کر شاعر کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ ہم تالی کے خلاف نہیں۔ اس کے بھی کچھ فوائد ہیں۔ مثلاً یہی کہ لوگوں کو بھری محفل میں سوتے سے جگانے اور خرآٹے لینے سے باز رکھنے کا مہذب طریقہ اجتماعی تالیاں ہی ہیں۔

آج کل داد کے لیے جو فقرے اور کلمات استعمال کیے جاتے ہیں وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں: سبحان اللہ! کیا کہنے! واہ وا! مکرّر ارشاد۔ اب ذرا ان کا موازنہ اُن کلمات تحسین سے کیجیے جو آج سے ستر اسّی برس قبل تک رائج و مستعمل تھے اور جن کا ذکر اب صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ بعض میں واقعی سو بوتلوں کا نشہ تھا:

کس رُخ سے مصرع لگایا ہے! مدح نہیں ہوسکتی۔ تعریف سے مستغنی ہے۔ پھر فرمایئے۔ اے سبحان اللہ!

کیا مزے کا شعر نکالا ہے۔ بھئی واہ! ذرا پھر پڑھنا۔

میاں جیتے رہو۔ جی خوش کردیا۔

مدح وستایش کے چند اور نادر و نایاب نمونے ملاحظہ ہوں:

اہا اہا! ارے بھائی، پڑھے جاؤ۔ کیا ثبوت ہے۔ کیا بات پیدا کی ہے! حضور، پھر فرمایئے۔ کس تیور سے مصرع لگایا ہے۔ قافیہ آپ کا ہوگیا۔ حضور، ایک مرتبہ زحمت فرمایئے۔ واللہ، سیری نہیں ہوتی۔

سبحان اللہ! فصاحت ختم ہے۔ اس زمین کو آسمان کردیا۔ پڑھیے۔ پھر پڑھیے۔ پڑھتے رہیے۔

کیا بندش ہے! سامنے کے مضمون کو کیا سے کیا کردیا۔ جواب نہیں۔

کیا خوب غزل فرمائی ہے۔ مطلع تا مقطع مرصّع!

نقل کرنے کو تو یہ کلمات تحسین وستایش ہم نے نقل کردیے مگر انہیں ادا کرنے کے لیے وہ لہجہ، وہ نکتہ رسی، وہ حسنِ سماعت اور قرنوں کا رچاؤ کہاں سے لائیں گے۔

جینز اور ٹی شرٹ پہن کر یا چیونگ گم منہ میں دبائے ہوئے یہ فقرے ادا نہیں کیے جاسکتے۔ زبان سَو سَو بَل کھائے گی۔ اور ایمان کی بات یہ کہ شاباشی کے ان کلمات نے خود بھی تو چوگوشیہ ٹوپی، کارچوبی کے پجنے اور شامتہ العنبر میں بسے بانکوں کے انگرکھے پہن رکھے ہیں۔

اس وقت جہانگیر خاں کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہورہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ بھلے بُرے وقتوں میں وہ بھی قبیلۂ سود خوراں کی آنکھ کا تارا اور ہمارے ہم پیشہ تھے، بلکہ اس لیے کہ جس محفلِ شعروسخن

میں وہ ہوں تو سامعین نہ شعر سنتے ہیں، نہ شاعر کو دیکھتے ہیں، بس ان کے داد دینے کے انداز کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ مشاعروں میں داد دینے کی داد پانے کے لیے اپنے خرچ پر لندن، دُبئی، ابوظہبی، دوحہ وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ عموماً اگلی صف میں، اور بعض اوقات ڈائس پر، وڈیو کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر، ادبدا کے کمزور مصرع کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ بینک کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے چار ایسے قابلِ ذکر کام کیے کہ، اللہ اگر توفیق نہ دے ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ پہلا کام تو یہ کہ سُودی دھندا چھوٹتے ہی داڑھی رکھ لی۔ جب وہ پوری طرح سفید اور نورانی ہوگئی تو دوسری شادی کرلی، جسے لوگ رشک کی نظر سے دیکھتے اور زبان سے بُرا کہتے! شادی کے فوراً بعد ایسی رنگ برنگی ٹوپیاں اوڑھنی شروع کردیں کہ اگر شادی والے دن اوڑھ کر جاتے تو قاضی نکاح پڑھانے سے صاف انکار کردیتا۔ چوتھا نیک کام یہ کیا کہ جب نوسو خراب مصرعوں کی داد دے چکے تو حج کو چلے گئے۔ توبہ واستغفار کے بعد تادمِ تقریر نہیں لوٹے۔ سنا ہے ہر گناہ سے توبہ کرلی ہے، لیکن خراب مصرعے کی داد سے تائب نہیں ہوئے! واضح ہو کہ ہم نے خراب مصرعے کہا ہے' خراب شعر نہیں۔ وجہ یہ کہ وہ پہلے مصرعے پر ہی اپنا دادخزانہ اس طرح لُٹا دیتے ہیں جیسے کسی زمانے میں نوابین اور رؤسا اپنے باغ لونڈیوں، کنیزوں سے لٹوا کر خوش ہوتے تھے۔ جہانگیر خاں پہلے مصرعے پر ہی لوٹ پوٹ ہوجاتے ہیں۔ دوسرے مصرعے کا انتظار نہیں کرتے کہ دم کا بھروسا نہیں۔ خدا جانے شاعر کو دوسرا مصرع سنانے کی مُہلت ملے نہ ملے۔ کسے خبر، جلاّ داجل کا، شعر کے بیچوں بیچ بھالا مار کے گرادے! للہذا پہلے مصرعے پر ہی اُچھل اُچھل کر داد دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو پہلے مصرعے سے بھی پہلے داد دینی شروع کردیتے ہیں!

شاعروں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی میں جہانگیر خاں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ شعر جتنا خراب ہو اتنی ہی زیادہ داد دیتے ہیں، جس سے شاعر کے دل میں اور زیادہ خراب شعر کہنے کا شوق اور ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک نامور شاعر جن سے ہمارا نیازمندی کا رشتہ ہے، تشریف لائے۔ فرمایا، سلامِ روستائی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ جہانگیر خاں آپ کے ہم پیشہ اور مدّاح ہیں۔ آپ کا بے حد لحاظ اور احترام کرتے ہیں۔ ان سے میری سفارش کردیجیے کہ میرے مصرعے پر داد نہ دیا کریں۔ جب سے انہوں نے داد دینی شروع کی ہے لوگ سمجھنے اور کہنے لگے ہیں کہ میں خراب شعر کہتا ہوں!

سچ جُھوٹ کا حال خدا جانے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اب اس شاعر نے مارے ڈر کے پہلا مصرع کہنا ہی چھوڑ دیا ہے!

اگلے وقتوں میں جو مُقطع اور مُتشرّع [1] شخص پہلے مبتدی شاعر سے لے کر آخری استاد تک، یعنی عشاء کے بعد سے اذانِ فجر تک، ہر طرحی غزل کو مطلع سے مقطع تک ایسے مبہم سکوت و سکون سے سنتا کہ دیکھنے والا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس باوقار سکوتِ مسلسل کا سبب محویت ہے یا نیند کا غلبہ، ثقلِ سماعت ہے یا ضعف پیری..... اُسے میرِ مشاعرہ کہتے تھے۔ وہ بیچارہ منہ تک آئے فقروں، جماہیوں، حوائج ضروریہ اور اپنی تازہ غزل کو ضبط کیے آٹھ نو گھنٹوں تک بُت بنا بیٹھا رہتا تھا کہ پہلو بدلنا مشاعرے کے آداب کے خلاف اور تقاضائے فطرت کے عین مطابق تھا! وہ مثالی صبر و تحمل اور صدارتی تجمّل کے ساتھ ساری رات سو (۱۰۰) سناروں کی سہتا رہتا۔ اس لالچ میں کہ جب اس کی باری آئے گی تو ساری کسر نکال لے گا۔ لیکن جب اس کی باری آتی تو اُس کی زندگی کی واحد خواہش اور ضرورتِ غیر شعری یہ ہوتی تھی کہ مختصر ترین راستے سے، کم ترین وقت میں، قریب ترین باتھ روم میں پہنچ جائے!

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میرِ مشاعرہ بالعموم شاعر ہی ہوا کرتا تھا۔ خراب اور بھرتی کے شعر کہنا اس کے فرائض و استحقاقِ صدارت میں شامل تھا۔ غالباً اسی لیے کسی نثر نگار کو اس اعزاز سے نہیں نوازا جاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ کبھی مسندِ صدارت پر متمکن رہے ہوں۔ ہاں، مفتی صدرالدین آزردہؔ جو کمزور شعر کہنے پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے تھے، بارہا میرِ مشاعرہ بنے۔ اُس زمانے میں شعراء نثر کا استعمال صرف داد دینے اور ایک دوسرے کے کلام میں زبان و عروض کی غلطیاں نکالنے کے لیے کرتے تھے۔ اور یہ بڑی سمجھداری کی بات تھی۔ اس لیے کہ جن جذبات کا واشگاف اظہار شعر میں بے جھجک اور بے جھپک کیا جاتا ہے، وہ اگر سلیس اردو، میرا مطلب ہے نثر میں کہہ دوں تو اپنے ہی گھر والے گھر میں نہ گھسنے دیں اور محلّے کی بہو بیٹیاں ہی نہیں، بڑی بوڑھیاں تک ہمیں اپنے گھر کے سامنے سے نہ گزرنے دیں۔ اور تو اور انتہا پسند مولوی صاحبان مرغیوں تک کو ہم سے پردہ کرائیں!

پردے پر یاد آیا کہ بیس برس ہونے کو آئے، مجھے خواتین کی ایک محفلِ شعر و ادب کی صدارت کے لیے کہا گیا تو میں نے مدعو کرنے والی خاتون سے معذرت کرتے ہوئے اپنا وہی گھسا پٹا پیٹنٹ فقرہ دہرایا کہ بی بی، اب میں محفلوں میں کم، بہت ہی کم جاتا ہوں۔ گوشہ نشین بلکہ پردہ نشین آدمی ہوں۔ بولیں، اسی لیے تو آپ کو بلا رہے ہیں۔ پردے پر اتنا ہی اصرار ہے تو عینک اتار کر بیٹھ جائیے گا۔ سوائے آپ کے، مرد حضرات نہیں ہوں گے۔

---

[1] مقطع اور متشرّع: لغت میں ان دونوں ثقیل الفاظ کے معانی خاصے طویل ہیں۔ اگر ہم لغت نویس ہوتے تو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کی غرض سے معنی کے خانے میں فقط "پروفیسر عبدالغفور اور مولوی فضل الرحمٰن" لکھ کر اپنا پنڈ چھڑاتے۔

خاتون کو اندازہ نہیں تھا کہ عینک اتارنے کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً اُس وقت جب اُس کے شیشے، میری عینک کی طرح، بوتل کے پیندے کے برابر موٹے ہوں۔ ایک دوست سے روایت ہے کہ استاد صوفی غلام مصطفےٰ تبسم جب ستر اسّی کے پیٹے میں تھے تو اُن کی محفل میں روز حاضری دینے والا ایک منہ چڑھا شاگرد ایک دن پہلی مرتبہ نئی عینک لگا کر آیا، جس سے اُس کا حُلیہ ہی بدل گیا۔ صوفی صاحب قبلہ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ برخوردار، عینک لگا کر تو تم بالکل اُلّو نظر آتے ہو!

شاگرد ہاتھ جوڑ کر بولا کہ حضور، عینک نہ لگاؤں تو آپ اُلّو نظر آتے ہیں!

اور ہاں ''مرد حضرات'' کی ترکیب جو اس خاتون نے استعمال کی، اُس پر مجھے اعتراض ہے۔ اردو اخباروں نے اس بھونڈی اصطلاح کو رائج اور عام کر کے بڑا غضب کیا۔ اگر ''مرد حضرات'' سے یہ مراد ہے کہ بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو صرف حضرات ہی ہوں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اخبار والے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ اور اگر حضرات سے پہلے مرد کی پخ محض اس لیے لگائی ضروری ہے کہ بعض خواتین بھی حضرت ہوتی ہیں تو میں خوفِ فسادِ feminists کے باعث کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

زندگی میں دوسرا مشاعرہ تھا جس کی صدرات کا شرف عاجز کو حاصل ہوا۔ تیسرے مشاعرے کی صدارت کا قصہ قدرے سبق آموز ہے۔ یہ مشاعرہ لندن کے ایک قدیم ہال میں جون ۱۹۹۹ء کے اوائل میں منعقد ہوا تھا۔ عمارت اتنی پرانی اور ہماری حکومت کی مانند مخدوش حالت میں تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ محض قوتِ ارادی سے کھڑی ہے یا گرا چاہتی ہے۔ کھڑے رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پاس پڑوس کی عمارتیں اتنی قریب تھیں کہ گرنے بھر کی جگہ نہیں تھی! چوبی روسٹرم اتنا تنگ تھا کہ کرسی اگر تین چار انچ بھی آگے یا پیچھے کھسکائیں تو صدر نشین اپنی کرسئ صدارت اور نیک خواہشات سمیت دھڑام سے نیچے جا گرتا۔ اس پر چار کرسیاں برابر رکھی بلکہ ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی تھیں۔ مہمانِ خصوصی محترمہ زہرا نگاہ میری دائیں جانب ایک تیموری ٹانگ والی ڈگمگ ڈگمگ کرسی پر اس طرح آٹومیٹک جھوم رہی تھیں گویا ہر اچھے برے شعر کی مسلسل داد دیتی چلی جا رہی ہیں۔ جُڑواں کرسیوں کے ہتھے اتنے پتلے تھے کہ اگر وہ اپنا بایاں ہاتھ اپنی کرسی کے ہتھے پر رکھتیں تو مجھے اپنا دایاں ہاتھ فوراً فولڈ کر کے اپنی گود میں رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے بے دھیانی میں اپنا دایاں ہاتھ اپنی کرسی کے ہتھے پر رکھ دیا تو وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں بھی احتراماً اور ندامتاً کھڑا ہو گیا تو وہ فوراً بیٹھ گئیں۔

تین شاعروں کے بعد اکبر حیدر آبادی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ انہوں نے غزل کے بجائے ساقی فاروقی کے خلاف ایک انتہائی سخت نظم پڑھی۔ جس سے ہال کا ٹمپریچر یکدم نقطۂ انجماد سے بڑھ کر

نقطۂ اشتعال تک پہنچ گیا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر پر ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں پڑ رہی ہیں۔ پہلے تو یہ گمان گزرا کہ کل رات شیکسپیئر کی ٹریجڈی King Lear دیکھی تھی اور آج لنچ میں، گلے میں خراش کے باوجود، اپنی پسندیدہ blueberry آئس کریم کے تین ''اسکوپ'' ندیدے بچوں کی طرح کھائے تھے، اس لیے سردی کچھ زیادہ ہی لگ رہی ہے! لیکن جب یہ برفیلی ٹپاٹپ جاری رہی تو سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور ثانی الذکر کو گیلا پایا تو اوّل الذکر یعنی سر اٹھا کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ عین سر کے اوپر ایک قدیم ڈیزائن کا روشندان ہے جسے انگریز سائنس دانوں نے ہمارے حیدرآباد کے ہوادان دیکھ کر ایجاد کیا ہوگا۔ اس ڈیڑھ سو سالہ روشندان کے اتنے ہی پرانے شیشے میں کوئی دراڑ یا سوراخ ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں پھوار سیدھ باندھ کر میرے سر پر پڑ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پیمائشی فیتے سے آخری سینٹی میٹر تک ناپ کر میری کرسیٔ صدارت عین اس سوراخ کے نیچے رکھی گئی ہے تاکہ بارانِ رحمت کا ایک قطرہ بھی فرش پر گر کر ضائع نہ ہو!

میں نے زہرا بہن سے کہا کہ میرے سر پر تو بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بولیں، ہم پر تو ایک بوند بھی نہیں پڑی!

چند منٹ بعد جب بارش کے ریلے میرے سر سے گزر کر، چہرے کو سیراب کرتے ہوئے، پتلون پر ڈیلٹا بنانے لگے تو میں نے زہرا بہن سے دُکھ بھرے لہجے میں کہا کہ باہر شاید جھڑ لگ گیا ہے۔ میرے سر پر بوندیں تڑاتڑ گر رہی ہیں۔

بولیں، ہم پر تو ایک بوند بھی نہیں پڑی!

صدارتی سر جب یخ بوندوں سے مُنجمد و ماؤف ہو چلا تو میں نے پھر اُن کی توجہ مبذول کرائی۔ مگر وہی ایک جواب: ہم پر تو...... وغیرہ وغیرہ نہیں پڑی!

مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ایک مقامی شاعر نے اپنے دیوان کا دستخطی نسخہ مجھے بصد خلوص و نیاز پیش کیا اور اپنی خوبصورت آٹوگراف بُک میں میرے دستخط کروانے کے بعد آٹوگراف بک کو پُچ پُچ کر کے دو دفعہ چُوما۔ چونکہ میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ زہرا بی بی سے یہ کہوں کہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کے میرے بیان اور موسمی حالات کی بدستِ خود تصدیق کرلیں، لہٰذا میں نے وہ دیوان اپنے سر پر رکھا اور جب وہ پوری طرح بھیگ گیا تو اُن سے درخواست کی کہ ذرا اس پر ہاتھ پھیریے۔

سمٹ کر پیچھے ہٹتی ہوئی بولیں ''کتاب مجھے ہاتھ پھیرے بغیر بھی نظر آ رہی ہے۔''

میں نے اصرار کیا۔ وہ مان تو گئیں مگر اس طرح کہ ''منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ۔''

مطلب یہ کہ بڑی کراہت سے کتاب پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے سر پہ ہے!

''آپ کو کیسا لگا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت خراب کلام ہے۔'' جواب ملا۔

''کتاب آپ کو گیلی لگی یا خشک؟'' میں نے سوال کی وضاحت کی۔

''بھیگ کر بھی اُتنی ہی خراب! مگر ہم پر تو ایک بُوند بھی نہیں پڑی!''

جس وقت یہ سوال و جواب ہو رہے تھے ایک مائیک آن تھا۔ کچھ نے سنا، کچھ نے نہیں سنا۔

ایک صاحب جو اپنی لاتعلقی اور مستغنی الاحوال انداز سے یکے از منتظمین معلوم ہوتے تھے اُدھر سے گزرے تو اشارے سے بلا کر کہا کہ ''میرے سر پر پہلے بوندا باندی ہوئی اور اب جھڑی لگ گئی ہے۔'' انگریزی میں جواب دیا کہ لندن کا موسم ہمیشہ سے ناقابلِ اعتبار اور بدلحاظ رہا ہے۔ سمجھ دار لوگ اپنے ساتھ چھتری رکھتے ہیں۔

زہرا بیگم کو اب میری شکایت کی سچائی پر کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا۔ مگر اب وہ ہمدردی کی بجائے زبان کی باریکیاں سمجھانے لگیں۔ فرمایا ''اگلے وقتوں میں اِس ٹپکاؤ کو ٹپکا کہتے تھے، جو اولتی کی ٹپاٹپ سے مختلف ہوتا تھا۔ رساؤ اور ٹپکے میں زمین آسمان بلکہ چھت اور چھپر کا فرق ہے۔ اس ٹپاٹپ کو ایک زمانے میں سلسلۂ تقاطرِ امطار بھی کہا جاتا تھا۔''

روایتی اُونٹ کی کمر پر آخری کمر توڑ تنکا ان کا یہ فقرہ تھا:

''اس وقت مرکزِ ترشحات بالائے بام و سقف معلوم ہوتا ہے!''

میں نے کہا ''اے بہن، عزیز از جان و دیوان بہن، میری ذات سے آپ کو وطن میں ایسی کون سی تکلیف پہنچی جو پردیس آن کے ایسی جناتی زبان میں کلام کرنے لگیں؟''

بولیں ''زخم پر جب ٹنکچر آیوڈین یا ڈیٹول لگایا جاتا ہے تو اگلا اصل چوٹ بھول جاتا ہے۔ صرف ڈیٹول کی جلن کی شکایت کرتا ہے۔ میں زخم پر نمک نہیں ڈیٹول چھڑک رہی ہوں۔ فائدہ کرے گا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ہم پر تو ایک بوند بھی نہیں پڑی!''

''آپ پر کاہے کو پڑنے لگی۔ 'بوند' گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔'' میں نے مدد کے لیے علاّمہ کو پکارا!

مشاعرہ بلاخیر وخوبی اپنے اختتام کو پہنچا تو وہ صاحب دیوان شاعر ڈائس پر میرے پاس غصّے میں بھرے تشریف لائے۔ اور کہنے لگے ''آپ نے آج مجھے بہت ذلیل کیا۔ میں نے تو آپ کو اپنی کتاب بڑی عقیدت سے پیش کی تھی۔ آپ نے فقط ثابت کرنے کے لیے باہر بارش ہو رہی ہے، میرے اخلاص اور اپنے اخلاق کو خاک میں ملا دیا! سارے ہال نے آپ دونوں کا duet بھی سُنا!

یہ کہا اور اپنی خوبصورت آٹوگراف بک، جس پر اُس کی چُوما چاٹی کے نشان ابھی نہیں مٹے ہوں گے، جیب سے نکالی اور وہ ورق جس پر میرے دستخط ''ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما'' کے طور پر ثبت کیے گئے تھے، پھاڑا اور چار غیر مساوی ٹکڑے کر کے ڈائس پر پھینک دیے۔ کچھ نے دیکھا، کچھ نے نہیں دیکھا۔

زہرا بیگم یہاں بھی اپنی زبان آوری کا ثبوت دینے اور ڈیٹول چھڑکنے سے نہیں چُوکیں۔ پُرزے اڑنے کے بعد گویا ہوئیں ''آپ نے اخلاص اور اخلاق کو خاک میں نہیں ملایا۔ پوری رسومات کے ساتھ سپردِ آب کیا ہے!''

ممکن ہے آپ دل میں سوچ رہے ہوں کہ عجیب شخص ہے۔ دوسرے اور تیسرے مشاعرے کا حال تو مزے لے کے سنایا ہے پہلے کا انجام صاف گول کر گیا۔ آپ کی بدگمانی کی داد دیتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ صحیح ہے! آج سے کوئی تیس برس قبل سکھر میں ایک چھوٹی سی شعری نشست کی صدارت مجھے بہت مہنگی پڑی۔ وہ اس طرح کہ اہلِ ذوق حضرات پر مشتمل مختصر شعری نشستوں کی تعریف کرتے کرتے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ میں نے کہا کہ آج کل بڑے مشاعروں میں پانچ دس ہزار سامعین ہوتے ہیں۔ کسی ''شوبز'' کی تقریب کا رنگ اور سماں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شعر بیک وقت پانچ دس ہزار سامعین کی سمجھ میں آ جائے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے، شعر نہیں ہو سکتا!

دوسرے ہی دن سے اس پر جو لے دے ہوئی، وہ آج تک جاری اور باعثِ خواری ہے۔

برسوں بعد یہ ڈنکیلا فقرہ ماجد علی صاحب تک پہنچا تو انہوں نے نہلے پر دہلا لگا دیا۔ ارشاد ہوا ''اردو غزل کی بُنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں گھٹیا آدمی بڑے بڑھیا شعر نکال سکتا ہے!''

قیصر مرزا صاحب نے کل مجھے مطلع کیا کہ ''مشاعرہ بیادِ جوشؔ'' کلب کے وسیع و عریض لان پر کُھلے آسمان کے نیچے ہوگا تو مرے دم میں دم آیا کہ نہ چھت ہوگی نہ ٹپکے کا ڈر۔ نہ یہ اندیشہ کہ کوئی زباں داں یہ پوچھ بیٹھے کہ ''بتایئے، ٹپک، ٹپکاؤ، ٹپکا ٹپکی اور اولتی کی ٹپاٹپ میں کیا فرق ہے؟ اس وقت جو بوچھار، پھوار یا موٹی موٹی بوندیں ٹپاٹپ یا تڑاتڑ گر رہی ہیں، انہیں آپ ترشح کہیں گے یا تقاطر؟ اور اگر ترشح

ہے تو ترشح اور تراوش کے فرق کی وضاحت کیجیے۔ نیز آپ کے جس بزرگ نے بچشمِ خود اولتی دیکھی ہو اُس کا نام اور سنہ رحلت و مدفن بتلائیے۔

خیر، اس آخری سوال کے جواب میں تو ہم بلاخوفِ تردید اپنا ہی نام بتادیں گے، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سنہ رحلت جاننے کے لیے اتنے اتاؤلے پن سے کیوں کام لیا جارہا ہے!

خوبیٔ قسمت سے ہم اس امتحان میں رعایتی نمبروں سے پاس ہو بھی گئے تو دوسرا سوال یہ ہوگا کہ جھَڑ لگنے، جھالے، رِم جھم، جَھما جَھم، دھواں دھار، دُھوں دُھوں کار اور چھاجوں مینہ برسنے کے نازک سے فرق کو مثالوں سے واضح کیجیے۔''

آج صبح ان اندیشہ ہائے دور دراز اور نمناک و شرابور سوالات کا ذکر مرزا سے کیا تو ہمدردی و دمسازی کے بجائے اُلٹے ہماری پیروڈی (parody) پر اُتر آئے۔ دلّی کا کرخنداری لہجہ بنا کے بولے ''اماں، آپ نے، کیا نام کہ، قطب مینار سے بھی دو ہاتھ اونچا پھنوارا تو دیکھا ہوگا جو اَپن کے شہر کرانچی میں دو سو کی نفری لگا کے دو کروڑ کی لاگت سے ہوا میں کھڑا کر دکھایا ہے۔ اس نے کرانچی کا نام نقش بریاب ★[1] سے سَو سوا سَو فٹ بلند بالا کر دیا۔ کس واسطے کہ بلندی دو بالائی کے لحاظ سے ایشیاء کا سب سے زیادہ دُور مار، پانی اُچھال پھنوارا ہے۔ سارا شہر لوڈ شیڈنگ سے تاریکی میں ڈوبا تراہ تراہ کر رہا ہو، اُس وَخت بھی روشنیوں کی زیادتی سے یہ پھنوارا، کیا نام کہ، بُرقعۂ نور ★[2] بنا اپنے بنانے والوں کے دل کو سرور آنکھوں کو نور بخشتا ہے! اب جہاں تلک الفاظوں کے فَرَخ وَ رَخ دکھلانے کی کھکھیڑ ہے تو بھائی میرے، اس پھنوارے کی پھنوار کو کمتی بڑھتی اور کیا نام کہ، بقدرِ اشکِ بُلبل کم کر کے علماؤں فُضلاؤں کے ان گھٹا گھنگھور، برساتی محاوراتوں کی باریکی، باغِ معنی کی بہار اور پھنوار اندر پھنوار کو دیکھا اور دکھلایا جاسکتا ہے۔ اس کے آگے سارے پھنوارے پانی بھرتے ہیں! اس کے ہوتے ہوئے دوسرے بالشت بھر کے اُپھنتے، پچپن اُگلتے پھنواروں کی مثالیں وثالیں سرتاپا سے پاؤں تلک بےفضول ہیں۔''

عرض کیا ''مرزا، یہ صرف میری ہی پیروڈی نہیں، تم نے کرخنداری کی بھی ناحق ریڑھ ماری ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔''

فرمایا ''حملہ کرنے کے لیے حق پر ہونا ضروری نہیں۔ حملہ آور کے تیور، ہتھیار اور پینتروں پر نظر رکھنی

★[1] نقش بریاب: نقش برآب

★[2] بُرقعۂ نور: بقعۂ نور

چاہیئے ۔ مکارمِ اخلاق اور تلاشِ حق کو کسی اور نا مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ اسی میں عافیت ہے ۔"

یہ قصہ لندن کی ایک چھت کے بے وقت ٹپکنے سے شروع ہوا تھا۔ بارے اپنے ہاں کی مضبوط چھت کا کچھ بیاں ہو جائے ۔ یہاں سے ذرا دور کراچی آرٹس کونسل ہے جہاں ہفتے میں ایک ، اور کبھی دو بار بھی، کسی نہ کسی کتاب کی رسمِ اجراء اور صاحبِ کتاب کی رونمائی بڑے اہتمام سے ہوتی ہے۔ میں نے کوئی تقریب ایسی نہیں دیکھی جس میں کتابِ مستطاب کو اچھوتی ، بے مثل، فکر انگیز اور عہد ساز قرار نہ دیا گیا ہو اور مقرر نے نابغۂ روزگار مصنف کا موازنہ ، اشارتاً کنایتاً، میر ، غالب ،فیض، محمد حسین آزاد، منٹو، موپساں، جیمس جوائس اور کافکا سے کر کے اُس کی برتری وہمسری اور اپنی خودسری کا اعلان نہ کیا ہو! آرٹس کونسل کے نومنتخب عہدیداروں کی ایک تقریب حلف برداری میں عہدیداروں کی بجائے میں نے چھت کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ چھت بلاشبہ بے حد مضبوط اور unbreakable ہے۔ اس کے نیچے شام ڈھلے ہر ہفتے عادتاً، مروتاً اور اخلاقاً بے حد وحساب غُلو کاری ہوتی ہے اور بے تحاشا جھوٹ بولا جاتا ہے ۔ پھر بھی یہ نہیں گرتی ! حکومت کو چاہیئے کہ اس کے آرکی ٹیکٹ سے پارلیمنٹ اور عدالتوں کی چھتیں دوبارہ ڈیزائن کرائی جائیں، اس لیے کہ وہاں کثرت سے دروغ حلفی ہوتی ہے اور بے دھڑک جھوٹ بولا جاتا ہے ۔ کہنے کو تو میں نے اپنی دانست میں سچ بات بھڑ سے کہہ دی۔ موقع محل ذرا نہ دیکھا۔ سامعین خفا ہو گئے ۔ ان کی خفگی بجا و برمحل تھی ۔ ان میں نصف تو وہ تھے جن کی کتابوں کی رسم رونمائی اسی جگہ اور شام کے ایسے ہی کسی جُھٹ پٹے میں ہو چکی تھی ۔ بقیہ نصف وہ تھے جنھوں نے ان کتابوں کی تعریف میں دھواں دھار تقریریں کی تھیں ۔ قیامت یہ کہ قصیدہ گویوں اور ثناخوانوں کی طویل فہرست میں کہیں اِس فقیرِ پرتقصیر کا نام بھی آتا ہے۔ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا......

ایک بار پھر شکریہ ادا کرنے سے پہلے ایک گزارشِ احوالِ واقعی بصد ادب کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب بھی کسی شاعر کی یاد میں مشاعرے کا اہتمام کیا جائے تو میرے خیال میں خطبۂ صدارت اور تقریروں کے بجائے مشاعرے کا آغاز اور اختتام اُسی شاعر کے کلام پر ہونا چاہیئے ۔

جوشؔ کے کیس میں یہ یاددہانی اور بھی ضروری ہے کہ انیسؔ کے سوا اُن جیسا قادر الکلام شاعر اردو نے نہیں دیکھا۔ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جس بے خوفی ، جرأت اور جذبے کے ساتھ انھوں نے نظمیں کہیں اُن کی مثال نہیں ملتی ۔ وہ عقلیت اور آزادی فکر و اظہار کے نڈر علمبردار تھے ۔ زباں بندی کے

بظاہر ختم نہ ہونے والے دور میں اس کا اعادہ اور وِردہم پر بمنزلہ فرض عائد ہوتا ہے۔ ایسے شاعرِ شعلہ نوا کی یاد میں کتنے ہی ورق تمام ہو جائیں گے اور مدح باقی رہے گی۔

لیجیے وقت بھی ختم ہوا۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ یہ چوتھا اور لندن کے غرقابی مشاعرے کے بعد پہلا مشاعرہ ہے جس کی صدارت کا شرف و اعزاز آج آپ نے بخشا۔ کوئی جا کے زہرا بی بی کو خبر کر دے کہ آج تو مجھ پر بھی کوئی بوند نہیں پڑی! یہ لندن نہیں، کیا نام کہ، اپن کا ادا و آداب شناس شہر کراچی ہے۔

؎ مٹی ترسی، بوند نہ برسی، بادل گِھر گِھر آئے بہت

شاہ جی کی کہانی دوسرے شاہ جی کی زبانی

(یہ مضمون ممتاز صحافی جناب شفیع عقیل کی تین کتابوں کی تقریبِ اجراء منعقدہ ۱۳ مارچ ۲۰۰۰ء کو کراچی پریس کلب میں پڑھا گیا۔)

صدورِ گرامی قدر، معزز خواتین و حضرات،

شفیع عقیل دانا و جہاں دیدہ اور درویش بے ریا و ریش ہیں۔ اس تقریبِ دلپذیر کے لیے انہوں نے مروجہ دستور کے مطابق ایک سرپرستِ اعلیٰ، ایک صدر، ایک مہمانِ خصوصی اور ایک مہمان اعزازی کو زحمت دینے کی بجائے نظر بد دُور، چار صدور کو کرسیٔ صدارت پر متمکن کر دیا! اس خوشگوار حالتِ ہم نشینی و مساواتِ منصبی کو presidium یا مجلسِ صدارت کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود تمام
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

شفیع عقیل ماشاء اللہ پچیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور یہ بارونق محفل ان کی تین تازہ کتابوں کی رسمِ رُونمائی ہے۔ وہ اپنی اس روش پر قائم ہیں کہ تین سے کم اولادِ معنوی کا عقیقہ عجلت پسند اور مایوس لوگوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ ایسے کثیر التصانیف مصنف کی نگارشات کا احاطہ تن تنہا کرنا ایک عدد صدر کے بس کا کام نہیں۔ آج کل وفاقی دستور کے ضمن میں checks and balances کا بہت چرچا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر دستورِ پاکستان میں بھی ایک کی بجائے چار صدور کی لازمی شرط ہوتی تو جو اَنہونی بار بار ہوتی آئی ہے وہ کبھی نہ ہوتی۔ مثلاً خان صاحب نے، میرا مطلب ہے غلام اسحاق خاں صاحب نے اپنے نزدیک دوسرکش اور نافرمان پرائم منسٹروں کو دستوری داؤں پیچ کے دھوبی پاٹ ★ سے کھڑے کھڑے ڈمس کر دیا اور وہ بے چارے اپنے اپنے عاقبت نااندیش مشیروں کے سَروں پر کفِ افسوس ملتے اور افتخار عارف کے رومینٹک شعر کا خون کرتے دیکھے گئے:

★ دھوبی پاٹ: ''مقابل کو کمر پر لاد کر پٹخ دینے کا کشتی کا داؤں۔''

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
خان بہت شرمندہ ہیں[1]★

پانچ سال ہونے کو آئے، میں نے اعلان کیا تھا کہ میں ادبی اعتکاف میں ہوں۔ صدارت سے معذور سمجھا جاؤں۔ کتابوں کی رُونمائی میں مضمون پڑھنے کا نہ حوصلہ اور سلیقہ۔ نہ استعداد۔ آج اعتکاف شکنی کے بارے میں بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ

لایا ہے ترا شوق مجھے حُجرے سے باہر

غالبؔ نے اپنے خط بنام میر مہدی مجروح میں اپنی نشلی گوشہ نشینی کی یادگار تصویر کھینچی ہے:

''مولانا غالب علیہ الرحمتہ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔

کسے کایں مرادش میسر بود
اگر جم نہ باشدُ سکندر بُود''

('جس شخص کو یہ مُراد مل جائے، اگر وہ جمشید نہیں تو سکندر ہے۔')

ایسی داستانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ کبھی ختم ہونے پر نہیں آتیں۔ ختم اس لیے نہیں ہوتیں کہ شروع ہی اُس نقطہ بوالعجبی سے ہوتی ہیں جہاں ختم ہو جانا چاہیئے تھا! سوچتا ہوں مجھ سے اگر ایسی بے انت داستانیں بالجبر اور بالجہر پڑھوائی جائیں تو میں نابینا ہونے سے پہلے باؤلا ہو جاؤں گا۔ رہیں توشک خانے میں بادۂ ناب کی سترہ بوتلیں، تو عرض ہے کہ فقیر کے توشک خانے میں (جو ایک زنگ خوردہ جہازی ٹرنک پر مشتمل ہے) صرف توشک یعنی پھولدار لحاف، پھوڑے دار گدیلے، رضائیاں، دُلائیاں، کرم خوردہ کمبل اور ناکارہ کافوری گولیاں پائی جاتی ہیں۔ ہاں، یاد آیا، لحاف میں دبی ایک بوتل بھی ہے! میرا اشارہ کمر اور گھٹنا سینکنے کی hot water bottle کی طرف ہے۔ اور ہاں، یہ بھی یاد آیا کہ ایک کاک ٹیل پارٹی میں ایک 'بٹر فلائی سوشلائٹ' نے اپنا وِسکی کا گلاس، جس کے کنارے

---

[1]★ تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

تحریف میں پہلے مصرع میں صرف دو نقطوں کا اضافہ ہے۔ اور دوسرے مصرع میں ایک نقطے کو چت سے پٹ کر دیا ہے۔ یعنی بس نیچے سے اوپر کر دیا ہے۔ اسے بھی خان صاحب ہی کا کمالِ تصرف اور نقطوں کا کھیل سمجھنا چاہیے!

پر لپ اسٹک سے sensuous ★[1] ہونٹ بن گئے تھے، میرے ''نمبو پانی'' کے گلاس سے بھڑواتے ہوئے کہا'' آپ اکثر کاک ٹیلز میں نظر آتے ہیں۔ نئی D.J. (ڈزجیکٹ) میں۔ خود بھی بینک کی طرف سے فارن بینکرز اور VIPs کی honour میں کاک ٹیل پارٹیز throw کرتے رہتے ہیں۔ مگر خود نہیں پیتے۔ "Why? But why?"

''جیسی باتیں یہ لوگ پی کے کرتے ہیں، میں بے پیئے کرسکتا ہوں!'' میں نے جواب دیا۔

"Oh dear! Oh dear! you are better off with your own concoction."

اُس نے ایک اور چُسکی لینے کے بعد چُٹکی لی۔

جہاں تک رونمائی کا تعلق ہے تو ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی رونمائی میں نہ صرف برضا و رغبت بلکہ بہ دلی فرحت شرکت کی ہے، مگر وہ غیر کتابی رونمائی تھی۔ یعنی اصلی اور سچ مچ کی۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کی رسمیں خالی از علت و مصلحت نہیں ہوتیں۔ مثلاً رونمائی ہی کو لیجیے۔ دُولہا اُس وقت تک اپنے چہرے پر سے سہرے کا عیب پوش نقاب ہٹانے کا رِسک نہیں لیتا جب تک رسمِ نکاح قانوناً مکمل نہ ہوجائے اور دلہن کے گواہ اور وکیل آکر سب کے سامنے یہ اعلان نہ کردیں کہ دلہن نے قبول کیا۔ اسی طرح دولہا دلہن ایک دوسرے کو پہلے پہل آرسی مصحف کے دوران صرف آئینے میں دیکھتے اور ایک دوسرے کی شکل وصورت کو آئینے کی خرابی اور روشنی کی کمی پر محمول کرتے ہیں!

یہ مضمون بھی ہماری پانچویں اور آخری (زیرِ تصنیف) کتاب میں شامل ہوگا۔ ہماری چاروں کتابوں کی طرح اس کی بھی رسمِ اجراء نہیں ہوگی۔ ہمارے یارِ طرحدار مرزا عبدالودود بیگ کی تجویز ہے کہ اب یہ لازمی قرار دے دینا چاہیے کہ تقریبِ اجراء کے دوران مصنف بہت دبیز سہرا باندھے بیٹھا رہے گا تاکہ سامعین اسے پہچان نہ سکیں اور وہ خود بھی ان کا فطری ردِ عمل دیکھ کر مایوس یا ہراساں نہ ہو۔

شفیع عقیل نے جب ازراہِ محبت مجلس صدارت میں شمولیت کی دعوت دی تو میں نے عرض کیا ''مجھے تنقیدی یا تقریظی مضمون لکھنا نہیں آتا۔'' اصل بات یہ کہ دل میں کب کا جمع شدہ غبار کدورت نکالنا یا کسی دوست کو اخلاقاً و مروّتاً جھوٹ بول کر خوش کرنا یا منانا مقصود ہو تو میں اُس کی کتاب کی رسمِ اجراء یا خود مجمع لگانے کا انتظار نہیں کرتا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ دل کے آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے تقریر اور

★[1] میں sensuous یا voluptuos کے لیے اردو کے کاشفِ معانی مترادفات استعمال نہیں کروں گا۔ مبادا ان سے باذوق قارئین کے منہ کا مزہ خراب ہوجائے۔ انگریزی میں وہی بات اتنی واشگاف معلوم نہیں ہوتی' کیوں کہ اُن کے ہاں بعض لفظ ہی نہیں مذکورہ لذت یا لغویت بھی کچھ ایسی معیوب نہیں سمجھی جاتی۔

حالاتِ حاضرہ پر غور یا تبصرہ کرنے سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔ مطلب یہ کہ تحریر و تقریر و تبصرہ...... تینوں سے معذور۔ جب کہ مرزا تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ناکارہ اور کرپٹ حکومت کو گالی دینے سے کلیجا ٹھنڈا ہوتا ہے یا السر کی سوزشِ شبانہ میں افاقہ ہوتا ہے تو خود کو اپنے اضطراری حقِ دُشنام اور خود مُداوات (self-medication) سے محروم نہ رکھو۔ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ۔

عذر معذرت کو ناقابلِ سماعت قرار دیتے ہوئے شفیع عقیل نے فرمایا کہ آپ کی سہ گونہ معذوری کے پیش نظر ہی آپ کو زحمتِ صدارت دی جارہی ہے! آپ کو قطعاً کچھ کہنا یا کرنا نہیں ہوگا۔ بس ڈائس پر باوقار انداز سے خاموش رہیے گا۔

عرض کیا، حضرت، آپ مجھے تقریب اجراء کی صدارت کی دعوت دینے آئے ہیں یا صدرِ مملکت کا آئینی رول ادا کرنے کی؟

اتنی دیر سے کُرسیٔ صدارت کا ذکر ہو رہا ہے تو یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چند روز پیشتر میں نے ایک محفل میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ صدرِ مملکت کو بڑھ بڑھ کے بولنے، آئے دن کی مداخلت اور محلاتی ریشہ دوانیوں سے باز رکھنے کی صرف ایک ترکیب ہے۔ وہ یہ کہ اُسے مرصّع و مطلا صدارتی کرسی کی بجائے قانوناً dentist's chair میں دھانس دیا جائے! اس کُرسی کی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی کو اِس میں ایسے پَسَر واں زاویے سے جکڑ بند کر دیا جاتا ہے کہ یوں لگتا ہے بچارا اُکڑوں★[1] حالت میں لٹا بلکہ لڑھکا دیا گیا ہے! پھر اُسے اتنا منہ کھولنے کو کہا جاتا ہے کہ کوّا نظر آنے لگے۔ اس کے بعد وہ تمام وقت منہ پھاڑے پڑا رہتا ہے۔ ایسے میں دخل در معقولات کرنا یا حکم صادر فرمانا تو درکنار، اگلا ہائے ہائے تک نہیں کرسکتا۔ بس اکڑا جکڑا اُکڑوں پڑا، مفلوج و گلگیر گورنر جنرل غلام محمد کی طرح ہرآئے گئے (بفنستر) کو منہ ہی منہ میں گالیاں دیتا اور صرف آنکھوں کی جنبش سے یہ ظاہر کرتا کہ ابھی مرا نہیں، اپنی میعادِ صدارت پوری کر کے رہے گا۔

★[1] اُکڑوں: ''اردو لغت'' میں اس اندازِ نشست کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی گئی ہے:

''تلووں پر بیٹھنے کا وہ انداز جس میں زانو پیٹ سے، گھٹنے سینے سے اور ایڑیاں پنڈلیاں رانوں سے ملی رہیں۔''

یہ غریبانہ اندازِ نشست جس میں کولھوں اور زمین کے درمیان فرنیچر کو حائل نہیں ہونے دیا جاتا، برِّصغیر میں بہت عام ہے۔ صرف اسی خطۂ نادار و نامُراد کے باشندے اور بندر ایسا اعضا و اعصاب شکن آسن مار کے گھٹنوں اپنے وعدہ خلاف اور وعدہ معاف لیڈروں کی بشارتیں سنتے یا بندر کسی ہرجائی کی راہ تکتے ہیں! بالترتیب۔ اگر کوئی یورپین یا امریکن خود کو توڑ مروڑ اور اعضاء کو تہ در تہ کر کے ایسی بندر بیٹھک کی کوشش کرے تو اُس کے گھٹنے گوڈے اور ہڈیاں چٹخنے لگیں گی۔ منہ سے خوفیاتی چیخیں، ساکٹ سے آنکھیں اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے۔

میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وسط افریقہ میں ایک چھوٹی سی قبائلی ریاست ہے جہاں ہر سات سال بعد اُس شخص کو بادشاہ بنایا جاتا جو یہ قدیم شرط بخوشی قبول کرلے کہ سات سال کی بادشاہت کے بعد اُس کا روسٹ بنا کر قبیلے کو نوش جان کرایا اور جشن منایا جائے گا! مرزا کا خیال ہے کہ ایشائی ممالک کو چاہیے کہ اپنے کرپٹ اور ظالم و جابر حکمرانوں کو معزولی کے بعد جلا وطن کر کے وہاں بھیج دیں تاکہ قبیلہ اپنے رسم و رواج کے مطابق قرار واقعی جشن منا سکے۔

معاف کیجئے، میں کہیں اور نکل گیا۔ وجہ ظاہر ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوئی کام کرنے سے کچیاتے یا جی چُراتے ہیں تو ایک عُذر پر بس نہیں کرتے۔ بلکہ طرح طرح کے عُذر تراشتے اور ایک سے ایک تاویل، معقول وجہ اور جواز پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ صاحبو، اس معقول وجہ کی اس سے بھی زیادہ ایک معقول وجہ ہوتی ہے! وہ یہ کہ کیس دراصل کمزور اور نیت میں فتور ہو تو ہم خود ہی اپنی تاویل و توجیہ سے دل میں مطمئن اور قائل نہیں ہوتے۔ اس نکتۂ راز کو ایک دن مرزا نے یوں بیان کیا:

''معلوم ہے؟ مبالغہ یا غلط بیانی کرنے اور جھوٹ بولنے والے کو جو شخص سب سے پہلے جھوٹا اور لپاٹیا گردانتا ہے وہ کون ہوتا ہے؟ وہ شخص، وہ ذاتِ شریف، وہ خود ہی ہوتا ہے!''

ساری عذر معذرت کے بعد مجھے کہنا پڑا کہ یہ تو طے ہے کہ میں آپ کے فن پر عالمانہ یا نقادانہ گفتگو نہیں کر سکتا۔ رہی کثیر الجہات شخصیت تو اُس کے قُرب اور لطفِ صحبت سے ہنوز محروم ہوں۔ میرا حصہ دور کا جلوہ۔

فرمایا ''میں اپنا تعارف آپ کرانے کے لے تیار ہوں۔''

اس کے بعد انہوں نے اپنا تعارف ایسے ہی خوبصورت طریقے سے کرایا جیسے ایک سردار جی نے کرایا تھا جن کے پڑوس میں ایک حسین خاتون نئی نئی آئی تھی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود کو کس طرح متعارف کرائیں۔ بالآخر ایک ترکیب سوجھی۔ ایک دن وہ گھر کے باہر کھڑی نظر آئی۔ یہ لپک کر گئے اور چھوٹتے ہی کہنے لگے ''دیکھئے جی، آپ کی بکری میری گلابوں کی کیاری چر گئی۔''

وہ چمک کے بولی ''میری تو کوئی بکری نہیں ہے۔''

''اجی تو میری کون سی گلابوں کی کیاری ہے؟'' سردار جی بولے۔

تو جب خیالی بکری فرضی گلابوں کی کیاری پیٹ بھر کے چر چکی تو میں نے شفیع عقیل کا ایک نہایت

مفصّل، بے تکلّف اور دلچسپ انٹرویو ریکارڈ کیا جس کے حوالے آپ کو اس مضمون میں جا بجا ملیں گے۔ اس کے علاوہ آٹھ برس قبل جو مضمون ان کی کتاب ''مثنوی سیف الملوک'' کی تعارفی تقریب میں پڑھا تھا اس کے بھی چند اقتباسات ★[1] تاُمل اور تکرار کی معذرت کے ساتھ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ شفیع عقیل نے ڈھارس بندھائی ''شاہ جی، آپ خاطر جمع رکھیں۔ بیشتر حاضرین آپ ہی کے ہم عصر اور ہمارے آپ کے ہی ہم عمر ہوں گے۔ حافظے بھی ہمارے جیسے ہی ہوں گے۔ بلکہ ہم سے بھی...... شاہ جی، آپ سمجھ رہے ہیں نا؟'' لیکن اب جو حاضرین کے شگفتہ و شاداب چہروں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو آپ کو اپنا ہم عمر کہتے ہوئے بینائی کے علاوہ میرا سنِ پیدائش بھی مانع ہے! رہا ہم عصر ہونا تو اگر میں یہ کہوں کہ البرٹ آئنسٹائن، وِنسٹن چرچل، اسٹالن، علامہ اقبال، میرلن منرو اور پکاسو میرے ہم عصر تھے تو آپ نہ تو اس کی تردید کریں گے، نہ لبوں پر آئی معنی خیز مسکراہٹ کو روک سکیں گے۔

میں نے اپنی دانست میں جو معقول عذر کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ میں نے تقریبِ اجراء میں متعارف ہونے والی تینوں کتابوں میں سے ایک بھی نہ دیکھی ہے نہ پڑھی! کتاب پڑھنے سے پہلے اگر اس پر گفتگو کروں گا تو بالکل الہامی معلوم ہوگی، جس پر ضعیف العقیدہ سامعین ایمان نہیں لائیں گے۔ پڑھنے کے بعد جھوٹ بولنے کے لیے دُگنی ذہانت درکار ہے، جس کا میں دعویٰ نہیں کرسکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بقول بُلھے شاہ:

جھوٹھ آکھاں تے کجھ بچدا اے

سچ آکھاں تے بھانبڑ مچدا اے

مطلب یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں تو پھر بھی کچھ بچتا ہے۔ سچ کہہ دوں تو شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔

یہاں بھی فرمودۂ مرزا نقل کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ فرماتے ہیں ''صاحب، وہ زمانے بہت غنیمت تھے جب سچ بولنے سے قیامت آجاتی تھی۔ اب اس سے بھی بڑا المیہ درپیش ہے۔ اب سچ اور سچ بولنے والے کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ 'اِگنور' کرتے ہیں۔ یہ سچ کی کہیں زیادہ تحقیر و تذلیل ہے۔ جب کہ وہ ظالم و جابر جو سچ بولنے پر کسی کو سُولی پر چڑھاتا ہے وہ سچ کی طاقت اور لازمی و لابُدی فتح مندی کا دل میں سب سے زیادہ معترف ہی نہیں، اُس سے بے طرح خوفزدہ بھی ہوتا ہے!''

اپنی کتابوں کے مطالعے سے میری محرومی کا فوری ازالہ تو صاحبِ کتب نے اس طرح کیا کہ دو

★[1] یہ پیوندی اقتباسات اب اس لیے حذف کردیے ہیں کہ محوّلہ بالا مضمون ''سیف الملوک، ملوک الکلام'' اس کتاب میں شامل ہے۔

کتابیں تو اس وقت مرحمت فرمائیں اور تیسری کل رات کو، کس منہ سے کہوں کہ ہنوز استفادے سے محروم ہوں۔ کتابوں سے قطع نظر، خود مصنف سے بڑی باقاعدگی سے سرراہے مڈبھیڑ ہر پانچویں برس ہو جاتی ہے۔ بقول مرزا، جب کسی دوست یا شناسا سے پانچ چھ سال تک ملاقات نہ ہو تو یقین جانو کہ وہ کراچی ہی میں ہے اور خیریت سے ہے۔ اگر لاہور میں یا کہیں اور ہوتا تو چھٹے چھماہے ضرور ملتا۔ اس صورتِ حال کا ایک پہلو یہ ہے کہ میں اور شفیع عقیل ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ شاید اسی لیے ایک دوسرے کی دل سے عزّت کرتے ہیں۔

شفیع عقیل مجھے ''شاہ جی'' کہتے ہیں، جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ''خاں صاحب'' اور مسرور حسن خاں ''سیّد صاحب'' کہہ کر میرے درجات بلند کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے شفیع عقیل سے پوچھا ''بندہ پرور، آپ مجھے شاہ جی کہہ کر کانٹوں میں کاہے کو گھسیٹتے ہیں؟ میں نے تو حاشا و کلّا اپنے سوا کبھی کسی کو گمراہ نہیں کیا۔''

فرمایا ''خدا کی قسم، میں آپ کو شاہ جی احتراماً نہیں کہتا، محض عادتاً کہتا ہوں۔ ڈرائیور، چپراسی، حتیٰ کہ جھاڑو پونچھے والی ماسی اور اپنے سڑیل باس کو بھی شاہ جی کہتا ہوں۔ وہ تو ذرا بُرا نہیں مانتے! زیادہ عرصہ نہیں ہوا، دلّی میں ایک کانفرنس کے دوران ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی۔ میں انہیں بھی شاہ جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بہت خوش ہوتے تھے۔ وقتِ رخصت بغل گیر ہوئے۔ پھر مجھے اپنی ہڈّی توڑ جپھی سے release کرتے ہوئے بولے کہ زندگی میں پہلی بار کسی نے عزّت سے پکارا ہے! ورنہ سردار جی! سردار جی! سنتے سنتے میرے تو کان پک گئے!''

اب میں بھی شفیع عقیل کو شاہ جی کہنے لگا ہوں! خدا اور حاضرینِ محفل گواہ رہیں کہ میں بھی احتراماً نہیں کہتا، بلکہ محض جواباً اور تکیۂ تخاطب کے طور پر!

لقب کہیئے، خطاب کہیئے یا طنزِ ملیح، مجھے تو یہ ایسا بھایا کہ اب میں اُس قصائی کو بھی شاہ جی کہتا ہوں جو دکان میں اُلٹا لٹکے بچھڑے کے ٹھڈّے یعنی ریڑھ کی ہڈّی کے آخری مُہرے کے قریب کالے بکرے کی دُم اُڑس بلکہ ٹرانسپلانٹ کر کے دھڑلّے سے مٹن بیچتا ہے! جواباً وہ مجھے حاجی صاحب کہنے لگا ہے! اور میرے دیئے ہوئے نوٹ دو دفعہ گنتا ہے۔

شفیع عقیل نے کبھی کسی اسکول یا کالج میں بسلسلۂ تعلیم قدم نہیں رکھا۔ اب وہاں لیکچر دینے اور مشاعرہ پڑھنے ضرور جاتے ہیں۔ اپنی محرومی کا سبب وہ غربت اور صرف غُربت کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن بے اُستادے کبھی نہیں رہے۔ انہیں وہ استادِ کامل ملا جو شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

کٹھن زندگی اور کٹھور زمانے سے بہتر و برتر کوئی استاد اور گرو نہیں۔ وہ جو اشک خونیں سے لکھا سبق پڑھاتے ہیں اُسے سمجھنے اور یاد رکھنے کے لیے آموختہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کسی دانا کا قول ہے کہ ہم نے جو پڑھا لکھا ہے، جب وہ ذہن سے محو ہو جائے تو جو کچھ بچ رہے گا، اُسے تعلیم کہتے ہیں! مطلب یہ کہ ''اکو الف تجھے درکار''

انہیں بچپن میں سگے ماموں نے اِغوا کر کے بیگار لی۔ ایک عرصے تک اُس کی بھیڑ بکریاں چَراتے رہے۔ عدالت کے ذریعے ان کی بازیابی ممکن ہوئی۔ رہائی کے بعد انہوں نے کسی سے دو پیسے اُدھار مانگ کر ایک عید کارڈ کسی کو بھیجنے کے لیے خریدا۔ لیکن جس پڑھے لکھے شخص سے اس پر پتہ اور پیغام لکھوانا چاہتے تھے، اُس نے ٹال مٹول کی تو انہوں نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور مصمم ارادہ کیا کہ اب پڑھ لکھ کے دکھاؤں گا۔ جب کچھ شُد بُد ہوئی تو سڑکوں گلیوں میں پڑے ردّی اخباروں کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر شوق سے پڑھتے رہے۔ کہتے ہیں کہ جیسے جیسے پڑھنے لگا، یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے اوپر اُٹھتا جا رہا ہوں۔

۱۹۴۷ء میں لاہور میں سڑکوں پر بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوتی تھیں۔ ٹرینوں سے بھی گاجر مُولی کی طرح کٹی ہوئی لاشیں نکلتی تھیں۔ انہوں نے نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو کر لاشیں اٹھائیں۔ چنوں کی بوریاں ڈھو ڈھو کر مہاجروں میں راشن تقسیم کیا۔ مدتوں کوڑے کے ڈھیروں اور گھوروں سے ٹین کے ڈبے اور بوتلیں جمع کرتے رہے۔ جلد سازی بھی سیکھی۔ ایک دوست کی شراکت میں سائن بورڈ پینٹ کرنے کی دکان اُس جگہ کھولی جہاں آج کل لاہور ٹی وی اسٹیشن ہے۔ مدتوں حمالی اور بار برداری کی۔ سڑک کے کنارے چھابڑی بھی لگائی۔ ان کے والد راج مزدور تھے۔ بیٹے نے رِیت نبھائی۔ محنت مزدوری کی اور غربت میں باوقار اور حوصلہ مند رہنے کا جانکسل ہُنر سیکھا۔ ایک زمانے میں ایکٹر بننے کا شوق بھی چُرایا۔ فرماتے ہیں، شاہ جی، میں نے دھندے سارے کیے ہیں۔ سب رستے دیکھے بھالے ہیں۔ ناکام نہیں گزرا۔ ہر کام جم کے کیا۔ رَج کے کیا۔

قرائن کہتے ہیں کہ نہ کرنے کے کام بھی انہوں نے بڑی دِلجمعی، لگن اور تندہی سے کیے ہوں گے۔

۱۹۵۰ء میں کراچی آئے تو ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ رختِ سفر میں ایک رجسٹر تھا جسے ان کے سُلگتے افسانوں کا (بقلم خود) مخطوطہ کہنا چاہیے۔ افسانے مجید لاہوری کو، جو ''جنگ'' میں کالم لکھتے تھے، بہت پسند آئے۔ مئی ۱۹۵۰ء سے شفیع عقیل بھی ''جنگ'' میں کام کرنے لگے۔ اور آج بھی بحمد اللہ اسی سے وابستہ ہیں۔ وفاداری بشرط استواری کی زندہ و تابندہ مثال! کیا ہی اچھا ہو کہ

مئی ۲۰۰۰ء میں جنگ اخبار اپنے اس دیرینہ و وفادار خدمت گزار کی گولڈن جوبلی شایانِ شان طریقے سے منائے۔ انہیں اُس زمانے میں ''جنگ'' سے ساٹھ روپے اور رسالہ ''نمکدان'' سے پینسٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خطیر رقم کو کیسے اور کس مَد میں ٹھکانے لگائیں۔

ایک وہ زمانہ تھا جب جُھگّی میں رہتے تھے۔ صدر سے پیر الٰہی بخش کالونی کا بس کا کرایہ پانچ پیسے تھا جو وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم جلیس، عزیز کارٹونسٹ اور دو تین دوست مل کر نیو چالی سے کالونی تک گاتے بجاتے، دُند مچاتے، پیدل جاتے۔ بعد میں ایک 'کھولی' میں رہنے لگے۔ از قسم بستر ایک رضائی تھی جسے گرمیوں میں بچھا لیتے اور سردیوں میں سب دوست اوڑھ کے سو جاتے تھے۔ ہوٹل والا چار آنے اُدھار پر کھانا دیتا تھا۔ اتوار کو ''ادھار'' کی ''لِمٹ'' بڑھا کر چھ آنے کر دیتا تھا۔

شفیع عقیل ہر اعتبار سے غیر معمولی اِنسان ہیں جس عمر میں ہم جیسے گنہ گاروں کو شادی کی خواہش رسماً، شرعاً یا ضرورتاً محسوس ہوتی ہے، اُس عمر میں ان کو ساری عمر کنوارا رہنے کی آرزو تھی جو آج بھی اپنی پوری صلاحیت اور شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ بھری جوانی میں انہوں نے کنواروں کا ایک کلب بنایا جس میں بشمولِ بانی، کل تین ممبر تھے! اپنی دانست میں یہ لڑکیوں کو رجھانے، اچنبھے میں ڈالنے اور ازالۂ تجرّد کرنے پر اُکسانے کا ایک عیارانہ طریقہ تھا! ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں ان برہمچاریوں کا پیچھا کریں گی، مگر ہوا یہ کہ پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی! گویا جو جال انہوں نے مچھلی پکڑنے کے لیے دریا میں پھینکا تھا اُس میں مگرمچھ پھنس گیا! کلب کا اور دو ممبران کے کنوار پن کا خاتمہ سامنے فلیٹ میں رہنے والی لڑکیوں کے عشق پر ہوا!

میں نے ان سے پوچھا ''آپ نے اس فلیٹ کے باقی ماندہ رومانی امکانات پر توجہ نہیں فرمائی؟''

بولے ''میں دن بھر چنے کی بوریاں اور مُردے ڈھوتے ڈھوتے اتنا ہلکان ہو جاتا تھا کہ کسی زندہ کو handle کرنے کے لائق نہیں رہتا تھا!''

شفیع عقیل کو گھر میں کبھی بیوی کی کمی محسوس نہیں ہوئی، جس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُن کا بیشتر وقت اپنے گھر میں نہیں گزرتا۔ شادی کے خیال سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ بھی متاہلانہ یعنی اِزدواجی زندگی کو محبت بامشقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور گرہستی جیون کو جنسی گزر بسر کی ایک شریفانہ، توکل پسندانہ اور باکفایت یعنی کم خرچ بالانشین شکل قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ''کوٹھوں'' پر جانے والوں کو شاہ خرچ بالاخانہ نشین کہتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا ''شاہ جی، اُس زمانے میں کوئی عشق بھی کیا؟''

فرمایا، کیوں نہیں۔ خود سے دُگنی عمر کی ایک سکھنی سے عشق ہو گیا تھا، جس کے اظہار کے لیے اُٹھتے بیٹھتے اسے فانی بدایونی کے اشعار سناتا تھا، جن سے وہ ایسی بدکی کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی فانی کے دیوان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ بھی تو فانی سے بدکتے ہیں۔ اُس دن جب آپ نے محفل میں فانی کا وہ بدنام ''کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ'' والا سوگوار شعر سنایا تو وہ سکھنی بے طرح یاد آئی۔ آپ کا منہ چومنے کو جی چاہا!

اس باب میں ہم نے زیادہ کُریدا تو طغیانی پر آئے دریائے شباب کو ایک کُوزے میں بند کر دیا۔ فرمایا ''شاہ جی، میں نے ہر مزہ چکھا ہے!''

وہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ مسلسل پچاس سال کے شغل اور ایک عُمر کی بدپرہیزی کو اگر محض ''چکھنا'' کہتے ہیں تو ہماری حسین حیاتی مسرت آوارگی کے لیے اُردُو ڈکشنری میں کوئی لفظ نظر نہیں آتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ دانا منہ بنا کے پیتے ہیں اور نادان پی کے منہ بناتے ہیں۔ ہمارے شاہ جی نے ہر کام کیا۔ بڑے شوق اور چاؤ سے کیا۔ نہ پہلے منہ بنایا، نہ بعد میں منہ چڑایا۔ اپنے فالج کا حال بھی اس طرح سناتے ہیں جیسے اگلے وقتوں کے شاعر خیالی وصل کی داستان رقم کرتے ہوئے زبان و بیان کے چٹخارے لیتے ہیں۔

شاہ جی نے کرنے اور نہ کرنے کے کاموں کے لیے مناسب وقت اور موقع کا انتظار کبھی نہیں کیا۔ ادھر علالت سے قبل، تقریباً ہر سال، گیارہ ماہ کی جمع شدہ حسرتِ سیر و شکار نکالنے اور فارن ایکسچینج کا سالانہ کوٹا ٹھکانے لگانے یورپ جاتے اور نت نئے مشاہدات و تجربات سے لدے پھندے لوٹتے تھے۔ ابنِ انشا مرحوم بہت یاد آتے ہیں وہ جہاں بھی جاتے، گڑیاں ضرور خرید کر لاتے جنھیں سیاحی سے ناآشنا دوستوں کو دکھا کر بچوں کی طرح خوش ہوتے اور سفرنامہ پڑھنے کی تلقین کرتے۔ زندہ گڑیوں کے حالات، حرکات و کمالات خاص الخاص مخلصین و مقربین کو بہ زبانِ سیاح سنا کر باور کراتے کہ

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

صاحبو، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ قصہ تو دراصل ایک ہی ہوتا ہے جسے سو سو طرح سے بیان کر کے مَسافت کو طول، لطفِ مسافرت اور خبرِ تحیّر سفر کو اعتبار بخشتے ہیں۔ لفظ کا نشہ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ ایک گھونٹ، ایک چُسکی میں سو بوتلوں کا نشہ اسی میں دیکھا۔ یہ واحد نشہ ہے جس کا اُتار نہیں۔ حرفِ راز و فلک سیر کے رسیا جانتے ہیں کہ اسے جب دیکھو، جب بھی بولو اور جب جب سوچو یہ شرابِ ناب سہ آتشہ سے صد آتشہ بنتی جاتی ہے۔

غالبؔ کلکتے کا ذکر آتے ہی تڑپ اٹھے:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے!
وہ سبزہ زار ہائے مُطرّا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے!
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت رُبا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے!
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے!

خوبصورت، لیکن بظاہر بے محل ہے اس یادگار قطعہ کو یہاں نقل کرنے سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ غالبؔ کے ہوش وحواس پر جیسا شب خُون صرف ایک شہر کلکتے میں پڑا، ویسا ہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تابڑتوڑ حملے شاہ جی کے پانچوں حواس اور تینوں اعضائے رئیسہ...... دل، دماغ، جگر...... پر یورپ کے ہر اُس شہر میں ہوئے جہاں ہوسِ سیر وتماشا انہیں کشاں کشاں لے گئی۔

قطعہ میں یہ نکتہ دادطلب ہے کہ یاد میں فریاد کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ہائے ہائے! چار دفعہ آئی ہے کہ یہ ردیف ہے اور طرزِ آہ وفُغاں بھی۔ قابلِ غور یہ پہلو بھی ہے کہ ہائے ہائے! میں ہر بار حیرت، حسرت، وارفتگی، سوز وگداز اور گدگُدی کی ایک بدلی ہوئی لے سنائی دیتی ہے۔ لہٰذا جب تک ہر شعر میں باندازِ دگر ہائے ہائے نہ کی جائے اور مختلف سُر نہ لگایا جائے، نظر اور نیت کا فتور آشکار نہ ہوگا۔ پھر صاف نظر آئے گا کہ کلکتے ★[1] کے بازاروں، یوروپین بنگلوں، تفریح گاہوں اور سبزہ زاروں سے کوئی ایسا ویسا یک رُخا، یک سُرا، یک رنگا اور یک فنا غزل گو نہیں گزرا۔ ان راہوں سے تو ابھی ابھی غالبِ آشفتہ نوا غزل سرا گزرا ہے۔ کہے دیتی ہے شوخیِ نقشِ پا کی۔

غالبؔ اور شفیع عقیل کے کیفِ نظارگی میں ایک بیّن فرق یہ بھی ہے کہ جہاں غالبؔ دل پکڑ کے ہائے ہائے کرتے ہیں وہاں شفیع عقیل اپنا پاسپورٹ اور فارن ایکسچینج بائیں اندرونی جیب میں سینے سے لگائے واہ وا، واہ! کرتے جاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ انہوں نے آیندہ سال اور اس کے بعد سال، کے سال یورپ جانے اور شہر شہر واہ وا! واہ وا کرنے کی ستّر سالہ منصوبہ بندی بلکہ منسوبہ بندی کر رکھی ہے! کوچۂ ملامت کا طواف تو عام ہے۔ دانا دسیانا وہ ہے جو کوچہ ہائے ملامت اور سبب ہائے ندامت بدلتا

★[1] کلکتہ اگر اُس زمانے میں اس کا نام، اِملا اور تلفظ کول کتا ہوتا تو میرا خیال ہے غالبؔ ایسی للک اور آزردہ آرزومندی سے اس کا ذکر نہ کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ "کول کتہ" کے بدیہی تنافرِ لفظی اور صوتی کراہت کے پیشِ نظر وہ اس نام کو شعر میں باندھنے سے احتراز کرتے۔ بنگالی phonetics (صوتیات) اور لہجے کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اگر آپ کلّے میں رس گُلا دبا کے اس کو اور اس کے رس کو تول، پول اور گول کر کے کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ یا جُملہ بولیں تو وہ ٹھیٹ بنگالی معلوم ہوگا!

رہے۔ تیلی کا بیل بھی اس وقت تک ایک ہی کولھو کے گرد چکر نہیں لگاتا جب تک کہ اُس کی آنکھوں پر blinkers (اندھیری۔کھوپے) نہ چڑھا دیئے جائیں۔

ہمارے سامعین و قارئین گواہ ہیں کہ منہ اور نوکِ زبان پر آئی بات روکے نہیں رُکتی! اللہ معاف کرے، ہم خود کو اس بدگمانی سے باز نہیں رکھ سکتے کہ غالب، غالباً کیا یقیناً، کلکتے میں اسکاچ وہسکی اور شیریں ادا فرنگنوں پر دل و جان و ایمان سے فریفتہ ہو گئے۔ رہے سبزہ زار ہائے مُطرّا اور میوہ ہائے تازہ و شیریں تو وہ فقط ایک نظر فریب فریم کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں نازنیں بُتانِ خود آرا کی تصویر لشکارا مارتے نگینے کی طرح جَڑ دی گئی ہے۔ غالب وہاں لان پر کُلیلیں کرنے یا میٹھا کدّ و اور مُنشی جڑ گنج کا چتّی دار کیلا کھانے تھوڑی گئے تھے۔ دراصل وہ گئے تو تھے اپنی پنشن کا مقدمہ لڑنے، مگر لوٹے میموں کی مفارقت کا داغ دل پہ لے کر! واضح ہو کہ مفارقت کی سب سے عام، ظالم، دائمی اور باؤلی صورت وہ ہے جو بغیر قُربت کے واقع ہو! یعنی یک طرفہ فریفتگی اور چاہت!

یہ بُقراطی سی تمہید دراصل اس لیے باندھنی پڑی کہ ہمارے شاہ جی کو ملازمت کرتے پچاس برس ہو گئے، مگر انہوں نے آج تک یہ نہیں کہا کہ میں اپنی پنشن کا مقدمہ لڑنے لڑانے کی غرض سے دیس بدیس مارا مار پھرتا ہوں۔ اور گھاٹ گھاٹ کے پانی سے غسل کر کے آتا ہوں۔

شاہ جی تادمِ تحریر ''کنفرمڈ'' کنوارے ہیں۔ ان کی سدا سُہاگن جوانی سے توقع نہیں کہ شادی کا تکلف کر کے خود کو خواہ مخواہ مقدّس بندشوں کا پابند کریں گے۔ کنوارے ہیں، کنوارے ہی رہیں گے۔ لیکن کیسے کنوارے؟ ایسے ویسے! انوکھے، اوکھے، البیلے! وقت کم ہے اور محفل میں خواتین بھی موجود ہیں۔ لہٰذا صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اگر وہ عورت ہوتے تو کبھی کی ''کاروکاری'' ہو چکی ہوتی! یہ بات میں الزام تراشی یا بُہتان طرازی کے طور پر نہیں کہہ رہا، بلکہ کاروکاری کی مذمت مقصود ہے۔ بڑی بُری رسم ہے۔

انہوں نے بہت مصروف، پُرطمانیت اور بامقصد زندگی گزاری ہے۔ جسے ہر اعتبار سے بھرپور کہا جا سکتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ دنیا ایک بُتِ ہزار شیوہ و صد ہزار عشوہ ہے، اُس سے رشتۂ وفا استوار رکھا۔ اُسے ہُنر مندی سے برتا، پرکھا، بھوگا، بَوسایا اور چاہے جانے کی فطری خواہش پر قابو پا کر، چاہنے کی طرح چاہا۔ اُس کے تلوّن، طُرفہ ماجرائی اور بوالعجبیوں سے کبھی بے مزہ نہ ہوئے۔ تمام سرگرمیوں اور ہر کام کو مشن جان کر پورے لطف اور ذوق و شوق کے ساتھ سرانجام دیا۔ مجلس اور تفریحی شب گرمیوں میں بھی اسی طور اور اتنی ہی تندہی سے حصّہ لیا۔ وہ ہر دور اور ہر اِبتلا و آزمائش میں ایک حوصلہ مند، زندہ و زندہ دل انسان نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا اِدّعائے برتری

کچھ ایسا غلط یا خالی خولی تعلّی غیر شاعرانہ معلوم نہیں ہوتی:

''زندگی کے سوا کوئی چیز اہم نہیں...... میں زندگی کو زندہ ہستیوں کے اندر ہی دیکھتا ہوں۔ باہر جتنی بھی مُردہ چیزیں ہیں، زندہ چیزوں کا ضمیمہ ہیں۔ مُردہ شیر سے زندہ کتا ہونا بہتر ہے۔ مگر زندہ کتے سے زندہ شیر ہونا بہتر ہے۔ میں ایک زندہ بشر ہوں اور خود کو کسی بھی سائنس داں، اولیاء یا فلسفی سے بالاتر سمجھتا ہوں، کیوں کہ یہ سب زندہ انسان کے مختلف اجزاء کے ماہر ہیں۔ مگر ان اجزاء کی سالم صورت کا اِدراک نہیں رکھتے۔ جُزو کی نسبت کُل ایک بڑی چیز ہے۔ اور زندہ بشر ایک کُل ہے۔''★[1]

ڈی۔ ایچ۔ لارنس

پسند ناپسند کا ذکر آیا تو شاہ جی کہنے لگے ''کتاب سے عشق ہے۔ بہت پڑھتا ہوں۔ مگر زندگی میں کوئی کتاب کبھی دوبارہ نہیں پڑھی۔ افسانے نہیں پڑھتا۔ ناول سے ہول آتا ہے۔ 'نان فکشن' پڑھتا ہوں۔ جب تک زندہ ہوں پڑھتا لکھتا رہوں گا۔''

ادبی تقریبوں اور جلسوں میں نہیں جاتے۔ فرماتے ہیں ''صرف اپنے فنکشن میں جاتا ہوں۔'' اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ اس میں انہیں طوعاً و کرہاً تالی نہیں بجانی پڑتی۔ یہ فریضہ دوسروں کو انجام دینا پڑتا ہے۔

میں نے پوچھا ''شاہ جی، آپ کو بال کس رنگ کے پسند ہیں؟''

بولے ''کسی بھی رنگ کے ہوں۔ میں تعصب نہیں برتتا۔ بس سفید نہ ہوں۔''

سوال: ''آپ کو کراچی میں رہتے پچاس برس ہو گئے۔ اب آپ کو شہر زندہ دلاں لاہور کیسا لگتا ہے؟''

جواب: ''خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جہاں جہاں بچپن میں مصیبتیں جھیلیں اور مشقتیں اٹھائیں، جہاں چھابڑی لگائی، بوجھ ڈھوئے...... وہ سب جگہیں مجھے پہچانتی ہیں۔ دور سے اشارے کر کر کے بلاتی ہیں۔ لاہور میں اگر ایک گھنٹے بھی قیام کروں تو تین مقامات پر ضرور حاضری دیتا ہوں۔ داتا صاحب۔ میاں میر صاحب اور شاہ حسین۔''

''آپ ان تینوں آستانوں پر ایک گھنٹے میں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟'' میں نے چھیڑا۔

''یہ بھی ان ہی بزرگوں کا فیضان ہے۔'' انہوں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے فرمایا اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

سوال: ''آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ مے خانہ نشینی سے ترقی کرتے کرتے خانہ نشینی پر اُتر آئے ہیں۔ اپنی

★[1] ترجمہ میرا نہیں ہے۔

عمر کے کس حصے کو آپ بہترین دور گردانتے ہیں؟''

جواب: ''لااُبالی پن کا وہ زمانہ جب میں مُجھّی میں رہتا تھا!''

یہ دعوئ عاجزانہ اور اعترافِ فاخرانہ شاہ حسین اور بُلھے شاہ کا شیدائی ہی کر سکتا ہے۔

انہوں نے کچھ غلط نہیں کہا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں ساری عمر عیش کیا ہے۔ غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں عیش کی جو تعریف کی ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں ''سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلّف عمر بسر کرے، اُس کا نام عیش ہے۔'' شاہ جی نے اس عیشِ فرواں میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی برابر شریک رکھا ہے۔

مرزا اس مضمون کا مسوّدہ یہاں تک پڑھ کر بولے ''بندۂ خدا۔ کمال کر دیا! تم نے شفیع عقیل کی کتابوں پر مضمون لکھا ہے یا غالب کی ۱۳۱ ویں برسی پر نذرانہ عقیدت پیش کر رہے ہو؟ دس صفحوں میں گیارہ دفعہ غالب غالب کر چکے ہو۔ غلبۂ غالب کب تلک؟''

سو میری توبہ۔ مگر صرف اس مضمون کی حد تک۔

اس زباں بندی کے باوصف، مجھے یقین ہے کہ جو شخص کلامِ غالب اور ذکرِ غالب سے اُکتانے لگے یا بدحظ ہو، اُسے میرے دل سے نکلی بدُعا لگے گی۔ وہ لمبی عمر پا کر جب جائے گا تو وہاں اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نثری نظمیں ترنّم سے ہمہ وقت سُناتے رہنے پر مامور و مجبور کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے ڈھیلی اور سیلی ہوئی ڈھولک پر غالب کی منہ لگائی ڈومنی کا تال بے تال گانا ابدالآباد تک سنتے رہنا ہوگا! خنجری بجا کے اُس ستم پیشہ کے ساتھ جو سنگت کرنا پڑے گی وہ الگ!

زندگی کے مصائب و شدائد شفیع عقیل کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ فالج تک ان کے قہقہے کی گونج اور گمک کو دھیمی نہ کر سکا۔ بس ایک بلائے ناگہانی باقی ہے:

ہے جُرمِ تجرّد کی سزا عقدِ مُفاجات

ایک ہفتے قبل ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ کو چاق چوبند دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ بولے، ہاں۔ بالکل نارمل ہوں۔ بس ذرا تیز نہیں چل سکتا۔ میں نے کہا، جو لوگ صبح سویرے ساحلِ سمندر اور پارکوں میں کدکڑے لگاتے یا تیز قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اُنہیں اپنی ٹانگوں کے حُسنِ کارکردگی پر کون سا صدارتی ایوارڈ یا اولمپک گولڈ میڈل مل جاتا ہے؟

''شاہ جی، ہم دونوں ہی سچ کہتے ہیں!'' یہ کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ان کے قہقہے کے لیے انگریزی لفظ belly laugh سے بہتر کوئی لفظ نہیں ملتا۔ یعنی ایسا قہقہہ جو منہ، حلق یا فقط ساؤنڈ باکس سے

نہیں، بلکہ پیٹ کی گونجیلی گہرائیوں سے نکلے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ اکثر اپنے لطیفے اور فقرے کی داد خود ہی اس طرح دیتے اور طلب کرتے ہیں کہ قہقہہ لگاتے ہوئے اپنا زانو دائیں ہاتھ سے پیٹنے کے بعد، وہی داد دہندہ ہاتھ سننے والے کے سامنے پھیلا دیتے ہیں تا کہ وہ اس پر اپنا ہاتھ مار کر دادِ ظرافت دے۔ شاہ جی کا طریقۂ داد و دارات مختلف ہے۔ یہ دوسرے کے فقرے پر بھی اپنا ہاتھ پھیلا کر دادِ سماعت وصول کرتے اور پرایا زانو پیٹتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ دوسرے کے فقرے کو اپنا فقرہ اور دوسرے کی ران کو اپنی ران سمجھ کر پیٹ پیٹ کے لال کر دیتے ہیں!

''بیلی لاف'' پر یاد آیا کہ میں نے ان سے پوچھا ''شاہ جی، آپ کو ڈانس کون سا پسند ہے؟''

بولے ''Belly dance''

میں نے کہا ''شاہ جی، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے کہ بیلی ڈانس میں فقط پیٹ ناچتا ہے۔ باقی وجود دیکھتا رہ جاتا ہے!''

فرمایا ''شاہ جی، ہم دونوں ہی سچ کہتے ہیں۔ پر میں اس پر عمل بھی کرتا ہوں!''

اِس مردِ مجرّد کے ایامِ جوانی کا قصہ ہے۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے جنسی افسانوں کا ایک سُلگتا بھبکتا مجموعہ شائع کیا، جس کا نام ''بھوکے'' تھا۔ فرماتے ہیں ''نام بدل بدل کے ہر افسانے میں بھوکا میں خود ہی تھا!'' واضح ہو کہ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو گنتی کے نوالے حلق سے اتارنے کے بعد مِٹ جاتی ہے۔ دوسری بھوک جو کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے، وہ یہ نوالے ہضم ہونے کے بعد گرم اور شور انگیز خون سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان کی جبلّی اور وحشی بھوک اور پہلی پیاس ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر زیرِ دفعہ ۱۹۲ تعزیراتِ پاکستان فحاشی کا فوجداری مقدمہ ثُریا بیگم مجسٹریٹ کی عدالت میں چلا۔ گواہانِ صفائی کی فہرست میں شورش کاشمیری، سعادت حسن منٹو، مولانا عبدالمجید سالک اور دیگر بڑے ادیب تھے جن کو عدالت میں اصالتاً پیش کرنا شفیع عقیل کے بس کی بات نہ تھی۔ عمائدین و اکابرین کی یہ فہرست تو کہاوت والی مینڈکوں کی پنسیری ثابت ہوئی جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ مینڈک انصاف کی ترازو سے ایک ایک کر کے پھدک کر نکل گئے۔ نتیجہ یہ کہ عدالت نے چھ ماہ قید اور ۱۰۰۰ روپے جُرمانے کی سزا سنادی!

میں نے ازراہِ ہمدردی کہا ''آپ غالباً پہلے ادیب ہیں جسے عُریانی اور فحاشی کے جرم میں چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ کیا آپ کے خیال میں آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی؟''

بولے ''نہیں۔ ناانصافی قطعاً نہیں ہوئی۔ وہ افسانے تھے بھی اسی لائق کہ مصنف کو جیل بھیج دیا

جائے۔''

اڑتالیس سال گزرنے کے بعد اس سزا پر شاہ جی کا واحد اعتراض اب یہ ہے کہ صرف تین مہینے کی ہونی چاہیے تھی جو کسی بھی نوجوان amateur اور سیکھتر فحش نگار کے جوشِ بلوغت و زورِ ابلاغ کو اعتدال پر لانے کے لیے کافی ہوتی۔

جوانی کے سارے قصے، قضیے اور فضیتے انھوں نے نوجوانی ہی میں نپٹا دیے۔ جو اتفاقاً اور سہواً باقی رہ گئے، انھیں پیری کی پختہ کاری اور دیدہ وری بلکہ ندیدہ وری کے لیے اُٹھا رکھا۔ کچھ بچے، وقت سے پہلے پکی پکی باتیں اور ویسی ہی حرکتیں کرنے لگتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ عین جوانی میں بڑھاپے کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ عمرِ رواں کا احساس اُنھیں تنگ جُوتے کی طرح ہمہ وقت کاٹتا رہتا ہے۔ ہم بعض ایسے شاعروں سے واقف ہیں جو ہماری طرح مدّت العُمر سے شِدّت العُمر میں مبتلا ہیں! کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ایامِ جوانی کے کلام میں ابہام اور ذم کا پہلو جھلکتا تھا اور اب عہدِ پیری کے اشعار سے زمزم چھلکتا ہے۔ کچھ شاعر اور ادیب ایسے بھی ہو گزرے ہیں جن کے لفظ کی امر جوانی پر بڑھاپے کے بڑھتے سائے کبھی نہیں پڑے۔ گردشِ لیل و نہار اور دہلا دینے والی رستاخیز اُن کے عزم و حوصلے کو پست نہ کر سکی۔ چشمِ تصور خیام اور حافظ شیرازی کو بڑھاپے کے روپ میں دیکھنے سے قاصر اور انکاری ہے۔ اس کا اطلاق جوش ملیح آبادی، ممتاز مفتی اور ضمیر جعفری کے سدا بہار قلم پر بھی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے ممدوح کی تحریر بھی نکھرتی، اُجلتی اور سنورتی جاتی ہے۔ ان کی میوز (Muse) موقع و محل اور کچھ اُدھر کا اشارہ بھی دیکھ کر چٹکی لینے اور سرِ راہے گاہے چُہلوں سے باز نہیں آتی۔

ایک زیرک اور حساس صحافی کی چشمِ نگراں نے پچاس برسوں میں کوئی بیس حکومتوں کو دھوم دھڑکے سے بنتے، بڑھکیں مارتے اور بے عزّتی سے رخصت ہوتے دیکھا ہے۔ حیف در چشم زدن صُحبتِ من آخر شُد اور ایک حکومت پر ہی موقوف نہیں، لوگ بھی جاگتی آنکھ سے خواب اور سوتی آنکھ سے حالاتِ حاضرہ کا مشاہدہ کرتے آئے ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ حالیؔ کا سوسوا سو سال پرانا مگر حسبِ حال شعر، دوسرے مصرعے میں تصرّف اور سکتے کے ساتھ، پڑھتے ہیں:

ے آنکھ سب ایک کُھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی
اس میں سندھی ہیں، مہاجر بھی ہیں، پنجابی بھی ★[1]

★[1]
آنکھ سب ایک کُھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی
اس میں مُسلم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی

جب دو آنکھیں زائد از ضرورت معلوم ہونے لگیں اور ایک بچی کچی سی آنکھ سے دیکھنے کی عادت پڑ جائے تو تسلیم و رضا کا شیوہ اتنا پختہ اور عقیدہ اتنا محکم ہو چکا ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ ذاتی نالائقی بھی سراسر من جانب آسماں معلوم ہوتی ہے!

صحافت اور ''جنگ'' سے ان کی پیشہ ورانہ اور جذباتی وابستگی نے پچاس بہاریں دیکھی ہیں۔ از رُوئے حساب و قیاس و قنوطیت، خزائیں بھی اتنی ہی ہوں گی۔ جو کام بھی انہیں تفویض ہوا یا صحافت اور تصنیف و تالیف کا جو شعبہ یا عنوان انہوں نے اپنے لیے تجویز یا مختص کیا اس کی بجا آوری اور تکمیل میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ ان کی لگن، تن دہی اور جگر کاوی کا ثبوت پچیس کتابوں کے علاوہ وہ بکھرے ہوئے مضامین بھی ہیں جو کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ان کے ذاتی خزینے میں نادر اور بیش بہا پینٹنگز اور ان پر وہ مضامین بھی ہیں جو وہ تواتر سے لکھتے رہے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس آرٹ اور آرٹسٹوں کے بارے میں ایسے اور اتنے مبسوط تبصرے اور معلومات اردو میں کسی اور نے بہم نہیں پہنچائیں۔ انہوں نے پاکستانی صحافت کے تاریخ ساز ادوار اور نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ فراز کم، نشیب زیادہ اور نشیب سے بھی بدتر جمود و بے ضمیری کا چٹیل اور بے برگ و بار پلیٹو۔ انہوں نے ظفر علی خان، چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کا آخری دور دیکھا۔ ڈھلتے سورج کی تابش و تابناکی دیکھی اور دوسروں کو دکھائی۔

پھر نیرنگیٔ دوراں نے وہ دن بھی دکھائے جب صحافت میں حُبِ جاہ اور جلبِ منفعت کی قلم لگائی گئی جسے عُرفِ عام میں ''لفافہ جرنلزم'' کہتے ہیں۔ شاہ جی اس گلشنِ پُر خار سے خود کو زخمائے بغیر بے نیازانہ گزر گئے۔ سیاست کی کثافت و عفونت اور polarization (قطبینی بُعد اور تضاد) کے مخرّبِ اقدار اثرات سے کتنے صحافی ہیں جو خود کو بچا لے گئے۔ اس ''سِناریو'' (منظر نامے) میں حکومتیں اگر Fourth Estate اور الیکٹرونک میڈیا کو اپنا زر خرید ترجمان و تابع فرمان بنانا چاہیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ صحافی ہو یا سیاست داں، جج ہو یا بیوروکریٹ ــــــ یہ سب اُسی ترکیب سے پکڑائی دیتے ہیں، جس سے بعض علاقوں میں بندر پکڑے جاتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ناریل میں بس اتنا سا سوراخ بنا دیا جاتا ہے کہ بندر کا صرف پنجہ اندر جا سکے۔ بندر اس میں ہاتھ ڈال کر مٹھی میں بہت سا کھوپرا بھر لیتا ہے۔ لیکن اب بھری مُٹھی کو تنگ سوراخ سے نہیں نکال پاتا۔ مُٹھی کھول کر نرم اور میٹھا کھوپرا چھوڑنے اور اس قیمت پر ہاتھ چھڑانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسی طرح ایک ہاتھ ناریل میں پھنسائے، تین پایہ بنا، لنگڑاتا پھدکتا پھرتا ہے اور آسانی سے پکڑا جاتا ہے۔ پھر ساری عمر مداری کی ڈُگڈُگی اور اشاروں پر گلی گلی اُچھل کُود دکھاتا، لونڈوں سے منہ چِڑاتے اور بھبکی دینے کے مقابلے میں ہار مانتا، ہاتھ پھیلا

پھیلا کے پیسے مانگتا اور دو ٹانگوں پہ کھڑا ہو کے سلام کرتا ہے۔ حلال روزی کما کے مالک کو دیتا ہے۔ مداری اگر رحم کھا کر اسے جنگل میں آزاد چھوڑ بھی دے تو تر نوالے کے لالچ میں تراٹ واپس آئے گا اور کسی نئے مداری کی تلاش میں مارا مارا پھرے گا۔ دوبارہ جنگل میں چتوں، گھاس پھوس اور بھنگلوں بھرے گولروں پر گزارہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسی آزادی کو لے کے کوئی کیا چاٹے۔ ایسی آزادی تو صرف بے ہُنر ٹھوٹھ جنگلی بندر اور کھوہ اور گپھاؤں کے باسی دو ٹانگ والے نِرے خُوش ★ بَن مانس چاہتے ہیں! اُنھی کو مبارک ہو۔

سو یہی احوال ان حضرات کا ہوتا ہے جن کے معزز پیشوں کے نام ابھی گنوائے ہیں۔ صحافیوں کی تخصیص نہیں۔ ایں خانہ ہمہ داغدار است۔ پھر بدگمانی اور شک وشبہ سے مملو ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حالیہ بارش یا نئی فصل کے خربوزے کی بھی تعریف کرے تو اسے حکومت کا آدمی سمجھا جاتا ہے! ایک زمانے میں تو بے توقیری اتنی بڑھ گئی کہ حکومت نے صحافیوں کو بے اثر و بے ضرر اور سینگ کٹا جان کر اُن کی مخالفت کا نوٹس لینا اور پکڑنا ہی چھوڑ دیا جس سے ان کی بڑی ہیٹی ہوئی!

آپ کے صبر، توجہ اور حسنِ سماعت کے دلی شکریے کے ساتھ گزارشات کی طوالت کی معذرت بھی قبول کیجیے۔ جیسا کہ آغاز ہی میں عرض کر چکا ہوں، میں نے تینوں کتابیں نہیں پڑھیں۔ اس لیے مضمون طویل ہو گیا۔

پس نوشت

اس مضمون کے چیدہ چیدہ حصے بطور ۱/۴ خطبۂ صدارت، شفیع عقیل صاحب کی تین کتابوں کی تقریبِ اجراء میں، جو کراچی پریس کلب میں ۱۳ مارچ ۲۰۰۰ء کو منعقد ہوئی تھی، پڑھے گئے۔ اس کے چند روز بعد شاہ جی غریب خانے پر تشریف لائے اور میرے سہو و تسامح کی طرف، جسے غلط بیانی کہنے میں ان کی شائستگی مانع تھی، توجہ دلائی۔ ایک پرچہ میرے حوالے کیا، جس پر چار قابلِ اصلاح اور نا قابلِ درگزر غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی جو اُن کے الفاظ میں کچھ یوں ہیں:

۱۔ ''آپ نے لکھا ہے 'میں افسانے نہیں پڑھتا'، جب کہ میں نے کہا تھا میں آج کل افسانے نہیں پڑھتا۔''

جواب: یہ واقعی بڑا باریک فرق ہے۔ مثلاً کوئی ملزم یہ کہے کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں قتل نہیں کرتا، بلکہ یہ کہا تھا کہ آج کل قتل نہیں کرتا، تو عدالت فیصلہ سنانے سے پہلے دس دفعہ سوچے گی۔ پھر بیس سال کی سزا

★ خُوش: یہ لفظ میں نے روز مرّہ گفتگو میں بارہا سنا ہے۔ (بمعنی وحشی، جنگلی، جانگلو، گنوار، اُجڈ، ناتراشیدہ) لیکن کسی لغت میں نہیں ملا۔ اردو لغت میں صرف اتنا سُراغ ملا کہ خُوشیہ یعنی ملک خُوش کی اُونٹنی بہت عمدہ سمجھی جاتی ہے۔
وہاں کے اونٹ اور آدمی کے بارے میں لغت نویس خاموش اور انگشت بدنداں بلکہ قلم بدنداں نظر آتا ہے!
اسی طرح ملک خُوش کے محلِ وقوع کو بھی قارئین کے قیاس و گمان اور صلاحیتِ خودشناسی پر چھوڑ دیا ہے!

سنائے گی۔

۲۔ ''تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں
آپ نے یہ شعر افتخار عارف کے حوالے سے لکھا ہے۔ یہ عبید اللہ علیم کا ہے۔''

جواب: عرض ہے کہ یہ شعر افتخار عارف کے پہلے مجموعے ''مہر دو نیم'' میں شامل ہے۔ وہ بہت محتاط اور دیانت دار انسان ہیں۔ صورت شکل سے بھی سرقہ کرنے والے نہیں لگتے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے مجموعے میں شامل کرنے سے پہلے انہوں نے پوری طرح اطمینان کر لیا ہوگا کہ مخاطب علیہا اور شعر کسی اور کے نہیں ہیں۔
جب وہ کتاب چھپ رہی تھی تو میں نے لندن میں افتخار عارف سے کہا تھا کہ عزیزم، یہ شعر حذف کر دو۔ اس لیے کہ تمہارے ذہن و شاداب چہرے پر شرمندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ بلکہ تازہ فتوحات کی علامات ہویدا ہیں! مزید برآں، محض زندہ بچ جانے پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوان آدمی کے لیے شرمندہ ہونے کا کوئی نامعقول جواز ضروری ہے۔
جہاں دیدہ ہیں۔ بولے، بلاوجہ شرمندہ شرمندہ پھرنے سے دوسروں کی انا کی تسکین ہوتی ہے!
یہ واقعہ ہے کہ بعض دکھیارے تو اتنا بھی ہیاؤ، حوصلہ اور اہلیت نہیں رکھتے کہ کوئی ایسا کام کر سکیں جس کے بعد خود شرمندگی میں اور دوسرے رشک میں مبتلا ہو جائیں!

۳۔ ''کھڑکیوں میں کھڑی ہونے والی لڑکیوں اور کنوارا کلب کا واقعہ گڈمڈ ہو گیا ہے۔ لڑکیوں کا قصہ ۱۹۴۸ء کا ہے اور لاہور میں دکان کے حوالے سے ہے، جب کہ کنوارا کلب ہم نے ۱۹۵۲ء میں کراچی میں بنایا تھا۔''

جواب: کھڑکیوں اور کنوارا کلب کا نام سنا اور ان کے تیور دیکھے تو میں سمجھا کہ وہ اس بات پر برافروختہ ہوں گے کہ میں نے ان کی مبینہ نظر بازی اور آوارگی کی تشہیر کیوں کی۔ لیکن میرا خدشہ بالکل غلط نکلا۔ وہ اس حکایت کو عام کرنے پر بہت خوش تھے۔ ان کی خفگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ آوارگی کی تاریخیں خلط ملط کر کے محققانہ لاپروائی اور مورّخانہ غیر ذمہ داری کا مرتکب ہوا ہوں!
میں واقعی شرمندہ ہوں کہ میں نے لذتِ آوارگی کو نحوستِ تجرد سے خلط ملط کر کے اپنی غلطی میں سنگینی و رنگینی بھر دی۔
ان کی وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی آزاد روی اور مبینہ آوارگی کے بیان میں بھی وہ اتنے ہی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں اور طریقہ و جائے واردات اور سنہ کی صحت کا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا کہ محققین بزرگوں کی تاریخ پیدائش و وفات کے تعین میں چھان بین سے کام لیتے ہیں۔

۴۔ ''بھیڑ بکریوں کی بجائے مویشی چراتا ہے۔''

جواب: وہ اس لیے بھی آزردہ تھے کہ میں نے روا روی میں یہ لکھ مارا کہ وہ بھیڑ بکری چراتے تھے، جب کہ وہ

گائے بھینس چراتے تھے!

اس اِلتباس کا اعتراف لازم ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ نے ہمیں ڈانٹا ''یار، تم بھی عجیب آدمی ہو! تمیں برس راجستھان کے صحرا میں گزارے اور جھڑ بیری کے بیر گنتے رہے! یہ تک معلوم نہیں کہ چرواہوں اور قصائیوں کی snobbery میں بڑا فرق ہے۔ بھیڑ بکری کا گوشت بیچنے والا قصائی، گائے بھینس کا گوشت بیچنے والے قصائی کے مقابلے میں برتر اور رُودار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بھیڑ بکری چرانے والا چرواہا، گائے بھینس چرانے والے چرواہے سے کمتر اور کم ذات گردانا جاتا ہے۔''

یہ سچ ہے کہ ہم اس فرق اور درجہ بندی سے صرف پچاس فی صد واقف تھے۔ یعنی صرف قصابوں کی حد تک۔ ہمیں تو بچپن میں صرف مرغیاں چُگانے اور انہیں ہنکال کر ڈربے میں بند کرنے کا تجربہ تھا۔ نوجوانی میں چند روز کبوتر بھی پالے، مگر وہ پڑوسی کی چھتری کو پیارے ہوگئے۔ ہمارے پاس ٹاپا اور کابک تو تھے، چھتری صرف مینہ سے بچانے والی رکھتے تھے۔ مرزا بولے ''یار، تم بھی بڑے وہ ہو! یہ کبوتر ہیں کبوتر۔ پرقینچ بیوی یا مرغی تھوڑا ہی ہیں کہ 'خانے، خانے' کی ہانک لگا کے جہاں چاہا بند کر دیا۔''

اللہ جانے، حیوانات کی چوکسائی پر مبنی اس social ladder (سماجی درجہ بندی کی سیڑھی) پر ہمیں کہاں کھڑا کیا جائے گا یا زمین پہ کھڑے ٹاپتے رہ جائیں گے۔

مرزا نے یہ بھی کہا کہ تم نے لکھا ہے کہ ''میں (یعنی شاہ جی) بکریاں چَراتا رہا۔'' جب یہ مضمون چھپواؤ تو ازراہِ کرم چَراتا کی چ پر زبر ضرور لگوانا۔ جلی قلم سے۔ یہ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آگے چل کر تم نے لکھا ہے کہ شاہ جی کو چھ ماہ کی سزائے قید سنائی گئی۔ جس طرح بعض لاپروا لکھنے والے واقعات کو خلط مَلط کر دیتے ہیں، اسی طرح کچھ پڑھنے والے اعراب اِدھر کے اُدھر کر دیتے ہیں۔ زیر کی جگہ زَبر اور زبر کی جگہ پیش لگا دیتے ہیں، جس سے مطلب کے علاوہ آدمی بھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے!

الطاف گوہراور گُڑ کی ڈلی

(ا)

جناب الطاف گوہر، جناب افتخار عارف، خواتین وحضرات،

گزشتہ ہفتے اس تقریب کے ضمن میں، میں نے محترمہ زہرا نگاہ سے اپنی مشکل کا ذکر کیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی جامع الحیثیات و حسیات وخنبیات شخصیت کے بارے میں اپنے تاثراتی مضمون کا سرا کہاں سے اور کیسے پکڑوں۔ انہوں نے ''نو پرابلم!'' والے انداز میں آزمودہ ٹِپ دیا کہ'' آپ writer's block (سدِ قلم) کو بہ یک جنبشِ قلم اس مشکل کُشا جُملے سے توڑ سکتے ہیں کہ 'الطاف گوہر کسی تعارف کے محتاج نہیں، پھر کہیں سے بھی طویل تعارف شروع کر دیجیے۔''

اس پر اتنا اضافہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کہ صرف تعارف ہی نہیں، الطاف گوہر بحمداللہ کسی بھی چیز کے محتاج نہیں۔ سبھی کچھ تو ہیں۔ ادیبِ شہیر، بیباک صحافی جس کی راست گوئی پر اس کی سزا یافتگی گواہ ہے، انٹرنیشنل جریدوں South اور Third World Quarterly کے مدیرِ اعلیٰ، ایک ناموراداراے Third World کے بانی وسربراہ ومنتظم ومنصرم، سابق بانکے بیوروکریٹ، تادمِ تحریر وتقریبِ ہٰذا پوشیدہ شاعر، سربلند Old Ravian اور سب سے نمایاں اور چھپائے نہ چھپنے والی شناخت...... یکے از شیدائیان وفدائیانِ حلقۂ اربابِ ذوق، علم ودانش، مشاہدہ، تجربہ، سیاحت، عزت شہرت، منصب ومصاحبین، بے مثل شریکِ حیات، ذہین، صالح اور سعادت مند بچے، پہلو میں بائی پاس سرجری سے گزرا ہوا گداز دِل......غرض کہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ یہاں تک کہ عُمرِ عزیز کی ساتویں دہائی میں، نظرِ بددُور، گھنے بال جن پر ہم جیسے فارغ البال لوگوں کو رشک آتا ہے۔ اور گھنے بال تو ہم رواروی میں لکھ گئے۔ ہماری مُراد تھی شانے پر بکھری ان کی یہ لمبی لمبی کاکُلیں جن پر ہمارے علاوہ سوامی رجنیش، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم اور عالم لوہار تک کو رشک آئے۔ مختصر یہ کہ

؎ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے قینچی کے سوا

میرے طنزِ رشک آمیز کا ایک سبب یہ کہ اب تو ہیئر ڈریسر مجھ سے پیسے لیتے ہوئے شرمانے لگا

ہے اور اِس طرح لیتا ہے کہ نظر سے نظر نہیں ملتی:

منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

چند ماہ قبل میں Colorado Springs میں غلطی سے ایک نہایت فیشن ایبل سیلون میں بال کٹوانے جا نکلا۔ بے حد اسمارٹ ہیئر ڈریسر لڑکی نے حقِ محنت ۲۰ ڈالر بتایا! وہ ۳۰ ڈالر بھی بتاتی تو اب کس منہ اور کس دل سے اس معصومہ سے haggling (بھاؤ تاؤ) کرتا۔ سر جھکائے سامنے گرتے ہوئے بالوں کو ۲۰ ڈالرز سے تقسیم کرتا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ تین چار منٹ ہی میں میرے بال کاٹنے سے فارغ ہوگئی تو دس ڈالر واپس کرتے ہوئے کہنے لگی کہ ''قینچی بھر بال کاٹنے کے لیے تو دس ڈالر بھی کافی سے زیادہ ہیں۔''

''Thank you. Take care.''

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ کچھ کہنے سے پہلے تامّل کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر شکیب اُستادانہ مہارت سے خود کو اپنی بناوٹی کھانسی سے گرماتے ہیں اور کھانسی کے تخلیقی وقفے میں غور و فکر کرتے اور فقرہ تراشتے ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس اپنا سر کھُجاتے ہیں تو جُملہ اور ڈینڈرف برآمد ہوتے ہیں! اس طرح ہمارے ایک پڑوسی جب تک بڑے نیچرل طریق سے مُنہ میں تین چار دفعہ ''مَم مَم، مَم مَم'' نہ کرلیں آبدار موتی نہیں اُگلتے۔ اگر کوئی دُودھوں نہائی پُوتوں پھلی دور سے یہ معصوم و مانوس ''مم مم'' سُن لے تو بے چین ہو جائے۔ الطاف گوہر اپنا پہلا جُملہ اور تبسُّم قبل از تکلّم شروع کرنے سے پہلے اپنے مخصوص اسٹائل سے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اِس اِتصالِ باہمی اور جادُوئی رگڑ سے جو static electricity پیدا ہوتی ہے، اُس کے زور سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ مخصوص انداز سے ہماری مُراد یہ ہے کہ شانوں کو چھُوتی ہوئی زُلفوں پر آج سے چالیس برس قبل بھی اس طرح ہاتھ پھیرتے تھے جس طرح اب کہیں جا کے لندن کی لڑکیوں نے (جنہیں پروفیسر قاضی عبدالقدوس لُعبتانِ★[1] فرنگ اور لولیانِ★[2] لندن کہتے ہیں) سیکھا ہے!

آپ سوچ رہے ہوں گے کتاب اور صاحبِ کتاب کا یہ کیسا انوکھا تعارف ہے کہ دو منٹ اور چار پیراگراف کے بعد ہی بات مصنف کے کاکُل و گیسو تک پہنچ گئی! اِس کی ضرورت اور جسارت اس لیے ہوئی کہ الطاف گوہر نے اپنی کتاب ''تحریریں چند'' کے نہایت دلچسپ اور شگفتہ دیباچے کے

★[1] لُعبت: گڑیا، پُتلی، عورت، یہ استعارہ کب کا آؤٹ آف ڈیٹ ہوا۔ اب کے زمانے والی گڑیوں میں خالی جان ہی نہیں پڑی، آفتِ جاں بھی تو ہوگئی ہیں!

★[2] لولی: کنچنی، رنڈی، کسبی، فاحشہ، جسم فروش کو Sex Worker کہنا تو مغرب نے حال ہی میں سیکھا ہے، جب کہ ہمارے ہاں اس ذکھیا کو سیکڑوں سال سے پیسے کی خاطر پیشہ کرانے والی، کسبی اور کسب کرنے والی کہتے آئے ہیں۔

پانچویں چھٹے صفحے پر ہی کاکلوں کی کلیدی اہمیت کا پس منظر مزے لے کر یوں بیان کیا ہے کہ "جب میں فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کرنل اسمتھ کے حضور پیش ہوا اور وہ میری درخواست پڑھ چکا تو اُس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اُس کے چہرے پر ناگوار حیرت تمتمانے لگی۔ 'تم نے اتنے لمبے بال کیوں رکھے ہوئے ہیں؟' اصل میں پروفیسر سراج الدین کی شاگردی میں بہت سے طالب علم گیسو دراز ہو گئے تھے۔ ملازمت نہ ملی۔ مگر حجامت اس فقیر نے پھر بھی نہ بنوائی۔ یوں بال کچھ ایسے بھی نہ تھے جیسے ظہیر کاشمیری نے بڑھا رکھے تھے۔ اُن پر پروفیسر سراج الدین کا نہیں، ولیم شیکسپیئر کا اثر تھا۔" لیکن سوٹ کے باب میں انہوں نے اتنی وضع داری نہیں برتی۔ انہیں کے بیان کے مطابق جب وہ ایک ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے دلّی گئے تو میرا جی نے کہا، یہ جو سُوٹ آپ نے پہن رکھا ہے، چوں کہ مانگا ہوا معلوم ہوتا ہے، لہٰذا پچاس نمبر تو اسی کے کٹ جائیں گے!

(۲)

بقول مرزا، بھائی گوہر کے جن مناصبِ جلیلہ، مشاغلِ مختلفہ اور (دُنیوی) مکروہاتِ متفرقہ کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، ان میں جو امتیاز اب بظاہر سب سے کم اہمیت کا حامل ہے وہ ہے ان کا کیریئر بحیثیت سابق بیوروکریٹ۔ لیکن یہ "سابقہ" ایسی Nessus' shirt ثابت ہوئی جسے وہ لاکھ اتارنا چاہیں، اُتر کے نہیں دے گی۔ اس دیو مالائی قمیص کا قصہ کچھ یوں ہے کہ یونانیوں کے عظیم ترین سُورما Hercules نے جب اپنی بیوی سے بیوفائی کی تو اُس عفیفہ نے اسے جو قمیص پہننے کو دی وہ اس کے دشمن نیسَس کی تھی جو اُس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اسے پہننا تھا کہ ہرکولیز کے بدن میں آگ سی لگ گئی جس کی جھلسا دینے والی تپش سے وہ تڑپنے لگا لیکن اسے اتار نہیں سکتا تھا، کیوں کہ مقتول کی اس قمیص کا خاصہ یہ تھا کہ جسم سے ایسے چمٹ جاتی کہ پہننے والے کو مار کے ہی اُترتی تھی۔ چنانچہ ہرکولیز کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

الطاف گوہر کی مصیبت یہ ہے کہ وہ کچھ بھی کریں، کہیں بھی جائیں، یا کچھ بھی نہ کریں اور کہیں بھی نہ جائیں، کہلائیں گے سابق بیوروکریٹ ہی! اصل بات یہ کہ دکھیارا سابق بیوروکریٹ اگر دنیا تیاگ دے اور سادھوؤں سنّیا سیوں کی طرح بدن پہ بھبوت مل کے پیپل کی چھاؤں میں دھونی رما کے تپسیا کرے، تب بھی دنیا کی نظروں میں وہی کا وہی! یعنی سابق بیوروکریٹ!

سابق بیوروکریٹ جب ملتے ہیں تو اپنے بین المحکماتی معرکوں، وزیرِ بے تدبیر سے مُچیٹوں، قبل از وقت برخاستگی، بعد از وقت ترقی، نااہلوں کی رسّی میں لامحدود ڈھیل اور فائل پر نوٹنگ میں وکٹورین انگلش میں انشاء پردازی کے مُنشیانہ کمالات کی ختم نہ ہونے والی الف لیلہ سے ایک دوسرے

کی تواضع کرتے ہیں۔ ایک سیکریٹری صاحب کی انگریزی کی تعریف میں تو ہم نے یہ تک سنا کہ اُن جیسا سیمی کولن (;) ساری سِوِل سروس میں کوئی نہیں لگا سکتا! ساری عمر سیمی کولن لگاتے اور منہ مانگی ترقیاں پاتے رہے۔ ان کے ایک ماتحت کا بیان ہے کہ عبارت خود بڑے صاب سے غلط جگہ بھی سیمی کولن لگوا کر مفتخر محسوس کرتی تھی! ہر چند کہ الطاف گوہر کو بیورو کریسی کا کوچۂ ملامت و صاحب سلامت چھوڑے بیس سال ہونے کو آئے مگر اُس کی چھاپ تِلک مٹائے نہیں مٹتی۔ کوچۂ ملامت سے ہماری مراد گورنمنٹ سکریٹریٹ کے وہ نیم تاریک corridors of power ہیں جو ہمیں تو گزرگاہِ شاہ گراں کی بجائے ہم جیسے اہلِ حاجت کی غلام گردشیں معلوم ہوتی ہیں جہاں سگرٹوں کی ٹمٹماتی روشنی میں پیتل کی چپڑاس کے سوا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

مداحین و محبانِ الطاف گوہر کا حلقہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔ حاسدوں اور دشمنوں کا حلقہ اس سے بھی زیادہ وسیع اور متنوع! جب کوئی اللہ کا بندہ اس حد تک محسودِ دوستاں اور معتوبِ دشمناں ہو جائے تو جاننا چاہیئے کہ اُس نے جو غیر معمولی ترقی اور کامیابی حاصل کی ہے وہ آتشِ رشک و حسد پر پٹرول کا کام کر رہی ہے۔ ناکام آدمی کی غیبت میں کوئی بھی وقت ضائع نہیں کرتا۔

(۳)

اردو ادب سے الطاف گوہر کا رشتہ اور عہدِ وفا بہت پُرانا ہے۔ وہ حلقہ اربابِ ذوق کے بانیوں میں سے ہیں۔ ان کی ادبی کاوشوں اور لندن میں اردو مرکز کے قیام کا ذکر آگے آئے گا۔ مغربی پاکستان کا ۱۹۶۳ء کا بجٹ پہلے پہل اردو میں پیش کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت کے حملے کے بعد فیلڈ مارشل ایوب خاں نے جو لہو کو گرمانے والی تقریر کی، وہ بھی انہیں کی لکھی ہوئی تھی لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں ادبی حلقوں میں جب بھی گفتگو ہوتی ہے تو اگر پہلا نہیں تو دوسرا جملہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس جس کے ذریعہ ایوب خان کے دور میں میڈیا اور صحافت کا گلا گھونٹا گیا اُنہی کے ایما اور تحریک پر نافذ کیا گیا اور یہی اس پر عمل درآمد کرانے کے ذمہ دار تھے۔ آیئے، ذرا جی کڑا کر کے پہلے اس کانٹوں کی باڑھ کو جو درمیان میں حائل ہے پھلانگ جائیں، تا کہ پھر یکسوئی سے گفتگو ہو سکے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کسی سکریٹری کے ایماء و اشارے پر صحافت یا کسی اور قسمت کے مارے کا گلا گھونٹنے یا گھونٹ کے سُلا دینے کے لیے ''بلیک وارنٹ'' جاری کر دیتے تھے یا نہیں۔ نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کوئی آرڈی نینس جاری کرنا چاہے تو کوئی تنخواہ دار سکریٹری اُسے ایسا کرنے سے باز رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا

ہوں کہ گوہر صاحب بارہا اس کالے قانون کے نفاذ و اجرائے ناتحقیق سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر چکے ہیں۔ وہ یہ بات ریکارڈ پر لا چکے ہیں کہ جب انہوں نے وزارتِ اطلاعات کا چارج ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء کو سنبھالا تو اس منحوس قانون کو نافذ ہوئے دس دن گزر چکے تھے! ذرائع سے اس کی تردید ہماری نظر سے نہیں گزری۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرکزی سطح پر اس کے تحت کسی اخبار، جریدے یا صحافی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ یہ بھی اس حد تک درست ہے کہ سرکش صحافیوں اور نٹ کھٹ ایڈیٹروں کی گوشمالی بالعموم صوبائی سطح پر ہی ہوتی ہے۔ صوبائی سطح سے ہماری مراد نزدیک ترین لاک اپ اور مقامی تھانہ ہے جس کے لمبے ہاتھ کسی بھی گھر سے فحش وڈیو، باغیانہ لٹریچر، کلاشینکوف اور ہیروئن (ہر دو قسم کی) برآمد کر سکتے ہیں!

الطاف گوہر نے غالباً اخلاقاً و احتراماً یہ بتانے سے گریز کیا ہے کہ انہوں نے چارج کس سے لیا تھا۔ لیکن خلقِ خدا کی زبان کس نے بند کی ہے۔ اس کی آواز تو اُس سناٹے میں سنائی دیتی ہے جب سب سیانے اور فرزانے چُپ سادھ لیتے ہیں! ایسے ہی الزامات قدرت اللہ شہاب صاحب پر بھی لگائے گئے تھے، جن میں سے ایک کی نوعیت زیادہ سنگین، مگر ان کا دفاع زیادہ ماہرانہ تھا۔ اُن پر یہ الزام تھا کہ جب مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح الیکشن میں ایوب خان کے خلاف کھڑی ہوئیں اور ریڈیو اور پریس میں بالمشافہ سوال و جواب کی منزل آئی تو ایوب خان کی تمامتر بریفنگ، گرومنگ، سبقاً سبقاً پڑھانا سکھانا اور آموختہ سننا شہاب صاحب نے اپنے ذِمّے لے لیا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ طوطا وہی کہتا تھا جو شہاب صاحب کہلواتے تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کی تابعداری صرف بولنے کی حد تک تھی۔ طوطا توپ ہمیشہ اپنی مرضی سے چلاتا تھا! سید محمد جعفری کا ایک قطعہ اس زمانے میں زبان زدِ عام تھا!

یہ سوال و جواب کیا کہنا
صدرِ عالی مقام کیا کہنا
کیا سکھایا ہے کیا پڑھایا ہے
قدرت اللہ شہاب کیا کہنا!

شہاب صاحب نے اپنے بارے میں بارہ سو صفحوں کی ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھ ڈالی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دورِ ماتحتی میں کوئی وزیرِ اعظم یا صدر ایسا نہ تھا جس کو راہِ راست پر لانے اور تنبیہ کرنے کا فریضہ انہوں نے اپنی ملازمت ہتھیلی پہ رکھ کر انجام نہ دیا ہو! ہم کہ رموز و مصلحتِ خسرواں اور تادیبِ اولوالامر کے آداب سے نابلدِ محض ٹھہرے، اس کا مطلب یہی سمجھتے ہیں کہ اگر غلام محمد،

ایوب خان اور یحییٰ خان نے ان کے بروقت مشوروں پر عمل کرلیا ہوتا یا عمل نہ کرتے تو کم از کم ان کے بتائے ہوئے عملیات کا ہی صبح و شام ورد کرلیا کرتے تو آج بھی ہم پر ٹھاٹ سے حکومت کرتے ہوتے اور تخلیے میں شہاب صاحب سے ڈانٹ کھاتے ہوتے! الطاف گوہر نے وظیفے تو نہیں بتائے، تفہیم القرآن کے چند اجزا کا انگریزی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور الطاف گوہر، دونوں ہی نے تفسیر جیل میں لکھنی شروع کی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ یہ قومی قلق کا باعث اور دائمی حسرت رہے گی کہ کاش ان کی مدّتِ اسیری اور سزائے قید زیادہ طویل ہوتی تاکہ وہ تفسیر و ترجمہ مکمل کر کے زیادہ ثوابِ دارین حاصل کرتے اور ہم گنہ گاروں کی نجاتِ اُخروی کا بھی کچھ سامان ہو جاتا۔

(۴)

یہاں نہ مجھے شہاب صاحب کے دفاع میں کچھ کہنا ہے، نہ الطاف گوہر کی صفائی پیش کرنی ہے کہ ہر دو اصحاب میری ناقص وکالت کے محتاج نہیں۔ بالخصوص الطاف گوہر کے بارے میں تو کبھی کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ انہیں معرکہ آرائی، ''کنٹروورسی'' اور mock مُجیٹے میں ایک گونہ لطف آتا ہے! ان کا تعلق اس اوکھے قبیلے سے ہے جس کو اپنے بارے میں خود غلط فہمیاں پھیلانے میں مزہ آتا ہے۔ اس قبیلے کے اراکین میں یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، اختر حمید خاں، جون ایلیا، ساقی فاروقی اور میرے عزیز دوست حنیف رامے شامل ہیں! اصل المیہ یہ ہے کہ بیوروکریٹ اگر شومئی قسمت سے انٹلکچوئل بھی ہو تو بیوروکریسی اسے عجیب الخلقت اور sissy (زنخا) سمجھتی ہے اور ادیب برادری اس سے غیریت برتتی اور بدکتی ہے کہ اُسے سول سروس کے محدودات اور دائرۂ بے عملی کا علم اور اندازہ قطعاً نہیں ہوتا۔ بیوروکریسی سے ہمارا رشتہ بوجوہ love-hale یعنی پیار۔ پھٹکار کا رہا ہے۔ بیوروکریٹ ہمارے ہاں سب سے جابر، مجبور اور سب سے زیادہ مسکین ظالم ہوتا ہے! سوائے تبادلے کے وہ کسی اور تبدیلی کے حق میں نہیں ہوتا۔ اُس غریب کو ہر آنے والے کا بول بالا اور جانے والے کا منہ کالا کرنا پڑتا ہے:

جب جاتے ہوئے روکا نہ تمہیں ؎
پھر آتے ہوئے کیوں روکیں گے

میراجی

ہر آنے والا اس سے غیر مشروط اطاعت اور تاحیات وفاداری کا طالب ہوتا ہے۔ گھاگ ہویا

گھامڑ، علمائے کرام ہوں یا جاہلِ مطلق و مطلق العنان آمر، شاطر ہوں یا صاحبان دولت و حشمت...... منجھے اور کڑھے ہوئے بیورو کریٹ کی فدویانہ فرعونیت اور فرعونی فروتنی ہر ایک سے حسب مراتب و اوقات، نمٹنا، سُلٹنا، لپٹنا لپٹانا، چپکنا چپکانا، جُوجھنا، چمٹیانا، چمکارنا، نباہ، معاملہ اور ''مُک مُکا'' کرنا خوب جانتی ہے! بیوروکریٹ ہر لیڈر، سیاست داں اور حکمراں کے اعمال نامے کی کاپی براہِ راست کراماً کاتبین سے حاصل کر لیتا ہے۔ اور پوری طرح باخبر ہونے کے بعد ایسا بن جاتا ہے جیسے کچھ نہیں جانتا! اسے ہر نئے گدّی نشین گوبر گنیش ★ کی آرتی اُتارنی، خود پوجا کرنی اور سنکھ بجا کے اوروں سے بھی پوجا کروانی اور بھینٹ وصول کرنا پڑتی ہے۔

ہمارے ہاں آمر کا شجرۂ نَصَب و عَزل اور سلسلۂ غَصَب و غَضَب اس کے اُستادِ اول اور جَدِّ اَمجد ایوب خان سے شروع ہوتا ہے۔ یحییٰ خان اور ضیاء الحق یعنی تین پُشتوں اور بے حساب کُشتوں کے پُشتے کے بعد فی الحال جنرل مشرف پر آن کے ٹھہر سا گیا ہے۔ کون جانے کب اور کدھر سے ''اسٹیٹ آف دی آرٹ'' قسم کا نیا آمرِ جابر و قاہر، ظہور اور نزولِ اجلال و اجلاس فرمائے اور سب سجدۂ تعظیم میں اوندھے پڑے کنکھیوں سے دیکھتے رہیں۔ منیر نیازی کا ایک خوبصورت شعر زباں زدِ عام ہے:

اک اور دریا کا سامنا تھا مُنیرؔ مجھ کو
جب ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

اس میں تحریف کی گستاخی کی اجازت چاہوں گا کہ متواتر عالمِ خوف و حیرت و مذلت کی ایسی تصویر عاجز کی نثر میں ممکن نہیں:

اک اور چیتے کا سامنا تھا مُنیرؔ مجھ کو
جب ایک چیتے کے منہ سے نکلا تو میں نے دیکھا!

اب اس کو کیا کیجیے کہ ہمارے یہاں ہر آمر کی زیرِ خر پرستی ایسے ایسے جُگادری ماہرین قانون اور بُقراط پڑے ہیں جو ہر آمر کے ورود اور قبضۂ غاصبانہ کو ایک خود ساختہ اُسطو خُودُوس تھیوری ''نظریہ و قانونِ ضرورت'' کی رُو سے جائز و ضروری قرار دیتے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے اتفاق ہے، بشرطیکہ ''ضرورت'' سے مراد آمر کی ذاتی ضرورت ہو! اور ضرورت و احتیاج بھی ایسی جو حاجتِ ضروریہ کی کراہیت اور تقاضائی شدت کی حامل ہو!

★ گوبر گنیش: ''گنیش جی کو، جن کا سر ہاتھی کی شکل کا ہوتا ہے، دانائی کا دیوتا اور مُشکل کُشا مانا جاتا ہے۔ ان کا گوبر کا بُت بنا کر نیا کام شروع کرنے سے پہلے پوجتے ہیں۔''

بیورو کریسی ایسی قلو پطرہ ہے جسے ہر سیزر اور انطونی کی دلداری پوری سپردگی اور تن دہی سے کرنی پڑتی ہے۔ وہ باری باری ہر سیزرِ دوراں کو آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ پھر اُسے بسترِ خجالت پہ لِٹا کر لال کے سُرخ فیتے سے مُشکیں کس دیتی ہے! اُس کی ادائے سپردگی میں بھی ایک فاتحانہ شان ہوتی ہے۔ جب وہ بیعت کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے تو وہ جانتی اور جتلاتی ہے کہ یہ وہ ہاتھ ہے جس نے بڑے بڑے لرزا نندانِ جہاں کو ٹھِکا نے لگا دیا:

"My bluest vein to kiss; a hand that kings Have lipped, and trembled kissing."

(Shakespeare, Antony and Cleopatra, Act 2 Scene 5)

ماتحت کہلاتے ہوئے بھی وہ سب سے زیادہ فرمانبردار فرمانروا ثابت ہوتی ہے۔ وہ عفیفہ ہر سرکارِ دولت مدار اور حاکمِ جلالت مآب کی خاطر لاکھوں کے بول سہتی اور مونا لزا کی طرح زیرِ لب مسکراتی رہتی ہے! وہ جانتی ہے کہ اُس کا وجود ناگزیر و ناگریز ہے! وہ ساری عمر ہر حاکمِ وقت اور آمرِ امروز کی حلیف وہم راز، دم ساز و دم باز بن کر اُسے اس طرح نچاتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے یہ کاغذی پشواز اور ۲۱، ۲۲ گھنگھروؤں والی نرتکی میری ہی تال، تنکار اور چشم و ابرو کے اشارے پر ناچ رہی ہے! خوش فہمی اور چال چلتر اپنی جگہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں مل کر جمہور★ کو ایسا ''بچّہ جمُورا'' بنا دیتے ہیں جسے مداری شعبدہ بازی کے دوران اپنا آلۂ کار ساز اور تابعِ فرمان و فریبِ نظر بنا کر اپنے شعبدوں اور کرتبوں پر بے تحاشا تالیاں بجواتا ہے۔ پھر ایک دن یہ تماشا اور ''نظر بندی'' کا کھیل اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ مداری کی ڈُگڈُگی گُنگ اور بے آواز ہو جاتی ہو۔ اُدھر بچّہ جمُورا راتوں رات بالغ، بے کہا، سیانا اور سرکش ہو جاتا ہے۔

۲۱، ۲۲ گھنگھروؤں کی چھما چھم اور راگ درباری، بِلہاری، تن من ہاری تھمتے ہی ایوانِ بے ستوں

★ جمہور: حیرت اور افسوس کا پہلو یہ کہ لغات میں ''جمہور'' کے اصل لغوی معنی یہ بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ ریت کا ڈھیر، فرہنگ آصفیہ۔

۲۔ ریت کا ڈھیر۔ ریت کا ٹیلا۔ علمی اردو لغت

۳۔ بہت ریت تہ بہ تہ۔ المنجد۔ عربی اردو لغت مطبوعہ دارالاشاعت کراچی۔

۴۔ A large sand-heap اردو انگلش ڈکشنری مرتبہ John T. Platts

اس پر مستزاد یہ کہ ''المنجد'' میں ''جمہوری'' کے معنی ''نشہ آور شراب'' بیان کیے گئے ہیں! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر ڈکشنر ڈکشنریوں میں مذکورہ بالا معنی دیکھنے اور سمجھنے کے بعد جمہور سے ویسا ہی سلوک کرنے لگتا ہے!

حیرت اور افسوس کا تیسرا مقام یہ کہ اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) نے اپنی بائیس ضخیم و جمیم جلدوں والی لغت میں جمہور کے یہ لغوی معنی درج نہیں کیے ہیں۔ اس کا سبب لاعلمی یا کسالتِ عالمانہ تو نہیں ہو سکتا۔

کے گنبدِ بے در میں ایک دل دہلانے والی صدا گونجتی ہے:

لِمَنْ الملکُ الیوم

(بتاؤ، آج بادشاہی کس کی ہے؟)

انجام کار جب سبزر دیدہ دانطونی چشیدہ قلوپطرہ عُمرِ یاس کو پہنچ کر اپنے فرائض منصبی ولذائذ غیر منصبی سے سبک دوش ومحروم کردی جاتی ہے تو اُس کا عجز وانکسار دیدنی ہوتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر یاد آتا ہے۔ (بادنیٰ تصرف):

میں نے پوچھا، کیا ہوا وہ آپ کا ''جاہ وجلال؟''
ہنس کے بولا وہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا!

اب اسے طُرفہ تماشا اور تلوّنِ مزاجِ دوراں نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ جب ڈکٹیٹر آتا اور مارشل لاء نافذ کرتا ہے تو حالات واقعی اتنے بگڑ چکے ہوتے ہیں کہ لوگ مٹھائی تقسیم کرتے ہیں کہ خدا خدا کر کے نااہل اور کرپٹ سیاست دانوں سے نجات ملی! لیکن چند برسوں تک جمہوری شیر کو سَدھانے، اُس پر سواری گانٹھنے اور حالات کو بد سے بدتر کرنے کے بعد پھرے ہوئے شیر پر سے اُترنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس کی وجہ صرف اُسی کو نہیں، شیر کو بھی معلوم ہوتی ہے! بعد از خرابیٔ بسیار جب وہ سب کو رُلا رُلا کر رُخصت ہوتا ہے تو وہی لوگ پہلے سے بھی زیادہ مٹھائی تقسیم کرتے ہیں! ماسٹر جلال الدین ناطقؔ چاکسوی سابق اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر، پرائمری اسکول، بہار کالونی اکثر کہتے ہیں کہ جس جس حکومت کو بھی مائی باپ قسم کی حکومت سمجھ کر لوگوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے، جے جے کار کی اُس کو تھوڑے ہی دن بعد اُن ہی لوگوں نے توبہ تِلّا کرتے اور ''باپ رے باپ'' کہتے ہوئے دفان کیا! آیندہ کو کان پکڑے چناں چہ اب یہ حال ہے کہ نئی حکومت بننے، حلف اٹھانے اور ''جیوے، جیوے'' کا غُلغلہ بلند ہونے سے پہلے ہی ''جاوے ہی جاوے! جاوے ہی جاوے!'' کے نعرے لگنے لگتے ہیں!

ماسٹر جلال الدین ناطقؔ چاکسوی کے نزدیک یہ پاکستان کا دوسرا سنگین اور ''real'' مسئلہ ہے۔ پہلا مسئلہ ان کی انتہائی قلیل پنشن ہے جس سے، بقول اُن کے، نہ تو اپنی بے اثر دوائیں خرید سکتے ہیں، نہ قبر کی کُھدائی کی رقم ادا کی جاسکتی ہے، نہ بارودی جیکٹ خریدی جاسکتی ہے! پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے ماسٹر صاحب کی ہمت بندھائی۔ فرمایا کہ نامساعد حالات کا مقابلہ علوئے ہمّت سے کرو۔ اس پر مرزا عبدالودود کا کمنٹ یاد رہے گا۔ فرمایا کہ علوئے ہمّت بحالت خلوئے معدہ، زمین بوس بلکہ شکم بوس ہوجاتی ہے!

شعر پرانی چال اور ''زبان کا'' ضرور ہے، مگر دیکھیے استاد ذوق ڈیڑھ سو برس قبل ڈکٹیٹر کے وُرود و خروج کی کیسی سادہ اور سچّی تصویر کھینچ گئے ہیں کہ، زباں لُوٹتی ہے مزے کیسے کیسے!

؎ آنا تو خفا آنا، جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا!

زبان کے شعر سے ہماری مراد ایسا شعر ہے جسے کہنے، پڑھنے، سننے، سمجھنے اور جس کی داد دینے کے لیے سوائے زبان کے کسی اور عضو، بالخصوص دماغ پر ذرا بھی زور نہ دینا پڑے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ''نثر میں اس کی مثال میرے فرمودات اور تمہاری نگارشات ہیں!''

چشمِ عبرت نے فوجی ڈکٹیٹر سے بھی بدر جہا بدتر ڈکٹیٹر کی ایک اور قسم دیکھی ہے! اسے سِول ڈکٹیٹر کہتے ہوئے آج بھی عتابِ حامیان و حواریان کے خوف سے ان کے نام نوکِ قلم پر نہیں آتے! علامہ اقبال کی نظر کی جتنی داد دی جائے کم ہوگی کہ کوئی ایک صدی قبل اُس کے رُخِ نازیبا سے نقاب اُلٹ دی:

؎ دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو اسے سمجھا ہے آزادی کی ہے نیلم پری

آمریت اور بیوروکریسی کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا۔ وہ قدرت اللہ شہاب ہوں یا الطاف گوہر، دونوں کو ایک عرصے تک اتنا اور ایسا تقربِ اُولوالا مر و آمر رہا ہے کہ بیوروکریسی اور آمر کے باہمی تعلق اور اس کی نوعیت پر تبصرہ کیے بغیر ان کے یا کسی بھی بیوروکریٹ کے ''رول'' پر گفتگو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تعلق کسی مخلص و راست گفتار مشیر سے ہوسکتا ہے۔ زمانہ ساز درباری یا سرچڑھے مصاحب سے بھی۔ اعزازِ مشاورت سے کسی، یگانہ روزگار گُن گا یک میراثی یا فنِ تشہیر میں طاق کسی ڈھولکیے کو بھی نوازا جاسکتا ہے۔ یہ خود صاحبِ تدبیر پر منحصر ہے کہ وہ سرکار دربار میں کون سا روپ بہروپ بھر کے داخلِ حسنات ہونا چاہتا ہے۔ اسی طرح حاکمِ دوراں بھی یہ فیصلہ خود ہی کرتا ہے کہ وہ کس ذاتِ شریف کو شرفِ تقرب و اعتبار بخشتا اور شُہرتِ عام یا رسوائی دوام کا وسیلہ بناتا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری ہوگئی کہ قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر پر جو جھوٹے سچے الزامات لگائے جاتے ہیں، ان کا جب تک صحیح تناظر میں تجزیہ نہ کیا جائے اور سرکاری ملازمت اور اعلیٰ عہدے کے اختیارات اور built in (ساخت میں پیوست) محدودات، منصبی مقدرت اور صوابدیدی تجاوزات کو ملحوظ نہ رکھا جائے، حقیقت کُھل کر سامنے نہیں آسکتی۔

؎ حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
ازبسکہ اہلکار ہوں، آمر نہیں ہوں میں

(غالب سے معذرت کے ساتھ)

یہ ماننا پڑے گا کہ حکم عدولی، نکتہ چینی اور حاکمِ بالا دست کی اصلاح کسی بھی سِوِل سرونٹ کی Code of Conduct کے مطابق فرائض میں داخل نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اعتراف بھی لازم ہے کہ بعض سینئیر بیوروکریٹس نے آقائے نامدار ایوب خان کا پرجوش حامی اور ترجمان بننے میں عافیت جانی۔ کچھ حمایت، مدح فرسائی، جبیں فرمائی، توجیہ طرازی اور تملق میں حد سے گزر گئے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنے ایک دلچسپ مضمون میں لکھا ہے کہ ''دلّی والوں کو بھلے وقتوں میں دُنبے پالنے کا بہت شوق تھا۔ یہ دُنبے اس قدر فربہ ہو جاتے کہ ان کی چکتیاں اتنی بھاری ہو جاتیں کہ اس بوجھ کو لے کر چلنا ان کے لیے ناممکن ہو جاتا۔ لہٰذا ہلکی پھلکی دو پہیوں کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بنوائی جاتیں جن پر ان کی چکتیاں رکھ دی جاتیں۔ تب کہیں ان کی پھرائی ممکن ہوتی۔'' ہمیں یہ اقتباس یہاں اس لیے نقل کرنا پڑا کہ بعض نامی گرامی بیوروکریٹ، حاکمِ وقت بالخصوص آمر کی انانیت اور مطلق العنانیت کی روز بروز بڑھتی اور پھولتی ہوئی چکّی کو اسی طرح اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ حاکم و آمر تو بالآخر رخصت ہو جاتا ہے، مگر تاریخ میں وہ چکّی انہی کندھوں پر دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ لاکھ اتارنا چاہیں، اُتر کے نہیں دیتی!

(۵)

الطاف گوہر سے ۱۹۴۴ء کے بعد دوسری ملاقات کوئی ۲۳ برس بعد اُس زمانے میں ہوئی جب ایوب خان کے آفتابِ اقبال کو گہن لگ چکا تھا۔ تاہم

ابھی باقی تھی کچھ کچھ دھوپ ایوان صدارت پر

فرماں رواں کا آفتابِ اقبال جب ڈوبنے لگتا ہے تو بونوں اور بالشتیوں کے سائے دیو قامت دکھلائی پڑتے ہیں! ایک صبح جو کسی لحاظ سے سُنہری یا سُہانی نہیں تھی، اسٹیٹ بینک کے توسط سے دعوت نامہ بصورتِ حکم نامۂ شاہی ملا کہ صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان تمام بینکوں کے سربراہوں سے ایک نہایت اہم قومی مسئلے پر خطاب کرنا پسند فرمائیں گے۔ بڑے بینکوں کو خدشہ ہوا کہ پھر کسی بہانے بھاری چندہ طلب کیا جائے گا۔ چھوٹے بینک جو چندہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، خوف زدہ

تھے کہ کہیں اسی بے توفیقی کی بناء پر کسی بڑے بینک کے ساتھ ضم نہ کردیئے جائیں۔ بینکوں کے سربراہ عالمِ بیم ورجا میں صوفوں کے عین کنارے پر اس طرح بیٹھے تھے کہ سربراہ کے بجائے برسرِ راہ اکڑوں بیٹھے دکھلائی دیتے تھے! بندہ بھی اس انبوہِ مخاطبین و خائفین میں شامل، کنارہ نشین تھا۔

کچھ دیر بعد اعلان ہوا کہ صدرِ ذی شان تشریف لا رہے ہیں۔ کچھ نے اپنی ٹائی، مگر بیشتر نے اپنی اپنی پتلون کو کھینچ کر اوپر کیا۔ صرف ایک چھوٹے بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر نے ایسا نہیں کیا۔ وہ نو دس بٹن والی شیروانی اور تنگ موری کا علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ سو وہ لپک جھپک سرکاری ٹائلٹ گئے اور جھٹ کمرد کمر بندکس کے واپس اُکڑوں آسن مار کے بیٹھ گئے۔ جو زیادہ نَروَس تھے انہوں نے ہتھیلی کو (اپنے اپنے) گھٹنے پر رگڑ کے مصافحہ شاہی کے لیے خشک کیا۔ الطاف گوہر صدر کی جلو میں تھے جو جلوس ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ اتنے جوان نہیں لگتے تھے جتنے کہ اب ہیں! انہوں نے ہم سب سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ فیلڈ مارشل نے ہم سب کو گردن کی ایک خفیف سی جُنبش سے بھگتا دیا۔ وہ کچھ تھکے تھکے سے نظر آئے۔ بعد میں جو گفتگو کی اس سے وہ اکھڑے اکھڑے اور قدرے senile لگے، senility (کہولت سے منسوب ذہنی خلل) کی بڑی پہچان یہ ہے کہ آدمی خود کو بالکل نارمل اور پہلے سے بھی بہتر اور چاق چوبند سمجھنے لگتا ہے! فیلڈ مارشل کو بہت قریب سے دیکھا تو ایک بات ایسی نظر آئی جس پر آج تک کسی نے توجہ نہیں دلائی۔ ایوب خان بلاشبہ بہت شایستہ، وجیہ اور جامہ زیب تھے۔ چہرہ سرخ و سفید اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بہت بارعب بھی تھا۔ ان کا بالائی دھڑ بھرا بھرا، پُر گوشت اور نسبتاً لمبا لگتا تھا..... مگر ٹانگیں چھوٹی اور کمزور! ان کی بُنیادی جمہوریت ہی کی مانند! چنانچہ میں ٹانگوں پر ہی نظریں جمائے، دل مضبوط کیے بیٹھا رہا!

ایوب خان نے بغیر کسی تعارف اور تمہید کے، چھوٹتے ہی فرمایا ''جنٹل مین' آپ کو معلوم ہے، روٹی پکانے میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے؟''

اس پر بعض بینکرز نے ایسے محتاط، ماتحتانہ اور مُتفق علیہ انداز سے سر ہلائے کہ اس کا مطلب دس منٹ ہوسکتا تھا اور دس گھنٹے بھی! ایوب خاں نے اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''ہمارے ملک میں وقت کی کوئی قدر نہیں۔ عورت لوگ کا سارا ٹائم روٹی پکانے میں ہی ضائع ہوجاتا ہے۔ روٹی پکانے کا طریقہ بالکل غلط ہے۔ آپ حضرات جو اس سلسلے میں بہت کچھ، بلکہ سب کچھ کرسکتے ہیں، کچھ بھی تو نہیں کرتے!''

اس مرحلے پر یہ خیال گزرا، بلکہ یقین ہوگیا کہ انگریزی محاورے کے مطابق غلط گھوڑے کو چابک مارا جارہا ہے۔ کسی typographical error (سہوِ کتابت) کے باعث bakers کے

بجائے bankers کو فوجی dressing-down (ڈانٹ پھٹکار) کے لیے پکڑ بلایا ہے! لیکن صاحب، توبہ کیجیے، کس میں اتنی جرأت تھی کہ فیلڈ مارشل سے یہ کہہ سکے کہ ہم نانبائی نہیں ہیں! کچھ اپنے گھٹنوں میں اور باقی ماندہ اپنی بھیگی بغلوں میں ہاتھ دبائے، سنا کیے!

ایوب خان روٹی پکانے اور چپاتیاں بیلنے کی خرابیاں اور خواریاں اپنے Sandhurst لہجے میں بیان کرتے رہے۔ وہ دھیرے سے مسکرائے تو بینکرز کے دم میں دم آیا۔ بلکہ اُسی چھوٹے بینک کے سربراہ نے تو حوصلہ کر کے ہماری چپاتی من بھاتی کی مذمت میں ایک یادگار جملہ بھی ارزانی فرمایا۔ ارشاد ہوا ''سر، چپاتی گرم ہو تو معدے میں تبخیر پیدا کرتی ہے۔ اور ٹھنڈی ہو تو قبض!''

فیلڈ مارشل نے انہیں تو کچھ نہیں کہا، مگر الطاف گوہر کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اِس جانگلوس کو کاہے کو پکڑ لائے؟ قبض کا علاج کرانے یہاں آیا ہے!

روٹی کی مذمت میں خطاب پُرمتاب جاری تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ روٹی کا اصل قصور کیا ہے۔ اور فیلڈ مارشل روٹی کی بجائے اب قوم کو بزور مارشل لا کون سی شئے کھلانے کے درپے ہیں! لیکن یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ شاہِ ذی حشم جب خود ہُشکائے تو سب درباری اور مصاحبین، مقربینِ بارگاہ تلواریں کھینچ کر چیونٹی کا سر قلم کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں! اور واقعتہً ایسا ہو بھی چکا تھا۔ جب سے ایوب خان نے اعلان کیا کہ ہری چُگ بکریاں ملک کے جنگلات، درختوں، سبزے اور معیشت کی پیدائشی و غذائی دشمن ہیں۔ ساری قوم بکریوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑی ہوگئی۔ مطلب یہ کہ مضبوطی سے پاؤں گاڑ کے کھڑی ہوگئی۔ کیا کرایا کچھ نہیں! بس مستقل مزاجی سے بےحس و حرکت کھڑی دیکھتی رہی! البتہ سرکاری ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں بکریوں کی کردارکُشی کی جانے لگی اور اُنہیں گشتنی اور گردن زنی ٹھہرایا گیا۔ ان پر سرکار نے ایسے الزامات لگائے جو بقول مرزا، ''jealous سے jealous بوک بکرا ★[1] بھی نہیں لگائے گا!'' غور

★[1] چھری پھرنے اور بُعدے سے تکا بوٹی ہونے کے بعد بھی اس کے گوشت سے وہی بکریوں کو رجھانے والی تیز مہک آتی ہے! مشہور فلمی ہٹ گانا 'میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا' جسے مہدی حسن نے گایا ہے آپ نے بھی سنا ہوگا۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس حسب حال گانے کو یہ بکرے بھی بطور ترانۂ گوسفندی، اپنانے میں حق بجانب ہوں گے! بعض مرد اسی پُرکشش خاصیت کے لالچ میں کپورے کھاتے ہیں۔ اور ان کے مادّے کے انجکشن لگواتے ہیں۔ پھر ان کی باتوں سے وہی بُو آنے لگتی ہے! خواتین، خلافِ توقع، انہیں دُر دُر کرتی ہیں۔ وہ پسند نہیں کرتیں کہ:

بکرے کی آنکھ سے انہیں دیکھا کرے کوئی

بکریاں ان کی بکر کو دیکھ کر یا بکرا ہند سونگھ کر بےقرار ہوتی یا مسیاتی ہیں یا نہیں، یہ امر ہنوز دریافت طلب ہے۔ یہ کسی بکری سے پوچھنا چاہیے۔

سے دیکھیں تو یہ ساری الزام تراشی بالکل غیر ضروری تھی۔ اس لیے کہ بکری کے گلے پر چُھری پھیرنے کے لیے مسلمانوں کو حکومت کے اشتعال دلانے یا اُکسانے کی ضرورت نہیں۔ عتابِ شاہی سے پہلے بھی شامی کباب پوری قوم بڑی رغبت سے کھاتی تھی۔ ہم نے تو آج تک کسی بکری کو کنواری رہتے یا فطری موت مرتے نہیں دیکھا!

جملۂ معترضہ خاصا لمبا ہوگیا۔ ہم چکن خور★[1] ہیں، بکری کے طرفدار نہیں۔ دکھانا صرف یہ تھا کہ الطاف گوہر بحیثیت سکریٹری اطلاعات اس بِکٹ بکر گھاٹی سے بھی آسان گزرے! رہی بکری، تو وہ اپنی موت مرتی رہی۔

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کُھلی رہ گئیں، پر مر گئی بکری
(میر انیس)

فیلڈ مارشل نے ڈپلواں لہجے میں یہ بھی کہا کہ عورت لوگ سے روٹی پکوانا سراسر ظلم ہے۔ یہ کہا اور دائیں بائیں گردن گھماتے ہوئے، سامنے بیٹھے مردوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک گھونٹ پانی پیا۔ آبنوشی کے اس اِنٹرول میں الطاف گوہر نے (اپنے) بالوں پر اپنے مخصوص انداز سے ہاتھ پھیرا۔ معاً ہمیں خیال آیا کہ صدرِ گرامی قدر کی تائید میں، یعنی بکریوں کے خلاف ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ صرف ہم ہی گم صم بیٹھے ہیں۔ کہیں محض بے محل خاموش رہنے کی بناء پر ہی نہ دھر لیے جائیں! لہٰذا بات کو قدرے ندرت سے آگے بڑھانے کی غرض سے کہا ''جناب والا، ہمارے ہاں سالن پکانے میں بھی بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ عورتیں گھنٹوں سِل پہ بل بل کے مسالا پیستی اور چولھا جھونکتی ہیں۔ مگر گوشت ہے کہ گلنے کا نام نہیں لیتا۔ نہاری، پائے اور شلغم شب دیگ رات رات بھر پکائی جاتی ہے۔ وقت اور ایندھن کا ضیاع اور روز مرّہ کی کھکھیڑ ہے۔''

ایندھن کے ضیاع اور بربادی کی نشاندہی کرتے ہوئے جی تو بے اختیار چاہا کہ بکریوں اور ''عورت لوگ'' کے ہاتھوں جنگلات کی تباہی پر بھی تبصرہ کروں، مگر اس ڈر سے چُپکا ہو رہا کہ اِسے کُھلی اور بھونڈی نوکرانہ بلکہ چاکرانہ چاپلوسی تصور کیا جائے گا، جو کچھ ایسا غلط بھی نہ ہوگا۔ ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ، کڑوا سچ تو بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی بھڑ سے بول سکتا ہے۔ خوشامد اور تملّق کے لیے زیرک، چرب زبان اور مزاج دار ہونا ضروری ہے۔ مصاحبانہ ہمنوائی و مدح سرائی

★[1] چکن خور: یہ بات بھی پرانی ہوئی، الحمدللہ، گزشتہ پانچ برسوں سے vegetarian ہوں۔ بقول برنرڈ شا (Bernard Shaw) پانچ سال سے fellow creatures کا گوشت نہیں چکھا۔

اور فنّی و مُتفنّی درباری مہارت کے بغیر ایسی تملّق کاری کبھی کارگر اور کارکشا نہیں ہوسکتی۔ میرؔ نے اپنی کم آمیزی اور آشُفتہ مزاجی کے پیشِ نظر اپنے ممدوح و مربّی کو بہت صائب مشورہ دیا تھا کہ صاحب، میری جگہ:

؎ مُصاحب کرو کوئی ہُشیار سا!

اردو میں میری گزارشات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دال یا سالن کو اگر curry یا کوفتوں کو minced meat balls کہا جائے تو سارا گرم مسالا اور بگھار انگریزی کے راستے نکل جاتا ہے! زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ٹائم میگزین میں خالص گھی کا ترجمہ rancid butter یعنی سڑی بُسی چربی کی سی سڑاند والا مکھن پڑھا تو پہلے غصہ، پھر ہنسی آئی کہ جس نے ہمارا ترتراتا پراٹھا اور گھی چھوڑتا حلوہ نہیں کھایا، نہ کڑکڑاتے گھی کے تڑکے والی دال جس کے ہر نوالے کے ساتھ داغنے کی چھن چھن بھی سنائی دیتی ہے، نہ گھان سے اُترتی لش لش کرتی گولڈن جلیبی چکھی، وہ کم نصیب اصلی گھی کا مزہ کیا جانے۔ تُو بیٹی برہمن کی تُو کیا جانے ماس کا سواد۔ اب رہا لفظ کھکھیڑ تو یہ ہم نے ابنِ انشاء سے تازہ تازہ سیکھا تھا اور اسے برسرِ محفل دھڑنے سے استعمال کرنے کے لیے مناسب موقع کی تاک میں تھے۔ بارے یہ میسر آیا تو کھکھیڑ کی ہردو ''کھ'' کو ہم نے کھر کھراتے کھرج سُر میں اور ''ڑ'' کو اس کی ٹھیٹھ دراوڑی اَڑ اَڑائیت کے ساتھ ادا کیا تاکہ سننے والوں کو یہ شک یا التباس نہ ہو کہ ہم whooping cough یعنی کتا کھانسی کے دوران کچھ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں، یا ملازمانہ خوف اور رُعبِ شاہی سے گھگھیانے کی بجائے کھکھیانے لگے! بہرکیف، اس لفظ سے فارغ التلفّظ ہونے کے بعد دل و زبان پر جو بوجھ سا تھا وہ اُتر گیا۔ وہ جو قرض ایک تھا زبان پر وہ حساب آج چُکا دیا۔

یہ لفظ جن قارئین کی نظر سے پہلی بار گزرا ہے، وہ لغت دیکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ کھکھیڑ کے معنی اس کی صوتیات ہی سے پھٹے پڑتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ کھکھیڑ کا کریہہ الصّوت ہونا تو ایک طرف رہا۔ اس کا تو اِملا تک آنکھوں میں رَڑکتا ہے!

خدا جانے ایوّب خان اسے بھونڈا مذاق سمجھے یا لفظ کھکھیڑ سے بدک گئے، انہوں نے ایک بار پھر ویسی ہی سوالیہ نظروں سے الطاف گوہر کو دیکھا۔ اور انہوں نے بھی آنکھوں آنکھوں میں جواب دیا ''سر، میں نے بھی اس دراوڑی شَبد بھنڈاری کو آج ہی دیکھا ہے! بخدا۔''

وہ تو خیریت گزری کہ گھبراہٹ میں اپنے ہم پیشہ سُود خوروں کی مذمّت میں کھکھیڑ ہی کی ٹکر کا رَڑکتا بھچ بھچاتا لفظ ''بھچیڑ'' استعمال کرنا بھول گیا، ورنہ یہ تو اُس زمانے میں زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ لُغت نویس اِس کے یہ معنی لکھتا ہے:

’تنگ دلی۔ دیتے دیتے رُک جانا، ہاتھ کھینچ لینا، سُکیڑ، بے ایمان، بینکرز کی روایتی سنگ دلی، مستحقین کو قرض دینے سے احتراز، قرضے اور سُود کی رقم کی وصولی میں شائلاک کی سی کمینگی اور نوچڑ پن کے لیے بچیز سے زیادہ گندہ اور کڑکیلا گولہ میرے توپ خانے میں نہیں تھا۔ گولے اور گولی میں اگر بارُود کی بجائے گالی بھر کے فیر کیا جائے تو اگلا مرتا تو نہیں پر ساری عمر ہائے ہائے کرتا پھرتا ہے۔ زخم بھرنے کا نام نہیں لیتا۔ رہ رہ کے گالی کی ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔

میرے دخل درنا معقولات کے کچھ دیر بعد صدر ایوب نے اصل مدّعا بیان کیا تو حاضرینِ بے تمکین نے اطمینان کا سانس لیا اور پہلی مرتبہ صوفوں سے پیٹھ لگائی۔ فرمایا کہ بینکوں کو چاہیئے کہ مشینی طریقے سے روٹی بنانے کے پلانٹس کی درآمد کے لیے بڑے شہروں میں فراخ دلی سے قرضے دیں تاکہ عورت لوگ کو دن بھر چولھا جھونکنے سے نجات ملے۔ ایسی ہی ایک اور اسکیم کی وضاحت کے بعد ہمیں بھی قُرب وکربِ حضوری سے نجات ملی۔

محفل برخاست کیے جانے سے پیشتر اُسی چپاتی نوش اور مُبتلائے قبض بینکر نے ہم سب کی طرف سے فیلڈ مارشل کو اطمینان دلایا کہ آئندہ ہم تمام مستورات کے ساتھ بہتر سلوک کریں گے۔ Without distinction of caste, creed and colour انگریزی میں کہنے کے بعد اُس نے انشاء اللہ العزیز کہہ کر اپنے سینے پر ہاتھ بھی رکھا! الطاف گوہر نے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ کر ہنسی ضبط کی جس کے باعث ان کے چہرے پر جگہ بے جگہ dimples اور گومڑے سے بن گئے مگر وہ اپنے پیٹ کو ہلکورے لینے سے باز نہ رکھ سکے۔ گُونگی ہنسی سے کانپتا ہوا ہاتھ اس دفعہ اپنے پٹوں پر دو مرتبہ پھیرا۔

ہم سب ایوانِ عالیشان کے در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈالے بغیر رُخصت ہونے لگے تو الطاف گوہر نے سب سے آخر میں مجھ سے بڑے تپاک سے نہ صرف ہاتھ ملایا، بلکہ اسے دیر تک جھلاتے بھی رہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جب وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کہنے لگے ”افسوس ہے، سالن اور شلغمی شب دیگ کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھر کبھی سہی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے عینک اتاری، ضبطِ خندہ سے آنسو بھری آنکھیں رومال سے پونچھیں اور سُلجھی لَٹ کو اُلجھاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

یہ تھی ان سے میری دوسری ملاقات۔

پہلی ملاقات کی تفصیل حسنِ ساعت کی کسی ایسی ہی ساعتِ نایاب تک کے لیے اٹھا رکھتے

ہیں۔ سرِ دست اشارہ کافی ہے۔ بہ زبانِ شاعری سہی:

ہفت شہرِ عشق در عطّار گشت

ماہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم

(مفہوم کچھ یوں ہے کہ عطّار نے تو سات شہروں کا گشت کر ڈالا اور ایک ہم ہیں کہ پہلی ہی گلی کے موڑ پر ہنوز سرگشتہ و حیران کھڑے ہیں!)

میں راستے بھر سوچتا آیا کہ صدرِ عالی مرتبت دن میں تین چار ایسے اجلاس ضرور کرتے ہوں گے جن میں الطاف گوہر کو نقیب، پیش کار اور ترجمانِ معجز بیان کے فرائض اسی طرح، مسکرائے بغیر، انجام دینا پڑتے ہوں گے۔ انہیں بکری کی بدذاتی، چپاتی کی کھکھیڑ، قلیے تورے کا قلع قمع...... اور اسی نوع کی نہ جانے کتنی ماورائے معقولیت تجویزوں کو نہ صرف مصاحبانہ متانت و شائستگی سے انگیز کرنا پڑتا ہوگا، بلکہ نہایت شستہ انگریزی میں ان کے minutes (روداد) بھی قلم بند کرنا پڑتے ہوں گے۔ میں نے ایک آمر دیدہ، منجھے اور گُدھے گُدھائے بیوروکریٹ کے روز و شب کی ایک جھلک بجلی کے سے کوندے میں دیکھی......بغیر چُندھیائے ہوئے!

خیر، انہیں تو کیا یاد ہوگا، اُس روز میں انہیں بہت عجیب اور بندۂ ناتراش لگا ہوں گا اور اب عجیب تر! مگر وہ مجھے اچھے لگے، بوہت!

آج بھی ان کے مصافحے کا جُھلاؤ یاد آتا ہے تو دل میں گُدگُدی اور ہاتھ میں چُلچُلاہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے!

آج ان باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ شیر دلیر ڈکٹیٹر جب ''ایلس اِن وَنڈر لینڈ'' کی بلّی کی لمبی دُم کی مانند فیڈ آؤٹ ہو جاتے ہیں اور فق چہروں سے اُفق تک کھسیانی سی مسکراہٹ باقی رہ جاتی ہے تو وہ بالکل کاغذی اور کیسے بےضرر معلوم ہوتے ہیں! باکسر کا ناک آؤٹ پنچ (knock-out punch) کچھ دیر بعد آپ سلوموشن میں دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے ایک نرم اور شفیق ہاتھ مخملی رخسار کو سہلانے کے لیے قریب اور قریب آ رہا ہے!

آج اس آمرانہ رعونت اور جلالی تیقّن سے بھری آواز میں توپوں کی گھن گرج بیک گراؤنڈ میں صاف سنائی دیتی ہے۔ وقت گزرنے کے بعد اس کا وڈیو دیکھتے ہیں تو ملک و قوم کو ایک اعلان سے فتح و تسخیر کرنے والا اب اچھا خاصا مسخرہ لگتا ہے! لیکن ساتھ ہی خود اپنی رعیّتی مرعوبیت پر حیرت سے زیادہ خجالت اور خجالت سے بھی زیادہ غصّہ آتا ہے!

ؔ یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں
(افتخار عارف)

ڈکٹیٹر کے درود، طاقت، قبضہ غاصبانہ اور مُسلّط رہنے کی وجہ مُسلّح افواج کی پشت پناہی، ٹینک، توپخانے اور بمبار جہاز نہیں ہوتے بلکہ اصل وجہ نہتّے عوام کالانعام★ کی خاموشی ہوتی ہے۔ یہی نہتے ''ڈھور ڈنگر'' اگر پھٹ پڑیں تو ہزار ایٹم بموں پر بھاری ہوں!

ؔ یوں تو ہم کچھ نہ تھے مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا!

فرانس اور روس یہ تماشا دنیا کو دکھلا چکے ہیں۔

چوں کہ روٹی اور روٹی پلانٹ کا ذکر ضمناً اور ازراہِ تفنن آ گیا ہے، اس لیے میں ذہنی بددیانتی کا مرتکب ہوں گا اگر یہ وضاحت نہ کرتا چلوں کہ جس روٹی پلانٹ کی امپورٹ، ملکیت اور انتظام ان کو تفویض ہوا، وہ اس اسکیم کے تحت ایوب خان کی فیض بخشی کا ثمرہ نہیں تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے انہیں یہ پراجیکٹ بھٹو صاحب نے الاٹ کیا تھا۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ الطاف گوہر نے ڈان اخبار میں ایک ایڈیٹوریل لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''پہاڑ نہیں روتے'' اس میں بھٹو صاحب پر تیکھے طنزیہ انداز میں تنقید کی گئی تھی، جس کی پاداش میں بھٹو صاحب سے دیرینہ، دوستانہ اور بے تکلف مراسم کے باوجود وہ جیل بھیج دیے گئے، جہاں انہوں نے مولانا مودودی کی تفسیر کے انگریزی ترجمے کا ڈول ڈالا۔ اسیری سے بغاوت تو فرو نہ ہوئی، لیکن وقت کے ساتھ جیل بھیجنے والوں کا غیظ و غضب ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ رہا کر دیے گئے۔ بطور تلافیٔ مافات اور ازراہِ الطاف خسروانہ روٹی پلانٹ کا لائسنس انہیں عطا کیا گیا۔ پاکستان میں پہلے روٹی کے کارخانے کو انہوں نے اور ان کے ذہین و سعادت مند صاحبزادے عزیزی ہمایوں گوہر نے بڑی خوش اسلوبی، کامیابی اور نیک نامی سے چلایا۔

(٦)

ناک کا بال اور دستِ راست

ملحوظِ خاطر رہے کہ الطاف گوہر نے دیدنی و نادیدنی، گفتنی و ناگفتنی سب کا سب نہ سہی، بہت کچھ، بہت قریب سے اور بہت عرصے تک دیدۂ بینا سے دیکھا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان

★ عوام کالانعام: عام لوگ جو مثل چوپایوں کے ہیں، علمی لغت
چوپایوں (ڈھورڈنگروں) سے مشابہ لوگ۔ اردو لغت
عوام کے لیے یہ اصطلاح صدیوں سے زباں زدِ خواص ہے۔

کے زوال بے ملال کے بعد ایک اور ہی مستِ مئے مرد افگن اور رسوائے زنانہ آمر کا عروج و خروج دیکھا۔ پھر ایک سویلین حکمراں کے لطف و عنایت اور عتاب کا مزہ چکھا۔ اس کے بعد فلک نے پاکستان کو تیسرے آمرِ فاخر کا وہ دورِ پُرفتور بھی دکھایا جب برسرِ عام کوڑے لگنے کے بعد دلوں میں ایسا ہول بیٹھا کہ لوگ املا تک میں گڑ بڑا جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ وبا کی طرح پھیلی ہوئی ذیابطیس کو ضیابطیس لکھنے لگے! غنیمت ہوئی کہ الطاف گوہر یہ دورِ ضیاع یعنی تیسرے آمر کا وُرُود و عروج اور ہبوط برسرِ زمیں خود کو مزید حیرت میں مبتلا کیے بغیر چار ہزار میل کی دوری اور لندن کے نیوزی لینڈ ہاؤس کے تیرھویں ٹاور کی بلندی سے بچشمِ بےنم دیکھا کیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک نہایت زیرک و پختہ کار بیوروکریٹ جو بلاشبہ یکے از ادا و خطاشناسانِ اُولوالامر ہونے کے علاوہ طناز و طبّاع ادیب بھی ہے، زیرِ تصنیف مقامات آہ و فغاں اور کارہائے سرکاری کی واہ واکے pitfalls (گپت گڑھوں) سے اپنے قلم اور دم قدم کی خیر مناتا کیسے گزرتا ہے۔ اور Decade of Decadence (عشرۂ انحطاط) کی داستانِ پُرفتن جی کڑا کر کے کیسے رقم کرتا ہے۔ اس کی آفریں و نفریں کے سزاوار کون ہیں؟ یا:

> The fault dear Brutus is not in our stars But in ourselves that we are underlings.
>
> Julius Caesar

شہاب صاحب اور الطاف گوہر کے بارے میں کبھی طنزاً اور کبھی left handed compliment (مبہم توصیف، چبا چبا کے یا اوپری دل سے تعریف کرنا) کے طور پر کہا جاتا ہے کہ دونوں ہی ایّوب خان کے نفس ناطقہ اور دستِ راست تھے۔ لُغت میں نفسِ ناطقہ کے یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں:

''وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کی ناک کا بال ہو۔''

ان معنوں میں دونوں کے لئکواں محلِ وقوع کو درست ماننے میں ہمیں بوجوہ تامل ہوگا۔ صاحبان جاہ و حشم کے حلقہ بگوشوں، ماتحتوں، کار پردازوں، مُشیروں، مداحوں اور حاشیہ نشینوں میں کوئی مقرب خاص الخاص ایسا ضرور ہوتا ہے جو ناک کا بال کہلاتا ہے بعض حکمرانوں کی اونچی ناک میں ایک سے زیادہ بالوں کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض بال ایسے ہوتے ہیں جو ناک کٹنے کے بعد بھی نکٹی ناک سے چپکے رہتے ہیں! یہ بھونڈی پھبتی اور anatomical (تشریح الابدان سے متعلق) لیبل قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر پر اس لیے چسپاں نہیں ہوتا کہ ان کے مزاج،

کارکردگی، دائرہ و طریقِ کار کی نوعیت، سطح اور تقاضے مختلف تھے۔ ہاں، ان معنوں میں ہم انھیں نفسِ ناطقہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معتمد و مشیر و مُقربِ بارگاہ تھے۔ اور بحیثیت سینیر بیوروکریٹ گورنمنٹ کے احکام، اقدام اور پالیسی کے حامی، پر جوش ترجمان، شارح اور تشہیر کنندہ ضرور تھے لیکن یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ امورِ سلطنت میں کوئی کام ان کی تحریک و توسط، صلاح و مشورے یا ذاتی مداخلت کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا۔

ملازم پھر ملازم ہے۔ اُس کی کُرسی کتنی ہی اونچی ہو، بلکہ ہزار پایہ ہی کیوں نہ ہو، رہے گا ملازم ہی! یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ عربی لفظ ملازم کا مادّہ لزم ہے، جس کے معنی ہیں کسی جگہ مستقل ٹھہرے یا چپکے رہنا! لغت میں ملازم کے معنی کسی کے پاس یا کسی جگہ پر ہمیشہ رہنے والا بیان کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ملازم کے ضابطۂ اہلکاری اور شرطِ پیوستگیِ مُدام میں اِختلاف، سَرتابی، ہچر مچر، ''ناں'' اور ''نہیں'' کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ ''ہاں'' کہنے کا بھی ماتحتانہ اور درباری لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ یعنی کبھی لے میں ڈُوبی ہوئی آواز میں، کبھی محکومانہ اور کبھی کبھار عروسانہ، یعنی دُلہن کی مانند جو گواہوں کی موجودگی میں شرماتے لجاتے ہوئے ''قبول ہے'' کہتی ہے۔ ملازم تو اپنی محبت اور تابعداری کا اقرار بھی Cordelia کی طرح تِنک کر، مگر نپے تُلے انداز سے کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا:

I love your majesty
According to my bond; nor more nor Less. ___ King Lear

جہاں تک دونوں کے ''دستِ راست'' ہونے کا تعلق ہے تو چوں کہ بیک وقت دو دائیں ہاتھ کسی راکشش، راون یا بھوت پریت ہی کے ہوسکتے ہیں، لہٰذا ہم اس کا یہی مطلب سمجھے کہ دونوں ہی باری باری دستِ راست رہے ہوں گے۔ ہم کہ اَسرارِ دربار اور آدابِ درباداری سے ناواقف ٹھہرے، محض قیاس و گمان و ظن ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ہر دو ''دستِ راست'' بلا کے کراماتی نکلے۔ مکروہات و مرغوباتِ سرکاری سے فراغت کے بعد ایک نے اپنے پیوند لگے فقیری خِرقے کی دائیں آستین جھٹکی تو بائیں آستین سے ''شہاب نامہ'' نکل کے مسندِ کرامت پر گرا۔ معتقدین نے اُٹھا کر ورق ورق چُوما اور ایک دوسرے کی آنکھوں سے لگایا۔ اسے کتابِ وظائف و عملیات جان کر باری باری گلے میں حمائل کرتے رہے۔ اس کتاب کے دستِ رقم طراز پر فقط سریع الاعتقاد پیروؤں نے ہی نہیں، بڑے بڑے پِیروں نے بھی بیعت کی! جب دوسرے ''دستِ راست'' کے خِلعتِ فاخرہ کی آستینوں کی تلاشی لی گئی تو دائیں آستین ہاتھ سے بھی خالی نکلی! لیکن ان کے تکیے

سے، جو پھُول کر گاؤ تکیے کے برابر ہوگیا تھا، ۸۰۰ صفحات کی ایک دلچسپ کتاب مُستطاب Ayub Khan, Pakistan's first military ruler کا مُسوّدہ برآمد ہوا، جس کی ضخامت کو کاٹ چھانٹ کر وہ نصف کرنے میں عرصہ ۸ سال سے راتیں کالی کررہے تھے! لکھنے والے ہاتھ کو متعلقہ آستین میں ڈالنے تک کی بھی فرصت نہ تھی!

ان دو کتابوں کے بارے میں یہاں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس پُرآشوب دور کی تاریخ لکھنے والا ان دو عینی اور معتبر شہادتوں سے صرفِ نظر نہ کرسکے گا۔ یہ اور بات کہ انہوں نے قضیے کو قصّے کی طرح بیان کیا ہے۔

(۷)

اگر فردوس برُ روئے فلک است

افسردہ دلی، بیزاری یا شِکوہ مندی کے لمحات میں کون ہے جس کے ذہن میں کبھی کبھی یہ سوال نہ اُٹھتا ہو کہ اگر اسے چوائس دی جاتی تو وہ کس زمانے میں پیدا ہونا پسند کرتا؟ بعض علماء اُس عہد میں پیدا ہونا پسند فرمائیں گے جب انسان نے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا! کچھ جذباتی لوگ اپنی پسند کے عہدِ زرّیں میں پیدا ہونے کے ضمن میں ہارون رشید کے دور کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یوں تو زبان سے اُس کے عدل و انصاف اور راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کی خیر و عافیت دریافت کرنے کی تعریف کرتے ہیں، لیکن دلِ آرزو مند میں بھرے پُرے اَلْف لیلوی حرم سمائے ہوتے ہیں! ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ، امیر خسرو کے عہد میں تولّد پذیر ہونے کے متمنّی ہیں! ہم نے پوچھا، بندۂ خدا، تمہیں اُس عہد میں اِس کے سِوا اور کیا دلکشی نظر آئی کہ بادشاہ یکے بعد دیگرے serial killing میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوجاتے تھے! جو دشمنوں سے بچ نکلتے انہیں سگے بھائی اور قریبی رشتے دار ٹھکانے لگا دیتے تھے!

بولے ''اس عہد میں یہ facility تھی کہ پیاسا پر دیسی پنگھٹ پر پیاس بجھانے کے بہانے دوشیزاؤں کو فی البدیہہ دوہے اور اپنا غیر مطبوعہ کلام سنا سکتا تھا۔ مشاعرے کے جھنجھٹ، رَدلے اور ہوٹنگ سے صاف بچ جاتا تھا۔''

ہم نے کبھی الطاف گوہر سے پوچھا تو نہیں کہ وہ اپنے شبابِ ثانی کے لیے کس معصوم دور کا انتخاب کریں گے، لیکن قرائن و قیافے سے یقین ہو چلا ہے کہ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے تو وہ

بغیر کسی تامل کے اُسی دور کو ترجیح دیں گے جب میرا جی اور حلقۂ اربابِ ذوق اپنے شباب پر تھے۔ میرا جی پر تو تین یادگار مضامین لکھ کر سُرخرو اور سبک دوش ہوگئے، لیکن لندن میں ایک مدّت سے مقیم ہونے کے باوجود ان کا جی اور قلم ہنوز حلقہ ارباب ذوق لاہور میں اٹکا ہوا ہے۔ ذکر کسی کا ہو، موضوع گفتگو کچھ بھی ہو...... مثلاً مسز تھیچر کا دُکھیارا شوہر، پرنسس مارگریٹ کا تازہ ترین اسکنڈل، نیلسن منڈیلا کی اسیری، ایران کا انقلاب، gays کی فوج میں بھرتی، داغ اور مُنّی بائی حجاب نامی طوائف کا معاشقہ...... الطاف گوہر کی تان ہمیشہ حلقۂ اربابِ ذوق پر ہی ٹوٹتی ہے، جسے ان کی دیکھا دیکھی ہم بھی اختصار اور پیار میں صرف حلقہ کہنے لگے ہیں! غالبؔ کا ایک خوبصورت اور فلسفیانہ سا شعر ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

میرا خیال ہے کہ اس میں "حلقہ" سے مراد اگر حلقۂ اربابِ ذوق لی جائے تو شعر کا مزہ ہزار چند ہو جائے گا اور اتنی ہی بار اُن پر پیار آئے گا! میرا مطلب ہے فریب اور حلقے پر!

کچھ اسی نوع اور شدّت کی شیفتگی صاحبِ طرز و معجز رقم ادیب اور اوکھے البیلے افسانہ نگار انتظار حسین کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔ کتنی ہی برساتیں آئیں اور جھما جھم برس کے گزر گئیں۔ جُگ بیت گئے۔ دو تین چھوٹے بڑے زلزلے بھی آئے! مگر وہ کسی طور، کسی شرط پر اور کسی بھی زمینی یا آسمانی آفت یا تنقیدی ڈراوے سے اپنے سحرزدہ پاک ٹی ہاؤس سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں! اور نکلیں بھی کیوں!

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رِند، رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

اصغر

جلے تن نقادوں کی گولہ باری اور حاسدوں کے کوسنوں سے پاک ٹی ہاؤس خدانخواستہ مُنہدم ہو بھی جائے اور "شور و شعور و سرور ایں جا بُوَد" کی فوصلائی (مُتَحَجِّر) یادگار بن جائے، تب بھی وہاں بھائی انتظار حسین کی مستقل رہائش و قبضۂ دانشورانہ، یارانِ رفتہ کی آرجار، "بیچلر" راتوں کی جگار اور جاگتی سڑکوں کے جگمگے ہرگز ختم نہ ہوں گے! پوچھیے کیوں؟ وہ اس واسطے کہ پاک ٹی ہاؤس کا اصل اور دائمی محل وقوع، اس بارونق خانہ خرابی کے قہقہوں چہچہوں، ہاؤہُوئے رِندانہ و عالمانہ، بلکہ متکلمانہ شور شرابے کا epicentre (مرکز تزلزل) تو کہیں اور ہے! صاحبو، انتظار حسین نے یہ البیلی بستی نہاں خانۂ دل

میں بسائی ہے۔ اِس کا اُجڑنا سہل نہیں۔ اس لیے کہ یہ سنگ وخشت کے ٹی ہاؤس سے کہیں زیادہ مستحکم، شاد و آباد، چونچال اور پائندہ و تابندہ ہے۔ اس کے چرچے کچھ ان کی، کچھ اوروں کی زبانی پھیلے ہیں۔ اس میں کڑک چائے کی پیالیوں کی کھنک، ترقی پسند ادب پر کھٹ مِٹھی کج بحثی، ایک گوشے میں غیر حاضر لکھاریوں کی سرگوشیوں میں غیبت (گوشہ کیا ہے اچھا خاصا غیبت کدۂ عزیزاں ہے!)، بیرے کی زبانی مینو کی گردان جو حاضرین کو پہلے ہی حفظ ہو چکی ہے، قینچی سگرٹ کے دُھویں، میلے موزوں اور ٹماٹر کے کیچپ کا بھبکا، نئی نظم اور پہلی بارش کی سوندھی مہک، زرداتی بولیوں سے لدے چھتنار نیم کی ٹھنڈی چھاؤں کے علاوہ رہ رہ کر اُٹھتے بیٹھے درد کی مانند مور کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ کُوکتا تو اب بھی اسی سمپورن ٹھاٹ میں ہے، پر بستی نے مدّتوں سے اُسے ناچتے نہیں دیکھا۔
لا دو اِک جنگل اسے بازار سے!

مور اور جنگل کا کیا ذکر، خود یہ طناز اور معجز رقم کہانی کار جنت کے شاندار درخت طوبیٰ کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے گھر آنگن کے چھتر چھاؤں نیم کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ اس بوڑھے نیم کا بالکل وہی مقام اور مرتبہ تھا جو خاندان کے شفیق بزرگ کا ہوتا ہے۔

نشۂ دانشوری، خُمارِ ماضی، یادِ عُمرِ رفتہ بلکہ ہر امرِ گزشتہ کا جو خیالی اور ناسٹلجک سا نقشہ کھینچنے کی ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے، اس پر مرزا نے اس طرح پانی پھیرا کہ ایک دن کہنے لگے "کل رات لطیفوں کی ایک کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آ گئی تو مُلہمِ غیبی نے رویائے صادقہ سے نوازا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ الطاف گوہر اور انتظار حسین...... اللہ دونوں کو صدوسی سالہ عمر عطا کرے (۱۳۰ سال مجموعی نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ)...... جنت کے اعلیٰ علیین طبقے کے عالیشان محلوں میں اقامت گزیں ہیں جن کی دیواریں ہیرے کی اور صدر دروازے زُمرّد کے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے قصر میں چاندی کے تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ لیکن دونوں سونے کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین کی خواب گاہ کی کھڑکی قصبہ ڈبائی کی جانب کُھلتی ہے۔ جنتیوں سے اکثر کہتے ہیں کہ "ذرا یہاں کھڑے ہو کر دیکھو تو سہی۔ کیسی ٹھنڈی، مہکیلی پُروا چل رہی ہے!" ڈیزائن اور decor (تزئین و آرائش) کے لحاظ سے ان کا ڈرائنگ روم پاک ٹی ہاؤس کا ہو بہو replica (چربہ۔ نقل) ہے۔ بوئیں خوشبوئیں، مہکار چہکار اور فرنیچر کی بے آرامی بھی بالکل ویسی ہے۔ ذرا دُور پر جھلمل جھلمل کرتی نہر کوثر کے کنارے شائقین اس کی طرف پُشت کیے لپٹن کی چُورا چائے اور دودھ پتّی چائے بالٹی میں کھنگالی ہوئی پیالیوں میں پی رہے ہیں۔ بہشتی پاک ٹی ہاؤس میں سگرٹ پینے یا سلگانے کی بوجوہ

سخت ممانعت ہے۔ تاہم قینچی سگرٹ اور کیپسٹن کے رسیا ان کے دھوئیں اور بدبو کا سینٹ رومال میں بسا کر ادبی گفتگو کے دوران سونگھتے رہتے ہیں۔ اگر نثری نظم ترنم سے سن کر کسی کو حال آ جائے یا ترقی پسند ادب پر بحث کرتے کرتے کوئی نازک مزاج بے ہوش ہو جائے تو کیپسٹن مارکہ سگرٹ کے دھوئیں، کیچپ کے بھبکے اور میلے موزوں کے سینٹ کا لخلخہ سنگھا کر ہوش میں لاتے ہیں!

انتظار حسین نے اپنے قصر کا قبضہ لیتے ہی حوروں کو نکال باہر کیا اور وہ روتی دھوتی، فریاد کرتی احمد فراز اور افتخار عارف کے حضور پہنچیں۔ پھر لوٹ کے نہ آئیں! اب ان کی جگہ انتظار حسین کے تاجِ سخن دری پر پاک ٹی ہاؤس کا بڈھا پھونس بیرا ہمہ وقت مورچھل جھلتا رہتا ہے! بہت ہی ضعیف و لاغر ہے۔ مورچھل بس اسی حد تک ہلتا ہے جتنا کہ ہاتھ میں رعشہ ہے! اس کو سامنے بٹھال کے لکھتے ہیں تو مضامینِ نو کے انبار لگا دیتے ہیں۔ کوئی بدلحاظ اس بڈھے پر فقرہ کستا ہے تو وہ اپنی طلائی غلیل میں کٹیلے محاورے کا غُلّہ رکھ کے ایسا مارتے ہیں کہ وہ ڈھینکلی کھا کے گرتا ہے اور اُٹھ کے چرکین کے اشعار پڑھتا اور محاورے بولتا تراٹ جاتا ہے۔''

بقیہ خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا ''میں ان کے بلوریں دیوار بیچ پڑوسی الطاف گوہر سے بھی ملا، وہ لبوں پہ آئی مسکراہٹ اور فقرہ ضبط نہیں کر سکتے کہنے لگے، چوں کہ ہیرے کی دیواریں transparent ہیں، لہٰذا بھائی انتظار نے پردہ دری کے اندیشے سے حوروں کو محل بدر کر دیا ہے۔

؎ حوروں کو شکایت ہے کہ محتاط ہے مومن!

قصر کے پاسبان نے بتایا کہ جب کوئی جنت کی تعریف کرتا ہے تو جنتی الطاف گوہر 'لہور لہور اے' اور 'ہائے حلقہ اربابِ ذوق' کی رٹ لگاتا ہے! جب کہ دوسرا پاکباز و پاک مغز بہشتی نابغہ ثمرِ طوبیٰ کی بجائے کڑوے نیم کی نبولی اور حور و غلمان کی بجائے راجستھان کا مور مانگتا ہے! اور گاہے گاہے اسی کی آواز ایسی مہارت سے منہ سے نکالتا ہے کہ فرشتے بھونچکا سے رہ جاتے ہیں کہ ہم نے تو انتظار حسین کو مورچھل لانے کی اجازت دی تھی۔ یہ سموچا زندہ مور جو مورنی کو رجھانے پھُسلانے والی آوازیں گلے سے نکال رہا ہے، اِسے جنت الفردوس میں کون اسمگل کر کے لایا؟ یارا جی، اب کس کو جنت سے نکلوانا مقصود ہے؟ حوریں الگ حیران پریشان ہوں گی کہ یہ کون حضرت آدم کا ہم قدم نکلا؟

جنت میں الطاف گوہر لاہور کے بدلتے موسموں اور رُت بھری صبح و شام کو بہت مِس کرتے

ہیں۔ اور ہر نو وارد جنّتی سے وہاں کی لُو کا حال جو آموں میں رس اور مٹھاس گھولتی تھی، بڑی للک سے پوچھتے ہیں۔ اور ان طوطوں کی ڈار کی بھی خیر خیریت معلوم کرتے ہیں جو امرُودوں پر چونچ سے دستخط کر کے اپنی حاضری لگاتے ہی بھرّا مار کے اڑ جاتے تھے۔ حلقے میں ان کا ایک ہم خیال و ہم نوا و ہم نِوالہ یار تھا۔ وہ اب جاں بلب اور عازمِ ملکِ عدم ہے۔ اُسے کہلا بھیجا ہے کہ لاہور سے رس بھری گنڈیریاں اور سرسوں کا ساگ، گزشتہ بسنت پر لاہور کی ہواؤں میں ڈولتی کٹی ہوئی کوئی پتنگ، حلقے کے آخری جلسے کی DVD اور سرگودھا کے ریڈ بلڈ مالٹے اپنے توشۂ آخرت میں سنگوا کر آخری ہچکی کے بعد لیتا آئے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کسی فرشتے نے نہ چُھوا ہو۔ بلکہ اس راہ سے کوئی فرشتہ پر مار کے نہ گزرا ہو۔ ورنہ پہلی بارش میں بھیگی مٹّی کی ساری خوشبو ہوا ہو جائے گی۔ ظالم ہر مزے، ہر لطف و لذت کا مُنھ مار کے ★[1] پاکیزہ کر دیتے ہیں! فرشتوں نے یہ ہُنرِ تطہیر چند نو وارد جلتّی مولیوں سے نیا نیا سیکھا ہے! پہلا موقع ہے کہ فرشتوں میں نو مسلموں کا سا جوش پایا جاتا ہے!

الطاف گوہر نے اپنے وسیع و عریض محل کا چپّہ چپّہ اس طرح آراستہ کیا ہے کہ اب ان کی جنّت لاہور کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔

فردوس کا ہر گوشہ ہے لاہور کی مانند!

گوجرانوالہ میں اپنے آبائی گھر کے قریب جس ٹاہلی تھلے ★[2] بچپن میں کھیلا کرتے تھے، اُس کی لکڑی سے بنی میز پر لاہور کی چوبرجی کا ماڈل سجا رکھا ہے۔ ایک طلسماتی DVD پلیئر پر ہر آئے گئے کو حلقہ اربابِ ذوق کے مناظر اور مناظرے فرصت کے اوقات میں یعنی تمام وقت، دکھاتے

★[1] مُنھ مارنا: محترمہ زہرا نگاہ کا خیال ہے کہ اس لفظ کے معنی میرے علاوہ صرف ایک شخص کو معلوم ہوں گے۔ وہ اردو لغت بورڈ کا لغت نویس ہوگا، جو غالبًا اس لفظ کی لُغویت یعنی لُغوی بوجھ تلے کب کا وفات پا چکا ہے!
بہرکیف، متوفی نے جلد ہفت دہم میں اس کے یہ معنی بیان کیے تھے:
''خراب کر دینا، ستیاناس کرنا، تباہ و برباد کرنا''
سند میں یہ مُنھ مار شعر بھی نقل کیا ہے، جو حاشا وکلاً میرا نہیں ہے۔ زہرا نگاہ بھی کانوں پر ہاتھ دھرتی ہیں۔ البتہ متوفّی مذکورہ مُطعُونہ بالا سے کچھ بعید نہیں!

بچپن یوں ہی گزرا سارا لاڈنے بنی کا مُنھ مارا!

ناس مارنے، ستیاناس کرنے یا تباہ کرنے میں وہ بات نہیں جو مُنھ مار دینے میں ہے۔ اس لفظ کا کوئی متبادل نہیں۔ اس لیے کہ اس فعل کا بھی تو کوئی متبادل نہیں ہے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

★[2] ٹاہلی تھلے: (پنجابی) شیشم کی چھاؤں میں۔

رہتے ہیں۔ فرشتوں کو بھی بُلا بُلا کر دکھاتے ہیں کہ اوئے ملکوتو! یہ کیا خالی خلاؤں میں اپنے دھنک رنگ شہ پر پھٹپھٹاتے، پھڑ پھڑاتے پھرتے ہو! ذرا نظر جھکا کے تودۂ خاک کی ہماہمی اور یہ رونقیں تو دیکھتے جاؤ جن سے حلقہ ارباب ذوق عبارت ہے:

دیکھو حلقے میں یہ انٹلکچویلز دست و گریباں نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ ترقی پسند ادب اور امن کی اہمیت پر گفتگو کر رہے ہیں!

اس منظر کو دیکھ کر بھی ہنسی نہ آئے تو جان لو کہ حسِ مزاح صرف اولادِ آدم کا ورثہ ہے: کڑکڑاتے جاڑے میں منہ سے لفظ نکلنے سے پہلے بھاپ کے مرغولے نکلتے دیکھ کر افتخار جالب جیسا مُجتی شرما کے چُپکا ہو رہا!

اس شاعر کے چہرے کا کلوز اپ ذرا غور سے دیکھو۔ اسے تازہ کہی ہوئی غزل لگ رہی ہے!

گلے میں رنگ برنگے موتیوں منکوں کی مالا پہنے اور ہاتھ میں گولے لیے جو صاحب بیٹھے ہیں، یہ محمد ثناء اللہ ڈار ہیں جنہیں ایک ہندو لڑکی میرا نے جس سے انہوں کبھی بات تک نہیں کی، میرا جی بنا دیا! تم فرشتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ یہ صرف خاکیوں کا وصف اور شرف ہے۔ تم نور کے پُتلے ٹھہرے۔ فقط سجدے پہ سجدہ، سجدے پہ سجدہ کرنا جانتے ہو۔ محبت نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ حوا سے محبت کی شرطِ اوّل جنت بدر ہونا اور کچے گھڑے سے چڑھتی ندی پار کرنا ہے۔

؎ تیرا سرِ شہ پَر بھی کبھی تر نہ ہوا ہے

دونوں جنتیوں کو زنجیروں سے باندھنے کی وجہ یہ ہے کہ قوی اندیشہ ہے کہ اگر ان کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ دونوں اہل قلم نابغے جنت کا سارا سامانِ عیش و عشرت چھوڑ چھاڑ کر، بغیر پیرا شوٹ کے ہبوط کرتے ہوئے سیدھے لاہور میں اپنی معلقّہ و منسوبہ جنت ارضی یعنی حلقہ ارباب ذوق اور پاک ٹی ہاؤس کی چھت پھاڑ کے دھم سے جا گریں گے! حاضرین، بالخصوص حاسدین و ناقدین، کو چوٹیں آئیں گی، جن سے ڈاکٹر صاحبان اُن کو جانبر نہ ہونے دیں گے!''

مرزا اپنے خواب کو لطیفاتے چلے گئے۔ ارشاد فرمایا ''ایک حور کہنے لگی' یہ جو ایک جنتی کے پائیں باغ میں بیوی کے کاسنی دوپٹے سے بنائے ہوئے سائبان تلے اپنے نا قابلِ اشاعت مسوّدوں

کے چبوترے پر سیتل پاٹی ★[۱] بچھائے مُنشیوں اور کاتبوں جیسا آسن بنائے، گھٹنے اور زانو پر رائٹنگ بورڈ رکھے، پنسل سے کچھ لکھ لکھ کر ربر سے مِٹا رہے ہیں اور اچھی طرح مٹانے کے بعد لفظ بہ لفظ پھر وہی لکھ دیتے ہیں...... معلوم ہے یہ کون بزرگِ دو جہاں دیدہ ہیں؟ یہ مشتاق احمد یوسفی ہیں! انہیں ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی سفارش پر اردو کے سب سے بڑے صاحب طرز ادیب محمد حُسین آزاد کے سرونٹ کوارٹر میں بحیثیت عارضی اسسٹنٹ مالی کی جگہ ملی ہے۔ یہ صرف ایک ہی پھول پہچان سکتے ہیں...... موتیا! سیکڑوں گملوں میں بس وہی لگا رکھا ہے۔ جنّت کے پھولوں کی ساری کیاریوں کو کھود کھاد کے اب ان میں اپنی پسندیدہ سبزی یعنی بھنڈی اور گوار کی پھلیاں اُگائی ہیں! جنتی انہیں گنوار کی پھلیاں کہتے ہیں۔ موتیا سونگھنے اور گوار کی گوڑائی سینچائی سے جو وقت بچ رہتا ہے اُس میں حوروں کے خاکے اپنے مخصوص انداز میں لکھ لکھ کر مٹانے اور مِٹا مِٹا کر پھر وہی کچھ لکھنے کے بعد انہیں دستخط کر کے (مع اپنی تاریخ وفات) دے دیتے ہیں۔ وہ بھی عید بقرعید پر انہیں ربر اور شارپنر کا تحفہ بہترین مُسکراہٹوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی کے رسوائے زمانہ گٹر بغیچے کی گوار کی پھلیاں ★[۲] ڈالڈا دسترخوان کی مصنفہ سے پکوا کر بذریعہ کوریئر سروس منگاتی ہیں اور انہیں کھِلا کر خوب ٹھٹھے لگاتی ہے۔ وہ زیادہ شوخیاں کرتی ہیں تو یہ انہیں جیب سے اپنی بیگم کی تصویر نکال کر دکھا دیتے ہیں!'

میں نے اُس باتونی حور سے پوچھا، کیا جنّت کے لباس میں جیب بھی ہوتی ہے؟ بولی، کیوں نہیں۔ اعمالنامے کی مکمّل DVD اسی میں تو رکھی جاتی ہے۔ روزانہ نہار منہ دیکھنا لازمی ہے۔ ادھر

★[۱] سیتل پاٹی: ''ایک قسم کی نرم چٹائی جو سیتل گھاس سے بنائی جاتی ہے۔''
اس پر بیٹھنے، یوگا آسن جمانے یا لیٹنے کے بعد، بقول مرزا، آدمی صرف پاکیزہ خیالات، نیک تمنائیں، خوش گمانیاں، شُبھ اور پوِتر کامنائیں رکھ سکتا ہے۔ بچوں کے سے معصوم خواب دیکھ سکتا ہے، جن میں روپ نگر کی پریاں، اگلی چپی برتھ ڈے کے غبارے، شیر، اژدہے، چُڑیلیں اور قینچی بردار مولوی نظر آتے ہیں۔ اس پر مراقبہ، تزکیۂ نفس، دھیان گیان، پُوجا پاٹ اور پاپی مَن کو شانت کرنے کے لیے تپسیا کر سکتا ہے۔ تمہارے جیسے مضمون لکھ سکتا ہے...... مختصر یہ کہ کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکتا!

★[۲] ہماری پسندیدہ پھلیوں کے بارے میں ذرا لغات کی گوہر فشانی ملاحظہ فرمایئے:
گوار: ''ایک قسم کا غلہ جو بھینسوں وغیرہ کو دودھ کی زیادتی کے لیے کھلایا جاتا ہے (علمی اردو لغت)۔ تِل اور گوار کی پھلی کو کوٹ کر چوٹ یا موچ کی سُوجن پر باندھنا چاہیے۔ (اردو لغت) جامع اللغات کے لُغت نویس کے کلیجے میں اس سے بھی ٹھنڈک نہیں پڑی تو گوار کھائے گنوار ('' آدمی کی خوراک اس کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے'') کی کہاوت نقل کر کے غذائی شواہد سے ہماری گنوارُو اوقات کو اُجاگر کیا ہے!

کچھ دنوں سے انہیں علی الصبح ایک نیا تولیہ آنسو پونچھنے کے لیے دیا جاتا ہے'

وہ مسکرائی تو میں نے دوسرا سوال داغا: اُن دونوں نابغوں کو تو سونے کی زنجیروں سے باندھ رکھا ہے۔ اِس بچارے کے پاؤں میں سوگز لمبی فولادی زنجیر کا ہے کو ڈال رکھی ہے۔ بولی'' یہ بزرگوار پاسِ وضع، وفا شعاری اور دوستداری کا راگ ہر وقت الاپتے رہتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ رات برات ترنگ میں زنجیر تُڑوا کر دوزخ کے اسفل السافلین طبقے میں نہ جانکلیں، کیوں کہ ان کے کچھ جگری دوست، پانچ چھ شاعر اور رائٹرز، ممدوحین و مداحین اور محبان یوسفی وہیں سکونت پذیر ہیں! ہر آئے گئے کو انہیں کے قصے اور قصیدے سناتے رہتے ہیں۔ جذبۂ رفاقت اور شوقِ خطابت زور مارے تو اردو بولتے بولتے انگریزی اپنے ٹھیٹ اردو لہجے میں بولنے لگتے ہیں۔ انگشتِ شہادت سے اپنے مسکنِ مقصود و موعود کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، پتہ نہیں اپنا یا کسی اور کا قول دہراتے ہیں:

Look! All the interesting people are there, including ★[1] ....''

ملاحظہ فرمایا آپ نے، بھٹک کر کہاں سے کہاں آنکلا! جو کچھ قلم دکھائے سولا چار دیکھنا، بات دراصل یہ ہے کہ مرزا کو یہ گمان گزرا کہ میں نے الطاف گوہر اور انتظار حسین کے ناسٹلجیا کا مذاق اُڑایا ہے جواباً انہوں نے ''دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ'' کہتے ہوئے راقم السطور پرُ فتور کی خبر لے ڈالی۔

میں خود بھی یہ ذکر چھیڑ کے ایسا اُلجھا ہوں کہ ''حلقہ'' کے آسیبی حصار سے باہر نہیں نکل پا رہا اور ٹی ہاؤس کی بھول بھلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہوں۔ اور تو اور، مضمون لکھنے بیٹھا تھا الطاف گوہر پر اور انتظار حسین پر دفتر کا دفتر لکھ ڈالا! بات دراصل یہ ہے کہ جہاں تک الطاف گوہر اور انتظار حسین اور ان کے محورِ تجلّیات حلقۂ اربابِ ذوق اور پاک ٹی ہاؤس کا تعلق ہے تو یہ نکتۂ راز ملحوظ رہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کی آفتِ جاں کشش اور اندازِ شیفتگی و یاد آوری اچھی طرح سمجھ میں آجائیں تو دوسرے کے حال، احوال و اقوال آپی آپ سمجھ میں آجائیں گے۔ کہنے صرف یہ جارہا تھا کہ حلقہ کی یادیں الطاف گوہر کو اور ٹی ہاؤس کی انتظار حسین کو بے طرح ''ہانٹ'' کرتی ہیں...... اور ہمیں ان کی بے مثل تحریریں، بالکل اسی طرح!

میں نے بارہا بچشم و بگوش خود دیکھا اور سنا کہ جب بھی حلقہ اربابِ ذوق کا ذکر آتا ہے...... جو کہ گفتگو میں ہر پانچ منٹ بعد ادبدا کے آجاتا ہے تو الطاف گوہر کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک اور لہجے میں یادوں بھری تلک اور کُمک در آتی ہے جو چند لطیفوں اور شوخ و شنگ فقروں کے بعد سہتی سہتی

★[1] وہاں اقامت گزیں اکابرین کے اسمائے گرامی خوفِ فسادِ خلق سے حذف کر دیئے۔ اپنے نام کا اعلان کافی ہے۔

اور سُہانی سی اُداسی میں ڈوب جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''میرا جی میرے لیے وہ وقت کا ایک ایسا لمحہ ہیں جو اٹل ہے۔ میں اس لمحے کو چھو سکتا ہوں۔ محسوس کر سکتا ہوں۔ اس کا سہارا لے کر گزرتے لمحوں کو دیکھ سکتا ہوں۔ یہ لمحہ میرے ساتھ رہے گا۔ میرے ساتھ گزرے گا۔'' پھر کسی اور سیاق و سباق میں مگر اسی بابِ بازگشت اور لمحۂ باریاب میں وہ دو مرتبہ میرا جی کے ''چل چلاؤ'' سے ایک بند، بڑے چاؤ اور پیار سے نقل کرتے ہیں:

''ہر بستی، ہر جنگل، صحرا اور روپ منوہر پربت کا
اک لمحہ من کو لبھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا......
ہر منظر، ہر انساں کی دیا، اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے پل بیتا سب مٹ جائے گا
اس ایک جھلک کو جھجھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی
ہے چاند فلک پر اک لمحہ
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں
اور لمحہ کا عرصہ بھی سوچو! اک لمحہ ہے''

(چل چلاؤ)

الطاف گوہر مرصّع کاری سے احتراز کرتے ہیں۔ برش کی کم سے کم strokes میں ایسی تصویر بنا دیتے ہیں کہ ذہن پر مُرتسم ہو جاتی ہے۔ میرا جی سے پہلی ملاقات کی تصویر ملاحظہ فرمائیے:

''مختار نے کھڑکی کے قریب جا کر کہا 'میرا جی صاحب' اندر سے آواز آئی ''آیئے'' متین کھرجدار آواز ایک پتلے دبلے کھُلتے رنگ کے آدمی نے دروازہ کھولا اور دونوں ہاتھوں سے چک کا نچلا حصّہ اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ ہم باہر اندھیرے میں تھے۔ مختار نے مجھے اشارے سے ٹھہرے رہنے کو کہا۔ سامنے وہ پتلا دبلا آدمی بدستور چک اٹھائے کھڑا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں کی لٹیں اس کے شانوں کو چھو رہی تھیں۔ دو بڑی بڑی چمکدار آنکھیں اطمینان سے اندھیرے کو ٹٹول رہی تھیں۔ وہ ایک ملگجی شیروانی پہنے تھا، سیاہ رنگ کی اُونی جُرابیں اس نے پتلون کے پائنچوں پر چڑھا رکھی تھیں۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے کہا 'آیئے' ہم اندر چلے گئے۔ مختار ہنس رہا تھا: 'میرا جی! چک کا پیچھا چھوڑ دیجیے ہم بغیر سائیکل کے ہیں۔' مجھے معلوم ہوا کہ جب کبھی کوئی اُن سے ملنے آتا، میرا جی

دروازہ کھول کر چک کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کھڑے ہو جاتے تا کہ ملنے والے کے پاس اگر بائیسکل ہو تو وہ اُسے بھی ساتھ لے کر اندر آ سکے۔ اچھے متوسط گھر کا کمرہ معلوم ہوتا تھا، ایک طرف دیوار کے ساتھ بڑا پلنگ لگا تھا جس پر لال غلاف کا ایک گاؤ تکیہ دھرا تھا۔ دو رویہ آرام کرسیاں رکھی تھیں اور ایک قد آدم آئینہ لکڑی کے فریم میں آویزاں تھا۔ ہوا کے جھونکے سے گلی کی بُو کمرے میں آ گئی۔ میراجی نے کہا بو آ رہی ہے ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں اور یہ کہہ کر انہوں نے یکے بعد دیگرے پانچ سات بیڑیاں سلگائیں اور دو دو چار چار کش لگا کر کمرے میں اِدھر اُدھر پھینک دیں۔ پھر بغیر کچھ کہے پلنگ پر سے کتابیں اکٹھی کرنے لگے۔ مختار نے میرا نام بتایا۔ میراجی نے ایک لمحہ کے لیے پلٹ کر دیکھا اور پھر کتابیں جمع کرنے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہو اور اب شاید ہمیشہ کے لیے مختار یونہی آرام کرسی پر پڑا رہے گا اور میراجی پلنگ پر سے کتابیں سمیٹتے رہیں گے۔ پہلی ملاقات کا یہ احساس بعد میں گہرا ہوتا گیا۔"

فروری ۱۹۴۶ء میں میراجی سے ان کی آخری ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی تصویر صرف ایک سطر میں ایسی کھینچ دی ہے کہ تادیر ہانٹ کرتی رہے گی۔ میراجی الطاف گوہر کو الوداع کہنے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر آئے ہیں۔ الطاف گوہر میراجی کو ان کی والدہ کا پیغام سنانا چاہتے ہیں جسے کچھ عرصے قبل سننے سے پہلے ہی انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ "اگر اماں کی طرف سے کوئی پیغام لائے ہو تو میں نہیں سنوں گا۔" اس دفعہ الطاف گوہر نے ہمت کر کے جو کچھ ان کی والدہ نے کہا تھا، ان سے کہہ دیا۔ ٹرین چلنے والی ہے، لیکن وہ کھڑکی سے لگے مقبول حسین احمد پوری کا گیت 'لاگ اساڑھ چلی پُروَیا' گاتے رہے۔"

اور اب برکھا رُت کا سندیسا لانے والی پُروَیا پوَن صرف اساڑھ ہی میں نہیں بلکہ بارہ ماس اسی طرح چلتی رہے گی۔ میراجی گزرتے لمحوں کو اپنے درشن دریچے سے لگے الوداع کہتے رہیں گے اور سدا اپنی ہی دُھن، اپنے ہی انگ اور ترنگ میں یونہی آمدِ باراں اور نوید بہاراں کے گیت گاتے رہیں گے۔

"تحریریں چند" میں میراجی پر ان کے اِکٹھے تین مضامین ہیں اور تینوں اپنی تازگی اور ہمدردانہ تجزیہ کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ میراجی پر اُس زمانے میں بہت سے باکمال لکھاریوں نے بہت کچھ لکھا، پر نہ اِس طرح دیکھا، نہ اِس طرح لکھا۔ الطاف گوہر ہر بار دیکھنے اور لکھنے کے بعد مُڑ مُڑ کے دیکھتے اور پلٹ پلٹ کے اپنے من موہنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ میراجی کی شاعری میں انہیں عورت کے تین رُوپ نظر آئے۔ "ہزار پُر اسرار پردوں میں چھپی ہوئی محبوبہ۔ ان گِنت رنگوں میں ڈوبی ہوئی دلہن۔ اور دہلیز کی طرح روندی ہوئی بیسوا۔" فطرت سے قُرب اور ردِ عمل کے خلوص

اور سالیت کو وہ میرا جی کی شخصیت کا اصل شعری جوہر قرار دیتے ہیں۔ میرا جی کے فن اور شخصیت سے شغف رکھنے والوں کو آج بھی ان مضامین میں ناقدانہ تفہیم وسخن شناسی اور نکتہ طرازی کے نئے پہلو اور خیال انگیز اشارے ملیں گے۔

اکثر خیال آتا ہے کہ شاید اردو مرکز لندن میں الطاف گوہر کو حلقۂ ارباب ذوق کی جانی پہچانی چھب چھاؤں نظر آتی ہے جو باعثِ شیفتگی ہو سکتی ہے۔ اس کا معقول جواز بھی ہے۔ اوائل جنوری ۱۹۷۹ء کا ذکر ہے۔ میں بر سبیل ملازمت لندن آیا تو کئی دوستوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ لندن میں ایک اردو لائبریری ہونی چاہیئے جہاں ادبی تقریبوں کا اہتمام بھی ہو سکے جس نے سنا، تجویز کو سراہا، پُر جوش تائید کی، میری پیٹھ تھپکی اور ...... کچھ نہ کیا! چار پانچ ماہ بعد الطاف گوہر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اُتنے زور شور سے تو تائید نہ کی، لیکن اپنے ادارے تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے تحت اردو مرکز قائم کر دیا۔ نام بھی انہیں کا رکھا ہوا ہے۔ چند روز بعد میں پاکستان گیا تو اپنے جانشین مسٹر عبداللہ، چیئرمین پاکستان بینکنگ کونسل اور پانچوں بڑے بینکوں کے صدور کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بینک تقریباً دو ہزار کتابوں کی کھیپ اردو مرکز کو تحفتہً ارسال کریں۔ چھ سات ماہ بعد یہ کتابیں لندن پہنچ گئیں اور اردو مرکز نے اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ آغا حسن عابدی صاحب کی توجہ، اعانت، سرپرستی اور تعاون کے بغیر ناممکن تھا۔ اسے فعّال رکھنے کا تمام تر سہرا الطاف گوہر، ان کے فرزندِ ارجمند ہمایوں گوہر اور عزیزی افتخار عارف کے سر ہے۔ اب اردو مرکز اپنی ادبی اہمیت کے علاوہ برصغیر سے آنے والوں کے لیے ایک ''ٹورِسٹ اٹرکشن'' کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لندن میں اب کسی کو کسی کُڈھب لفظ کے بارے میں اشتباہ ہوتا ہے یا کسی نو وارد شاعر کو ٹاور آف لنڈن کا بَس رُوٹ دریافت کرنا ہو، یا کسی نقاد کو کباب کھانے ہوں یا گُردے کا آپریشن کرانا ہو تو پہلے اردو مرکز سے رجوع کرتا ہے!

اب اِسی اردو مرکز کے قیام کی داستان ذرا ڈاکٹر عبادت بریلوی کی زبانی سنیے جو انہوں نے اپنی تازہ ترین تصنیف میں بیان کی ہے جس کا موضوع آغا حسن عابدی اور مرکزی کردار وہ خود ہیں:

''میرے ایک شاگرد لندن میں رہتے ہیں۔ شاعر ہیں، اور اُردو کا کام کرتے ہیں۔ چند سال ہوئے اُنہوں نے لندن میں ایک اُردو کانفرنس منعقد کرنے کا ڈول ڈالا۔ میرے پاس لاہور آئے۔ اپنے اس منصوبے کا مجھ سے ذکر کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے لیے میں آغا حسن کو توجہ دلاؤں۔ میں نے اُردو کی محبت کے پیش نظر آغا حسن کو اس سلسلے میں خط لکھ دیا اور اُنہوں نے اچھی

خاصی رقم انہیں دے دی۔ لیکن انہوں نے اس رقم کو غلط طور پر استعمال کیا۔ کانفرنس بھی نہیں کی اور پیسہ بھی ضائع کیا۔ مجھے اس کا علم ہوا تو بہت افسوس ہوا۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کرسکتا تھا کہ شرمندگی کا اظہار کروں۔ اپنی قوم کے بیشتر لوگ ایسے ہی غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ آغا حسن اِن لوگوں کے شکوہ سنج ہیں اور اکثر دَبی زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن اُن کی بڑائی اِس میں ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لیے بھی اپنے دروازے بند نہیں کرتے۔

چند سال ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے پاکستان، ہندوستان کے شعبے میں اُردو اور مطالعۂ پاکستان کی ایک پروفیسر شپ قائم ہوجائے تو اِن موضوعات پر تدریس و تحقیق کا کام باقاعدگی کے ساتھ ہو سکے گا۔ چنانچہ میں نے حکومت پاکستان کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ وزارت تعلیمات اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اس سلسلے میں لکھا۔ اِن اداروں نے اصولی طور پر میری اس تجویز کو منظور بھی کرلیا لیکن جب یہ معاملہ فنانس میں منظوری کے لیے گیا تو فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے منظور نہ ہوسکا، اور اس طرح یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

اب میں نے یہ سوچا کہ آغا حسن کی توجہ اس طرف دلاؤں۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں اُنہیں مفصل خط لکھا، اور اپنے دوست رالف رسل سے کہا کہ وہ لندن میں آغا حسن سے ملیں اور اس منصوبے کی تفصیل انہیں بتائیں۔

رالف اُردو کے عاشق ہیں اور اُردو کے لیے ہر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں آغا حسن سے مِلے اور طویل مذاکرات کے بعد اُنہوں نے آغا حسن کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں اُردو کی چیئر قائم کرنے کے لیے مالی امداد دینے کو تیار ہیں۔

آخری مُلاقات میں اُنہوں نے پچاس ہزار پونڈ کا چیک رسل کو اس کام کے لیے دے دیا۔ یہ چیک مل گیا تو رسل نے لندن یونیورسٹی کے ارباب اختیار سے اس سلسلے میں بات کی۔ یہ لوگ اصولی طور پر اس رقم کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن شرط یہ لگائی کہ اُردو کی اس پروفیسر شپ کا اشتہار دیا جائے گا، اور اس پر کسی انگریز کا تقرر ہوگا۔

رسل کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اُن کی خواہش تو یہ تھی کہ بغیر اشتہار کے میرا تقرر اس پروفیسر شپ پر ہو جائے تاکہ ہم دونوں مل کر وہاں اُردو کا کام کریں لیکن جب انہیں لندن یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے فیصلے کا علم ہوا تو وہ پھر آغا حسن کے پاس گئے۔ اُنہیں اس فیصلے سے آگاہ کیا،

اور وہ چیک انہیں واپس کردیا لیکن آغا حسن نے کہا کہ وہ اس چیک کو واپس لینے کے لیے تیار نہیں ہیں، کیونکہ یہ اُن کے اصول کے خلاف ہے۔

رالف نے مجھے اس کی اطلاع دی۔ بالآخر رسل سے طویل ملاقاتوں کے بعد آغا حسن نے یہ فیصلہ کیا کہ اس رقم سے لندن میں اُردو سنٹر کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کردیا جائے جو اُردو زبان وادب کا کام کرے۔

یہ ہے لندن میں اُردو مرکز کے قائم ہونے کی کہانی!''

ڈاکٹر عبادت بریلوی علمی اور فکری سطح پر دانا و بینا، مگر عملی میدان میں بھولے اور ''بیبا'' آدمی دکھلائی دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں انہوں نے اپنے لڑکپن کے واقعات کا ذکر بڑی للک اور بھولپن سے کیا ہے، جس پر اگر ان کی بزرگی مانع نہ ہوتی تو ہمیں بہت پیار آتا۔ ان کا ناسٹلجیا بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہمیں تو اُن کے بچپن اور بڑھاپے کی باتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، بجز اس کے کہ اب وہ ان کو قلم بند بھی کردیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آغا حسن عابدی نے محض ان کے ایماء و اصرار پر بینکنگ کا پیشہ اختیار کیا ورنہ وہ تو خودکشی پر تلے بیٹھے تھے۔ کاش، ڈاکٹر صاحب اپنے بارے میں بھی خود کو ایسا ہی دانشمندانہ مشورہ دیتے۔ اپنی مشکلات ومصائب کی جو سچی تصویر انہوں نے کھینچی ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آغا حسن عابدی کو خودکشی سے بچانے کے بعد انہوں نے خود اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا وہ انہیں پریشانی اور احتیاج و ابتلا کی اس منزل پر لے آیا جہاں خودکشی محض جائز ہی نہیں، واجب معلوم ہوتی ہے!

ڈاکٹر صاحب کو غالباً اس کا علم اور اندازہ نہیں تھا کہ لندن یونیورسٹی میں نئی چیئر اس طرح قائم نہیں کی جاتی کہ ایک ریٹائرڈ اسکالر پچاس ہزار پونڈ کے چیک سے وائس چانسلر کو پرچاتا پھرے! حساب میں ہم بھی ہمیشہ سے کمزور ہیں لیکن اب ایسے بھی نہیں کہ اتنی قلیل رقم سے وائس چانسلروں کی سُوجھ بُوجھ کی آزمائش کرتے پھریں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پچاس ہزار پونڈ سے زیادہ تو اردو مرکز کا صرف کرایہ ہی ہے! مسٹر رالف رسل کو اس کارِ دشوار میں شریک کرنے کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ ایک سے دو بھلے۔ سیدھا سادھا، بے ضرر اور مفید مطلب کام تو آدمی تنِ تنہا بھی کرسکتا ہے لیکن شوقِ فضول اور ناقابلِ عمل آدرش وادی مہم میں اپنے ہی جیسے unpractical اور مستغنیٔ الحقائق شخص کی مورل سپورٹ (اخلاقی مدد) اور دُسراتھ کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ رالف رسل صاحب خاصے عمر رسیدہ یعنی میرے ہی ہم عمر، دُھن کے پکے، سنجیدہ اور مخلص انسان

ہیں۔ انہوں نے دُھوپ میں بال سفید نہیں کیے۔ وہ اور ان کے بال پیدائشی سفید ہیں، جس میں ان کی کوشش، نزلے اور نامساعد حالات کو دخل نہیں۔ عبادت بریلوی صاحب کی داستان کے اس باب حسرت ناک کو درست ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ رالف رسل صاحب نے اردو کی چیئر کے قیام کے لیے اپنی سی دوڑ دھوپ کی، لیکن جہاں تک پچاس ہزار کے چیک کا تعلق ہے وہ اردو مرکز کو نہیں ملا۔ کیا ڈاکٹر عبادت بریلوی یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ اس کی رقم کس نے وصول کی یا اس کا حشر بھی وہی ہوا جس کا ذکر ''میرا لونگ گواچا'' اور ''جُھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں'' آتا ہے؟ یہ بات پورے وثوق اور ذمہ داری ...... اور اتنے ہی ادب و احترام کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رالف رسل صاحب کا تعلق کسی بھی حیثیت سے اور کسی بھی دور یا مرحلے میں اردو مرکز سے نہیں رہا۔ اور اس سے ان کی بیش بہا خدمات، تبحرِ علمی اور مرتبے میں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ★[1]

منٹو کے بارے میں جو پتے کی باتیں الطاف گوہر نے آج سے تیس پینتیس برس قبل کہی تھیں، ان کی کُرش تازگی اور کاٹ آج بھی ویسی ہی ہے۔ ان کا مزاج بنیادی طور پر غیر جذباتی اور تجزیاتی ہے۔ ان کو تیکھی اور تُند وتُرش بات دوسروں کے گلے سے اتارنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کے خیال میں منٹو کی شخصیت کے پس منظر میں جو جذبات کارفرما تھے، اُن میں سب سے اہم اور حاوی تحسین وستائش کا جذبہ تھا۔ وہ خود کو ایک مصلح اور لیڈر کی حیثیت سے منوانا چاہتا تھا، لیکن اُس کے خیالات سطحی اور جذباتی تھے۔ لوگوں کو چونکا دینے والا انداز اختیار کرنے کی غرض سے جو تکنیک منٹو نے اپنائی وہ الطاف گوہر کے الفاظ میں یہ تھی کہ ''دیکھنے میں جو چیزیں عام طور پر بھلی معلوم ہوتی ہیں، اُن میں کوئی نہ کوئی بُرائی ضرور ہوتی ہے۔ اور جو چیزیں عام طور پر بُری سمجھی جاتی ہیں، اُن میں کوئی نہ کوئی خوبی نہاں ہوتی ہے۔'' وہ سمجھتے ہیں کہ اس فارمولے نے منٹو کی کردار نگاری کو بُری طرح متاثر کیا۔ نتیجۃً جنسی موضوعات سے متعلق افسانوں کے انجام بھی میلوڈرامائی ہو کر رہ گئے۔ فطری انجام منٹو کو پھُسپھُسا لگتا تھا!

الطاف گوہر نے منٹو کی جس تکنیک کی کمزوری کی جانب اشارہ کیا ہے اس کا تعلق بنیادی طور پر denouement یعنی پہلے سے طے شدہ ڈرامائی انجام سے ہوتا ہے۔ اسے موپساں نے بڑی

★[1] سامعین میں جو حضرات شامل تھے ان میں اردو مرکز کے بانی مبانی الطاف گوہر، ناظم و منتظم اعلیٰ افتخار عارف اور B.C.C.I کے سب سے سینیئر ایگزیکٹو ایم۔ آر۔ پیر بھائی جو بینک کے ذیلی اور فلاحی اداروں کی ''فنڈنگ'' کے شعبے کے سربراہ تھے، بہت نمایاں تھے۔ وہ وہیں تردید کر کے پانی کا پانی اور بڑی محنت سے میرے دوہے ہوئے دودھ کا بھی پانی کر سکتے تھے۔

ہنر مندی سے برتا جس کے خیرہ کُن تاثر اور تقلید سے منٹو خود کو نہ بچا سکا۔

انہوں نے منٹو اور میرا جی کی ''فحش نگاری'' کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اس پر میں صرف اتنا اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس کا جنسی تجربہ جتنا کم ہوگا اور جنسی محرومی و نا آسودگی جتنی زیادہ ہوگی وہ فحش نگاری میں اتنا ہی زیادہ کُھل کھیلے گا۔

''طرز اور صاحبِ طرز'' اور ''طرز اور تجربہ'' پر ان کے خیال انگیز مضامین خصوصی توجہ اور داد کے مستحق ہیں۔ ایسے ادق موضوع پر جسے اُس زمانے کے بہت سے سکّہ بند نقادوں نے بھاری پتھر سمجھ کر چُومنے تک کی زحمت گوارا نہ کی، انہوں نے اختصار سے لیکن باخبر اور پُر اعتماد لہجے میں گفتگو کی ہے۔ خود ان کا اسلوب سادہ، سلجھا ہوا اور رواں دواں ہے۔ وہ پچھلے پہر موم بتّی کی روشنی میں نگینے نہیں جڑتے۔ ان کا واضح مفہوم و مدّعا خود اپنا چُست پیرہن و پیرایہ اختیار کرتا جاتا ہے۔

متفرقات کے ذیل میں ان کا مضمون ''گر تو بُرا نہ مانے'' خاصے کی چیز ہے۔ ممکن ہے مجھے التباس ہوا ہو، لیکن گمان غالب ہے کہ یہ مضمون پطرس کی بعض بشری کج ادائیوں پر انہی کے اسٹائل میں لکھا گیا ہے۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو ماننا پڑے گا کہ پطرس کی شخصیت کے اس پہلو پر اس سے پہلے کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ کم از کم میرے علم میں نہیں۔

''تحریریں چند'' کے بیشتر مضامین پچیس تیس برس قبل لکھے گئے تھے۔ کاش وہ ہر مضمون کے آخر میں اُس کا سنہ تصنیف بھی دے دیتے تو تاریخی تناظر میں ان کی تازہ کاری، جودت اور ندرتِ فکر کی بہتر طریقے سے داد دی جاسکتی۔ مانا کہ شرابِ کُہن خود سر چڑھ کے بولتی ہے، تاہم بادہ فروش اِلتزاماً بوتل کے لیبل پر سنہِ کشید درج کر دیتے ہیں کہ بعضے بعضے تو فقط سنہ دیکھ کر ہی بہکنے اور لڑکھڑانے لگتے ہیں! انہیں پینے پلانے میں اتنا مزہ نہیں آتا جتنا کہ بہکنے بہکانے اور لڑکھڑانے میں! ایک دفعہ رات گئے ہمارے کرم فرما سردار زین الدین خاں، پریسیڈنٹ بغدادی جم خانہ نے مے نوشی کے فوائد و فضائل بیان کرتے ہوئے اس رمزِ رندانہ کو فاش کیا کہ حکومت کے خلاف بڑے بڑوں کو کچھ کہنے کی ہمت اور ہیاؤ نہیں پڑتا لیکن بہت پرانی اسکاچ وہسکی کے تین چار پیگ حلق سے اترنے کے بعد آپ میں اتنی اخلاقی جُرأت اور روحانی طاقت آجاتی ہے کہ Men's Bar کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر حکومت، منسٹر اور اپنے دشمن کو بے دھڑک اور بے دغدغہ اُسی کی مادری زبان میں گالی دے کر برسوں کی جمع شدہ بھڑاس نکال سکتے ہیں! دشمن بھی یہی کچھ کرتا ہے!

کتاب کے اخیر میں تیس صفحوں پر مشتمل حصّہءِ منظومات ہے، جس کا رنگ، آہنگ اور مزاج

بالکل مختلف ہے۔ افسوس کہ میں اس پر سیر حاصل تبصرہ نہ کرسکوں گا۔ یہ مضمون میں نے بہت مختصر نوٹس پر بہت کم وقت میں لکھا ہے، اس لیے طویل ہوگیا ہے۔ مختصر بات کہنے کے لیے تو زیادہ وقت اور بہت محنت درکار ہے۔ اُن کی نثر کا مجموعی تاثر معروضیت، کشادگی، تازگی، صاف گوئی اور شگفتگی کا بنتا ہے۔ جب کہ شعر میں دل گرفتگی، یادِ ایامِ رفتہ اور حزن و ملال کی زیریں لہر ایک مختلف کیف اور کیفیت کی حامل ہے۔ عنوانات سے ممکن ہے مترشح نہ ہو، لیکن ان کے لہجے میں بعض واقعات اور سانحات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے...... تقسیمِ ہند، سقوطِ مشرقی پاکستان، دوستوں سے جدائی، ان کی اپنی اسیری، بلوچستان میں فوجی آپریشن، ایامِ رفتہ کی یاد، دل کا آپریشن، شعر میں ان کی اُداسی دو چار برس کی بات نہیں، ۱۹۴۷ء میں بھی جب آتش جوان تھا، اُس نے دل پر پنجے گاڑ دیئے تھے:

ابرِ بہار چل دیا، اب نہ کوئی کھنک نہ شور
رند کہاں چلے گئے، پیرِ مغاں کو کیا ہوا
وہ جو تمہاری بزم سے اُٹھ گئے اُن کا ذکر کیا
وہ جو وہاں کے ہو رہے، ان کے نشاں کو کیا ہوا

۱۹۷۳ء میں یہ اُداسی کسی اور ہی عالم کی نشاں دہی کرتی ہے:

بس ایک بار وہ آیا اور اس پہ یہ عالم
کہ جیسے آیا نہیں اور ہزار بار گیا

۱۹۸۰ء میں اچانک تسلیم و رضا کی منزل آجاتی ہے۔ اسے اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ یہ وہ سال ہے جب انہیں دل کا آپریشن کرانا پڑا:

عالم الغیب بالآخر تسلیم
مالک القدس بالآخر تسلیم
ہر حسیں نام ترا، رنگ ترا، تیرا جلال
خالق الباری بالآخر تسلیم

۱۹۸۳ء تک پہنچتے پہنچتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جھومتی گھٹا ہے جو کھلتی ہے نہ برستی ہے۔ اور یہی اس گداز کیفیت کا حسن ہے۔ لندن میں وطن کی یاد انہیں بہت ستاتی ہے۔ اور وہ اپنی بے کلی میں ہم سب کو شریک کرلیتے ہیں۔ ''اے پیارے لوگو!'' ایک سہمے سہمے پُر ملال اندیشے سے شروع ہوتی ہے:

ے گھر واپس جب آؤ گے تم
کون تمہیں پہچانے گا
کون کہے گا، تم بن ساجن
یہ نگری سُنسان

دوسرا بند اسی کیفیت کا تسلسل ہے:

ے بن دستک دروازہ گم صُم
بن آہٹ دہلیز،
سُونے چاند کو تکتے تکتے
راہیں پڑ گئیں ماند
کون کہے گا، تم بن ساجن
یہ نگری سُنسان

اضطراب اور رنج و ملال کی کیفیتوں سے گزرتی یہ نظم ایسے صبر و قرار پر ختم ہوتی ہے جو آنسوؤں اور سسکیوں کے بعد گہری نیند کو اپنی جِلو میں لے کر آتا ہے:

ے لوٹ کے اب کیا آؤ گے
اور کیا پاؤ گے
کون کہے گا تم بن ساجن
یہ نگری سُنسان

کچھ دیر بعد آپ یہ نظم اسد امانت علی خاں سے سنیں گے، جس کی راگ داری میں آپ کو وطن سے دور لوگوں کا سوزِ دروں، اسد کے والد مرحوم کی آواز کی گونج ...... جیسے اندھیری رات میں جنگل کی آگ میں لپکتا لہراتا شُعلہ اور خود اسد کی بھری جوانی تان لیتی سنائی دیتی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل اسد نے یہ نظم دریائے ٹیمس کے کنارے ایک یادگار محفل میں گائی تھی تو سُننے والوں کی آنکھیں نمناک ہوگئی تھیں۔ میں نے بعد میں الطاف گوہر سے کہا کہ دل کی گہرائیوں سے نکلی اور دلوں کو چھوتی یہ نظم بلاشبہ اس لائق ہے کہ اسے Anthem of the Expatriates یعنی ''تارکین وطن کا ترانہ جلا وطنی'' کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔ اب جو غور کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ بیشتر لوگ تو اسے سن کر اس لیے گریہ کرتے ہیں کہ وطن واپسی کی آس نہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی پڑے ہیں جو اس خیال سے آبدیدہ ہو

جائیں گے کہ اگر سچ مچ وطن واپس جانا ہی پڑا تو......؟

الطاف گوہر اور اسد امانت علی، دونوں ہی بہت خوش نصیب ہیں، ورنہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے اشعارِ آبدار کو کوئی مُغنّی آتشِ نفس اپنے کمالِ فن سے سہ آتشہ کر دے۔ آج کل تو یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بعض خراب گانے والے جب اپنے ہی جیسے شاعروں کا کلام گاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو مزید خراب و خوار اور رسوا کرنے میں برابر سرگرم اور سُرگرم ہیں! اور دونوں ہی سوفی صد کامیاب! ہم تو بس یہی مشورہ دے سکتے ہیں کہ

؎ شعر مُہمل ہے اسے اور بھی مُہمَل نہ بنا

یادش بخیر، مخدومی مولانا کوثر نیازی کے دورِ وزارت پُر خطابت میں جب پری چہرہ تصوّر خانم ان کا کلام پکّے راگ میں گانے کی کوشش کرتی تھی تو نہ کلام سمجھ میں آتا تھا نہ راگ۔ بس چہرہ سمجھ میں آتا تھا۔ ایسی ہی صورت کے دیدار سے پیدا شدہ صورتِ حال کے بارے میں ایک ظالم اپنے شدید تاثر اور بے کراں تمنا و تشنگی کو ایک چھوٹے سے مصرعے میں کس خوبی سے سمو گیا ہے:

؎ مری آرزو سے کم تر، مری تاب سے زیادہ!

جب وہ حسینہ ٹی وی پر اپنے مخصوص سیکسی انداز سے ناک سکیڑتی تو بس جان ہی تو نکل جاتی تھی! میرا مطلب ہے مولانا کے کلام کی! بار بار ناک سکیڑنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ شعر نہ صرف سمجھ کے گا رہی ہے بلکہ مردوں کو سمجھانا بھی چاہتی ہے۔ حالاں کہ اصلی مطلب تو، مردوں کو چھوڑیے، مُردوں کے مُردوں تک کی سمجھ میں آ سکتا تھا لیکن گھروں میں ٹی وی دیکھنے والی بیویاں اس کا مطلب مردوں سے بھی پہلے سمجھ جاتیں اور کسی بہانے ٹی وی سیٹ کے سامنے سے اپنے شوہروں کو پرے ہٹا دیتی تھیں۔ حکومت کے معاملات میں اگر ہمارا کچھ عمل دخل ہوتا تو ہم اس نادرِ روزگار بینی کار کو تمغۂ حسنِ کارنا کردنی دلوا دیتے کہ یہ پہلی فن کارہ ہے جس نے ناک کو سیکس کے برملا اظہار و انگیخت کے لیے اور بطور آلۂ تسخیرِ مردانِ خوش اوقات، پہلے پہل استعمال کیا۔ بلاشبہ یہ پہلی سترناک ناک ہے جس پر غِلاف اور پردہ واجب ہیں!

اخیر میں مودّبانہ معذرت کے ساتھ ایک گزارش۔ مجھے اور الطاف گوہر کو تادمِ گزارش ایک دوسرے کا سنِ پیدائش معلوم نہیں لہٰذا محض اندازے اور قیافے سے ہم ایک دوسرے کو اپنا بزرگ سمجھتے اور درگزر کرتے آئے ہیں۔ طرزِ تخاطب اور رکھ رکھاؤ کی حد تک اسے محتاط رویّہ کہہ سکتے ہیں، لیکن دوستی کے لیے بہترین آغاز نہیں کہا جا سکتا۔ بہرکیف، سخن گسترانہ نوبت آ ہی گئی تو انہیں نصیحت

کرتے اور مشورہ دیتے ہوئے حفظ مراتب سے صرف نظر کرنے کی پیشگی معذرت۔

ان کی قائم کردہ تھرد ورلڈ فاؤنڈیشن کا موعودہ دائرۂ کار بہت وسیع اور اس کے مقاصد اتنے ارفع اور بلند و بالا ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کے دیکھیں تو مجھ جیسے بوریہ نشین کی دستارِ فضیلت اپنے ہی قدموں پہ آرہے۔ ان کی نگرانی و ادارت میں شائع ہونے والے جریدے South اور Third World Quarterly اب بفضلہٖ تیسری دنیا میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے میں انہیں کیا کچھ انگیز کرنا پڑا، اس کا اندازہ عام قارئین نہیں لگا سکتے۔ وہ خود مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں گارجین اخبار میں ہر ہفتے تھرڈ ورلڈ کا ایک علاحدہ سیکشن شائع ہوتا تھا، جو ان کے تحریر کردہ یا ایڈٹ کیے ہوئے مضامین و شذرات پر مشتمل ہوتا تھا۔ جب ان کا مسودہ ادارتی ڈیسک پر پہنچتا تو ایک پھٹیچر سا انگریز سب ایڈیٹر مین میکھ نکال کر تقریباً ہر سطر پر نیلی پنسل پھیر دیتا تھا۔ تقریباً اس لیے کہا کہ پاکستانی ناموں اور مقاموں کو جوں کا توں رہنے دیتا تھا! سوائے ایک موقع کے جب ایک سیاسی تجزیے میں انہوں نے ایک سیاست داں کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے والد کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ اُس سڑیل ایڈیٹر نے حاشیے پر یہ نوٹ لکھ کر نام قلم زد کر دیا کہ والد کا نام بتانا چنداں ضروری نہیں۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ سیاست داں کی ولدیت کو اس کی حرکات پر بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے! مطلب یہ کہ ایسوں کی پسرانہ نالائقی کو پدرانہ ترکہ و تبرک سمجھنا چاہیئے۔

الطاف گوہر کہتے ہیں کہ اب احساس ہوتا ہے کہ ''بابو انگلش'' میں جو پیوندی جملے ہم بڑے جتن سے انگلش گریمر کے مطابق ڈھال ڈھال اور گھڑ گھڑ کے بناتے تھے ان کی قرار واقعی داد صرف ملکہ وکٹوریہ ہی دے سکتی تھی جسے آنجہانی ہوئے ایک صدی ہونے کو آئی! جدید انگلش idiom اور usage (یعنی جدید روز مرّہ) سے ہماری انگریزی کو وہی نسبت تھی جو کسی نجیب الطرفین لارڈ کے شجرۂ نسب میں کیلٹر کی ہوسکتی ہے!

سچ تو یہ ہے کہ contemporary (جدید۔عصری۔ روزمرّہ) انگلش سیکھنے میں ہمیں اتنا کشٹ نہیں اٹھانا پڑا جتنا کہ سات برس کی عمر سے ساٹھ برس کی سٹھیاہٹ تک بڑی محنت سے سیکھی ہوئی وکٹورین انگلش کو unlearn کرنے میں!

اب کہیں لندن آکے یہ بات ہماری بھی سمجھ میں آئی کہ اسکاٹ، ایڈیسن، لیمب، ہیزلٹ، کارلائل، ڈِکنس، میکالے اور ہارڈی کا اسلوبِ انشا پردازی پیچدار، شاخ در شاخ جملہ سازی، تراکیب و تشبیہات اور وہ سرمایۂ لفظیات جو ۱۸۵۷ء کے بعد نسلاً بعد نسلاً ہمارے ماڈل اور منتہائے نگارش رہے...... ان سب کو آج کل انگلینڈ میں لکھی اور بولی جانے والی انگریزی سے وہی

نسبت ہے جو...... مثال کے طور پر...... اپنے وقتوں کے اِس معتبر و معتبر نثر پارے کو آج کل لکھی اور بولی جانے والی اردو سے ہو سکتی ہے:

''اپنے نفس کی رہائی میں عمل کر کہ وہ سباعِ ضاریہ و افاعی جاریہ و کلابِ عادیہ و عقبانِ مختلہ و شیاطینِ موسوسہ و سموم قاتلہ سے رہا ہو جائے۔'' تشنیف الاسماع

ایک دفعہ مرزا کو یہ اقتباس سنایا تو کہنے لگے'' کچھ دن اور صبر سے کام لو۔ اللہ اور عوام نے چاہا تو تمہاری نثر کے نمونے بھی بالکل اسی طرح تمہارے جیسے نفسِ مضمون و طرزِ تحریر سے رہائی دلانے کے علاوہ کان اور عبرت پکڑنے کے لیے بھی quote کئے جائیں گے!''

معاف کیجئے، ایک نہیں بلکہ ایک سے ایک جملۂ معترضہ بیچ میں آن پڑا، ورنہ کہنا صرف یہ تھا کہ اب ماشاء اللہ یہ عالم ہے کہ الطاف گوہر کی تحریریں، تجزیے، اداریے اور تقریریں اپنی کاٹ، طنازی، ژرف نگاہی اور بے ضغطہ راست نگاری کا لوہا ان معنوں میں بھی منوا چکی ہیں کہ سمندر پار سرکاری حلقوں نے سخت ناپسندیدگی اور بین السّرا عظمی برہمی کا اظہار کیا ہے۔ کولمبیا، زمبابوے، ہانگ کانگ، بیجنگ، ماسکو اور منیلا میں جن بین الاقوامی کانفرنسوں کا وہ اعلیٰ ترین پیمانے پر انعقاد اور اہتمام کر چکے ہیں اس سے ان کے ادارے کی شہرت اور رسائی، انجمن آرائی اور خود ان کی بلند حوصلگی اور خوش سلیقگی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ اُن ذہین و لائق اور اتنے ہی خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنے شوق اور کام میں نشاطِ کار بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ اردو ادب سے ان کا رشتہ عشق عاشقی کا رہا ہے، گو کہ اب انہیں اِس اولڈ فیشن مشغلۂ دل کی فرصت شاذ و نادر ہی میسّر آتی ہے۔ وہ ایک عمر سے اس کے منتظر ہیں کہ بڑے لوگوں سے اِنٹرویوز، تھرڈ ورلڈ پرائز، انٹرنیشنل کانفرنسوں کے انعقاد و انصرام کشاکشِ غمِ روزگار، کشایشِ رزق، اور کششِ لیلائے صحافت و سیاحت سے ذرا دم لینے اور قلم سے رجوع کرنے کی فرصت ملے تو اپنی روٹھی ہوئی میوز (Muse) کو منائیں۔

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا!

کس کی شامتِ آئی ہے کہ ایسے کامیاب و کامراں، دانا و فرزانہ کو سمجھانے بیٹھ جائے کہ حضور والا، ایسی بجنّت، ٹھالی ٹھلووں والی مکمل فُرصت و فراغت زندگی اور اس دنیا میں تو نہیں مل سکتی۔ رہی وہ دنیا، تو وہاں کی فرصت یا عدیم الفرصتی اور اپنے باب میں وہاں کے طرزِ تپاک یا تپشِ تعزیر کا فی الحال عاجز کو ذاتی علم ہے، نہ ہُوکا کہ بیٹھے بٹھائے اَن جانی جگہ جانے کی جلدی مچاؤں۔

مجھ جیسا فقیر عُزلت گزیں جو ایک تہائی صدی سے اردو ادب کے ایک نیم روشن گوشے میں اپنی ہی دُھن میں ایک سادہ اور خود ساختہ سا ساز...... اِکتارا بجاتا رہا ہے، (اس لیے بھی کہ اسے کچھ اور نہیں آتا) اور اب جب کہ اس کی باج اور جھنکار دم بدم مدّھم پڑتی جارہی ہے، وہ ایسے لوگوں کو جنہوں نے بادشاہوں اور بادشاہ گروں کا تماشا دیکھنے کی طرح دیکھا ہے اور پردہ گرنے کے بعد زوردار تالی بھی بجائی ہے، بھلا کیا مشورہ دے سکتا ہے۔ فقیر کی بُری بھلی پہچان اور مان دان تو بس یہی ایک اَدھورا سَدَھورا غریبانہ سا ساز ہے، جسے وہ کبھی کاندھے پہ رکھے، کبھی گلے میں لٹکائے اور کبھی سینے سے لگائے رہا، لیکن نہ تو نگری نگری، گلی گلی داد و تحسین طلب کشکول لیے پھرا، نہ کبھی جنگل کی راہ لی کیوں کہ

ع اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

سو وہ اِسی صحرائے صحن اور دشتِ دالان میں اپنا راگ پراگ وقت بے وقت بجا کے جی خوش کرلیتا ہے کہ وہ خود ہی باجا ہے، خود ہی باج اور خود ہی بجَیا بھی! کبھی ہُوک اُٹھتی ہے تو خود ہی ''تھیا تھیا'' بھی کرلیتا ہے!

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ساز بجانے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''ساز بجانے والوں کی یہ شان نہیں کہ ساز کو دیوار پر لٹکا دیا ہے۔ اِس خوبصورت صبح سے تم کیوں بیر باندھے بیٹھے ہو؟ تمہیں اِس ساز کے بغیر ساز بجانے والا کون کہے گا؟''

تو یہ یک فنا، یک سُرا، یک تالہ اکتارا بدوش سازندہ عرض پرداز ہے کہ سنو، فقیر یہ پیش گوئی کرنے کی جسارت ضرور کرے گا کہ آج سے پچاس برس بعد جب وقت کا درّاک جوہری پوری چھان پھٹک اور پرکھ کے بعد ہیرے، موتی، مرجان، لعل اور زُمرّد کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں سنگوا کر رکھ دے گا۔ ہمارے سنگریزے، کنکریاں اور خالی سیپیاں تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکتا چلا جائے گا۔ شیش محل کا سارا آڈمبر تبدّل وتغیّر کی کالی پیلی آندھی اڑا کر لے جائے گی۔ فیصلے کی اس گھڑی میں الطاف گوہر کو ان کے وطن عزیز اور علم و ادب کی دنیا میں تھرڈ ورلڈ کے سربراہ، انگلش جریدوں کے نامور ایڈیٹر، انٹرنیشنل کانفرنسوں کی رونق اور روح درواں کے رُوپ بہروپ اور صحافتی سِنگھار میں کوئی نہیں پہچانے گا۔ ہاں ایک ذہین لکھاری، ''تحریریں چند'' کے مصنف اور اردو اور اردو مرکز کے سچے خدمت گزار کی حیثیت سے ہمیشہ محبت اور عزت سے یاد کیا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں اردو میں کچھ لکھنے کی ہُوک رہ رہ کر اُٹھتی رہتی ہے۔ کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔ دست بدعا ہوں کہ خدا انہیں وہ فراغتِ فراواں اور کامل یکسوئی عطا فرمائے جو اس دیرینہ شوق

اور شمع کو فروزاں رکھے۔

شعر و ادب کا چسکا زمانۂ طالب علمی میں پڑ جائے، پھر چُھٹائے نہیں چُھوٹتا۔ آزاد کا قول ہے کہ جس نے بچپن میں گُڑ کھالیا، پھر زندگی بھر کوئی مٹھاس اس کے کام و دہن کو نہیں بھائے گی۔ سو میرے بھائی، میرے ہم قلم، میرے ہم سِن بزرگ! زندگی کے ہنگاموں اور جھمیلوں سے ہٹ کے دیکھو تو سہی۔ ذرا دیر کو آنکھیں بند کرلو گے تو سب کچھ نظر آنے لگے گا۔ دیکھو جُھٹ پٹا سا ہو چلا ہے شام کا۔ گھر کے طاقِ نسیاں پہ رکھی وہ اَدھ کھائی گُڑ کی ڈلی جانے کب سے راہ تک رہی ہے۔

؎ لوٹ کے گھر کب آؤ گے؟

یہاں کچھ پھول رکھے ہیں

اس تقریب میں شرکت کے دعوت نامے کے ساتھ جب مجھے مطلع کیا گیا کہ میرے تقریباتی فرائض خالصتاً رسمی اور حاشیائی ہوں گے تو مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ ایک گونہ میں رواروی میں لکھ گیا، ورنہ سچ پوچھیے تو دوگونہ اطمینان ہوا۔ اس لیے کہ مجھے اطمینان دلایا گیا کہ رسمِ اجراء نہایت مختصر و سادہ ہوگی۔ اس میں وہی ہوگا جو اس طرح کی شاموں میں شایانِ شان ہوتا ہے یعنی کچھ نہیں ہوگا۔ بس صاحبِ شام (میں نے جان بوجھ کر صاحبہ شام نہیں کہا) شاہدہ حسن کی تاج پوشی نہیں ہوگی۔ میرے تردّد و تامّل اور اس وضاحت کا سبب یہ تھا کہ ایک ہفتے قبل میں شاہدہ کا ایک خیال انگیز تعارفی مضمون مخدومی و مکرمی جناب جاذب قریشی کی تاج پوشی کی تقریبِ سعید میں سُن چکا تھا۔ جاذب صاحب کی شاعری اور تنقید کا دلپذیر سلسلہ، نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ ایک عمر کے ریاض، مہارتِ تامّہ، ژرف نگاہی، وضعداری اور ادبی سیرچشمی کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ تعجب اس پر ہوا کہ جیسا تاج پیرومُرشِد کو عقیدتمندوں نے پہنایا، ویسا تاج امریکہ میں حسینۂ عالم کو اور پنجاب میں صرف دلہن کو پہنایا جاتا ہے۔ دولہا کے سر پر تو سہ غزلے کی لمبائی کے برابر اونچی طرّے دار کُلاہ ہوتی ہے۔ پنجاب میں اگر دولہا ایسا زنانہ تاج پہن کر آجائے تو قاضی نکاح پڑھانے سے انکار کردے گا۔ اور اگر نکاح ایک دن قبل ہو چکا ہے تو دلہن والے نکاح ٹوٹنے کا اعلان کر دیں گے۔ دلہن اپنے بائیں دستِ حنائی سے دائیں ہاتھ کی ہری ہری چوڑیاں توڑ دے گی اور دائیں ہاتھ سے بائیں کی۔ پھر ان ہی سونا سے ہاتھوں سے دھکّے دے کر ہریالے بنڑے کو عقدگاہ سے یہ کہہ کر نکال دے گی کہ

؎ عقد کو عقد سمجھ مشغلۂ دل نہ بنا

برات کو رات کے ساڑھے گیارہ بجے، کوکا کولا کی بوتل پلائے بغیر کھڑے کھڑے واپس کر دیا جائے گا۔ تاج اور ادھورے وڈیو سمیت!

تاجپوشی کی تصویریں کِلک کِلک کھنچنے لگیں تو مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر خدانخواستہ یہ پنجاب کے اخباروں میں چھپ گئیں تو لوگ کہیں گے کہ کراچی کے اہل زبان حضرات بزرگوں کے ساتھ دلہنوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور عرُوسی زیورات کے استعمال میں تذکیر و تانیث کا ذرا خیال نہیں رکھتے! جب کہ الفاظ کے نر و مادہ نہ پہچاننے پر اب بھی لے دے ہوتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ جب حضرت جاذب براتِ دلداگاں میں گھِرے، تصویریں کھچوا رہے تھے تو ہمارے دوست پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے بی ٹی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے وہ گھر میں ہوتے ہیں تو اسی حصہ جسم پر معصوم بچے لوٹتے ہیں۔ مرزا نے ہمارے کان کو ہاتھ سے اپنے منہ کے قریب کھینچ کر ان شعرا کے نام گنوائے جو حسد سے جلے مر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ حاسدین کی فہرست میں ایک نثر نگار کا نام بھی ہے۔ پوچھا بھلا کون؟ بولے، مشتاق احمد یوسفی۔ پھر اکبرالہ آبادی کے اشعار اپنی تحریف و سکتے کے ساتھ سنائے:

؎ اوجِ بختِ مُلاقی اُن کا
چرخ ہفت طباقی اُن کا
محفل و تاج طِلائی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

یہ معروضات ازراہِ تفنن نہیں ہیں۔ اگر سن و سال کا بیّن تفاوت راہِ حُسنِ عقیدت و ارادتمندی میں حائل نہ ہوتا تو میں محترم المقام جناب جاذب قریشی اور ان کے استاد مکرم، بلکہ استاذ الاساتذہ حضرت فرمان فتح پوری کو اپنا پیر و مرشد کہنے میں فخر محسوس کرتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسی رشتۂ ارادت و نیاز مندی کے باعث رسم تاج پوشی کچھ عجیب سی لگی۔ یادش بخیر، تیس پینتیس برس اُدھر کی بات ہے۔ ایسی ہی تاجپوشی ایک شاعرہ مِس بلبل کی ہوئی تھی جو اپنے والد کے ہمراہ اندرون سندھ سے تشریف لائی تھیں۔ ان کے سر پر ابنِ انشاء نے دستِ خاص سے تاج رکھا اور ملِکہ تغزل کے لقب سے نوازا۔ اپنے تیکھے انداز میں ایک مضمون بھی پڑھا جسے مدحیہ ہجو یا ہجویہ قصیدہ کہا جائے تو دونوں تعریفیں درست ہوں گی۔ بعد کو ابن انشاء نے مِس بُلبُل پر چار پانچ مزیدار کالم بھی لکھے۔ اُس زمانے میں مِس بلبل اور ہیئر ڈریسرز انجمن کے صدر سلمان، ان کے کالموں کے دل پسند موضوع تھے۔ ہال کا کرایہ، باسی سموسوں اور خالص ٹین کے تاج کی قیمت خود ملِکہ عالیہ نے جیبِ خاص سے ادا کی۔ رہی ان کی شاعری تو اتنا اشارہ کافی ہے ملکۂ اِقلیم سُخن کی طبعِ آزاد، عروض کی

غلام نہ تھی۔ غزل میں دورنگی نہیں پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ کہ مطلع سے مقطع تک ہر شعر وزن اور بحر سے یکساں خارج ہوتا تھا۔ پڑھتے وقت ہاتھ، آنکھ اور دیگر اعضاء سے ایسے اشارے کرتیں کہ شعر تہذیب سے بھی خارج ہو جاتا! ان اشاروں سے شعر کا مطلب تو خاک سمجھ میں آتا، شاعرہ کا مطلب ہم جیسے کند ذہنوں کی سمجھ میں بھی آ جاتا تھا۔ بے پناہ داد ملتی جسے وہ حُسنِ سماعت سمجھ کر آداب بجا لاتی تھیں۔ وہ دراصل ان کے حُسن و جمال پر واہ واہ ہوتی تھی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ، سامعینِ بے تمکین کے مردانہ جذبات کے فی البدیہہ اخراج کو وہ عفیفہ خراجِ عقیدت سمجھتی تھی! لوگ انہیں مصرع طرح کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتے۔

تقریب اجراء کا ماجرا قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ میرے خوشگوار فرائض رسم اجراء ہی سے متعلق ہیں۔ دوم، قوی اندیشہ ہے کہ اگر تاجِ شہی کے وصول کنندگان اور تاج دہندگان کی بروقت حوصلہ شکنی نہ کی گئی تو یہ بدعتِ فاخرہ یعنی رسم تاجپوشی اب ہر تقریب رونمائی و اجراء کا لازمی حصہ بن جائے گی، جس سے صرف ہر دو قسم کے اُن کاریگرانِ باکمال کو فائدہ ہوگا جو چاندی پر سونے کا ایسا ملمع کرتے ہیں کہ

ع نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا

(دستِ نقاد جو چھو جائے، رنگ ہو میلا)؟

جو اہلِ قلم اب تک کمالِ فن، تمغہ حسن کارکردگی، ہلالِ امتیاز اور اکیڈمی آف لیٹرس کے انعامات کے لیے تگ و دَو کرتے اور آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے ہیں وہ اب تاج اور منصب تاجوری کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار و بیزار ہوں گے۔ ایک دوسرے کے کام اور کلام الملوک ملوک الکلام میں پورے مصرع کے برابر لمبے کیڑے نکالیں گے۔ مجھ جیسا ہر گیا گزرا ادیب اور شاعر خود کو ARY کے ۲۲ کیرٹ گولڈ کے تاج کا اکلوتا حقدار قرار دے گا۔

ع انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے تاج!

کیسی یہ انوکھی بات!

مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے کی قید نہیں، genuine شاعر کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ صرف میرؔ اور غالبؔ کو اوپری دل سے شاعر تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ وہ بروقت وفات پا چکے ہیں۔ بروقت سے مراد اِن کی پیدائش سے پہلے۔

تاجپوشی کی تصویریں کِلک کِلک کھنچنے لگیں تو مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر خدانخواستہ یہ پنجاب کے اخباروں میں چھپ گئیں تو لوگ کہیں گے کہ کراچی کے اہل زبان حضرات بزرگوں کے ساتھ دلہنوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور عرُوسی زیورات کے استعمال میں تذکیرو تانیث کا ذرا خیال نہیں رکھتے! جب کہ الفاظ کے نرومادہ نہ پہچاننے پر اب بھی لے دے ہوتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ جب حضرت جاذب براتِ دلداگاں میں گھرے، تصویریں کھچوارہے تھے تو ہمارے دوست پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے بی ٹی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے وہ گھر میں ہوتے ہیں تو اسی حصہ جسم پر معصوم بچے لوٹتے ہیں۔ مرزا نے ہمارے کان کو ہاتھ سے اپنے منہ کے قریب کھینچ کر ان شعرا کے نام گنوائے جو حسد سے جلے مر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ حاسدین کی فہرست میں ایک نثر نگار کا نام بھی ہے۔ پوچھا بھلا کون؟ بولے، مشتاق احمد یوسفی۔ پھر اکبرالہ آبادی کے اشعار اپنی تحریف و سکتے کے ساتھ سنائے:

اوجِ بختِ مُلاقی اُن کا
چرخ ہفت طباقی اُن کا
محفل و تاج طِلائی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

یہ معروضات ازراہِ تفنن نہیں ہیں۔ اگر سن و سال کا بیّن تفاوت راہِ حُسنِ عقیدت و ارادتمندی میں حائل نہ ہوتا تو میں محترم المقام جناب جاذب قریشی اور ان کے استاد مکرم، بلکہ استاذ الاساتذہ حضرت فرمان فتح پوری کو اپنا پیر و مرشد کہنے میں فخر محسوس کرتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسی رشتۂ ارادت و نیاز مندی کے باعث رسم تاج پوشی کچھ عجیب سی لگی۔ یادش بخیر، تیس پینتیس برس اُدھر کی بات ہے۔ ایسی ہی تاجپوشی ایک شاعرہ مِس بلبل کی ہوئی تھی جو اپنے والد کے ہمراہ اندرون سندھ سے تشریف لائی تھیں۔ ان کے سر پر ابنِ انشاء نے دستِ خاص سے تاج رکھا اور ملِکہ تغزل کے لقب سے نوازا۔ اپنے تیکھے انداز میں ایک مضمون بھی پڑھا جسے مدحیہ ہجویا ہجو یہ قصیدہ کہا جائے تو دونوں تعریفیں درست ہوں گی۔ بعد کو ابن انشاء نے مِس بُلبُل پر چار پانچ مزیدار کالم بھی لکھے۔ اُس زمانے میں مِس بلبل اور ہیئر ڈریسرز انجمن کے صدر سلمان، ان کے کالموں کے دل پسند موضوع تھے۔ ہال کا کرایہ، باسی سموسوں اور خالص ٹین کے تاج کی قیمت خود ملِکہ عالیہ نے جیبِ خاص سے ادا کی۔ رہی ان کی شاعری تو اتنا اشارہ کافی ہے ملکۂ اِقلیم سُخن کی طبعِ آزاد، عروض کی

غلام نہ تھی۔ غزل میں دورنگی نہیں پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ کہ مطلع سے مقطع تک ہر شعر وزن اور بحر سے یکساں خارج ہوتا تھا۔ پڑھتے وقت ہاتھ، آنکھ اور دیگر اعضاء سے ایسے اشارے کرتیں کہ شعر تہذیب سے بھی خارج ہو جاتا! ان اشاروں سے شعر کا مطلب تو خاک سمجھ میں آتا، شاعرہ کا مطلب ہم جیسے کند ذہنوں کی سمجھ میں بھی آجاتا تھا۔ بے پناہ داد ملتی جسے وہ حُسنِ سماعت سمجھ کر آداب بجا لاتی تھیں۔ وہ دراصل ان کے حُسن و جمال پر واہ واہ ہوتی تھی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ، سامعینِ بے تمکین کے مردانہ جذبات کے فی البدیہہ اخراج کو وہ عفیفہ خراجِ عقیدت سمجھتی تھی! لوگ انہیں مصرع طرح کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتے۔

تقریب اجراء کا ماجرا قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ میرے خوشگوار فرائض رسم اجراء ہی سے متعلق ہیں۔ دوم، قوی اندیشہ ہے کہ اگر تاجِ شہی کے وصول کنندگان اور تاج دہندگان کی بروقت حوصلہ شکنی نہ کی گئی تو یہ بدعتِ فاخرہ یعنی رسم تاجپوشی اب ہر تقریب رونمائی و اجراء کا لازمی حصّہ بن جائے گی، جس سے صرف ہر دو قسم کے اُن کاریگرانِ باکمال کو فائدہ ہوگا جو چاندی پر سونے کا ایسا ملمع کرتے ہیں کہ

ع نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا

(دستِ نقاد جو چھو جائے، رنگ ہو میلا)؟

جو اہلِ قلم اب تک کمالِ فن، تمغہ حسن کارکردگی، ہلالِ امتیاز اور اکیڈمی آف لیٹرس کے انعامات کے لیے تگ و دَو کرتے اور آپس میں لڑتے بھِڑتے رہتے ہیں وہ اب تاج اور منصب تاجوری کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار و بیزار ہوں گے۔ ایک دوسرے کے کام اور کلام الملوک ملوک الکلام میں پورے مصرع کے برابر لمبے کیڑے نکالیں گے۔ مجھ جیسا ہر گیا گزار ادیب اور شاعر خود کو ARY کے ۲۲ کیرٹ گولڈ کے تاج کا اکلوتا حقدار قرار دے گا۔

ع انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے تاج!

کیسی یہ انوکھی بات!

مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے کی قید نہیں، genuine شاعر کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ صرف میر اور غالب کو اوپری دل سے شاعر تسلیم کرلیتا ہے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ وہ بروقت وفات پا چکے ہیں۔ بروقت سے مراد ان کی پیدائش سے پہلے۔

صاحبو، غزل کی زمین کی ہمیشہ سے یہ خاصیت رہی ہے کہ

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی

خدشہ ہے کہ تاجپوشی کی رسم اس زردوز زمین میں جڑ پکڑ گئی تو صرف کراچی میں ہی اِقلیمِ سُخن کے پانچ چھ سو تاجدار نظر آئیں گے۔ بے تخت و سلطنت! جھوٹ کیوں بولیں۔ ہم خود بھی ۲۲ کیرٹ گولڈ سے الرجک نہیں ہیں۔ تاج کو پگھلا کر روٹھی مِلکہ کے لیے پازیب بھی تو بنوائی جاسکتی ہے۔

جہاں اتنے تاجداروں کی گھمسان کی ریل پیل ہو، وہاں خون خرابا لازمی ہے۔ بادشاہ لوگ نیشنل اسٹیڈیم میں ایک دوسرے کے تاج سے فُٹ بال کھیلیں گے۔ اور ایک دوسرے کے دیوان اور ناول ان کے سرچشمے یعنی متعلقہ سر پہ دے ماریں گے۔ طوائف الملوکی کا یہ عالم ہوگا کہ وہ مخلوق بھی جس کا نام اس بدنام محاورے میں آتا ہے، اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھے گی۔ دلہنیں تاج پہننا چھوڑ دیں گی۔ محض اس ڈر سے کہ تاج دیکھتے ہی لوگ ان سے تازہ غزل یا نیا مزاحیہ مضمون سنانے کی فرمائش کر دیں گے۔

ناں، بابا ناں! ہمیں تاج سے زیادہ اپنا سر عزیز ہے۔

صاحبو، اصل بات یہ ہے کہ ہمارے بادشاہ اور شہنشاہ تو مدتیں ہوئیں ایک بغل میں تاج شہی اور دوسری میں نعلَین دبائے رخصت ہوئے مگر ہمارا جذبۂ اطاعت و بیعت سلطانِ وقت اور مٹی کے پیر والوں کی قدم بوسی کی صدیوں پرانی عادت برقرار ہے۔ رعب و دبدبہ شاہی دل کی پاتال گہرائیوں میں جاگزیں ہے۔ تجربہ کار سائیس اور سلوتری کہتے ہیں کہ بعض گھوڑے سواری دینے کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ان پر کوئی سوار نہ ہو تو دو قدم نہیں چل سکتے۔ اپنی چال بھول جاتے ہیں۔ وِراثت میں ملا جذبہ محکومیت اتنا راسخ ہے کہ بادشاہی ہمارے نزدیک انسانی کمال و فضیلت اور برتری کی معراج ہے۔ اور اس کا اطلاق عالموں، کاملوں اور فن کاروں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم اپنے محبوب فن کار کو شہنشاہِ غزل، ملکۂ ترنم، اور ملکۂ غزل کے لقب سے نہ نوازیں اور تاج شہی ان کے سر پر نہ رکھیں، ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ اگلے وقتوں میں عورتیں اگر شوہروں کو خط میں سرتاجِ من سلامت کہہ کر مخاطب کرتی تھیں تو بالکل بجا تھا۔ اس لیے کہ تاج خاص خاص موقعوں پر پہننے کے بعد اتار کر رکھ دیا جاتا ہے۔ بدبخت ہوتا بھی اسی لائق ہے۔

ہمارے سنتری بادشاہ سے لے کر رئیس المتغزلین، بادشاہِ حسن، شاہِ خوباں اور شاہ شمشاد قداں

تک اسی کمپلیکس کی کارفرمائی بلکہ شاہ فرمائی نظر آتی ہے۔ اور تو اور ایک صاحب شہنشاہ ظرافت کہلاتے ہیں۔ میرا اشارہ اپنی طرف نہیں ہے۔ ظریف آدمی court jester اور فالسٹاف تو ہوسکتا ہے، تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔ ہاں تاج وتخت یا ہماری طرح ملازمت چھننے، چھوٹنے یا چھوڑنے کے بعد ظرافت پر اتر آئے تو بات نہ صرف سمجھ میں آتی ہے بلکہ دل کو بھی لگتی ہے۔

بات پرانی ہوئی، اس لیے کہ آتش اس زمانے میں بھی جوان نہیں تھا۔ ایک ناظرین کے دل سے اور سِن سے اتری ایکٹریس ملکہ جذبات کہلاتی تھیں وہ اس مرحلے سے گزر رہی تھیں جب، مرد ہو یا عورت، صرف جذبات پہ گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کسی خاتون کو عمر کے کس مرحلے میں ملکہ جذبات کہا جاسکتا ہے۔ اتنا ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ کم و بیش ۷۰ برس کے بعد نناوے فی صد مرد غالب کی طرح اُس عمرِ یاس کو پہنچ جاتے ہیں جس کی طرف اس نے اپنے شعر میں (ہماری تحریف کے ساتھ) اشارہ کیا ہے۔

ع منفعل ہوگئے قویٰ غالب
اب عناصر میں ابتذال کہاں

جب آخرِ شب کے ہمسفر اس منزل نامقصود پر پہنچتے ہیں تو ہر مردِ نرا شہنشاہ جذبات ہو کے رہ جاتا ہے۔ نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز اور جذبات گھوڑے کے سے اور یہ جو نناوے فی صد کی قید ہم نے لگائی ہے تو دانستہ ہے۔ ایک فی صد کی گنجائش و استثنا بپاس خاطرِ نازک خیالاں رکھا ہے۔ آخر اپنا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔

''اک تارہ ہے سرہانے میرے'' سے ''یہاں کچھ پھول رکھے ہیں'' میں سات برس کا وقفہ اور سات ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ سفر اور ہجرت اس کا خاص موضوع بھی ہے جس کے اطراف وہ رہ رہ کر لوٹتی ہیں۔ شعر کے موضوع کی حیثیت سے سفر اور ہجرت میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ مسافت طے کرتے وقت قدم قدم پر احساس مُسافرت ڈنک نہ مارے۔ بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ اس طرح ہجرت باعث 'صد' خیر و برکت ہے بشرطیکہ ہجرت کے بعد احساس و عذابِ مہاجرت میں اس حد تک نہ مبتلا ہو جائے کہ حاضر و موجود سے آنکھیں پھیر لے۔ شاہدہ کا سفر کیسا گزرا، انہیں سے سنیئے:

؎ اگرچہ زعم مجھے بھی بہت سفر کا ہے
کمال سارا مگر اس کی رہ گزر کا ہے
ہاتھ آنکھوں پہ دھرے چلنا تھا
راستہ دیکھتی جاتی کیسے

''سات سمندر کی دوری سے ایک نظم'' اداس کردینے والی نظم ہے''دور افتادہ زمینوں میں انہیں اپنے شہر کی یاد'' ستاتی ہے۔

؎ اشکوں کی روانی میں ڈوبا ابھرا وہ شہر
چہرہ چہرہ مجھ میں تصویر ہوا وہ شہر

کراچی شہر بڑا البیلا، انوکھا اور اوکھا شہر ہے۔ بہت ظالم شہر ہے۔ انسان جب تک اس شہر میں رہتا ہے شاکی و نالاں ہی رہتا ہے۔ جب وہ اسے چھوڑ دیتا ہے تو اس پر کُھلتا ہے کہ اب وہ کسی اور شہر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ پھر یہ شہر کوہ ندا کی مانند اُسے بلاتا ہے یا اخی، یا اخی یا اخی! اور وہ کھنچا چلا جاتا ہے۔

جب بیسویں صدی کا بھولا اکیسویں صدی میں گھر لوٹتا ہے تو ایک سال میں پوری ایک صدی اپنا ورق بدل چکی ہوتی ہے۔

؎ میں جب گھر آئی ایک سال کے بعد
سانسیں لیں کمروں نے، بستر جاگ گئے

یہ کتاب زیادہ آٹو بایوگرافیکل ان معنوں میں بھی ہے کہ شاہدہ کی maturity اور اختیاری جلاوطنی کی روداد ہے۔

مغرب میں فیمی نزم درحقیقت ایک سماجی، سیاسی اور معاشی تحریک تھی جس کی بانی ومحرک و ہراول اہل قلم خواتین بہنیں تھیں۔ میرے نزدیک feminism نسائیت کا مُتبادل نہیں۔ نسائیت اور نسوانیت feminity کا مترادف ومتبادل تو ہوسکتی ہے، feminsim کا ہرگز نہیں۔ female feminine شاعری اور ادب کا اپنا مقام ہے۔ Feminist بالکل علاحدہ صنف ہے لیکن ایک دوسرے پر برتری و فوقیت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ فیمی نزم کے ساتھ عام طور سے strident aggressive/abrasive یعنی متشدد اور جارحانہ اور مردآزار کی صفات استعمال کی

جاتی ہے۔ ہمارے شاعرات ادا جعفری، زہرا نگاہ، پروین شاکر، شاہدہ اور فاطمہ حسن کی شاعری کو feminist poetry نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی ثقافتی روایت یا پرم پرا مہذب و شائستہ لہجہ اُنہیں وہ اُسلوب ڈکشن اور انداز بیان اختیار کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جو فیمی نزم کی سب سے نامور ادیبہ مصنفہ Germaine Greer مصنفہ The Female Eunuch کی چھاپ بن چکا ہے۔ زہرا نگاہ عورت کے دکھ درد کا پورا احساس و ادراک اور اس کے مصائب و مسائل سے ماہرانہ واقفیت رکھتی ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ سمجھوتے کی چادر بُننا اور اُسے سلیقے سے بچھانا، اوڑھنا اور استعمال کرنا جانتی ہیں:

اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھِل اٹھے گا آنگن
اٹھالیں گے تو گر جائے گی چلمن

یہ فیمی نزم نہیں، اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس کے تانے بانے میں صدیوں کی سہار، قرنوں کی بصیرتوں اور ایک باوقار شیوہ تسلیم و رضا کے تار جھلملاتے ہیں۔

شاہدہ کے ہاں وہ وصف تو ہے جسے اب نسائی حسیت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن جارحانہ feminism کا شائبہ نہیں۔ نسائی حسیت اور feminism کو اس منزل تک آنے میں کئی صبر و مرد آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ادا جعفری کی دلآویز حسرت دیکھئے۔

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی بر سرِ الزام ہی آئے

پھر اس کا موازنہ فہمیدہ ریاض کے بوسے سے کیجیے جس کے دوران یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ''تم ...... پاتال سے میری جان کھینچتے ہو۔'' ہونٹوں پر نام آئے سے پیار کی پاتال گہرائیوں تک اترنے میں دو نسلوں اور نہ جانے کتنی ذہنی صدیوں اور موروثی inhibitions کا فاصلہ ہے۔ یہ جوگ بیراگ اور جنم جنم کی پیاس سے بھوگ بلاس تک کا سفر ہے۔ اسی سفرِ پُرخطر میں ایک اور جرأت مند شاعرہ محوِخرام نظر آتی ہے جو سب کچھ چھپا کر سب کچھ دکھا دینے کا ہنر سیکھ رہی ہے۔

ے میں یہ بھی چاہتی ہوں ترا گھر بسا رہے
اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ تو اپنے گھر نہ جائے

مرزا کب چُوکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خواہش تو تمہارے رومینٹک vegetarianism کی مانند ہے۔ تم دراصل یہ چاہتے ہو کہ جس مرغے کا روسٹ تم شام کو کھاؤ، وہی مرغا صبح اٹھ کر اذان بھی دے! مطلب یہ کہ ذبح کیے بغیر اس کا گوشت کھانا چاہتے ہو۔

میں اختتام ہوں اِک عہد کے فسانے کا

(یہ مضمون کراچی کلب میں ۸ مارچ ۲۰۰۸ء کو پڑھا گیا)

جنابِ صدر، صاحبِ شام حضرت نظر امروہوی، معزز خواتین و حضرات،

یہ ہم سب کے لیے بڑے فخر و مسرت کا مقام ہے کہ محبان و نیاز مندانِ نظر امروہوی نے اظہارِ ارادت مندی و سپاس گزاری کے لیے اس خوبصورت تقریب کا اہتمام کیا ہے۔ دن اور تاریخ کا انتخاب بھی معنی خیز ہے اور خوب ہے۔ جیسا کہ ہم سب کے علم میں ہے، آج دنیا بھر میں Women`s Day منایا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس دلآ ویز غلط فہمی کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس تقریب کو اسی Feminist سلسلے کی امروہوی کڑی سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے تو آج کے دن اس تقریب کے انعقاد کا یہی جواز نظر آتا ہے کہ حضرت نظر امروہوی خواتین میں اس قدر مقبول ہیں کہ اِن کا شوخ شعر اُن کی سمجھ میں بالکل نہ آئے، تب بھی فقط طرزِ ادا پر لہلوٹ ہو جاتی ہیں:

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کماں داری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا
حالی

نظر صاحب ذاتی زندگی میں جیسے یکسُو، پُر اعتماد، طرحدار، سراپا اخلاص، خوش خُلق اور خندہ رُو ہیں، بعینہٖ یہی اوصاف و مکارم اخلاق ان کی شاعری میں محاسن کلام کی صورت جلوہ ریز ہیں۔ نشۂ مے، جوشِ شباب اور وفورِ شعر گوئی میں کوئی آدمی لاکھ چاہے اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتا۔ ڈھنگ سے جھوٹ بولنے کے لیے عالمِ ہوش و حواس میں ہونا ضروری ہے۔ جملہ اصناف سخن میں انہوں نے غزل کو اپنا واحد وسیلۂ اظہار بنایا۔ اور ایک بار اسے اپنانے کے بعد کبھی دوسری جانب حریصانہ یا حریفانہ نگاہ نہ کی۔ پیچھے مڑ کر تاسفانہ نظر ڈالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شعر خواہ ترنم سے اپنی مخصوص للک اور گمک کے ساتھ پڑھیں یا تحت اللفظ، مشاعرہ لوٹنے میں انہیں کوئی جتن نہیں کرنا پڑتا۔ نہ شاگردوں اور

مصرع اٹھانے والوں کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔ اس نازک سی صنف سے اپنی شیفتگی اور ایک عمر کی وابستگی (خواتین اور ذکیہ غزل معاف فرمائیں، نازک سی صنف سے میری مراد غزل ہے) کے بارے میں خود مالکانہ تیقن و تفاخر کے ساتھ فرماتے ہیں:

اس کا کوئی ہے اور نہ اب وہ کسی کی ہے
محبوبۂ غزل نظر امروہوی کی ہے

صد حیف کہ ان کی بلا شرکتِ غیرے محبوبۂ دلنواز پر عجب وقت آن پڑا اور خود عاشقِ صادق کو یہ دن بھی دیکھنا پڑا۔ نظر امروہوی اس صنفِ طناز کے ثنا خواں تو سدا سے تھے، اب نوحہ خواں بھی بننا پڑا:

ناقدوں نے لُوٹ لی شعر و ادب کی آبرو
اب نظر امروہوی ہے مرثیہ خوانِ غزل

بابِ مرثیہ خوانی میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ ایک صدی قبل مولانا حالی جیسا شعر کا پارکھ اور نبض شناس مایوس ہو کر شاعری کی موت کا اعلان کر گیا:

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کُڑھانا ہرگز

یہ ماتم قبل از مرگ تھا جس کا سبب فرطِ تشویش و غلبۂ مایوسی و پیش گوئی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شاعری ''غالب و شیفتہ و نیرّ و آزردہ و ذوق'' کے بعد واقعی مر گئی تو کوئی بتلائے کہ اقبال، حسرت، میرا جی، ن۔م راشد، فیض اور فراز کی شاعری...... زندوں کی زندہ شاعری...... کو کہاں، کس دل اور کن ہاتھوں سے زندہ درگور کریں؟

یہ خوبی ہم نے جون ایلیا اور نظر امروہوی میں ہی دیکھی کہ مشاعرے کا رنگ دِگر ہو جائے، ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچھا بھلا شاعر داد پائے بغیر یا باقاعدہ ہُوٹ ہو کر بغل میں بیاض دبائے اُلٹے پاؤں رخصت ہوا ہو، سامعین کتنے ہی سرزور، بے قابو اور ہُلّڑ بازی پر اُتارُو کیوں نہ ہوں، وہ ان کو پہلے ہی مصرع سے اپنی مکمل گرفت میں لینے پر قادر ہیں۔ اس کے بعد مجمع ان کو حسنِ سماعت کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا!

بقول مرزا، نظر امروہوی کی، دراز قامتی فوجیوں جیسی، شیروانی علی گڑھ کے طالب علموں والی، جذبات جوانوں کے اور حلیہ بزرگوں کا سا بنائے رکھتے ہیں، جب کہ باتیں نوجوانوں، ہنسی اور

حرکتیں بچوں کی سی! جیسی پاٹ دار آواز اس عمر میں بھی ہے اُس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ میں نے جن نامور شعراء کو مسحور کن ترنّم سے شعر پڑھتے سنا، ان میں جگر مراد آبادی سرِ فہرست ہیں۔ ان کے بعد آنے والوں میں مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، سرور بارہ بنکوی، نشور واحدی اور حبیب جالب نے لفظ و معنی میں اپنے ترنّم سے کیسا جادو جگایا! جگر کے بعد درباری ٹھاٹ کا ترنّم صرف زہرا نگاہ کے حصّے میں آیا۔

نظرا مروہوی کی آواز کی گرج گونج سُورمائی دور کے کڑکیت★ کی یاد دلاتی ہے۔ ان کا انگ اور رنگ، لہکتی گمکتی لے کا انترا اور لہرا سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ جس بیتابانہ انداز و ادا سے وہ شعر پڑھتے ہیں اس کی نقل نہیں کی جا سکتی، نہ الفاظ میں ان کی لہکتی گمکتی لے کا گونجتا لہرا سنایا یا بیان کیا جا سکتا۔ بالعموم دو زانو بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے داد کے ڈونگرے برسنے لگتے ہیں، نشست کا زاویہ پسرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مقام آ جاتا ہے جب نشۂ شعر سے سرشاری کے عالم میں وہیں فرش پر لمبے لمبے لیٹ جاتے ہیں۔ بعد ازاں باقی ماندہ اشعار لیٹے لیٹے ہی ترنم سے پڑھ کر اتنی داد سمیٹتے ہیں کہ بڑے بڑے استادوں کو استادہ صورت میں اس کی آدھی بھی نصیب نہیں ہوتی:

ے تم کہ لیٹے پہ ایک آفت ہو
اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

یوں کہنے کو تو داد ترنّم کی ملتی ہے، لیکن وہ شعر کا اصل مطلب بڑی بڑی آنکھوں کی کثیرالمعنی گردش سے اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں کہ سامعین، بالخصوص خواتین ان کو دیکھتی رہ جاتی ہیں اور وہ بالخصوص اُن کو! تحیّر و تحسینِ باہمی کا یہ چشمناک سلسلہ غزل در غزل جاری رہتا ہے۔ جب وہ لیٹے لیٹے ہی اشعار مع دوچشمی تشریح عنایت فرماتے ہیں تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ وہ اسی طرح جادو جگاتے رہیں۔ اللہ جل شانہٗ انہیں حِینِحیاتِ جنّت نگاہ اور تاثیر نصیب کرے۔ آمین

ڈیڑھ دو گھنٹوں کے ترنّم اور داد سے اپنی طبیعت اُوب جائے تو دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور آداب بجا لاتے ہیں۔ آداب اور سلام ہمیشہ اپنے مخصوص طریقے سے کرتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ پہلے حالتِ رکوع میں جاتے ہیں اور دایاں ہاتھ دونوں ٹانگوں کے بیچوں بیچ سے کچھوے کی گردن کی مانند نکالتے ہیں۔ پھر اسی آسن کو سادھے، ہاتھ کا چُلّو بنا کر فرشی سلام و آداب کرتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان کی صحت کا راز اسی ورزشی یوگا آسن میں ہے!

ان سے میری نیاز مندی کم و بیش چالیس برسوں پر محیط ہے۔ ان سے ملاقات دن اور رات

★ کڑکیت: ''وہ شخص جو میدانِ جنگ کے اندر رزمیہ نظم یا نثر بہادروں کو جوش دلانے کے لیے پڑھتا ہے۔''

کے مختلف اوقات و مقامات میں ہوتی رہی ہے۔ میں نے کبھی ان کو شیروانی کے بغیر نہیں دیکھا۔ شنید ہے کہ شیروانی اتار دیں تو ترنّم بے سُرا اور جذبہ بے سرا ہو جاتا ہے۔ شعر کی آمد بھی بند ہو جاتی ہے۔

حِس مزاح کی کاٹ اور تاب و تواں کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ آدمی خود پر دوسروں کو ہنسانے کے ہُنر سے واقف ہو۔ یہ سعادت و صلاحیت جتنی خداداد و دہبی ہے، اُس سے کہیں زیادہ انکسار و خودشکنی کی متقاضی ہے۔ ایکٹرس انجمن سے، اُس کے بھلے دنوں اپنی ملاقات کا جو حال وہ مزے لے لے کر ہر بار نئی تفصیلات کے ساتھ سناتے ہیں، وہ بار بار سننے کی چیز ہے۔ آپ بھی کبھی اصرار کر کے سنیئے۔ اب اسے پہلی نظر میں یا پہلی ہی غزل پر فریفتگی کہیئے، حسین تصادم یا ''ٹاکرہ'' کہیئے۔ پھر بھی تشفی نہ ہو تو مُچیٹا اور سندھی ''ملاکھڑا'' کہہ کے دل ٹھنڈا کر لیجئے۔ ان کی بلا سے۔ بالفرضِ محال، اس داستان میں آرزومندی کی آمیزش ہو، تب بھی کیا کہنے! آئینے کے مقابل

؎ مکالمہ تو دِل ناتواں نے خوب کیا

لیکن نظر امروہی اپنے دیوان پر جو حال میں شائع ہوا ہے ہاتھ رکھ کے کہتے ہیں کہ اس کلام کی قسم، واردات حرف بحرف صحیح ہے۔ مبالغے یا رنگ آمیزی کو اس میں ذرا دخل نہیں۔ ہم بھی اپنی چاروں کتابوں پر اسی طرح ہاتھ رکھ کر تصدیق کرتے ہیں کہ ہم نے نظر امروہوی کو کبھی نثر میں غلط بیانی کرتے نہیں دیکھا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ خود پر بہتان لگانے کے لیے جگرا چاہیئے۔ اللہ اگر توفیق نہ دے ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

ان کے بیانات کی رنگین روشنی میں جب ہم نے ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم بھی سکہّ بند نقادوں کی طرح ان کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کلام ماقبل انجمن اور کلام مابعد انجمن۔ بالفاظِ دیگر، اک ترے ملنے سے پہلے، اک ترے ملنے کے بعد۔

بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، طُرفہ ماجرا یہ کہ مذکورہ بالا عشق سے پیشتر کے کلام میں جنون اور باؤلے پن کے آثار زیادہ پائے جاتے ہیں! صاحبو، پروفیسروں کی باتیں اور گھاتیں پروفیسر ہی جانیں۔

اب ذرا دو چغل خور سے شعر میری قرأت اور تشریح کے ساتھ سماعت فرمایئے:

؎ نَفَس کے سوز نے سازِ نَفَس کو لوٹ لیا
تری غزل نے نظرؔ، انجمن کو لُوٹ لیا

اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ وہ عفیفہ غزل پہ لہلوٹ ہوگئی۔ گویا انہوں نے اسے غزل سے لوٹ لیا۔ یہ شعر اسی باہمی لُوٹ مار کی یادگار ہے۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس کہ تحقیق و تدقیق کے آدمی ٹھہرے۔ یہاں بھی اپنی نکتہ طرازی سے باز نہیں آئے۔ ارشاد فرمایا ''یہاں غزل سے مراد حضرت نظر امروہوی کی مدّاح اور ہونہار شاگردہ عزیزہ ذکیہ غزل ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ میری نوبت تو بہت بعد میں آتی۔ سرِ دست میری شاگردہ ذکیہ غزل ہی نے سُسری انجمن کو لُوٹ لیا۔''

بات پرانی ہوگئی۔ اسی زمانے میں سنی تھی۔ وہ بھی اڑتی ہوئی زبانی طیور کی۔ وہ یہ کہ انجمن اس یادگار ملاقات کے بعد ایکٹنگ سے ہمیشہ کے لیے تائب ہوگئی۔ دنیا میں حاسدوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ انجمن اب اتنی پھیل گئی ہے کہ سینما اسکرین پر نہیں سماتی!

ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے:

لباس دے کہ ترے غم کو اپنے شعروں کا
بنا دیا ہے تجھے جانِ انجمن میں نے

مرزا دوسرے مصرع کو اس طرح پڑھتے ہیں:

بنا دیا ہے تجھے جان، انجمن میں نے!

بھلا ہم مرزا کو بے وزن شعر پڑھنے اور حسنِ بہتان طرازی سے کیسے باز رکھ سکتے ہیں؟

اسے ان کی خودداری کا شاخسانہ ہی سمجھنا چاہیے کہ وہ یک طرفہ محبت کے نہ صرف قائل ہیں، بلکہ اُس پر عامل بھی ہیں۔

میں نے یک طرفہ اُسے چاہا ہے اس انداز سے
ایک لمحے کو بھی وہ مجھ سے جُدا ہوتا نہیں

یک طرفہ محبت میں دو بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں ناکامی کا اندیشہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کا دورانیہ کسی دوسرے کی مرضی پر منحصر نہیں۔ آپ جتنی دیر اس میں مبتلا رہنا چاہیں بلا کھٹکے رہ سکتے ہیں۔ دو طرفہ محبت میں عاشق مزاج لوگوں کو ایک خدشے بلکہ کُھلے خطرے کا سامنا ہوتا ہے۔ ذرا بھی غفلت برتیں تو نکاح کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر ہنی مون کی جگہ نون تیل لے لیتے ہیں اور رومان کی جگہ نونہال!

نظر امروہوی نے ساری زندگی کمال یکسوئی اور وضعداری کے ساتھ فکرِ سخن اور گلشن معنی کی آبیاری میں، صلے و ستائش کی تمنا کے بغیر گزار دی۔ یہ اور بات کہ داد و ستائش بن مانگے ملی۔ فراوانی سے ملی اور ہر دور میں ملی۔ سچا اور کھرا فن اس کا محتاج بھی نہیں ہوتا۔ فن کار کے لیے سب سے بڑا انعام اُس کا اپنا کام ہوتا ہے۔ ہزار تالیاں اور بیسیوں ایوارڈ وہ طمانیت نہیں بخش سکتے جو قلب مطمئنہ

کو اپنے ریاض و مزاولت اور حُسنِ کارکردگی سے خود بخود حاصل ہوتی ہے۔ نظر امروہوی کی شخصیت اور فن میں تلخی، بیزاری یا شکست خوردگی کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ انگریزی محاورے کے مصداق

He is at peace with himself.

اور یہ بڑی بات ہے۔ وہ جب، جہاں اور جیسے بھی رہے ہیں، اپنے آپ سے مطمئن رہے ہیں۔ نالاں، آزردہ، شرمسار یا برسرِ پیکار کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ انہیں اپنے فن کی سچائی، کھرے پن اور انفرادیت پر پورا اعتماد ہے:

؎ میں مُقلِّد نہیں کسی کا نظرؔ
میرا زورِ بیان ہے مجھ میں

ان کے رکھ رکھاؤ اور لہجے میں ایک رُخصت ہوتی ہوئی تہذیب کا لوچ، رچاؤ اور بانکپن ہے جس کا انہیں خود بھی احساس ہے:

؎ دلوں پہ نقش رہے گا مرے زمانے کا
میں اختتام ہوں اِک عہد کے فسانے کا

جب ایک تہذیب اور اس کی روایات و اقدار دیکھتے ہی دیکھتے مٹنے لگتی ہیں تو ان کی آئینہ دار ہستیاں بھی نایاب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہر نسل اپنی جگہ خاتمِ دوراں ثابت ہوتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شجرِ ثمر دار تو زمین بوس ہو جائے اور اس کا پھل باقی رہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اگلے وقتوں کے لوگوں کو دیکھنے کی طرح دیکھا اور چاہنے کی طرح چاہا۔

صاحبِ شام ہی کے شعر پر اظہارِ سپاس ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا:

؎ ہمارے بعد نہ آئے گا کوئی ہم جیسا
ہم ایسے خاک نشینوں کا احترام کرو

وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ہم ان کا صرف احترام ہی نہیں کرتے، ان سے دِلی محبت بھی کرتے آئے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں تادیر سلامت باکرامت رکھے۔

پلکوں سے پینٹ کرنے والا مصوّر

برطانیہ میں ایک دانش ور لارڈ مینکرفٹ (Lord Mancroft) گزرا ہے جو اپنے بعداز عشائیہ (after dinner) تقریروں کے لیے بہت مشہور تھا، اس کا قول ہے کہ تقریر تو معاشقے (love affair) کی مانند ہوتی ہے۔ اسے شروع تو کوئی بھی کرسکتا ہے مگر ختم کرنے کے لیے بڑا سلیقہ اور بڑی استادی چاہیے۔ مانا کہ یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے قابل ہے۔

لیکن یہ بات برطانیہ اور امریکا کی حد تک تو درست معلوم ہوتی ہے جب کہ ہمارے ہاں معاشقہ ختم کرنے میں اتنی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس لیے کہ ختم کرنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کبھی شروع ہوا ہو۔

جب نہ ہو کچھ بھی ہنر دکھلائیں کیا

ہمارے ہاں معاملہ برعکس ہے، یعنی معاشقہ اور تقریر شروع کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ تقریر ختم کرنے کے لیے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا، ہمارے ہاں یہ کام معزز سامعین انجام دیتے ہیں۔

میں چھ مبارک و مسعود مواقع پر تقریر کرنے کے خلاف ہوں۔ اس لیے کہ تقریر سے ان تقریبات کے لطف د غایت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ ان تقریبات میں تقریر نہ پہلے اچھی لگتی ہے، نہ بعد میں۔

یہ چھ تقریبیں جن میں تقریر کی گنجائش نہیں ہوتی، میرے نزدیک یہ ہیں۔

۱۔ نمائش کسی بھی قسم کی۔ مثلاً جہاں نئے فیشن ڈیزائن کا شو ہو اور لوگ سٹیج پر catwalk کے بے تابی سے منتظر ہوں، وہاں آپ مجھے یا قاضی حسین احمد صاحب کو تقریر کے لیے کھڑا کردیں تو ہمارا جو حشر ہوگا، وہ نا قابل دید مگر قابل شنید ہوگا۔

۲۔ رخصتی، دلہن کی رخصتی سے اگر پہلے یا بعد میں تقریر کی جائے تو دولھا چھواروں سے سنگسار کردے گا۔

۳۔ مشاعرہ، لوگ شعر سننے آتے ہیں نثر تو بے چارے دن بھر سنتے رہتے ہیں۔

۴۔ ماحضر، ڈنر سے پہلے تقریر کی جائے تو اشتہا متاثر ہوتی ہے اور بعد میں کی جائے تو ہاضمہ متاثر

ہوتا ہے۔

۵۔ میوزیکل کنسرٹ، جہاں لوگ مہدی حسن، مہناز یا عابدہ پروین کو سننے کے لیے آئیں، وہاں تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے شاہی ٹکڑے، فیرنی اور سوفلے کھلانے کے بعد آپ مہمان کو زبردستی گنڈیری کھلائیں۔ اور یہ کہتے جائیں کہ گنا اس فقیر نے دست خاص سے چھیلا اور دہن مہمان کی گولائی کے عین مطابق تراشا ہے۔

۶۔ خطبات ماہرین، جس تقریب میں ماہرین اظہار خیال کر چکے ہوں، وہاں ایک outsider یعنی نابلد باہر والے کا خطبہ صدارت بے عزتی خراب کرانے کی باعزت صورت ہے۔

اچھی تقریر کی تین شرائط ہیں۔ سچ بولو۔ بولنے سے پہلے تولو۔ بیٹھ جاؤ قبل اس کے کہ بٹھائے جاؤ۔

چند روز قبل جمال احسانی صاحب نے مجھے تقریر کی دعوت دینے سے پہلے ایک ذہین آرٹسٹ سے تعارف کراتے ہوئے ایسا نام لیا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ کہنے لگے ''رسام سے ملیے'' یہ نام پہلے سنا تو مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا اور جب میری درخواست پر انھوں نے بہ آواز بلند نام دہرایا تو مجھے اپنے املا پر شبہ ہونے لگا۔ یعنی پہلے تو ایسا لگا کہ میں اونچا سننے لگا ہوں، اب محسوس ہوا کہ اونچا سمجھنے لگا ہوں۔

میں نے ہجے پوچھے تو فرمایا ر۔س۔ا۔م'' ۔''س'' پر ''تشدد'' معنی پوچھے تو مسکرا دیے، کہنے لگے کہ معنی تو جون ایلیا صاحب کو معلوم ہیں، ہم نے کہا کہ ہمیں تو خود جون ایلیا کے معنی معلوم نہیں۔ ایک زمانے میں جب ہم جوان تھے اور جون ایلیا بالکل ایسے ہی تھا کہ جیسے کہ اب ہیں تو ہم رسالوں میں ان کی غزلیں یہ سمجھ کر بڑے شوق اور بے تابی سے پڑھتے تھے کہ یہ آوارہ اینگلو انڈین لڑکی کا کلام ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ان سے اچانک مسلم کمرشل بینک میں ملاقات ہوگئی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور اس دن میں روزے سے نہیں تھا، مجھے السر کی شکایت تھی اور جون ایلیا کی صحت بھی اتنی خراب تھی کہ پانی تک سے پرہیز کرتے تھے۔ چناں چہ ان کو اس زمانے میں بھی روزے ہی نہیں اور بہت سے فرائض معاف اور لذائذ حلال تھے۔ تواضع کی غرض سے میں انھیں ایسی محفوظ جگہ لے گیا جہاں ہمارے اور مسلح گارڈ کے علاوہ اور کوئی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یعنی بینک کے لوہا پلائی ہوئی دیواروں اور آہنی سلاخوں والے اسٹرانگ روم میں۔ جس میں چار تجوریاں اور ایک چوہے دان رکھا تھا۔ چوہے دان کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ یہاں کیوں رکھا ہے؟'' وہاں ہم دونوں نے چوری چھپے جو چائے پی اس کا مزہ ''مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا انھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ چائے میں گناہ کی آمیزش ہو جائے تو شراب کا مزہ دیتی ہے۔

دوران ارتکاب ہم نے جون ایلیا سے ان کے نام کے معنی پوچھے۔ وہ سمجھے ہم طنز کر رہے ہیں۔ کہنے لگے ''آپ کو عبرانی آتی ہے۔'' ہم نے جواب دیا ''نہیں'' پھر پوچھا ''آپ کو عربی آتی ہے۔'' ہم نے سر جھکا کر کہا ''نہیں'' بولے مجھے آتی ہے۔ یہ عبرانی اور عربی نام ہے۔ اس ناک آوٹ ضرب کے بعد ہمیں کچھ ہوش آیا تو ہم نے شرارتاً پوچھا کہ ''چارلس لیمب'' نے جو مشہور انگریزی مصنف ہے، اپنے انشائیوں کا نام Essays of Elia رکھا ہے۔ کیا آپ کو اس سے بھی کچھ نسبت ہے؟ اپنی ذہین خمار آلود آنکھوں سے مسکرا چکے تو فرمایا۔ ''اسے خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔''

ہم نے شاہد رسّام سے کہا کہ ''آپ کے اصل نام ''شاہد'' میں ہمیں بہ ظاہر کوئی عیب نظر نہیں آتا، بجز اس کے کہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس سادہ و معصوم کو اس کے چہرے سے بھی بڑی یہ رسّام کی نتھ کیوں پہنادی؟'' بولے ''استاد نے اس کے معنی ''ٹھگ'' بتائے ''ح۔ک۔ت۔ ایک بڑی ح پر زبر اور ک پر تشدید'' اور سنیے رسّام کے معنی ہوئے ٹھگ۔ گویا یک نہ شد دو شد۔

عربی نام رکھنے کا آج کل فیشن ہے جو مستحسن ہے۔ اور یہ بات کہ ہمارے بہت سے عربی نام تو ایسے ہیں جو خود عربوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لیے کہ ان میں ''ح'' اور ''ع'' سے حلق کی آزمائش کے علاوہ اور کوئی چیز عربی زبان سے ماخوذ نہیں ہوتی مگر دور اندیش والدین اس لیے ایسے نام رکھ دیتے ہیں کہ برخوردار جب پڑھ لکھ کر بے روزگاری کی عمر کو پہنچے گا تو دبئی اور سعودی عرب کا ورک پرمٹ حاصل کرنے میں شاید نام کا کھپلا کام آجائے۔ لیکن عزیزم شاہد کے کیس میں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کا سلسلہ ''سلسلۂ صادقینی ایلیائی'' ہے۔ درویشوں کا سلسلہ ہے۔ ہم نے ان کے استاد کا اسٹوڈیو دیکھا ہے۔ اسٹوڈیو کا ہے کو ہے، مرشد نے خانقاہ میں بتکدہ کھول دیا ہے۔ شاہد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ اقبال مہدی صاحب میرے استاد اور مرشد ہیں اور صادقین مرحوم اُن کے بھی استاد تھے اور استاد الا اساتذہ حضرت جون ایلیا ہم تینوں کے مرشد ہیں۔'' میں نے کہا ''ہم چاروں کے کہیے'' بولے۔ ''سنیں گے تو بہت ہوں گے، شاید آپ کی کتاب پڑھنے کے لیے مانگیں تو یوسفی صاحب، ابتدائی زمانے میں میرے استاد اقبال مہدی اپنے نام کے آگے ''مہدی'' نہیں لکھا کرتے تھے۔ جون ایلیا نے ایک دن اعلان کیا کہ آئندہ ہم تو تم کو اقبال رسّام کہہ کر پکاریں گے۔ چناں چہ اقبال صاحب اسے ''یکے از عطائے درویش بے ریا و بے ریش'' جان کر اپنی شاہکار تصویروں پر اسی نام یعنی اقبال رسّام کے نام سے دستخط کرنے لگے۔ پھر ایک دن اقبال رسّام صاحب نے عالم جذب میں اعلان کیا کہ ''عزیز دنیا فانی ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ میں آج سے تمھیں بخشتا ہوں کہ تم ہی اس کے مستحق ہو۔'' میں نے عرض کیا کہ اس کے معنی بھی بتا دیجیے۔ اقبال مہدی صاحب نے سکوتِ عالمانہ اختیار فرمایا پھر ہاتھ سے ہوا میں

''ج۔ا'' لکھا اور انگشت شہادت سے جو سگریٹ کے دھوئیں سے عنابی ہوگئی۔''ج'' کے پیٹ میں نقطہ بھی لگا دیا، مطلب یہ کہ جون ایلیا سے رجوع کرو جس طرح دوپٹا بدل بہنیں اور پگڑی بدل بھائی ہوتے ہیں، اسی طرح سلسلہ ایلیائی میں''نام بدل شاگرد'' ہوتے ہیں۔ ہمیں رسّام سے تعلقات بڑھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ گرم خون ہے، کل کلاں کو جوش میں آکر کہہ دیں کہ آج سے میں اپنا نام آپ کو بخشتا ہوں۔ پھر میں کس کس کو بتاؤں گا کہ یہ نام نامی سلطنت کی طرح دست بدست آیا ہے اور اس کے معنی سرشار و سرمست لہجے والے شاعر جون ایلیا کو معلوم ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان باتوں کا تصویروں کی نمایش سے کیا تعلق ہے؟ بات یہ ہے کہ تصویروں کو سمجھنے سے پہلے مصور اور اس کے سلسلہ رشد و صورت گری سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ عزیزم شاہد نے مجھ سے فون پر صدارت کے لیے کہا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے دو وجہیں بتائیں۔ اوّل یہ کہ اگر مزاح نگار آرٹس کونسل کی کسی نمایش میں تقریر کرے تو لوگ قدرتی طور پر یہی سمجھیں گے کہ کارٹونوں کی نمایش ہورہی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں اتنی معلومات نہیں رکھتا کہ شخصیت کے متعلق کچھ کہہ سکوں۔ نہ آپ کی اتنی تصویریں دیکھی ہیں کہ اُن پر گفتگو کرسکوں؟ کہنے لگے''نو پرابلم، میں اپنے بارے میں معلومات فراہم کرنے ابھی رکشے میں حاضر ہوتا ہوں۔ تصویروں کے فوٹو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔''تصویروں کے عکس دیکھے تو دیکھتا رہ گیا اور یہ تک پوچھنا بھول گیا کہ آپ ہنوز کنوارے ہیں یا پچھتا رہے ہیں؟ یہ ایسی خوبصورت تصویریں بناتے ہیں اور بہ ظاہر عام سے چہرے کو یوں کیمرائز کرتے ہیں کہ اگر فقط اُن کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر شادی طے کرلی تو رونمائی کے وقت ہی طلاق ہوجائے۔

جس فن میں انھوں نے اپنے استادِ کامل کی زیرِ نگرانی حیرت انگیز مہارت حاصل کی ہے، اب اس کے نمونے مغرب میں دیکھنے میں نہیں آتے کہ اس کا چلن نہیں۔ یہ بڑے صبر، ریاض اور دیدہ ریزی کا طالب ہے۔ جوشوا رینلڈز (Joshua Reynolds) ایک بہت نامور اور صاحبِ طرز آرٹسٹ گزرا ہے جس نے پورٹریٹ پینٹنگ کو ایک نئے معیار سے آشنا کیا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ آپ کیسا پینٹ استعمال کرتے ہیں اور کیسے پینٹ کرتے ہیں؟ اس نے جو مختصرا جواب دیا وہ کلاسک کا درجہ رکھتا ہے۔ اُس نے کہا "!With brain, sir" شاہد رسّام کی تصویریں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ برش سے تصویر نہیں بناتے، اپنی پلکوں سے پینٹ کرتے ہیں۔ ایک مربع انچ میں سیکڑوں لکیروں کے حساب سے بڑے کینوس پر خد و خال نمایاں کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم اون کے بجائے سوئی میں استعمال ہونے والے دھاگے سے قالین بُننے کی کوشش کریں۔ انتہائی مہین خطوط سے خال بہ خال مژہ بہ مژہ مو بہ مو چہرہ بہ چہرہ جو تصویریں یہ بناتے ہیں انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہر چہرہ

دستِ دعا کی رحل پر رکھ کے تصویر بنائی ہے۔ شاہد نے ہر میڈیم میں طبع آزمائی کی ہے۔ واٹرکلر، پنسل، چارکول ڈرائنگ، پین اینڈ انک اور آئل۔ مرزا کہتے ہیں کہ پنسل تصویر نازک مزاج نازنین کی مانند ہوتی ہے کہ ''نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا'' آئل پینٹنگ اور سیاست کو قریب سے نہیں ذرا فاصلہ رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ چارکول ڈرائنگ منکوحہ کی طرح ہوتی ہے۔ قریب سے دیکھو یا دور سے بالکل ایسی ہی نظر آتی ہے۔ پین اینڈ انک والی تصویر محبوبہ کی طرح ہوتی ہے جسے دور سے دیکھیں تو قریب، اور اور قریب سے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

ہم پاکستان کے ممتاز اور نامور آرٹسٹ گل جی کے گیارہ سال دیوار بیچ پڑوسی رہ چکے ہیں۔ انھیں بہت قریب سے پینٹ کرتے دیکھا ہے۔ وہ صرف رات کو اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد پینٹ کرتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید انھیں رات میں بہتر دکھائی دیتا ہے لیکن جب سے خود نے السر کی تکلیف کے سبب رات کو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ہمسائے کے بارے میں بدگمانی سے کام لینا چھوڑ دیا۔

؎ کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

انھیں بھی گھوڑوں سے بے انتہا شغف ہے۔ ان کی تصویریں بنا کے لاکھوں کماتے ہیں۔ سُنا ہے ایک بار کسی نے (ہم نے نہیں) مذاق میں کہہ دیا کہ جتنے کی آپ ایک گھوڑے کی تصویر بیچتے ہیں، اس میں تو تین زندہ گھوڑے بآسانی آسکتے ہیں۔ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اس کے بعد وہ کینوس پر کم از کم تین گھوڑے بنانے لگے۔ یہ بھی دیکھا کہ جتنے پیار، تفصیل وار موشگاری اور انسپریشن سے وہ گھوڑے کی دُم بناتے ہیں، اس کا سوواں حصہ بھی گھوڑے اور سوار پر صرف نہیں کرتے۔ صرف گھوڑے ہی کی نہیں، سوار کی بھی ساری پرسنالٹی کھنچ کر دُم میں آجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک بال پر مالکانہ شفقت کے ہاتھ پھیر پھیر کے دُم بنائی ہے۔ چناں چہ ہر دُم منفرد، البیلی اور انمول ہوتی ہے۔ دل کی بات پوچھیے تو وہ فقط دُم ہی بنانا چاہتے ہیں۔ باقی ماندہ گھوڑا انھیں فقط دُم کو اٹکانے کے لیے طوعاً کرہاً بنانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی وی آئی پی خاتون کی پورٹریٹ خاص توجہ سے بہت ہی خوب صورت بنانی مقصود ہوتی تو اس کے بالوں کی پونی ٹیل بہ طور خاص ایسی بناتے تھے کہ کوئی گھوڑا دیکھ لے تو بے قرار ہو جائے۔

شاہد نے بھی بچوں، ضعیفوں اور گھوڑوں کی تصویریں بڑی محنت اور شیفتگی سے بنائی ہیں۔ وہ بار بار اُن کی طرف بہ انداز دیگر پلٹ کر آتے ہیں، بالخصوص گھوڑوں کی تصویروں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ پینٹ نہیں کر رہے، گھوڑے کی پیٹھ تھپک رہے ہیں۔ شاہد اور گل جی میں موضوع اور اُس کا ٹریٹمنٹ یعنی پیرایۂ اظہار مشترک ہے۔ دونوں حضرات گھوڑے کی ساری ذات یا بدذاتی کا اظہار

اس کی دُم کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ صرف دُم کے بدلتے زاویوں اور بالوں کے بکھرنے کی ترتیب یا بے ترتیبی سے گھوڑے کے موڈ رفتار، تیور، دم خم بلکہ لغوی معنوں میں ہارس پاور کی مکمل تصویر بنا دیتے ہیں۔

تصویر بناتے وقت شاہد نے اپنے موضوع یعنی گھوڑے سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور تصویر دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آرٹسٹ نے گھوڑے کو کیمرے کی آنکھ سے نہیں دیکھا، گھوڑی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ شاہد رسام اپنے فن کو ''ریئلسٹک آرٹ'' کہتے ہیں۔ ہم اسے فوٹو گرافک آرٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ فوٹو گرافی میں بالخصوص اپنے فوٹو میں ہمیں صرف ایک ہی عیب نظر آتا ہے وہ یہ کہ ہمارا فوٹو بالکل ہماری شکل سے ملتا ہے، بہتر نہیں ہوتا۔ شاہد کی ٹیکنیک فوٹو گرافک ضرور ہے مگر قدرے فرق کے ساتھ۔ وہ پہلے کیمرے سے فوٹو کھینچتے ہیں پھر اسے انلارج کرتے ہیں اور اس کی مدد سے پین اینڈ انک میں تصویر بناتے ہیں لیکن جو تصویر ان کے کینوس یا کاغذ پر ابھرتی ہے وہ اس سے مشابہ ضرور ہوتی ہے جو کیمرے کی آنکھ نے دیکھی تھی لیکن قدرے مختلف بھی۔ ان کے فن کا سارا حُسن اور رمز اسی ذرا سے فرق میں مضمر ہے۔ اگر ایک کھردرا سا محاورہ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو کہوں گا کہ وہ مکھی پر مکھی نہیں مارتے مکھی پر تتلی مارتے ہیں اور اس تتلی کے تعاقب میں وہ کہاں کہاں گئے ہیں؟ کبھی وہ آسمانی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تیکھے پر وفائل والی خاتون کو بید کی میز پر جھکے ہوئے کسی خیال میں گم دکھاتے ہیں۔ اس کے لمبے بال فرش کو چھو رہے ہیں اور ہلکا نیلا رنگ اس کے موڈ کی عکاسی کرتا ہے اور کہیں وہ اس تتلی کو زخمی حالت میں منجمد کر دیتے ہیں۔ ایک غریب لڑکا پھینکے ہوئے کھانے، ڈبوں اور بوتلوں کی تلاش میں کوڑے کے ڈرم کے اندر کھڑا ہے اور ڈرم کے پاس بیٹھے ہوئے کتے کو کھانے کے لیے روٹی کا......ایک ٹکڑا دے رہا ہے۔ کتے کو اس سے کوئی رغبت نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ غالبا وہ ٹکڑا گھر لے جا کر خود ہی کھائے گا۔ یہ وہ کہانی ہے جو کیمرے کی آنکھ نے ایک بٹا سو سیکنڈ میں فلم پر مرتسم کی اور رسام نے اس دل گداز لمحے کو امر کر دیا۔ یہی کمالِ نقاشی ہے اور رسام کے لغوی معنی یہی ہیں۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ تتلی کی کم و بیش دس ہزار آنکھیں ہوتی ہیں جن کی مجموعی بصارت سے وہ پھول کو دیکھتی ہے تو اب ملاحظہ ہو کہ یہ تتلی ہمیں ایک دوشیزہ کے سراپا کا عقبی رخ یعنی ننگی پیٹھ دکھاتی ہے۔ دوشیزہ میں نے رسمایا اخلاقاً کہہ دیا ورنہ میں تصویر کے چال چلن کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ تصویر کا فوکل پوائنٹ یعنی ''مرکز نظر بد'' گہرے براؤن شیڈ سے بنایا ہوا وہ چھوٹا سا سینسو اس ڈمپل (sensuous dimple) ہے جو ننگی پیٹھ کے نشیب میں دکھایا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے جوش پر آیا ہوا بگولا بدن کھل کھلا کر ہنس دیا ہے تو یہ ڈمپل پڑا ہے مگر یہ کہنا کہ گردن تا کمر

پیٹھ بالکل ننگی ہے، سراسر غلط ہوگا اس لیے کہ دوشیزہ نے ایک باریک سی زنجیر ہندوؤں کے جینئوں کی طرح ڈال رکھی ہے۔ آرٹسٹ نے عقبی منظر یعنی پچھایا تو دکھا دیا۔ قیاس کہتا ہے کہ دوسرا رخ اس سے زیادہ قابل دید اور قابل بیان ہوگا، نظیر اکبر آبادی نے آج سے کوئی دو سو برس قبل کچھ ایسا ہی منظر ایسے ہی سماں دیکھا ہوگا جبھی تو کہا'' آگا بھی کھل رہا ہے۔ پیچھا بھی کھل رہا ہے۔ یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور ووں بھی واہ واہ ہے'' آپ یہ تصویر دیکھیں گے تو شاہد کی مصوری اور نظیر اکبر آبادی کی ''ووں'' کی داد دیے بغیر نہ رہیں گے۔

رسّام کچھ عرصے سے سورج مکھی دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ انسانی جسم پر چہرے کی جگہ سورج مکھی پھول ٹرانس پلانٹ کر دیتے ہیں جو اپنا رخ ہمیشہ روشنی کی طرف رکھتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد کون سی علامت اس کی جگہ لیتی ہے۔ پکاسو Bule Period سے گزرا تھا۔ صادقین ایک مدت تک cactus کے کانٹوں پر اپنی زبان رکھ کے زیست کا ذائقہ بیان کرتے رہے۔ جمیل نقش عرصہ دراز سے کبوتر کو ایک حسین استعارے اور معصوم مگر معنی خیز علامت کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ میرا اندازہ اگر غلط نہیں تو نصف صدی ہونے کو آئی، اُن کے کبوتر نئے آسمانوں کا چکر لگا کے اپنی پرانی چھتری پہ آن بیٹھے ہیں!

Worshippers نامی جو mural نگار خانہ رواں درقصاں میں موجود ہے اس میں سورج مکھی پھول مرکزی اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ فوٹو گراف آرٹ اور کمر کے ڈمپل سے سورج مکھی تک کا سفر گیارہ سال پر محیط ہے۔ یہ آرٹسٹ کے ذہنی و فنی ارتقاء اور قلبِ ماہیت کا عکس جمیل ہے۔ اس کا بنیادی موضوع human suffering یعنی انسانی دُکھ اور ازلی اِبتلا ہے۔ اس سے پہلے رسّام کچھ ایسے ہی دُکھ مبتلا و مضطرب مخلوق کی تصویر کشی کر چکے ہیں۔ میرا اشارہ اُس سلسلہ تصاویر کی طرف ہے جس کا موضوع عرف عام میں prostitutes اور جدید اصطلاح میں sex workers ہے۔ ان تمام تصاویر میں روایتی sensuousness کے بجائے بہت واضح حسی دردمندی ٹپکتی ہے۔ ورنہ دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض آرٹسٹ اور افسانہ نگار جب طوائف اور اُس کی شبوں کے گداز اور درگت کی تصویر کھینچتے ہیں تو قلم اور موقلم کو پینٹ اور روشنائی کے بجائے رال میں ڈبو کر قرطاس و کینوس پر رکھتے ہیں۔

Realistic سے Abstract پینٹنگ کی جانب مراجعت کلاسیکی ڈسپلن میں مشق و مزاولت بلکہ ایک عمر کی ریاضت کے بعد ہوئی۔ ہمارے ہاں ابسٹریکٹ آرٹ کی نزاکتوں اور رموز سے جو لوگ آشنا یا مانوس نہیں ہیں وہ اسے طنز و استہزا کا ہدف بناتے ہیں۔ سیّد محمد جعفری نے ایسے ہی رویے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ابسٹریکٹ آرٹ کے ملبے سے یہ دولت نکلی
جس کو سمجھا تھا اننناس وہ عورت نکلی

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ Abstract آرٹ کی پینٹنگ میں بالکل ویسی ہی حیثیت ہے جیسی کہ موسیقی میں پکّے راگ کی۔ رہا Pop Music تو ہم اسے باوضو ہوکر بڑے خضوع وخشوع سے سنتے ہیں۔ اس سے ہمارا ایمان مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اسے سن کر یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ موسیقی کو حرام کیوں کہا گیا۔

چہرہ اور منظر جب چشمِ بینا سے گزر کر باطن کی کٹھالی پہنچتے ہیں تو جذب دروں کی تپش و تابش سے خطوط پگھلنے لگتے ہیں۔ پھر دیکھے بھالے خدوخال کچھ اور ہی روپ سروپ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جب رنگ باتیں کرے اور باتوں سے خوشبو آئے۔

رسّام کی لائن اور رنگ دونوں سے اب ان کا نڈر پن جھلکتا ہے۔ برش اب آزاد اور بے خوف ہو چلا ہے۔ وہ کسی رنگ اور کسی لائن کو اس کی اوریجنل اور پٹی پٹائی شکل اور ہیئت و ماہیت میں قبول نہیں کرتے۔ اب وہ پری رخوں کو ظاہری خدوخال سے پرے دیکھتے ہیں۔

Picasso نابینا لوگوں کا پیشہ جو دیکھتا ہو پینٹ نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اسے متشکل و مجسم کر دیتا ہے۔ قلم ہو یا موقلم، جب تک ''انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا'' نہ ہو بات نہیں بنتی۔

Renoir سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی nudes کا رنگ روپ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کیا راز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں مستقل پینٹ کیے جاتا ہوں۔ جب کینوس پر جلد کا رنگ texture اور گداز ایسا ہو جائے کہ بے اختیار چٹکی لینے کو جی چاہے تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ تصویر ٹھیک بنی ہے۔

رسّام کے حسینوں کی تصویر دیکھ کر خود رسّام کے چٹکی لینے کو دل چاہتا ہے۔

اور اب تو شنید ہے، دریائے مصوری کے شناور، لکیروں اور رنگوں کے گرامی قدر ناقد جناب اکبر نقوی، شاہد اور رسّام کے فن پر ایک کتاب "Sense and Insanity" لکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد کسی اور سند کی شاہد صاحب کو کیا حاجت رہ جاتی ہے۔ پھر تو ہمارے سارے سُنے کو کنارے کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

قصّہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں ★ تک

(نوٹ: یادوں، باتوں اور ملاقاتوں پر مشتمل ایک تجرباتی تحریر جس کے کچھ حصّے پشاور میں منعقدہ تقریبات میں پڑھے گئے۔)

ڈپارٹمنٹ آف کلچر، صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) کی دعوت پر تیس برس بعد پشاور جانے کا اتفاق ہوا، تو گئے دنوں کی یادوں نے بے طرح یلغار کی۔ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ یاد کسی کی، کیسی بھی، کبھی کی ہو، جب آتی ہے تو آتی چلی جاتی ہے۔ ایسے میں کسی تاریخی تسلسل، منطقی ربط اور اصل موضوع پر تمامتر فوکس کی توقع یا تقاضا، بے وقت و بے سود معلوم ہوتا ہے۔ فارسی کہاوت ہے کہ آخر چمچے میں وہی کچھ تو آئے گا جو دیگ میں ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ہو تو گرہستنوں کی اصطلاح میں ایسی دیگ باؤلی ہانڈی کہلاتی ہے۔ پکائی کھیر ہو گیا دلیا بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال کی تصویر ہے۔

یادوں کو قلمبند کرنے بیٹھا تو جدھر بے کہا قلم اور دھیان دھارا لے گئے، سَت چھوڑ کے بہتا چلا گیا۔ کسی گیانی کا کہا یاد آیا کہ گہرے اور پھرے پانی میں آدمی اس لیے ڈوبتا ہے کہ بے تحاشا ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اگر جی کڑا کر کے بالکل ساکن اور بے حرکت وجُنبش ہو جائے تو ہرگز نہیں ڈوبے گا! دریا دریا، ساحل ساحل، موج موج اور بیچ بھنور تِرتا ہی رہے گا! یوں تو digression (موضوع سے گریز قلمی، موضوع سے ہٹ کر) میرے اُسلوب کی کمزوری بلکہ پہچان بنتی جا رہی ہے، لیکن اس دفعہ میں نے تہیّہ کر لیا کہ مُنتشر خیالی اور زِگ زیگ طرزِ بیان کا قبلہ کسی قطب نما کے مطابق راست کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب یاد در یاد اور بات سے بات نکلتی چلی جائے تو اصل موضوع سے دُوری اور اپنے آپ سے قُربت بڑھتی جاتی ہے! lateral یعنی ترچھے اور شاخ اندر شاخ اندازِ فکر و بیان کی یہی خوبی اور خرابی ہے! لکھاری لکھنے کچھ بیٹھتا ہے اور کچھ کا کچھ لکھ ڈالتا ہے، جیسا کہ اس مضمون میں ہوا۔ قارئین اگر اسے hop-skip-and-jump style قرار دیں تو مجھے اعتراض نہ ہو گا۔ جب یہ ایک تجرباتی تحریر ٹھہری تو اس کا بھی پیشگی اقرار کرنا ذہنی دیانت کا تقاضا ہے

★ ماضی گیراں: (بروزن ماہی گیراں) ماضی کو پکڑ کر بیٹھ جانے والے۔ ناسٹلجیا میں مبتلا لوگ۔

کہ بعض تجربے اتنے خالص بلکہ ''نخالص'' ہوتے ہیں کہ ان میں سوائے شوقِ تجربیت کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی غلطیوں اور لاحاصلی کے پشتارے اور پشیمانی کو عُود و عَنبر کی دُھونی دے کر تجربہ وتدبّر کا بھلا سا نام دے دیتا ہے!

ایسی تحریروں میں جانا پہچانا اور ٹکسالی آکار یا format ایک مدِّ فاضل بلکہ سراسر فضول بن کر رہ جاتا ہے۔ بنیادی سبب یہ کہ ماضی کی یاد بھُوت کی طرح چمٹ جاتی ہے۔ چُھڑائے نہیں چھوٹتی۔ یہ بھی یاد رہے کہ سنسکرت میں بھُوت اور بھُوت کال کے معنی گزرا ہوا زمانہ ہیں۔ یہ بھُوت جس پر ایک دفعہ سوار ہو جائے تو وہ حال و مستقبل سے ہمیشہ کے لیے مستغنی بلکہ متنفر ہو جاتا ہے:

ع فردا مرے پیچھے ہے، گزشتہ مرے آگے ★[1]

گزشتہ زمانے کی یادوں کو عربی میں محاضرات کہتے ہیں۔ جب ان سے شغف اور محویت حد سے گزر جائے تو نوبت حاضرات ★[2] تک پہنچ جاتی ہے!

مرزا مجھ سے کوئی سنجیدہ بات سُننے کے رَوادار نہیں۔ کہتے ہیں ''سمجھ داری کی باتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔ جب تم اِترونے اور بچکانہ لہجے میں ایسی گھور گمبھیر باتیں کرتے ہو تو جی چاہتا ہے پہلے تو تمہارے کان کھینچوں۔ پھر انعام میں چاکلیٹ دوں اور گل بہیّاں ★[3] ڈال دوں۔'' میں نے بہ امیدِ داد اوپر والا پیراگراف پڑھ کر سنایا تو بولے ''یہ تو وہی مُرغی والی بات ہوئی۔''

''وہ کیا؟ وہی مُرغی کی ایک ٹانگ والی بات؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

فرمایا ''جی نہیں۔ میں ایک ٹانگ کی نہیں، سالم مُرغی کی بات کر رہا ہوں۔''

''ارشاد!''

''مُرغی خواہ پولٹری فارم کے شکنجے نما خانے میں کمٹی سکڑی ٹنگی ہو یا کُھلے میں چُھٹی پھرتی ہو یا بڑی بوڑھیوں کی زبان میں گھر گھر ہانڈتی، دانہ دُنکا چگتی، مستاتی اور مُرغوں کا حق مُرغوں تک پہنچاتی پھرے، اصل نُمیٹ یہ ہے کہ انڈا بھی دیتی ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دُکھیا کُڑک ہو گئی ہے اور اب سارے میں کُڑکُڑاتی یا خالی خُولی کُٹکُٹاتی پھر رہی ہے!''

★[1] تحریف:

ع کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے (غالب)

★[2] حاضرات: دُعائیں یا منتر پڑھ کر جن، بھُوت، پریت اور رُوحوں یا بدرُوحوں کو بلانے اور حاضر کرنے کا عمل۔ اردو لغت۔

★[3] گل بہیّاں: ''گلے میں بانہیں ڈال کر پیار محبت جتانے کی حالت۔''

اب نئی نسل نے اظہارِ محبت اور کاربرآری کے بالغ اور نتیجہ خیز طریقے دریافت کر لیے ہیں۔

''یارا، ذرا سی بات پر تم نے تو سارا مرغی خانہ مجھ پر چھوڑ دیا!''

''حق بحقدار رسید'' انہوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی!

ان چار کرم فرماؤں کے التفاتِ بے پایاں کا شکریہ لازم ہے جن کی کشش اور اصرار نے مجھے بہت مختصر عرصے میں تین بار کشاں کشاں ہی نہیں، شاداں و فرحاں پشاور کھینچ بلایا۔ احباب جانتے ہیں کہ میرا روئے سخن، حبیبِ لبیب مریز خاں، گرامی قدر عبداللہ صاحب، ڈاکٹر روبینہ شاہین اور محبّی ظہور احمد اعوان صاحب کی طرف ہے۔ مریز خاں سے یاری و دلداری ۱۹۶۵ء سے یعنی بیالیس محبت بھرے برسوں پر محیط ہے۔ اتنا اور بتاتا چلوں کہ بیالیس برس قبل بھی ہم دونوں جوان نہیں تھے! امیرؔ مینائی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

ابھی امیرؔ کو صاحب بُرا بھلا نہ کہو

بُرے بھلے کا تو صحبت سے حال کھلتا ہے

سو جیسے جیسے صحبت کا حال کھلتا گیا وہ عزیز تر ہوتے گئے۔ ان پر میرا مضمون بعنوان ''کلاہِ مَریزی'' آپ سماعت فرما چکے ہیں۔ عبداللہ صاحب سے پہلی ملاقات دس برس قبل ریاض میں ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے خود اُن سے آدابِ لب کشائی سیکھنے اور خاموش ہو جانے کے مقامات کا درس لینا ہوگا۔ اتنا معلوم ہے کہ اہلِ کمال کے مواجہہ ہیں:

جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

تقریر اردو میں ہو یا انگریزی میں، ان کی حیرت انگیز طلاقت، خطیبانہ دسترس اور گل افشانئ گفتار کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جس نے ان کی فی البدیہہ تقریر سُن لی وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ہم نے تو جب بھی انہیں فون کیا، گھر والوں نے مطلع کیا کہ اسلام آباد، لاہور یا اسٹاف کالج صدارتی تقریر کرنے گئے ہوئے ہیں۔ ان کی خوش خلقی، پاسِ خاطرِ دوستاں، وضعداری اور مہمان نوازی ستائش اور رسمی شکریے سے بالاتر ہے۔

پروفیسر ظہور احمد اعوان صاحب کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ ان کی پُرلطف صحبتوں اور مُسافر نوازی نے میرے قیام کو یادگار بنا دیا۔ ان کی بے مثل خاکہ نگاری پر چند تاثرات باب ہفتم میں ملاحظہ فرمایئے گا۔ ان کی نہایت دلچسپ کتاب ''سِرِّ دلبراں'' میں روبینہ شاہین پر ان کا بے حد دلچسپ اور معلومات افزا مضمون ''آنسوؤں کی شہزادی'' پڑھا تو معاً خیال آیا کہ اپنی میزبانِ خصوصی کا

شکریہ ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ اعوان صاحب کے نقشِ قلم پر چلتے ہوئے میں بھی حسبِ توفیق خامہ فرسائی کروں۔ پشاور میں گزشتہ تقریب کے بعد میری طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس عزیزہ نے سب کام کاج چھوڑ کر جس خلوص اور تندہی سے خدمت، تیمارداری، دائرِ درمن اور دوڑ دھوپ کی، اُسے محض رسمی مہمان داری کا تقاضا یا بزرگی اور خردی کے روایتی لحاظ یا استحقاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے (جس کا دسیوں دفعہ اظہار کر کے بیسیوں دفعہ بُرا بھلا سُن چکا ہوں) کہ آرٹ اور ادب کی دنیا میں جو عزت صرف سن رسیدگی یعنی محض بیٹھے بیٹھے بُوڑھے ہو جانے کی بناء پر کی جائے وہ عزت کی ذلیل ترین صورت ہوتی ہے!

''سرِّ دلبراں'' نے ماڈل اور مہمیز کا کام کیا۔ میں نے لکھنا شروع کیا تو اور بھی من موہنی شخصیات، یادیں اور باتیں آپ ہی آپ موضوعِ گفتگو بلکہ جداگانہ بابِ مودّت کا سرنامہ اور عنوانِ جلی بنتی گئیں۔ نظرِ ثانی کے دوران جہاں تہاں اضافے بھی ہوتے رہے۔ جیسا کہ عرض کیا میں دراصل دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ رہوارِ قلم کو بدرکاب ہونے کی حد تک بے عنان چھوڑنے کے نتیجے میں اصل موضوع کا دامن چھُوٹ جائے اور بات سے بات نکلنے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ لفظ لفظ سے بات نکلنے لگے تو مضمون کی کیا ہیئت اور شکل بنے گی؟ سو وہ آپ کے سامنے ہے۔

اب جو پلٹ کر دیکھا تو digressions (موضوع سے گریز) کو معمول سے کہیں زیادہ پایا۔ لیکن کیا کیا جائے، تیر کو جب نشانے تک پہنچنے سے پہلے دُنیا جہان کا چکّر لگانے کی عادت پڑ جائے تو تیر انداز کبھی تیر اور کبھی کمان کو حیرت سے دیکھتا ہے۔ پھر اپنے آپ کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خود اسے زخم کاہے کو لگا۔ کیسے چپیٹ میں آ گیا؟

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کماں داری
''خود'' بچ کے کہاں جاتا گر تیر خطا ہوتا[1]★

(۱)

چھتوں پر کھلے پھول برسات کے

گزشتہ ستمبر کی بات ہے۔ میں نے رات کے دس بجے ایک ضروری کام سے روبینہ کو پشاور

---

[1]★ ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا (حالؔی)

فون کیا، جو، ان کے میاں عزیزی شاہجہاں نے اُٹھایا۔ کہنے لگے ''یہاں اس وقت دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ روبینہ چھت پر بارش میں نہا رہی ہیں۔''

''چھت پر؟ اس وقت؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔ چوبیس گھنٹوں میں جتنی بار بارش ہو، اُتنی ہی دفعہ اپنا تھیسس، پتیلی پر سے اُبھنتا دودھ، گولڈ فش، چہیتے lovebirds (ننھی منّی رنگ برنگی چڑیاں) اور مجھے چھوڑ کر اُوپر نہانے چلی جاتی ہیں۔ ابھی آٹھویں دفعہ چھت پر گئی ہیں اور چوتھی دفعہ نہا رہی ہیں۔''

''مگر آٹھ دفعہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''بقیہ چار دفعہ یہ دیکھنے گئی تھیں کہ کمبخت بارش کیوں نہیں ہو رہی۔''

''چھت پر پردے کا انتظام ہے؟''

''دن ہو یا رات، وہ چھت پر وہی لباس، مع سینڈلز، پہن کر غسل کرتی ہیں جسے زیبِ تن کر کے یونیورسٹی جاتی ہیں۔''

مجھ سے نہیں رہا گیا۔ ''جب بارش نہیں ہوتی تو آپ کے یہاں نہانے کا کوئی کم معقول انتظام بھی ہے کہ نہیں؟ اور اگر تین چار ہفتوں تک مینہ نہ برسے تو لیڈیز کے کپڑے دھونے کی کیا ترکیب ہے؟''

اتنے زور سے ہنسے کہ فون جھنجھنانے لگا۔ پھر بولے کہ ہماری طرف لڑکیاں بالیاں چھتوں پر بڑے شوق سے نہاتی ہیں۔ انہیں نہ کوئی گھورتا ہے نہ چھیڑتا ہے۔ نہ گھر والے ٹوکتے ہیں۔

''کیا آپ بھی نہیں ٹوکتے؟ خیر۔ مُنیر نیازی نے کیسی خوبصورت تصویر کھینچی ہے کہ مِٹائے نہیں مٹے گی۔ جب بھی بارش ہو گی رنگ اور نکھرتے اور دمکتے چلے جائیں گے:

گھٹا دیکھ کر خوش ہوئیں لڑکیاں
چھتوں پر کِھلے پھول برسات کے!''

میرے پسندیدہ شعر کو سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بولے ''ایک دفعہ اوپر سے ہنستی مسکراتی آئیں تو میں بے دھیانی میں پوچھ بیٹھا کہ چھت پر کاہے کو گئی تھیں؟''

تُنک کر بولیں ''گویا آپ کو معلوم نہیں چھت پر شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں کاہے کو جاتی ہیں!''

اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا جو کانِ لطافت و لطائف امجد اسلام امجد کی عطا ہے۔ (اگر اس سے معاً آپ کا ذہن جُڑواں لطیفہ گو عطاء الحق قاسمی کی طرف گیا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں!) دست بدست اور سینہ بسینہ آئے لطیفے، بالخصوص کثیفے، کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جب تک اُسے آگے نہ بڑھائیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فرض اور قرض اُتارنے میں ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ تو وہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ایک حلوائی کا لڑکا لاپتہ ہوگیا۔ محلّے بھر میں ڈھنڈیا پڑی۔ اُس کے یار اور خوار دوستوں سے پوچھ گچھ کی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کے بیت الخلاء میں جھانکا کہ کہیں چوری چُھپے سگرٹ کے ٹوٹوں کا دم لگاتے ہوئے بیہوش تو نہیں ہوگیا۔ کہیں سُراغ نہ ملا۔ سب تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ دفعتاً کیا دیکھتے ہیں کہ کڑھاؤ اور تھالوں کے پیچھے اور لکڑی کے تھڑے کے نیچے سے لونڈے نے سر نکالا۔ ہونٹ جلیبی کے شیرے میں لِسڑے ہوئے اور ہاتھ بیسن کے لڈّو میں سنے ہوئے۔ جیسے ہی باپ کے دم میں دم آیا اُس نے ڈپٹ کر پوچھا ''تو وہاں چُھپ کے کیا کر رہا تھا؟''

لونڈے نے تڑ سے جواب دیا ''ابّا، سچّی سچّی بتا، تیرے کو ملوم نئیں میں وھاں کیا کر رہا تھا؟''

چھت پر ہم بھی گئے، کوئی گُل نہ کِھلا!

جھوٹ کیوں بولیں، چھت پر تو ہم بھی جاتے ہیں۔ مگر تین چار سال کے وقفے سے۔ یہ خاندانی منصوبہ بندی والی قیدِ میعاد اس لیے کہ کراچی میں بارش اتنے ہی وقفے کے بعد ہوتی ہے۔ ہم یہ چیک کرنے جاتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پرنالے کا موکھا ہمارے تازہ مضمون کے مسودے سے بند کر کے بچے چھت کے برساتی تالاب میں نہائے ہوں اور ٹخنوں ٹخنوں پانی کھڑا ہو۔ گزشتہ برسات میں تو یہ سراغ لگانا پڑا کہ غسل خانے کے آئینے پر جو پانی کی تلتلی بندھی ہے، اُس کا منبع و مخرج کہاں ہے۔ لڑکپن میں ہمارا بھی کافی وقت دوسری منزل کی کثیر المقاصد چھت پر گزرتا تھا۔ اس کا پہلا مصرف یہ کہ وہاں پتنگ اُڑانے بلکہ کٹوانے کے لیے جاتے تھے۔ پیچ لڑانے کا بے حد شوق تھا، مگر یاد نہیں کبھی کسی کی پتنگ کاٹی ہو! پتنگ کٹواتے کٹواتے اتنے عاجز آ گئے تھے کہ محلے کے ایک لونڈے عبداللہ چِیتو کو اس کارِ خیر پر مامور کیا کہ جیسے ہی پتنگ کٹے، وہ اُسے لُوٹ کر آدھی قیمت پر ہماری نذر کر دے۔ جب یہ پتنگ دوبارہ کٹتی تو یوں کہیئے پھوکٹ میں یعنی ۱/۴ قیمت میں مل جاتی تھی۔ قیمت کا حساب بالعموم پائیوں اور بعض اوقات کوڑیوں میں کرنا پڑتا تھا، جو غریب غُربا کے لیے چھوٹے سکّے (دمڑی، چھدام، گنڈا، ادھیلا اور ڈھوکا) کا کام کرتیں اور لین دین میں حساب آخری کوڑی تک

چُکتا کر دیتی تھیں۔ اکثر دیکھا کہ ایک دفعہ کٹنے کے بعد پتنگ بے حیا ہو جاتی ہے! ڈھیل نہ دو تب بھی مارے آلکسی کے پیٹا چھوڑ دیتی ہے۔ مخالف مانجھے کے گھِسّے کے بغیر بھی آپ ہی آپ ڈور تڑا کر بے حیائی سے ہوا میں ٹھمکی کے ساتھ ڈولنے لگتی ہے۔ لُوٹنے والوں کی ٹولی ایسی کٹی پتنگیں جو پتنگ بازوں کے ہاتھوں ذلیل ہو چکی تھیں، مجھ جیسے پر جوش اناڑیوں کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول بیچ دیتی تھی۔ تنگ آ کر میں نے زیادہ تیز اور دھار دار مانجھے کی ڈور استعمال کرنا شروع کی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ پتنگ تو حسبِ معمول کٹتی رہی، مگر اب اس کے ساتھ انگلی بھی کٹنے لگی! انگلیاں فگار اپنی، مانجھا خوں چکاں اپنا۔ آخر آخر میں میری پتنگ ہارے ہوئے پہلوان کی مانند اتنی کچی ہوگئی کہ کٹنے کے ڈر سے اجنبی پتنگوں سے دور دور رہنے لگی۔

چھت پر نزولِ اجلال اور اجلاس فرمانے کا دوسرا مقصد ممنوعہ لٹریچر مثلاً الف لیلیٰ اور مثنوی زہرِ عشق کا جہاں تہاں سے مطالعہ تھا۔ طوطا مینا کی کہانیوں میں طوطے کی زبانی عورت کی بے وفائی اور تریا چلتّر کا کچا چٹھا اور مینا حرّافہ کی زبانی مرد کی حرامزدگی کا حال پہلے پہل چھت پر ہی منکشف ہوا اور نو بالغوں کو حیران کر گیا! آٹھویں جماعت میں پہنچا تو چرکین کے کلام کا سبقاً سبقاً اور لفظاً لفظاً بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فُحشاً فُحشاً مطالعہ اپنے کلاس فیلو رحمت اللہ کے ساتھ کیا جو یہ کتاب والد کی الماری سے چُرا کر اور اپنی تُرکی ٹوپی میں چھپا کر لایا تھا۔ بڑا مزہ آیا۔ میں نے تو بیشتر مُغلّظات اپنے محلّے شکاریان، اندرون سانگا نیری دروازہ میں آئے دن کے مُچیٹوں اور گالی گلوچ کے دوران سُن رکھی تھیں۔ پانچ چھ مُصطلحاتِ چرکین کا مطلب اُس گاؤدی کو سمجھایا جو مجھ سے ڈیڑھ سال بڑا تھا۔ تین فارسی گالیوں کا لُغوی اور لغو مطلب مع صحیح تلفظ بھی مجھے معلوم تھا۔ تلفّظ کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ بقول مرزا، گالی میں تلفظ کی غلطی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے! مجھے وہ خارا شگاف گالیاں بھی آتی تھیں جو محلّے کی جاہل اور بے پردہ عورتیں چُوڑی بھرے ہاتھ نچا نچا کر ایک دوسرے کو دیتی تھیں۔ ان کے آگے مردوں کی گالیاں نابالغ اور توتلی لگتی تھیں! اس میں کلام نہیں کہ میں کسی بھی جاہل، لڑاکا اور گلیر عورت کو اگر ہرا نہ سکتا تو برابر ضرور چھوٹتا! بدھو ہم عمروں میں میری بڑی عزت اور دھاک تھی۔

رحمت اللہ نے بتایا کہ یہ فحش کتاب ہر قدم پر ٹوپی میں بہت پھُدکی اور پھڑکی۔ اس کا پھُندنا آج شرارت اور چغل خوری پر اُتر آیا۔ کلاک کے پنڈولم کی طرح بے تحاشا جُھولا۔ میں زِچ ہو کے کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی اس حرامی پلّے نے ہلنا نہیں چھوڑا۔ دراصل اندر اُستاد چرکین زور مار رہے

تھے۔ مجھے پکڑوانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ پر پاجی پن میں بندہ بھی اس سے دس جوتے آگے نکلا۔ اُستاد کا فیضان ہے۔

چھت کے پھیرے لگانے کی تیسری وجہ چوری چھپے سگرٹ پینا اور وہیں لوٹے سے پچر پچر کُلیاں کرنا تھی تاکہ نیچے آئیں تو منہ سے تمباکو کے بھبکے بھک بھک نہ نکلیں۔ مرزا کہتے تھے کہ چھت پر یا پاخانے میں سگرٹ پینے سے دوگنا سرور اور چار گُنا بدبُو آتی ہے۔ انہیں نے اس بدبو کو دور کرنے کا یہ نسخہ بتایا کہ بزرگوں کے سامنے جانا پڑے تو کلّے میں سالم الائچی یا پیاز کا لچھا پان کی طرح دبا کر جاؤ۔ میں نے جب یہ نسخہ چوتھی دفعہ آزمایا تو والدہ نے کہا کہ آج تم نے پھر سگرٹ پیا؟ سینچر کو تمہارے منہ سے الائچی کے اور پاخانے میں سگرٹ کے بھبکے آرہے تھے!

اب یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُس زمانے میں سگرٹ پینے میں بذاتہٖ کبھی مزہ نہیں آیا۔ بلکہ اوّل اوّل تو مزے کی بجائے چکّر آتے تھے۔ منہ کا مزہ گھنٹوں خراب رہتا اور دھوئیں سے دم گھٹتا تھا۔ لیکن محض یہ احساس کہ غلط کام اور ممنوعہ حرکت کر رہے ہیں، ایک عجب عالمِ سرخوشی میں رکھتا جو دوسرے سگرٹ کی سرشاری تک باقی رہتا۔ آگے چل کر publicly یعنی دھڑلے سے سب کے سامنے چین اسموکنگ کی مگر وہ مزہ کبھی لوٹ کے نہ آیا جو اس فعل کو معیوب و ممنوع جانتے ہوئے چُھپ کر دم لگانے میں آیا کرتا تھا۔ اب کہیں جا کے بھید کھُلا کہ نشہ تمباکو میں نہیں، بڑوں کا عیب اپنانے اور غرورِ غلط کاری میں تھا۔ اب کہاں سے لائیں وہ معصوم معصیت کے مزے۔

اس اعتراف سے پہلے بات پیاز کے لچھے کی ہو رہی تھی۔ ترکی ٹوپی والے رحمت اللہ نے اپنی ٹوپی میں پیاز...... سالم یا تراشیدہ...... لانے سے صاف انکار کر دیا۔ حالاں کہ ماضی قریب میں وہ اس طربوش کو پیاز سے بھی بدتر چیزوں کی بار برداری یعنی بطور آلۂ نقل و حمل بڑے فخر اور کامیابی سے استعمال کر چکا تھا مثلاً سینما کے ٹکٹوں کے لیے بھائی کے piggy bank (بچت گولک) سے بڑی کاریگری سے نکالی ہوئی ریز گاری؛ امتحان میں نقل کرنے کے نوٹس؛ پیڈرو سگرٹ؛ موم جامہ میں لپٹا تسخیرِ زن کا تعویذ جس سے اس کا ماموں بیاہی تیاہی پڑوسن کو مُسخر کرنا چاہتا تھا اور خود رحمت اللہ اس سے ارتھمیٹک کے ہتھ چھُٹ اور بیدباز اُستاد ماسٹر پیارے لال ماتھر کو قابو کرنا چاہتا تھا؛ خوبصورت تاشوں کی گڈّی جن کی دغا بازی کے باعث چچا اتوار کو ڈھیر سارے کلدار روپے جوئے کی پھڑ میں ہار گیا تھا؛ کنگ ایڈورڈ کی شبیہہ والا اَدھنا (آدھا آنہ) جس کے بارے میں اُس کا دعویٰ تھا کہ میں نے اسے اُپلے کی راکھ، چوری کے نیبو اور ذاتی تھوک سے ایسا چماچم چمکایا ہے کہ تم

اس میں اپنا منہ اور تمہارا چھوٹا بھائی اپنے دودھ کے ٹوٹے دانت کی کھڈّی دیکھ سکتا ہے! اسی ٹوپی میں رکھ کر وہ عطر شامتہ العنبر کا وہ پھویا بھی لایا جسے کان میں رکھ کر قبلہ والد صاحب جمعہ کی نماز پڑھنے اور رات کو اپنے بھانجے کی شادی میں خورشید طوائف کا مُجرا دیکھنے گئے تھے۔ باری باری سب کو سنگھایا۔ سبھی کو طوائف کی خوشبو آئی!

خوب یاد آیا۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے کموڈ سے ملتی جلتی حیدرآبادی اسٹائل کی ایسی ہی ترکی ٹوپی اوڑھنے والے کو کموڈیا کہا ہے!

مرزا کہتے ہیں کہ میدانِ حشر میں اِس ٹوپی کی مع جُملہ مشمولات و نوادرات نمائش لگائی جائے گی، جس کے اختتام پر تمہاری چاروں کتابیں اس میں رکھ کر انبوہِ عاصیاں کی پُر جوش تالیوں کے بیچ تمہیں اُڑھا دی جائے گی۔ اس دستار بندی بلکہ کُلاہ پوشی کے بعد حکم ہو گا کہ بچّو! اب اسی کو اوڑھے اوڑھے چُپ چاپ چلے جاؤ جہاں بھی تمہیں لے جایا جائے! تمہی مُنصفی سے کہہ دو تمہیں کہاں لے جایا جانا چاہیئے!

چوتھا سبب چھت پر آر جار کا یہ کہ مئی جون کی تپش اور اَبس گُھمَس سے سارا بدن چیونٹیوں کے انڈوں جیسی الائیوں (گرمی دانوں) سے ڈھک جاتا تھا۔ ٹیلکم پاؤڈر اس زمانے میں انگلینڈ سے مہنگے داموں آتا تھا۔ لہٰذا جو گاچنی (زرد ملتانی مٹّی) ہماری خوشنویسی کی تختی پر پھیری جاتی تھی، اُسی کا گاڑھا لیپ ہمارے ریگ مالی بدن پر لگا دیا بلکہ منڈھ دیا جاتا، جس سے جلد واقعی ایسی ہو جاتی تھی کہ اس پر بدخط لونڈے نیزے کے قلم سے خوشنویسی کی مشق کر سکتے تھے۔ پھر ساون کی پہلی جھڑی میں الائیوں کی کینچلی اتر جاتی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ جو لڑکا کبھی بارش میں ننگ دھڑنگ نہیں نہایا اور برساتی کیچڑ میں ننگے پیر پچا پچ نہیں چلا، وہ بعد میں کسی بھی ٹرکش باتھ، ایرانی حمام، Riviera کے ساحل اور jacuzzi میں غُسل کرتا پھرے، اُس راحت فزا تھرتھری اور تھرِل (thrill ★) سے ساری عمر محروم رہے گا جو بھری برسات کی تیز بارش اور اس کی تیر آبی بوچھار میں محسوس ہوتی ہے۔

★ thrill: جن باذوق قارئین کو انگریزی لفظ کا ایسا درّانہ استعمال ناگوار گزرے، ان سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ پڑھتے وقت اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، مرتبہ شان الحق حقّی میں بیان کیے گئے مندرجہ ذیل معانی و مترادفات میں سے کوئی سا متبادل اس جملے میں جڑ کر دیکھیں اور عاجز کو عِند اللہ و عِند اللّغات معاف کر دیں:
''سنسنی۔ جذبے کی لہر۔ عصبی ارتعاش۔ اہتزاز۔ دھڑکن پھڑکن، استماع الصدر میں سُنی جانے والی تلملین یا لرزش۔ کسی جذبے کا اعصاب کو جھنجھوڑتے، جھنجھناتے ہوئے گزرنا۔''

(۲)

ریختی

کل مجھے چُغل خور ذرائع یعنی میڈم★[1] روبینہ کے عزیز شاگردوں نے بتایا کہ چند روز قبل باڑہ گلی میں ایک یادگار سیمینار ہوا جس کا موضوع ''ریختی'' تھا۔ میڈم روبینہ نے اس کے لیے ایک مضمون لکھا جو سامعین، بالخصوص طلبہ، کو بہت پسند آیا۔ مجھے سیمینار کے مقام، موضوع، معصوم مضمون نگار خصوصی اور معصوم تر سامعین کے اِنتخاب پر تعجب ہوا، اس لیے کہ میرا خیال ہے کہ جس مہربان نے اس بی بی کو ریختی پر مضمون لکھنے کے لیے آمادہ یا مجبور یا مشتعل کیا، اُس نے ان کو ایک ایسے امتحان میں مبتلا کیا جس میں کامیاب ہونا مرد کے لیے باعثِ شرمندگی ہے، جب کہ خاتون کا بُری طرح فیل ہونا عین دلیل شریف النفسی! میڈم اس خارستانِ بے غُنچہ و گُل و بلبل سے دامن کَشاں گزری ہیں۔ ریختی میں یوں تو عورت کے جذبات کی ترجمانی کا اِدّعا ملتا ہے اور مقصد بظاہر زباندانی اور لسانیات و نسائیات پر مرد کی حیرت انگیز قدرت کا اِتر دنا مظاہرہ ہوتا ہے، لیکن نیت اوّل تا آخر خراب اور ماحصل مخربِ اخلاق!

ریختی کی ساخت، روایت اور ترویج میں چار بنیادی خرابیاں مُضمر ہیں۔ دراصل وہی مردوں کو بہت بھاتی ہیں! پہلی تو یہ کہ بُرقع کی see-through (آر پار) نقاب کے نیچے گھنی، کالی سیاہ اور تاؤ دی ہوئی خضابی مُونچھ صاف چھپتی بھی نہیں، سامنے آتی بھی نہیں! دوسری یہ کہ جن جذبات و خواہشات کا اظہار عورت کی زبانی کرایا جاتا ہے وہ درحقیقت ہوسناک مرد کے اپنے جذبات ہوتے ہیں جنھیں مردانہ پسند کے زنانہ الفاظ میں شعرایا جاتا ہے! سب نہ سہی، بعض اشعار میں مستورات ــــ جی ہاں اس زمانے میں خواتین کو مستورات، مُخدّرات، طبقۂ اِناث اور زنانی سواریاں کہا جاتا تھا ــــ کی زبانی شہُوتی لہجے میں مرد اپنی شہوت انگیز تمناؤں کا اظہار کرتا ہے، جنھیں کسی بھی لحاظ سے نیک اور نسوانی نہیں کہا جاسکتا۔ گئی گُزری بیسوا بھی اس طرح گفتگو نہیں کیا کرتی۔ لیکن کیا کیا جائے رنگوڑے مرد کی خواہش ہے کہ یہ دِیپک راگ ڈھلتی عمر کی راکھ میں دبی چنگاری کو ہوائے ہوس سے شعلۂ جوالہ بنادے! ریختی میں مینا وہی بولی بولتی ہے جو پنجرے کا مالک اُس سے

---

[1] ★ میڈم: شاگردوں پر ہی موقوف نہیں، روبینہ کو ان کے استاد، بزرگ اور سینئر ساتھی بھی میڈم ہی کہتے ہیں۔ چنانچہ اُن سے گفتگو اور ان کے ذکر میں ہم بھی اپنے سنہ پیدائش کو دخل اندازی کرنے یا بیکار میں گھُنڈت نہیں ڈالنے دیتے۔ مطلب یہ کہ اپنی ہم عمر سمجھ کر عزت و احترام سے پیش آتے ہیں۔

بُلوانا چاہتا ہے۔ شاعروں نے مرثیے، نوحے، شہر آشوب اور خونیہ اشعار خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھے ہیں۔ ریختی کے شاعر نے انگلیوں کو تینوں پوروں تک رال میں ڈبو کر ریختی رقم کی ہے! مولانا حالی بہت معتدل اور متحمل مزاج کے نقاد تھے۔ لیکن اِس مقام پر اُنہیں بھی طیش آ گیا۔ لکھتے ہیں: ''شاعروں میں کوئی ہاجی[★] ، ہزل گو، ریختی گو اور گندہ ذہن ایسا نہ ہوگا جو قوم کا مُسلمان نہ ہو۔''

(مقالاتِ حالی)

اِس میں کلام نہیں کہ جان صاحب نے اس فنِ پُرفتور کو درجہء کمال تک پہنچا دیا۔ کہیں کہیں زبان عُریانی سے گزر کر ننگی پر اُتر آتی ہے! اس ظالم نے اچھی بھلی گھر گرہستن عِفت النساء کو آخر کار خفت النساء بنا کے چھوڑا! وہ غریب گھر گرہستی کے لائق نہ رہی۔ صرف ریختی کے کام کی ہو کے رہ گئی! مرد نے اپنی خواہشاتِ نفسانی پر عورتوں کی طلاقتِ لسانی کا واش ایبل (شو بیدنی) لیبل لگا دیا! رہی شاعری تو وہ نصیبوں جلی طاقِ عصیاں پہ دھری چیختی ہی رہ گئی:

تم تو کرو ہو صاحبی، بندی میں کچھ رہا نہیں

ایک دن مرزا کو بحثا بحثی کے دوران طرارہ آ گیا تو کہنے لگے ''صاحب، مرد جب عورت بن کے بولتا اور لکھتا ہے، تب بھی سُسرا مرد ہی رہتا ہے!''

تیسری خرابی یہ کہ بیگماتی زبان اور محاوروں کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو اُس زمانے میں صرف زرخرید لونڈیوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔

زیادہ غور کیا تو چوتھی خرابی یہ نظر آئی کہ باعتبار لہجہ و صنف، ریختی مردانہ ہے نہ زنانہ۔ یہ سرتاپا مخنث صنفِ سخن ہے! اکثر اشعار کے بیک گراؤنڈ میں ایسی تالیاں پٹخارنے کی آواز آتی ہے جو تیسری جنس کے ساتھ مختص ہیں۔ ریختی عورت کا مضحکہ خیز ''کیری کیچور'' ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی آخری شب کا پچھلا پہر ہے اور ایک زبان آور نقال جو نہ خُوئے مرداں رکھتا ہے نہ رُوئے زناں، بیگماتی محاوروں کی زرق برق پشواز پہنے، کہاوتوں اور رمز و کنائے کا گھونگٹ نکالے، قافیوں کے گھنگھرو باندھے، عورتوں کی سی آواز بنا کر چھما چھم کہروا ناچ رہا ہے، جو نئے دن کا سورج نکلنے سے ذرا دیر پہلے کا راگ اور گئے گنوائے دن کا وِداعی رقص ہے۔

★ ہاجی: ہجو کرنے والا۔ نقال۔ منہ چڑانے والا۔
ہجو بھی ایک مُسلمہ صنفِ سخن رہی ہے۔

میڈم کلاس روم میں ہوں یا باہر، اپنے پیشے اور منصب کے آداب اور ڈسپلن پر سختی سے کاربند رہتی ہیں۔ زبان و قلم بھی توازنِ فکر و نظر، وضعِ احتیاط اور شائستگی کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ ہمارے بے کہے اور سرزد ر قلم کی طرح نہیں کہ

؎ گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے!

کیا کریں، ہمارا زور تو اپنے آپ پر بھی نہیں چلتا! قلم کے بہکاوے میں آکر رپٹتے چلے جاتے ہیں۔

مذکورہ مقالے کے علاوہ ہم نے ان کے اور بھی مضامین دیکھے ہیں۔ ان کا اُسلوب سادہ اور سلجھا ہوا ہے۔ مناسباتِ لفظی اور جھالر پھندنوں سے بے نیاز، رواں دواں نثر لکھتی ہیں۔ اندازِ فکر و بیان مثبت ہے۔ عین مدح میں اگر قدح و تنقیص کا مقام آہی جائے تو اپنے ممولے کو شہباز سے لڑا کر لہولہان نہیں ہونے دیتیں۔ سیدھے سُبھاؤ کسی جید نقاد کے قولِ فیصل کی چنگاری چھوڑ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ریختی پر انہوں نے ہمدردانہ حد تک متوازن تبصرہ کیا ہے اور اپنے لہجے کو تضحیک اور ناصحانہ طنز و توبیخ سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس کا اندازہ انشاء اللہ خان انشاء، سعادت یار خان رنگین اور جان صاحب کے ان بے ضرر اور سینگ کٹے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے بطور نمونۂ کلام نقل کیے ہیں۔ وہ سب اتنے سادہ و معصوم سے ہیں کہ ہم بھی میڈم کو ترنم سے سنا سکتے ہیں! انہیں پڑھ کر تو گمان گزرتا ہے کہ ہر دو خان صاحبان اور جان صاحب میڈم سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ غیر اصلاح شدہ کلام صاف بچایا اور اُن حلقوں میں سراہا جاتا ہے جو ایسی شاعری کو سراہتے ہیں۔

(۳)

میڈم کان لپیٹ لیتی ہیں

طرزِ تحریر میں تمامتر حزم و احتیاط کے باوجود انہوں نے سیمینار میں ریختی پر اپنا مقالہ خود نہیں پڑھا۔ اپنے ایک شاگرد رشید سے پڑھوایا اور خود پشاور میں قصہ خوانی بازار میں شاپنگ کرتی رہیں۔ موازنہ یا مقابلہ، وہ بھی ایک پروفیسر سے، مقصود نہیں۔ ہمارا رُوئے سخن تو اکثر و بیشتر اپنی ہی طرف ہوتا ہے! ہمارا بھی اکثر جی چاہتا ہے کہ ہمارے مضامین کے بعض جاندار و جان ہار یعنی حساس حصے کوئی دوسرا پڑھ کر سنائے۔ میدانِ حشر میں اگر ہمارا اعمالنامہ ہمارے بائیں ہاتھ میں پکڑایا گیا تو شرم کے مارے ہم اُسے پڑھ نہ پائیں گے۔ ضیاء محی الدین سے پڑھوا کر سنیں اور سنوائیں گے، تاکہ لذتِ گناہ سے ناآشنا اور معصومیت میں مبتلا بیچارے جنتی کم از کم لطفِ سماعت سے تو محروم نہ رہیں۔

آخری دو جملے سن کر مرزا بولے کہ آج کل تم میدانِ حشر کا ذکر بار بار اُس طرح کرتے ہو جیسے صور پھونک کر وہ سارا آڈمبر[1] اور عظیم الشان مجمع مُردگان صرف تمہاری شام منانے کے لیے لگایا جائے گا!

عزیزان گرامی قدر، آپ کی میڈم فرماتی ہیں کہ ''میری موجودگی میں کبھی کوئی ایسی ویسی باتیں کرتا یا کسی کی غیبت کرتا ہے تو میں جھٹ اپنے کان لپیٹ لیتی ہوں!''

ادب اور شاعری میں نازک مقامات اور انفرادی سنسر شپ کا ذکر آیا تو مجھے اپنی خواری یاد آ گئی۔ یادش بخیر بلکہ یاد بطیش! زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مجھے بہاولپور میں ایک تقریب پذیرائی میں اپنے مضامین کے چند اقتباسات پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ فارسی کے ایک فاضل پروفیسر نے اپنی تعارفی تقریر میں فرمایا کہ ''یوسفی صاحب کی تحریروں میں جگہ جگہ سیکس کی زیریں لیکن زوردار لہر صاف نظر آتی ہے۔ بار بار ایسے مقامات آتے ہیں جن کی تشریح ہم کلاس روم میں طلبہ و طالبات کے سامنے نہیں کر سکتے۔ حالانکہ وہ شیطان ادبدا کے اُنھی فقروں کے معنی مجھ سے پوچھتے ہیں، جن کے نہ صرف معانی بلکہ محل اور ترکیبِ استعمال بھی وہ مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہیں! یوسفی صاحب رہنمائی فرمائیں، ایسے میں غریب پروفیسر کو کیا کرنا چاہیے؟''

عرض کیا، ایسے میں پروفیسر کو جو بظاہر غریب اور غبی نہیں ہے، صرف مسکرا دینا چاہیے۔ مسکراہٹ سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔ مسکراہٹ وہ معنی بھی ذہن نشیں کرا دیتی ہے جو متن میں نہیں ہوتے! جہاں تک جگہ جگہ شئے ممنوعہ اور موضوعِ مطعونہ کے پائے جانے کا سوال ہے تو اس کی وجہ مجھے تو یہی نظر آتی ہے کہ آپ کو جگہ جگہ وہی کچھ مل جاتا ہے جو آپ بڑے شوق اور دیدہ ریزی سے جگہ جگہ تلاش کرتے ہیں۔ آپ نے بھی یقیناً پڑھا ہوگا کہ ڈاکٹر جانسن کی بے مثل ڈکشنری پر ایک ثقہ خاتون نے اعتراض کیا کہ اس میں جابجا گندے اور فحش الفاظ ملتے ہیں۔ جانسن نے جواب دیا کہ میڈم، آپ کو جابجا وہی الفاظ مل جاتے ہیں جنھیں آپ جابجا تلاش کرتی رہتی ہیں۔

ایسا ہی گلہ ایک لڑکی نے کیا، جو ایم۔ اے کی طالبہ معلوم ہوتی تھی۔ لاہور میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی ۵۷ویں سالگرہ کی تہنیتی تقریب میں، میں نے ایک طویل مضمون پڑھا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد یہ صاحبزادی میرے پاس آئیں۔ کچھ دیر ادب آداب، رسمی تعریف اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جانے لگیں تو بولیں، سر، بات چیت میں تو آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ لیکن کتاب میں بالکل لُچے لگتے ہیں!

---

[1] آڈمبر (ہندی) شان و شکوہ کا ساز و سامان۔ بکھیڑا۔ کھڑاگ۔

''بی بی، آپ نے یہ گندہ لفظ کہاں سے سیکھا؟ میں نے تو پنجاب میں کسی کو یہ لفظ بولتے نہیں سنا۔'' میں نے کہا۔

''آپ ہی کے ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ لُچّہ بھی پہلی دفعہ اسی مضمون میں دیکھا!''

ایک دن میں نے روبینہ سے پوچھا، پروفیسر صاحبہ، کیا میرے مضامین سے متعلق آپ کے شاگرد بھی ایسے سوال کرتے ہیں جن کا جواب کلاس روم یا بچّوں کی موجودگی میں نہیں دیا جا سکتا؟

ہنسی سے فراغت پانے کے بعد فرمایا ''آپ نے پوچھا ہے تو عرض کرنا پڑے گا کہ آپ کا طریقۂ واردات مختلف ہے۔ آپ کا قلم، بلکہ پنسل، حیا کا گھونگٹ نکال کے ناچتی ہے۔ مگر چھنچھناتے گھنگرو مرزا عبدالودود بیگ کے پیروں میں باندھ دیتی ہے اور جب پبلک کے اصرار پر گھونگٹ اُلٹتی ہے تو ڈارک گلاسز لگا کر آنکھ مارتی ہے! ہمیں ان پر رشک آتا ہے، اس لیے کہ ہم تو اپنے کان تو بتہ بھی نہیں پکڑتے۔

یہ کان سلامت ہیں جب تک

میں نے میڈم کو کان لپیٹتے تو کبھی نہیں دیکھا، لیکن یہ ضرور دیکھا کہ جہاں جہاں انہیں ہمارا طرزِ نگارش واشگاف یا کھلا ڈلا لگا، وہاں انہوں نے ''خاکم بدہن'' اور ''زرگزشت'' کے گستاخ صفحے کا کان یعنی کونا مروڑ دیا ہے۔ زرگزشت تو اوّل تا آخر dog-eared (ہر ورق کا کونا مڑا ہوا) ہے۔ اس پر بھی بس نہیں کیا۔ بعض صفحے تو ایسے ہیں جن کا نہ صرف اوپر والا کان بلکہ نیچے کا کان بھی تادیباً مروڑ دیا ہے! وہ تو خیریت گزری کہ کراچی اور پشاور کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ ہے اور میڈم کے دستِ سبق آموز کی لمبائی زیادہ سے زیادہ ۳۰ انچ ہوگی ورنہ ان سے بعید نہ تھا کہ یہ سلوک تصنیف کی بجائے صاحبِ تصنیف کے ساتھ کرتیں تاکہ بقیہ مصنفین بھی کان اور عبرت پکڑیں۔ کتاب پر ہی موقوف نہیں، دورانِ گفتگو بھی میرے کسی فقرے پر سبحان اللہ کہنے کے بعد وہ دوسرے سانس میں استغفراللہ، استغفراللہ کہتی ہیں! میں نے آج تک کسی خاتون کو ایسی قرأت اور مردانہ کھرج میں استغفراللہ کہتے نہیں سنا۔ وہ کراچی آئیں تو میں نے تکلّف بالائے طاق رکھ کر کہا، آپ اتنی کنفیوزڈ کیوں ہیں؟ یکسُو ہو کر یا تو داد دیجیے یا لاحول پڑھیے۔ بولیں، بیساختہ داد دینا میرے ذوقِ سلیم اور مجلسی آداب کا تقاضا ہے۔ پھر اسی پر لاحول پڑھنا میری تربیت اور تدریسی فرائض کا تقاضا ہے۔

اور ان دونوں تقاضوں کے درمیان سینڈوِچ ہونا ہماری مصنفانہ مجبوری کا تقاضا ہے!

یہ لکھنے کے بعد خیال آیا کہ کان اور کونے موڑنے مروڑنے کی یہی رفتار رہی تو ہماری زیرِ تصنیف کتاب میں تو کچھ باقی نہیں رہے گا۔ پروفیسر روبینہ شاہجہاں کے ہاتھوں کتاب گُلدستہ گوشمالی بن کے رہ جائے گی! پھر دل نے کہا ''بھائی میرے، 'یہ کان سلامت ہیں جب تک' اُنہیں اینٹھنے اور مروڑنے کا سلسلہ تو جاری رہے گا۔ تم کب تلک ہول کھاتے رہو گے؟'' ایک زمانے میں خاندانی پہلوان بچپن ہی میں دونوں کان تُڑوا لیتے تھے تاکہ آگے چل کر عین کُشتی اور دنگل میں منہ سے بچپن کی سی چیخ نہ نکلے! ہماری طرف بھی ایک نامور بُوچا پہلوان ہو گزرا ہے۔ ایسی ہی توڑ مروڑ سے ملتی جلتی صورتِ حال کے بارے میں آج سے نصف صدی پیشتر پروفیسر عندلیب شادانی نے اپنے طویل مضمون میں ریختی کا یہ چُلبلا سا شعر نقل کرتے ہوئے اس کی علامتی اور متصوفانہ شرح کا مذاق اُڑایا تھا:

اگر یوں ہی توڑا مروڑی رہے گی
تو کاہے کو انگیا نگوڑی رہے گی

جہاں تک یاد پڑتا ہے، ریختی کے کسی رسیانے اس کی یہ تشریح کی تھی کہ انگیا تو محض استعارہ ہے۔ اس سے مراد روح کا پیراہن خاکی یعنی جسم ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے اگر روحانی کرب و اضطراب، باطنی فشار اور نفسانی نوچا کھسوٹی اسی طرح جاری رہی تو کمبخت کی ماری انگیا (جسم) کیسے باقی رہے گی۔

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔ اب میڈم چاہیں تو کُلّی کر کے دل ہی دل میں استغفراللہ کہیں اور اِس نگینے کو بھی ریختی کے پاکیزہ اشعار کی بیاض میں ٹانک لیں۔ پھر گھوڑا گلی، نتھیا گلی، چھانگلا گلی یا اپنی ہی گلی کے کسی سیمینار میں ہم سے پڑھوا کر اپنے حُسنِ انتخاب کی داد سمیٹیں۔ حُسنِ انتخاب سے ہماری مراد شعر پڑھنے والے کا انتخاب ہے!

(۴)

زعفران کہاں ملے گی؟

کل میں نے روبینہ سے فرمائش کی کہ چوک یادگار اور قصہ خوانی بازار دیکھے مدتیں گزریں۔ مجھے لے چلیں۔ انہوں نے پوچھا ''آپ نے پہلی بار پشاور کب دیکھا تھا؟'' میں نے جواب دیا ''۱۹۵۳ء میں'' وہ دل ہی دل میں حساب لگا کے خاموش ہوگئیں کہ یہ ان کی پیدائش سے رُبع صدی قبل، گویا پتھر کے زمانے کا واقعہ تھا۔ ہمارے درمیان اے دوست لاکھوں 'سال' حائل ہیں! وہ بھی

کیا زمانہ تھا! لنڈی کوتل بڑے چاؤ سے جاتے اور وہاں سے جو سامانِ تعیش وقتاً فوقتاً اسمگل کر کے لاتے تھے، اُس کی مکمل فہرست پر اب نظر ڈالتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

Dunhill سگرٹ کے چھ پیکٹ، چاکلیٹ چار عدد، ماچس کے بکس سے بھی چھوٹی ڈبیا میں چٹکی بھر ایرانی زعفران، گڑیا ایک عدد، ڈبل عرض کا چائنیز بروکیڈ ڈھائی گز، Yardley کا ٹیلکم پاؤڈر ایک عدد، کاجو ایک سیر، فوم کے چپل ایک جوڑی، Scholl کی corn caps اور دو چیتابے، ٹشو بکس دو عدد، اِمپیریل لیدر صابن چار عدد، غلط سائز کی برا (جو ایک ہی کافی ہوتی تھی)۔

ایک مہربان یہ سامان لنڈی کوتل سے Dean's Hotel اپنے کسی گُرگے گماشتے کے ذریعے پہنچا دیتے تھے۔ اگر ہم لاتے ہوئے پکڑے جاتے تو ایک رات حوالات میں ملزموں اور ان سے زیادہ خطرناک مچھّروں کی صحبت میں اور اوّل الذکر کی ثانی الذکر کی ہمشیرگان کی شان میں آرزو بھری گالیوں کی ساعت میں گزارنے کے بعد صبح مُنہ پر چوخانے کا رُومال ڈالے عدالت میں پیش ہوتے۔ ضمانت کے لالے پڑ جاتے۔ عزت، غیرت، ملازمت اور کاجو ہاتھ سے جاتی رہتی۔ ایک پھیرے میں ممریز خاں نے حوصلہ بڑھایا تھا کہ ہمارے قانون سخت نہیں ہیں۔ حد سے حد تین ماہ کی ہوتی ہے۔ وہ بھی بلامشقت! ہم نے قانون کی موی نرمی اور smuggler friendly رَویّے کی اتنی تعریف سُنی کہ واللہ تینوں پر پیار آنے لگا۔ تیسرے ہم خود ہوتے تھے!

یہ نادر اشیاء اُس زمانے میں کراچی میں نہیں ملتی تھیں۔ انہیں بیک وقت خریدنے کا تو کبھی اتفاق یا بُوتا نہیں ہوا، لیکن اور کچھ لاؤں یا نہ لاؤں، بیگم کی فرمائش یعنی زعفران اور اپنی مرغوبہ یعنی کاجو لانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ بعض اوقات سوغات کی یہ کھیپ اتنی مختصر ہوتی کہ رحمت اللہ کی بار بردار ترکی ٹوپی میں بہ آسانی اسمگل کی جاسکتی تھی۔

ابھی بیگم کی فرمائش یعنی زعفران لانے کا ذکر آیا تو Memory Lane (کوچہء یادآوری) میں ایک انوکھا واقعہ دُند مچانے لگا کہ پہلے میرا ذکر کرو، پھر کوئی اور بات ہوگی تو بقول مرزا، وہ واقعہ کچھ یوں وقوع پذیر ہوا کہ ہمارے عزیز دوست اور ڈان اخبار کے واجب الاحترام ایڈیٹر احمد علی خاں سرکاری دورے پر ایران جانے لگے تو ان کی بیگم ہاجرہ مسرور نے فرمائش کی کہ ''fresh زعفران لانا نہ بھولیں۔ ڈائری میں کہیں نوٹ کر لیجئے۔'' خان صاحب بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہی تہران کے امیگریشن کاؤنٹر سے فراغت پائی اور ایئرپورٹ کے باہر قدم رکھا، میں نے اپنے وفد کے ساتھیوں

اور گائیڈ سے پوچھنا شروع کر دیا کہ fresh زعفران کہاں ملے گی؟ میوزیم میں داخل ہونے سے پہلے اور نکلنے کے بعد جو بھی قریب سے گزرا اُس سے پوچھا fresh زعفران کہاں ملے گی؟ جن دکانوں سے بیٹی کے لیے جوتے اور اپنے لیے دیوانِ حافظ اور پائپ کا تمباکو خریدا، اُن سے بھی فریش زعفران کا پتہ پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

ایرانیوں کی دیرفہمی کے پیش نظر انہوں نے اپنے ہی جیسے تین ثقہ ساتھیوں کی مدد اور مشاورت سے ''فریش زعفران کہاں ملے گی؟'' کا فارسی متبادل گھڑ لیا تھا جسے احتیاطاً عربی لہجے میں ادا کرتے تھے! یوں تو وفد میں دو جیند فارسی داں بھی تھے، لیکن ان کی فارسی دانی ہی سب سے بڑی رُکاوٹ ثابت ہوئی! وہ اس طرح کہ وہ کہتے تھے کہ ایرانیوں کی بات ہماری سمجھ میں اس لیے نہیں آتی کہ ان کا accent خراب ہے! آدھا لفظ چبا جاتے ہیں اور بقیہ آدھا فرنچ لہجے میں عطا کرتے ہیں! اس کے برعکس وفد کے کچھ ممبران ایرانیوں پر اپنی فارسی دانی کا رُعب جمانے کی غرض سے ہر جملے کی چُول گریمر کے عین مطابق بٹھا کر فارسی کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف بالکل واضح، بلکہ یوں کہیے، ہجے کر کر کے صحیح مخرج سے ادا کرتے تھے۔

مرزا تک یہ خبر پہنچی تو تبصرہ فرمایا ''ان ہی بواعث تو غریب ایرانی ہماری فارسی نہ سمجھ پائے۔''

''مرزا، مجھ غریب کی سمجھ میں تو تمہاری اردو بھی نہیں آ رہی۔ یہ بواعث کیا بلا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اچھا کیا جو پوچھ لیا۔ بواعث جمع ہے باعث کی۔ سنا ہے ایک صاحب نے یہ عربی لفظ اپنی فارسی جملے میں نگینے کی طرح جڑ کر نذرِ ایرانیان کیا تھا!''

بالآخر وفد کے ایک ذہین و فطین رکن نے اس خلفشار کا یہ حل نکالا کہ ایرانیوں سے ٹھیٹ جھنگوی لہجے میں پنجابی میں گفتگو کرنے لگے! سب کو حیرت ہوئی۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیرت اس پر ہوئی کہ ایرانی اب مطلب کی بات کچھ کچھ سمجھنے لگے! مرزا کہتے ہیں کہ توانا زبان اور لوک لہجے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ ۲۵ فی صد مطلب بولی سے اور بقیہ ۷۵ فی صد body language (بدن بولی۔ انگ بھاؤ) سے ادا ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے ٹوکا ''یہ تو ڈیڑھ سو فی صد ہو گیا!''

بولے ''اور کیا۔ یہی تو اس کی اصل خوبی ہے!''

معاف کیجئے، جملہ معترضہ ایسا پھیلا، ایسا پھیلا کہ ورق تمام ہوا، مدعا باقی! دکھانا صرف یہ چاہتا تھا کہ ایسی ہی فارسی میں خان صاحب اور ان کے ترجمانوں نے ہر غلط دکان پر فریش زعفران طلب کی! انتہا یہ کہ آخری رات کو رقص و موسیقی کے کلچرل پروگرام میں تشریف لے گئے تو نئے گائیڈ سے وہی سوال کیا: ''فریش زعفران کہاں ملے گی؟ عنقا ہو گئی! ہم تو کل چلے جائیں گے۔'' اس مرتبہ وفد کے ساتھ پاکستانی سفارت خانے کا ایک سینئر افسر بھی تھا۔ اُس نے خان صاحب کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ یہاں ایسے موقع پر زعفران کا نام نہیں لیا جاتا! اس واسطے کہ یہ نائٹ کلب نہیں ہے۔ یہ آپ کے اعزاز میں سرکاری استقبالیہ ہے۔ یہاں فریش زعفران کا ذکر سنگین و رنگین غلط فہمی اور دنگلی کا باعث بن سکتا ہے! یار لوگ لے اُڑیں گے۔ وجہ یہ کہ مقامی slang (عامیانہ روزمرّہ) میں زعفران سے مراد نوخیز چنچل چھوکری ہوتی ہے! پھر آپ تو پاکستانی وفد کے بزرگ لیڈر بھی ہیں۔

خان صاحب پر تو جو گزری سو گزری، اس واقعے سے میرے تو ایسے کان ہوئے کہ اب پشاور آتا ہوں تو فریش کو چھوڑیئے، پُرانی یا مہک اور مزے سے اُتری زعفران تک کا نام زبان پر نہیں لاتا! ممریز خاں گواہ ہیں۔

مرزا بھی کہتے ہیں کہ اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد بیگم اب کبھی مُزعفَر (زعفرانی زردہ) بناتی ہیں تو مجھے زعفرانی چاولوں سے چنچل کنوار پتے کی ایرانی مہک آتی ہے! لقمہ لیتا ہوں تو مارے ہنسی کے زرد چاولوں کی پُھلجھڑی سی چھوٹ جاتی ہے!

(۵)

کوچہء ماضی گیراں

اس دفعہ پشاور آیا تو نہ جانے کیوں یادوں نے بے پناہ ہجوم کیا۔ بھٹکتا بھٹکتا شارعِ یاد آوراں سے کوچہء ماضی گیراں میں جانکلا۔ یہ ایک پیچ در پیچ بند گلی ہے۔ یاد آوری کا عمل منطق کے تقاضوں یا تقدیم و تاخیر کے کسی ضابطے کا پابند و تابع نہیں۔ یاد میں تو چھینک کا سا اچانک پن اور بے اختیاری کا عالم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ٹیس کی سی میٹھی میٹھی دُکھن بھی۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ میں ایک مدّت

سے عزلت گزیں ہوں۔ مجھے یہاں لانے اور بلانے میں ڈپارٹمنٹ آف کلچر اور شعبہء اردو کی تحریک و دلچسپی کے علاوہ روبینہ شاہین کی ترغیب و تواضع کا بھی قابلِ ذکر و تشکر حصہ ہے۔ چنانچہ یادوں اور دنیا جہاں کی باتوں کے درمیان آپ جہاں تہاں ان کی جھلکیاں اور کہیں کہیں تسلسل کے ساتھ ذکر اذکار بھی دیکھیں گے۔ اظہارِ سپاس و تشکر کا بس یہی پیرایہ اپنا بُرا بھلا فن ٹھہرا۔ مرزا کہتے ہیں کہ تم کسی کے ممنون و مشکور ہوتے ہو تو بعض اوقات تمہارا اظہارِ سپاس و تشکر ایسا لگتا ہے جیسے بھرے میلے میں اعلیٰ نسل کا مُشکی گھوڑا گلے میں چُنری ڈالے، پیروں میں جھانجھن پہنے، پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر رقص کا پوز بنائے، یا سدھا سدھایا پہاڑ کا پہاڑ ہاتھی گنا کھانے کے بعد سُونڈ دُہری کر کے مہاوت اور ناظرین کو سلام کرے!

میں نے کہا ''مرزا، یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے بچپن میں صرف انہیں دو جانوروں کا ناچ اور کرتب دیکھے، ورنہ میں اپنا منہ تو منہ، دُم تک دکھانے کے قابل نہ رہتا!''

اب وہ زماں نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں

میڈم نے قصہ خوانی بازار کی سیر کرائی۔ اُس حلوائی کی دکان کہیں نظر نہ آئی جہاں سے میں، بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، شُتر مرغ کے انڈے کے برابر کالی گلاب جامن خرید کر کراچی لے جاتا تھا۔ موصوف بڑے شوق سے کھاتے اور پوچھتے جاتے، وہاں موتی چُور لڈو کتنا بڑا ہوتا ہے؟ کبھی وہ بھی تو چکھائیے۔

جب بات کُھل کر ہو رہی ہے تو یہ بتانے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ۲/۱ کلو پشاوری گلاب جامن گپاگپ چٹ کر جانے کو وہ ازراہِ کسرِ نکسار و اختصار ''چکھنا'' کہتے تھے!

ایک دن میں نے انہیں یونہی للچایا کہ قصہ خوانی کے حلوائی کی پوری جسے کھانے کے لیے میں التزاماً اتوار کا دورہ رکھتا ہوں، اپنے ہاں کے پراٹھے کے برابر ہوتی ہے!

اس پر محققانہ استفسار فرمایا ''اور چھولے؟''

جی تو بہتیرا چاہا کہ بھڑ سے کہہ دوں: ''تمہارے سر کے برابر!''

لیکن یہ سوچ کر چپکا ہو رہا کہ وہ اسے بھی سچ سمجھ کر جلد لانے کی فرمائش کر دیں گے!

میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ مرزا میرے ہمراہ پہلے پہل پشاور آئے تو گلاب جامن، شفتالو (آڑو) اور سیخ کباب کے جمبو سائز پر بقول شاعر کبھی دل نثار کرتے، کبھی جان صدقے کرتے۔ اثنا قاایک گلی میں ہیجڑوں کو گاتے بجاتے دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے ''حد ہوگئی! یہاں کے تو

ہیجڑے بھی......‘‘ آگے ریختی اور حدِ ادب!

کراچی لوٹے تو مرزا نے پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو بتایا کہ انہوں نے پشاور میں سنا کہ وہاں ہیجڑے کو رسماً اور اخلاقاً پھوپھی کہتے ہیں! مثلاً پھوپھی نرگس پھوپھی خلیل! پروفیسر قدوس کے دل و دماغ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اپنی سگی پھوپھی کو مُمانی کہنے لگے!

’’اور پھوپھا کو؟‘‘ میں نے مرزا سے پوچھا۔

’’پھوپھا کی تو صورت ہی سے نفرت ہوگئی!‘‘

میں نے میڈم کو بتایا کہ ۱۹۵۴ء میں میں نے پشاور میں کسی عورت کو بغیر برقعے کے اور مرد کو بندوق اور کارتوسوں کی پٹی کے بغیر نہیں دیکھا۔ داؤد خاں محسود کہتا تھا کہ مونچھ، بندوق، ٹھیک نشانہ، ٹھیک ٹھاک شجرہ، کڑیل بیٹے اور قد کاٹھ کے بغیر اللہ بھی بندے کو عزت، عافیت اور غیرت نہیں بخشتا۔ میں نے اس کو غنیمت جانا کہ کاجُو کے حصول میں ان کڑی شرائط یعنی مونچھ، بندوق وغیرہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مقامِ شُکر اس لیے بھی کہ وہ دن لد گئے جب شکر خورے کو خدا شکر ہی دیتا تھا۔ اب اس کے ساتھ شکر خورے کو ذیابیطس بھی ملتی ہے اور خدا کسی قوم سے خفا ہو جائے تو پوری قوم جمہوریت سے محروم ہو کر ضیابیطس میں مبتلا ہو جاتی ہے!

روبینہ نے چوک یادگار میں وہ جگہ بھی دکھائی جہاں سے میں بہت ہی سستے داموں گھِسے (دیسی، سلیم شاہی سے ملتے جلتے جوتے) خریدتا تھا۔ بیوی کے لیے مختلف ڈیزائن کے دو تین جوڑی جوتوں کی سوغات ضرور لے جاتا تھا۔ تنخواہ اس سے زیادہ قیمت کے تحفے کی مُتحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ اللہ کی بندی اس شاہ خرچی سے بھی ہر بار منع کرتی تھی! مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں پہلی دفعہ اس دکان پر آیا اور ایک خوبصورت جوتا ’’ٹرائی‘‘ کرنے لگا تو دکاندار نے ٹوکا ’’یہ زنانیوں کا ہے!‘‘

’’معلوم ہے۔ میرا اور بیوی کا سائز ایک ہی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’یارا جی، آپ کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟‘‘ اُس کے چہرے پر حیرت، ہمدردی اور حقارت کا مِلا جُلا ایکسپریشن تھا۔

سُپریم کورٹ جانے والے راستے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے باتونی ڈرائیور جہاں زیب نے کہا ’’یہاں پھانسی کی سزا کی تصدیق ہوتی ہے۔ میرا دوست حیدر زمان بولتا ہے کہ اس نے کراچی کا پھانسی گھاٹ دیکھا ہے! آپ نے دیکھا ہے؟‘‘

’’دیکھا ہوتا تو آج یہاں نہ ہوتا۔‘‘ میں نے کہا۔

میڈم روبینہ نے ایک جگہ کار رکوا کر کہا کہ یہ بازار دال گراں ہے۔ میں نے کہا کہ پٹھان تو دال نہیں کھاتے۔ پھر اس بازار میں کیا ہوتا ہے؟

فرمایا ''اس کا نام اصل میں بازار دل گراں ہے۔ میں نے بے ادبی سے بچنے کے لیے د اور ل کے بیچ میں الف کی پچر لگا کے دال گراں بنا دیا۔''

ذرا دیر بعد بازار مِس گراں آیا تو کہنے لگیں، اس نام کا وہ مطلب نہیں جو آپ سمجھ رہے ہوں گے!

''اور یہ آپ کی دلچسپی کی جگہ ہے، سکندر پورہ۔ یہاں آپ کے تمام امراض، یعنی ہر مرض کی دوا ملتی ہے!''

مجھے وہ دکان کہیں نظر نہ آئی جہاں کے ہنٹر بیف پر بچے ٹوٹ پڑتے تھے۔ ایک دفعہ چھوٹی بیٹی نے پشاوریوں پر رشک کیا جو اُس کے خیال میں لنچ اور ڈنر میں روٹی اور سالن کی بجائے صرف ہنٹر بیف اُڑاتے ہوں گے۔ گیا گپ! مجھے وہ دکان بھی نہیں ملی جہاں بہترین کالج پنیر بہت سستا ملتا تھا۔

میں نے روبینہ سے کہا ''عُرفی کا شعر:

عُرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کُند رزقِ گدارا

پہلی مرتبہ پشاور ہی میں نظر سے گزر کر دل میں اُتر گیا۔ جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے، کسی مسجد کی عقبی دیوار پر جلی حروف میں خوبصورت خطاطی کی گئی تھی۔ میں ان دنوں بہت پریشان تھا، اس نے بڑی ڈھارس بندھائی۔ مجھے پھر وہیں لے چلو۔''

''ایسا لگتا ہے جیسے عُرفی اور آپ کے درمیان مسجد کی دیوار حائل ہے، جس پر شعر ہی نہیں، شعر کی شرح بھی کندہ ہے!''

''اور شرحِ صدر[★1] بھی؟''

آنکھیں برابر تلاش کرتی رہیں، مگر وہ کتابوں کی دکان بھی نظر نہ آئی جہاں سے رُبع صدی قبل، بلکہ اس سے بھی پہلے ڈھیر ساری کتابیں خریدنے کے بعد جیب میں صرف ڈھائی روپے بچے اور میں دھک سے رہ گیا۔ میرے ساتھ بے حد ہنس مکھ چیف منیجر سلیم ملک بھی تھا جس نے کچھ دن بعد ٹرین کے آگے آ کر خودکشی کر لی۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں نے اِس المناک سانحے کی خبر مرحوم کے دوست نقاد و محقق

[★1] شرحِ صدر: سینہ کو کھول دینا یا کھل جانا۔ (مراد) حقیقت واضح کر دینا، نُورِ ایمان سے سینہ کو بھر دینا۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو سنائی تو اِنا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون پڑھنے سے پہلے دریافت فرمایا ''خیبر میل تھی یا کراچی ایکسپریس؟''

(۶)

تحقیق و تشکیک کا مردِ میداں

صرف تحقیق و تنقید پر موقوف نہیں، پروفیسر قاضی عبدالقدوس غیر علمی و نجی معاملات اور مسائل میں بھی اپنے رویّے اور طریق کار کو thorough ★[1] سمجھتے ہیں۔ طبعاً اور اصولاً شکّی اور وہمی واقع ہوئے ہیں۔ وہ ہر شخص کو بُرا سمجھتے ہیں تا وقتیکہ وہ خود کو اچھا ثابت نہ کر دے! جب سے وہ ترقی پا کر پروفیسر کے گریڈ میں آئے ہیں اُن کی شخصیت میں، بقول مرزا، چند بُنیادی اور ڈھانچوی تبدیلیاں رُونما بلکہ خود نُما ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اُن کی vocabulary (لفظیات) متاثر ہوئی جو سُوج پھُول کر غبارہ بن گئی۔ روز مرّہ گفتگو میں اب اتوار کو یک شنبہ، چنوں اور بیسن کو نخود، بیٹے اور پوتے کو پِسَر اور نبیرہ، جوشِ جوانی کو غلیان و جنسی تہیّجات، لطف و مہربانی کو ملاطفت، میاں بیوی کی باہمی نوک جھونک کو مُلاعنت، عام خط کو عطوفت نامہ، ہم لوگوں کو ابنائے زمانہ، ہم پیشہ اور ہم جنسوں کو زاغ و زغن اور اپنے بیوی بچّوں کو مکروہات دنیوی کہنے لگے! ۳۶ کی بجائے اب ۳۸ سائز کا بنیان پہننا شروع کر دیا ہے۔ اور دن میں دو تین دفعہ سینہ پھُلا پھُلا کر بنیان کو سینے کے برابر ثابت کرتے ہیں! اللہ جانے، کہاں تک صحیح ہے، مرزا نے تو یہ تک اُڑا دی تھی کہ باٹا کی سالانہ سیل میں ۸ نمبر کا جوتا ''ٹرائی'' کر رہے تھے کہ سیلز گرل نے یہ کہتے ہوئے جوتا پاؤں سے اُتروا لیا کہ سر، آپ کو تو سائز ۶ فِٹ آئے گا۔ چپّل کی پائداری اور چمڑے پر تو ان کی نظر نہیں گئی، البتہ اُس حسینہ کے غمزہ و ادا کا دل پر اتنا اثر ہوا کہ اُس کے بتائے ہوئے ناپ کی چپّل اور تین شُو ہارن بلا ضرورت خرید لیے۔ اور بلا ضرورت دو دفعہ ''شکریہ'' کہنے کے بعد تین دفعہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، یعنی تھینک یُو کہا!

شکّی پن، وہم اور وضعِ احتیاط میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ منہ دھونے سے پہلے ہاتھوں کو صابن سے تین دفعہ دھو کر پاک کرتے ہیں۔ پھر تین دفعہ صابن سے اپنا منہ دھونے کے بعد صابن کو تین دفعہ دھو کر پاک کرتے ہیں!

★[1] thorough: مکمل۔ بھرپور۔ بلا کم و کاست۔ احتیاط و استیعاب کے ساتھ انجام دیا ہوا ___ اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری۔

۲۔ ان کے والد اور بڑے بھائی کو لقوہ ہوا تھا جس سے منہ ٹیڑھا اور آنکھ دب گئی۔ ایک ڈاکٹر نے ان کو خبردار کیا کہ یہ مرض genetic یعنی موروثی ہو سکتا ہے۔ آپ کے کیس میں قوی امکان ہے۔ یہ سن کر انہیں زندگی میں پہلی بار اپنے شجرۂ نسب پر سخت غصہ آیا۔ دل میں ایسی دہشت بیٹھی کہ اب صبح آنکھ کھلتے ہی آئینہ ضرور دیکھتے ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ سوتے میں لقوے سے منہ موروثی تو نہیں ہو گیا۔

۳۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد کار روک کر اپنا اطمینان کر لیتے ہیں کہ کوئی کار لِفٹر یا اغوا (برائے تاوان) کرنے والا گینگ ان کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ وہ اپنے سے زیادہ ہر تندرست آدمی کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں!

۴۔ گزشتہ برس چھ ماہ تک سُوئے ہضم اور اسہال میں مبتلا رہے۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ جو کچھ کھائیں، بہت دیر تک خوب چبا چبا کر کھائیں۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ وہ امرُود ہمیشہ سے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ایک حکیم نے بھی امرُود کے یہ مُتضاد خواص بتلائے کہ اس کا گُودا قبض کرتا ہے، جب کہ بیج ہاضم ہوتے ہیں، بشرطیکہ سالم نہ نگلے جائیں۔ پہلے فصلی اور قدرے ہرے امرُود دن میں تین چار نوش جان ہو جاتے تھے۔ اب یہ ممکن نہ رہا، اس لیے کہ ایک ایک بیج کو ''فرداً فرداً'' چبا چبا کر بلکہ پیس پیس کر سرمہ کرنا پڑتا ہے۔ گویا دانے دانے پر مُہر دنداں لگانی پڑتی ہے! اس طرح ایک بیج بھرے امرُود کو اس کے انجام تک پہنچانے میں کم از کم آدھا گھنٹہ لگ جاتا ہے!

یار لوگ ان کی طولانی گفتگو سے عاجز تھے۔ انہوں نے بڑے غور و خوض کے بعد اس کا یہ توڑ نکالا کہ جیسے ہی وہ تشریف لاتے، ملیر اور لاڑکانے کے امرُود یا قندھاری انار پیش کر دیتے۔ ہر دانے کی منہ سے فمِ معدہ تک ترسیل میں جبڑا اتنا اکڑ اور دانت اتنے اَمَل جاتے کہ ہُوں ہاں کرنے کے بھی لائق نہ رہتے! چنے، بھٹے، حلوہ سوہن اور گیہوں کے دانے دار دَلیے سے بھی پرہیز کرنے لگے!

چند روز بعد جلیبی کھانا اور جھوٹ بولنا بھی چھوڑ دیا ان دونوں کا شمار ترک لذات میں کرتے ہیں! اور لذّات کو حظوظ کہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا، یہ کیا بلا ہے؟ بولے حظ کی جمع! بمعنی مزے۔

۵۔ تین ماہ قبل ایک لیکچرر کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے تھیسیس میں سرقے کی پاداش میں برخاست کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے نے ان کے شکّی پن میں اس حد تک اضافہ کر دیا کہ بعض اوقات اپنے ہی کسی فقرے پر پھڑک اُٹھتے ہیں تو فوراً quotations کی کتاب اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ کہیں

شیکسپیئر یا مارک ٹوین کو توارد تو نہیں ہوا۔ ممکن ہے وہی نکتہ ان نابغوں کے ذہن میں بھی اتفاقاً آ گیا ہو! اپنے شک کو درست پا کر وہ خود کو بہت فتح مند محسوس کرتے ہیں!

شیکسپیئر کے بارے میں مرزا کہتے ہیں کہ اس ظالم نے کہنے کی ہر بات ایسے کہہ دی ہے کہ اب کہنے کو کچھ رہا نہیں۔

۶۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بینک میں چیک کیش کرانے کے بعد کاؤنٹر پر نہ صرف نوٹوں کو تھوک لگا کر دونوں طرف سے گنتے ہیں، بلکہ ہر ایک پر گورنر اسٹیٹ بینک کے دستخط بھی چیک کرتے جاتے ہیں۔ اپنا اطمینان کرنے کے بعد نوٹوں کی گڈّی اپنے خانساماں کو تھما دیتے جسے اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ وہ یہ کیش اپنے نیفے میں اُڑس کر بس سے بحفاظت تمام گھر پہنچا دیتا تھا۔ یہ چالاکی ڈاکوؤں اور جیب کتروں کو چکمہ دینے اور ان کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لیے کرتے تھے۔ یہ بدمعاش موٹی اسامی کی تاک میں بینکوں کے اطراف منڈلاتے رہتے ہیں۔ انہیں تنخواہ ملنے کی اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ان چور اُچکوں کو غچّا دینے میں محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ بریف کیس میں رقم کی بجائے اپنے نامکمل تھیسس کا مسوّدہ رکھتے تھے جو چور ڈاکو کے کسی کام کا نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ان کے اپنے کام کا بھی نہ تھا! اس کے نامکمل رہنے کی پندرہ بیس معقول وجہیں تھیں، جن میں ایک یہ بھی تھی کہ جو ادیب اس کا موضوع تھا اُس کی وفات کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس کا کچّا چٹھا اور کچھ ایسے رازہائے سربستہ بیان کرنا چاہتے تھے جو اس کی زندگی میں اس لیے افشا نہیں کر سکتے تھے کہ وہ موذی بھی ان کے رازہائے پنہاں سے بخوبی واقف تھا کیوں کہ ان حرکتوں میں دونوں برابر کے شریک رہے تھے۔ انتظار کرتے کرتے دس برس ہونے کو آئے مگر وہ مر کے نہیں دے رہا! اُلٹا اپنا یہ حال ہو گیا کہ صحت میں، بقول خود، گہری دراڑیں پڑ گئیں! ایک دراڑ میں جھانکنے کا ہمیں بھی اتفاق ہوا۔ گہرائی میں ایک خوبصورت لیڈی ڈاکٹر دِکھلائی پڑی جس سے ڈپریشن کا علاج کرا کر وہ ایک نیا دردِ سر مول لے رہے تھے۔ شروع میں تو ہم یہی سمجھے کہ کوئی نسوانی مرض لاحق ہو گیا ہے جسے وہ مردوں سے چھپانا چاہتے ہیں۔ نئے پُرانے دونوں ہی مرض ایک جیسے نکلے۔ مطلب یہ کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

ہاں، یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اگست کی پہلی تاریخ کو وہ خانساماں ساری نقدی نیفے میں اُڑس

کر بینک سے چلا تو ۲۲ نمبر بس صدر میں بدل کر ایئر کنڈیشنڈ بس سے بحفاظت تمام اپنے گاؤں پہنچا اور نیفے کی تہ سے خزینہ برآمد کیا۔ نوٹوں کو تھوک لگا کر دونوں طرف سے گنا اور دونوں دفعہ غلط گنا۔ پروفیسر موصوف نے تین دن تک رقم اور حامل رقم کی واپسی کا انتظار کیا۔ چوتھے دن اپنا بریف کیس، تھیسس سمیت، جھلاتے ہوئے خانساماں کے اغواء کی FIR درج کرانے تھانے پہنچے۔ تین ماہ بعد پولیس ملزم کو گرفتار کر کے کراچی لے آئی۔ دوران تفتیش اس نے بیان کیا کہ "میں غریب، بال بچے دار آدمی ہوں۔ میرا تعلق ایک عزت دار گھرانے سے ہے۔ میں تو گاؤں سے بالکل معصوم اور اللہ کی گائے بلکہ گاؤدی آیا تھا۔ آپ کو خدا کی قسم پر یقین نہ آئے تو میں اپنے بچوں کی قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ سارا حرامی پن کیا نام کہ کراچی میں ہی سیکھا! یہ ترکیب خاص طور سے مجھے صاب کے چوکیدار نے سکھائی۔ بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ وہ بندہ آج بھی صاب کے گھر کی چوکیداری چوکسائی کر رہا ہے۔ چوری کی رقم سے اس کو تین ہزار روپے کی مشورہ فیس بذریعہ منی آرڈر گھر پہنچتے ہی بھیج دی تھی۔ کسی کا حق مارنا کیا نام کہ سؤر برابر سمجھتا ہوں۔ ساری رقم قریباً عنقریباً میں نے اپنی ماں کے جگر کے علاج (ہیپاٹائٹز) میں خرچ کر دی۔ اُس کی پیٹھ میں ایک ایک اُنگل گہرے زخم ہو گئے تھے جن کی بُو سے گھر والے پریشان تھے۔ علاج سے جو رقم بچی وہ کفن دفن اور چالیسویں کے کارِ ثواب میں خرچ کر دی۔ خود پر ایک پیسہ بھی خرچا ہو تو کیا نام کہ سؤر برابر! صاب سے میں نے رگو گڑا کے تین ہزار روپے مانگے تھے جس پر انہوں نے خوب ڈانٹ پلائی کہ تم لوگ فضول خرچ ہو۔ اپنا خرچ اپنی آمدنی کے اندر نہیں رکھتے۔"

یہ اور بات کہ اُس نے تنگ آ کر اپنا خرچ اپنی آمدنی کے اندر رکھنے کی بجائے کیا نام کہ اپنی میانی ★ اور نیفے کے اندر رکھ لیا!

پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے چوکیدار سے تین ہزار روپے، پھاٹک کی چابی، ٹارچ، لاٹھی، لوٹا اور اسٹول تو اسی وقت دھروا لیے۔ بقیہ رقم کے بارے میں ڈھنڈورا پیٹنے لگے کہ میں اسے جان و مال کی زکوٰۃ سمجھ کر معاف کرتا ہوں! اس پر ایک منہ لگے شاگرد نے ٹوکا کہ سر! جو رقم چور یا ڈاکو زورا زوری سے ہتھیا لے اُس کا شمار زکوٰۃ شکاۃ میں نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر عبدالقدوس کو طیش آ گیا۔ فرمایا "ابے مُفتی کے بچے! میں تو اپنے دل کو سمجھا رہا ہوں۔ تو مجھے فقہ کا مسئلہ سمجھانے بیٹھ گیا!"

★ میانی: "پاجامے کا وہ کپڑا جسے دونوں پائچوں کے بیچ میں سی دیتے ہیں۔ رُومالی۔ زمیندار پاجامے میں میانی نہیں لگاتے ہیں۔" اردو لغت

اب ہر شخص خود کو زمیندار سمجھتا ہے۔ میانی نہیں لگاتا!

میانی کے ذکر پر یاد آیا کہ ٹونک (راجستھان) میں جہاں میرا بچپن گزرا (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء) گھر میں چار روپے ماہوار پر روٹی پکانے والی ایک غریب نوکرانی کو چوری کی دو روٹیاں بلکہ ٹکڑ★[1] میانی میں چھپا کر لے جاتے ہوئے ہمارے ہی ایک چوکس اور وفادار ملازم ابراہیم نے رنگے ہاتھوں پکڑا۔ اُس نے پہلے تو بُڑھیا کو وہ گالی دی جو صرف مردوں کو دی جاتی ہے۔ پھر کہا کہ "ٹکڑ خور★[2]، ٹکیا چوٹی★[3]! تو جس ہانڈی میں کھاتی ہے اُسی میں چھید کرتی ہے! سُور کھاتی ہے۔" ڈرانے دھمکانے پر بڑھیا نے قبولا کہ میں دو روٹیاں اسی طرح اپنی اپاہج (پولیو زدہ) بیٹی کے لیے چھپا کر لے جاتی ہوں۔ ابراہیم نے دونوں روٹیاں وہیں دھروالیں۔ اُس کی اپنی پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔ بیوہ بہن کے سات بچے ان کے علاوہ۔ اکثر خود کو وہی گالی دے کر کہتا تھا "۱۹ جنوں کا بھُوکا ٹَبر اور میں (وہی گالی) اِکلا کمانے والا! آخر کے تیئیں کتنے پیٹ کب تلک بھرے گا۔ حال فی الحال شاباش ہے تیرے حوصلے کو میرے شیر! کمائے جا، ٹھُسائے جائے۔"

اَسّی برس بعد اب کیسے اور کس منہ سے بتاؤں کہ سَرقہ و سزا اور مالِ مسروقہ کی بازیابی کے اس مقدمے میں کون کون لائقِ تعزیر تھا!

(۷)

Dirty Old Man

میں نے میڈم سے کہا، مجھے Dean`s Hotel لے چلیں۔ جُگ بیت گئے۔ اُس کا Cabaret نہیں دیکھا۔

بولیں "اب وہاں کوئی کیبرے شیبرے نہیں ہوتا۔ یہ سب جیب اور پیٹ بھرے لوگوں کے چاؤ چونچلے ہیں۔ اب وہاں شریفانہ محفلیں، سنجیدہ functions اور سیمینار ہوتے ہیں۔"

"سنو۔ فنا نظامی کانپوری ایک غیر معروف سا شاعر ہو گزرا ہے۔ ظالم نے کیسا شعر کہا ہے:

یہ عمارت اک عبادت گاہ ہے!
اس جگہ اک میکدہ تھا، کیا ہوا؟"

میں اُس زمانے میں بارہا اِس ہوٹل میں ٹھہرا جب رات کو cabaret کے جگمگے تھے۔ آرکسٹرا

★[1] ٹکڑ: "ہاتھیوں کے کھانے کا روٹ۔" اردو لغت۔

★[2] ٹکڑ خور: "وہ شخص جو روٹی کے ٹکڑوں پر گزارہ کرے، طفیلیہ؛ ملازم؛ خادم" (جامع اللغات)

★[3] ٹکیا چوٹی: روٹی چُرانے والی خادمہ۔

کا کنڈکٹر ایک اُدھیڑ عمر کا گنجا گوانیز تھا جو دُہرا بلکہ تہرا ہو ہو جاتا تھا۔ بائی دی وے، انگلش ڈکشنری کیبرے کو فرنچ لفظ cabanaret (جھونپڑی) کا مشتق قرار دیتی ہے، جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ سردار کریم نواز مرحوم (سابق کمشنر) کہتے تھے کہ تاریخی، لُغوی اور صوتی اعتبار سے ''کیبرے'' اپنے خرابات ★[1] کی خرابی یعنی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بہرکیف، کہہ میں یہ رہا تھا کہ ڈنر کے بعد میں اکثر میز پر تنہا ٹُرّوں ٹُوں بیٹھا اپنے ہم عمر جوڑوں کو ڈانس کرتے دیکھا کرتا تھا۔ تربیلا ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں غیر ملکی انجینئرز ہوٹل میں بکثرت نظر آتے تھے۔ ان کو ''کمپنی دینے'' (دُسراتھ) کے لیے پاکستان بھر سے اینگلو انڈین لڑکیاں کھنچ کر پشاور آ گئی تھیں۔ انہیں ستاروں بھری رات کا ذکر ہے۔ ایک غیر معمولی حسین لڑکی ایک عُمر رسیدہ انجینئر کے ساتھ tango رقص کر رہی تھی۔ بڈّھے کی بے طاقتی اُس کی ہوس پر غالب آئی اور وہ دونوں کٹ کر ایک نیم تاریک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ ذرا دیر بعد وہ جھڑوس ہانپتا کانپتا دفعان ہوا۔ اور میرے دیدہ و دل کو قرار آیا۔ لڑکی نزدیک ترین میز یعنی میری اُجاڑ میز پر آن بیٹھی۔ میں نے پوچھا، کچھ پیوگی؟ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اشارے سے اسٹیورڈ کو بلایا اور کہا کہ اِن کے لیے وائن لاؤ۔

لڑکی نے گھنے سنہری بالوں والا سر ہلاتے ہوئے کہا ''A double scotch'' پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''وائن تو بڈّھوں اور حاملہ عورتوں کا ڈرنک ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا: چچاؤں اور زچاؤں کی چُسکی اور اَچھوانی ہے!

ایک ہی سانس میں پورا گلاس ڈکوسنے کے بعد اس نے بلا تکلف وہسکی کا بڑا پیگ آرڈر کیا۔ دُسراتھ کی خاطر میں اپنے لالوں لال جُوس ٹماٹو کا دوسرا گلاس آرڈر کرنے سے قاصر تھا، اس لیے کہ Men بہت دور تھا۔ تیسرے پیگ کے بعد وہ بہکنے لگی: ''آپ تمام وقت آنکھیں پھاڑے dancing couples کو گھورتے رہے۔ اس کا شمار good manners میں نہیں ہوتا۔ آؤ۔ تھوڑی دیر میرے ساتھ ڈانس کر کے اپنا لبدھڑ اور کسیلا ٹماٹو جُوس ہضم کرو۔'' میں نے جھینپ کر معذرت کی ''سوری۔ مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔ فی الحال صرف دیکھنا اور گھورنا آتا ہے۔ W.H.Davies کہتا ہے:

> What is this life if, full of care.
> We have no time to stand and stare.

خوب یاد آیا، ڈانس کے بارے میں برنرڈ شا (Bernard Shaw) نے کیسی پتے کی بات کہہ دی:

★[1] خرابات: شراب خانہ، میخانہ، قمار خانہ، فحاشی کا اڈا، بُت خانہ

Dancing is perpendicular expression of a horizontal desire.''

کھلاڑن نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں نے کسی غبی یا رَٹا لگانے والے انڈر گریجویٹ کی طرح جُگالی کی ہو! وہ بدحَظ ہو کر کچھ کہے سنے بغیر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا اسکرٹ اُس زمانے کے فیشن کے مطابق ایک طرف سے چاک (slit) تھا۔ مجھے اس کی ران پر ایک نیل نظر آیا۔ یقیناً یہ اس کھوسٹ کے ڈینچر سے پڑا ہوگا، میں نے خود کو باور کرایا اور اُس بڈھے ٹھرکی تھر کوے پر دل ہی دل میں لعنت بھیجتا رہا! Dirty Old Man

اپنی ۸۰ ویں سالگرہ پر میں نے مرزا کو یہ قصہ ایک بار پھر سنایا تو کہنے لگے ''اب اُس جیسی کوئی حسینہ تمہارا ہاتھ پکڑ کے ڈانس کرنے کو کہے تو کیا ڈانس کرو گے؟

''اب ضرور کروں گا...... بشرطیکہ تم کسی قریبی اُجاڑ میز پر ٹُنڈروں ٹُوں بیٹھے رشک و حسد کی آگ میں جھلستے بھُلستے، Davies کی لائنز کا ورد کرتے رہو۔''

پلٹ کر بولے ''اگر میں وہ لڑکی ہوتا تو تمہارے recitation کی شاباشی دیتے ہوئے، انعام میں ایک lollipop، چڑیاں مارنے کے لیے ایک غلیل، نرسری رہائمز کی کتاب اور اُس بڈھے ٹھڈے ٹھرکی کی تصویر ضرور دیتا/ دیتی کہ اسے سرہانے رکھا کرو۔ سویٹ ڈریمز آئیں گے۔''

مرزا نے اس پر بھی بس نہیں کیا۔ رگیدتے چلے گئے۔ ''یارا، دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ، مگر مختصراً، کہ اب اس عمر میں حسین و جمیل لڑکی کو دیکھ کر کیا محسوس کرتے ہو؟ مختصراً''

''خود کو لڑکا محسوس کرتا ہوں، مختصراً!''

''واقعی؟ کمال کرتے ہو! مختصراً ہی سہی۔''

W.B.Yeats ذاتی طور پر مجھے ایلیٹ (Eliot) سے بھی زیادہ پسند ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی عین عالمِ پیری میں ظالم کیا کہہ گیا ہے:

"---lust and rage dance attendance on my old age."

اور بیتے دنوں کی دھیان دھول میں اٹا ایک عمر رسیدہ مسافر کوچۂ یاد آوراں میں ٹلکتا ٹلکتا بھٹک کر بند گلی میں جانکلا۔

ساتویں خندق

بہت ڈھونڈا مگر وہ دکان کہیں نظر نہ آئی جس کے جوان اور ذہین مالک کے ساتھ بینکر کسٹمر تعلق بہت جلد دوستی کے درجے پر پہنچ گیا۔ یہ جوانِ رعنا اصلاً پوٹھوہاری تھا اور ایک پردہ نشین پٹھان لڑکی کی

محبت میں گلے گلے ڈوبا تھا۔ انگریزی میں شاعری کرتا، مگر سوچتا اردو میں اور محسوس پوٹھوہاری میں کرتا تھا! ہر نظم کی مخاطب اور موضوع وہی لڑکی ہوتی تھی۔ ایک شام ڈینز ہوٹل (Dean's Hotel) میں، میں نے اس جوان سے کہا کہ عزیزِ من، تمہارے اور محبوبہ کے درمیان تو اکٹھی چھ خندقیں حائل ہیں! انہیں کیسے پھلانگو گے؟ چھؤں کی چھؤں P سے شروع ہوتی ہیں!

''وہ کیا ہیں؟''

''پوٹھوہار، پشتو، پنجابی، پردہ، parents اور انگلش پوئٹری!''

''اوہ! ان خندقوں کی موجودگی کا علم تو مجھے اس وقت ہوا جب ایک ہی جست میں انہیں پار کر چکا تھا! آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔''

''مگر وہ غریب iambic pentameter میں لکھی تمہاری نظمیں جو تم نے بلیک کافی اور اسمگل شدہ Dunhill سگرٹیں پی پی کر لکھی ہیں کیسے سمجھ سکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

بولا ''love poems تو صرف اپنے آپ کو سنانے، اپنے آپ سے داد وصول کر کے، بے اختیار اپنے آپ سے لپٹ جانے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے نہیں لکھی جاتیں کہ محبوبہ انہیں باتھ رُوم میں گنگنائے یا اپنے والدِ بزرگوار کو ترنم سے سُنا کر مار کھائے۔ آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا کہ Swinburne نے وصیت کی تھی کہ اس کی تمام نظموں کا مسوّدہ اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ یہ نہیں کہا کہ مِس فلاں بنت فلاں کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر دیا جائے۔ معاف کیجیے، رات آپ کے ڈنر میں مرچوں کا سالن اور کباب کھائے۔ ہاضمہ اور حافظہ دونوں اپ سیٹ ہیں۔ یاد آیا وہ شاعر Rossetti تھا۔ شاید۔''

میں جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن چلا گیا اور اس عاشقِ صادق اور شاعرِ خوش نوا سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ بارہ برس بعد دسمبر ۱۹۹۰ء میں لوٹا تو سنا کہ اس جوان کو رخصت ہوئے تو مدتیں ہوئیں۔ کسی نے کہا، ہارٹ فیل ہوا۔ کسی نے کہا، مٹھی بھر سونے کی گولیاں کھا کے ایسا سویا کہ پھر نہ اٹھا۔

وہ جوان ساتویں خندق بھی ایک جَست میں پھلانگ گیا!

ے جو ہچکچا کے رہ گیا، وہ رہ گیا اِدھر
جس نے لگائی جَست وہ خندق کے پار تھا

میرے دل کا آپریشن ہو چکا ہے۔ مجھے تو اُس گلی تک جانے کا بھی حوصلہ نہ ہوا جہاں ایک دفعہ اُس نے لڑکی کے مکان کی طرف شرماتے ہوئے اُنگلی سے اشارہ کر کے ہاتھ جیب میں رکھ لیا تھا۔

ے کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا!

کھوئے ہوئے کی جستجو

میں نے پرانے لینڈ مارک، پرانے دکاندار، شناسا چہرے، پرانی ہمہ ہمی، جانی پہچانی مہکار چہکار اور سَمے کی جوت سے دمکتا سماں بہت ڈھونڈا۔ کہیں نہ پایا۔ پھر یہ سوچ کر تلاش کی کہ یارا جی، تم تو بھرے میلے میں دراصل اپنے آپ کو تلاش کرتے پھر رہے ہو! اُس اپنے آپ، خواب اور سراب کو جسے نصف صدی قبل دیکھا اور جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ وہ اب کہاں۔ تم لینڈ مارکس نہیں تلاش کر رہے، ریگِ رواں میں اپنے ہی پگ مارکس ★ کا کھوج لگا رہے ہو! ہَوا جب ان کا اُڑا لے گئی نشاں اک ایک۔ ان راہوں سے کیسے کیسے سکندر، صاحبقراں اور نادر شاہ گزرے ہیں۔ ذرا آنکھ اُٹھا کے دیکھو تو سہی۔ اطرافِ مرگلہ و ٹیکسلا میں اشوک کے استوپا اور پشاور میں قصہ خوانی وہیں کے وہیں اور وہی کے وہی ہیں! قصہ خوانی بازار نہیں بدلا۔ تم خود قصہ کہانی ہوا چاہتے ہو! سمجھا کرو، میری جان۔

(۸)

لذتِ آوارگی اور ایلس کی بلی

معاف کیجئے، میں ایک بار پھر پٹری سے اُتر گیا۔ مرزا کہتے ہیں کہ تمہارا انجن چڑھائی، کچے اور دلدل میں زیادہ تیز دوڑتا ہے! digression (موضوع سے گریزاں۔ آوارہ قلمی) اب تمہارے طرزِ تحریر کا ٹریڈ مارک بن گئی ہے۔'' میرے عزیز دوست ابن حسن برنی کہا کرتے تھے: ''عنوان اور موضوع کچھ بھی ہو، آپ تو اُسے ایک کھونٹی کی طرح استعمال کرتے ہیں، جس پر دُنیا بھر کی شیروانیاں ٹانگتے چلے جاتے ہیں۔ چند روز بعد الگنی کی ضرورت پڑے گی!'' برنی صاحب علی گڑھ کے اقبال مند فرزند و شیدائی تھے۔ شیروانی کے بغیر کسی علیگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ۲۷ برس پاکستان میں اور تیرہ برس لندن میں رہے۔ علی گڑھ سے جدائی کے ۴۰ برس بنتے ہیں تو بنا کریں۔ شیروانی ہمیشہ اُسی کاٹ کی اور اُسی دُکان کی سِلی ہوئی پہنی۔ رشک اس پر آتا تھا کہ ناپ بھی وہی رہا، جب کہ بقول مرزا، ہماشما کے تو سر اور جوتوں تک کا سائز سُکڑ جاتا ہے! جامہ زیب تھے۔ میں نے جب ان پر مضمون لکھا تو ان کی شیروانی سب سے الگ بلند و بالا کھونٹی پر ٹانگی۔ اب وہی وہ نظر آتی ہے بلکہ مضمون بھی اُسی درزی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے!

★ پگ مارکس: شکاریوں اور کھوجیوں کی اصطلاح۔۔ ہرن، شیر اور درندوں کے پیروں کے نشان جن سے کھوج لگایا جاتا ہے کہ وہ کدھر گئے۔ کہاں زد پر آئیں گے اور دھائیں کی گونج کے ساتھ ڈمیکی کھا کے ڈھیر ہو جائیں گے۔

جہاں تک پٹڑی سے اُترنے کا سوال ہے تو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جس چٹورے کو بارہ مسالے ★[1] کی چاٹ کا چسکا پڑ جائے تو اسے من و سلویٰ اور caviar بے مزہ اور پھیکا سیٹھا لگے گا۔ دراصل کھانے میں مزہ اور سواد مسالوں سے نہیں، بھوک سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح گم گشتہ راہ ایک بار لذت آوارگی سے آشنا ہو جائے تو پھر سیدھی سڑک پر نہیں چل سکتا۔ جادہ و منزل کی قید سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے!

وضاحتاً ایلس کی بلّی کو اپنی کُمک پر بلانا پڑے گا۔ ایلس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کدھر جائے۔ اُس نے دیکھا کہ نزدیک ہی ایک درخت کے گُدّے پر Cheshire Cat ٹنگی ہے۔ ایلس نے اُس سے پوچھا:

"Would you tell me, please, which way I ought to go from here?"

"That depends a good deal on where you want to get to," said the Cat.

"I don't much care where---" said Alice.

"Then it doesn't matter which way you go", said the Cat.

"____ so long as I get somewhere," Alice added as an explanation.

"Oh, you're sure to do that," said the Cat, "if you only walk long enough."

اِس کو ہمارا بھی روڈ میپ تصور کیجیے۔ عذر معذرت اب اس لیے بھی بے صرفہ اور خارجہ المیعاد ہوگئی کہ ہم نہ شرمندہ ہیں، نہ خضر کے متلاشی و محتاج۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خسرو کے شعر میں اگر "کوئے بُتاں" کی بجائے "کوئے زِیاں" پڑھنے کی اجازت مل جائے تو نہ صرف ہماری دُعا اور اِدّعا کی ترجمانی ہوگی بلکہ اِعادۂ آوارگی کی تمنا کا اعلان بھی ہوگا:

؎ گر اے زاہد دُعائے خیر می گوئی مرا ایں گو
کہ ایں آوارۂ کُوئے زِیاں آوارہ ترباد

★[1] بارہ مسالے: ۱ زیرہ سفید، ۲ زیرہ سیاہ، ۳ پودینہ، ۴ الائچی، ۵۔ مرچ سیاہ، ۶ سونف، ۷ نمک، ۸ دھنیا، ۹ ہلدی، ۱۰ ادرک، ۱۱ کلونجی، ۱۲ اجوائن۔

قابلِ غور بات یہ کہ pizza، noodles، McDonalds کے burger اور KFC کی chicken میں ان بارہ مسالوں میں سے صرف نمک استعمال ہوتا ہے! پھر، بقول مرزا، نئی اور پرانی نسل کا قارورہ ملے تو کیوں کر ملے!

(۹)

ظہور احمد اعوان: ''سِرِّ دلبراں'' سے شیوۂ دلدادگان تک

پروفیسر ظہور احمد اعوان کا شکریہ اور ذکرِ جمیل اس لیے بھی ایک نہایت خوشگوار فریضہ کا درجہ رکھتا ہے کہ میں ان کی خاکہ نگاری کا دل سے معترف اور قتیل ہوں۔ ان کے خاکوں اور یادوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کا نوٹس معروف اور تُند جبیں نقادوں نے حسب معمول نہیں لیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران برما کو Forgotten Front (فراموش کردہ محاذ جنگ) کہا جاتا تھا۔ کسی کو مطعون کرنا یا طیش دلانا مقصود نہیں، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا فرنٹیئر (خیبر پختون خوا) اردو کا Forgotten Front ہے! اعوان صاحب پورٹریٹ میں سیاہ رنگ استعمال کرنے میں ذرا نہیں ہچکچاتے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اوّل تا آخر سفید رنگ صرف خالی صفحے، lily، کفن اور nun کی habit (راہبانہ لباس) کا ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زندہ اور جیتے جاگتے انسان کی تصویر سیاہی کے بغیر فقط سفید رنگ یا رنگوں سے نہیں بنائی جا سکتی۔ مرزا بیدل نے تو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کھُل کر کہہ دیا:

تصویرِ حُسن و قُبح جہاں تا کشیدہ اند
بر رنگ دیدہ اند مقدّم زُگال را

(جب بھی دنیا کے حسن و قبح کی تصویر کھینچی گئی ہے، رنگ پر سیاہی کو مقدم پایا گیا ہے۔ ترجمہ۔ افضال احمد سیّد۔)

ہر اچھے آرٹسٹ کی طرح وہ سیاہ رنگ میں برش ڈبونے سے پہلے اپنے palette اور پیالی میں بہت سارا پیار گھول دیتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی خوبی یہ ہے وہ سِرِّ دلبراں کے ساتھ ساتھ شیوۂ دلدادگان کی جھلک بھی دکھلا دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے ممدوح کی ذات و صفات کے تمام پہلوؤں کو قابلِ رشک اختصار، Judicial impartiality (عدالتی غیر جانبداری یا معدِلت گسترانہ) اور بے خوفی سے چند صفحوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ ان کا قلم کسی رُو رعایت، ڈپلومیٹک ابہام اور under-statement (کسر بیانی) کا قائل نہیں۔ اپنے لکھے پر معذرت خواہ ہوتا ہے نہ کسی کے ردِّ عمل سے خوف زدہ۔ پروفیسر نذیر تبسّم سے ظہور صاحب کا دوستانہ اور پیشہ ورانہ تعلّق کم و بیش تیس برسوں پر محیط ہے۔ ان پر جو مضمون واقعی جی اور دیدہ لگا کے لکھا ہے، اس کا شمار ان کے بہترین

خاکوں میں ہوگا۔

بقول مرزا، یہ امر بھی باعثِ حیرت، غیرت و مسرت ہے کہ اس خاکے کی اشاعت کے بعد مدّاح اور ممدوح کے باہمی اخلاص، بول چال، میل ملاقات، محبت و مودّت۔ حد یہ کہ ممدوح کی ملازمت تک پر آنچ نہ آئی۔

میں نے گزشتہ بیس پچیس برسوں میں ان سے زیادہ کٹیلے، بے لاگ، بیباک، رنگا رنگ اور دلچسپ خاکے نہیں پڑھے۔ مجھے اس کا رنج ضرور ہے کہ ''سرِّ دلبراں'' کو کوئی انعام، کوئی ایوارڈ نہیں ملا، لیکن تعجب نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس نے ''سرِّ دلبراں'' نہیں پڑھی، اُس نے گویا خود کو ایک رنگا رنگ، خوبصورت اور خیال انگیز پورٹریٹ گیلری میں جانے سے محروم رکھا۔

(۱۰)

آنسوؤں کی شہزادی اور ہنسی کی سرگم

روبینہ پروفیسر ظہور احمد صاحب کی با قاعدہ شاگرد رہی ہیں۔ اور بارہ تیرہ برسوں سے شعبۂ اردو میں ان کی ''ہمکار'' بھی ہیں۔ وہ انہیں بیٹی کہتے اور بزرگانہ شفقت سے پیش آتے ہیں۔

ظہور صاحب نے اپنی شاگرد اور ساتھی پر ایک نہایت دلچسپ اور خوبصورت مضمون نما خاکہ بعنوان ''آنسوؤں کی شہزادی'' لکھا ہے، جس سے میں نے کُھل کر استفادہ کیا ہے۔ اس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

''روبینہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ رو رہی تھی۔ اس کے بعد اس کا چہرہ جب بھی سامنے آتا ہے موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں ڈل ڈل کرتے آنسو ہی نظر آتے ہیں۔ اسے ویسے بھی رونا بہت زیادہ آتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ عورت ہے بلکہ اس لیے کہ وہ روبینہ ہے جو باہر سے صحیح سلامت مگر اندر سے کرچی کرچی ہے۔ خوش خصال مگر زخمی زخمی۔''

اگلے صفحے پر لکھتے ہیں ''روبینہ میرے کمرے میں بیٹھی بلاوجہ رو رہی تھی۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔'' گستاخی معاف، میں بلاوجہ رونے رُلانے کے duet کا یہ منظر یعنی دوگانہ و دوگونہ گریہء بے سبب دیکھتا تو بوجوہ ہنسی چھوٹ جاتی۔ روبینہ سے جب میری پہلی ملاقات ۱۹۹۶ء میں ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر بلاوجہ آبدیدہ نہیں ہوئیں، بلکہ ایسے کِھلکِھلا کے ہنسیں کہ مجھے اپنی شکل و صورت کے بارے میں

طرح طرح کے شبہات ہونے لگے۔ میں نے تو روبینہ کو کبھی روتے یا مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہنستے ہی دیکھا ہے۔ ایسی ہنسی میں کنوار پنے کی بے ساختہ کھِکھلاہٹ اور جولانی زور دکھاتی ہے، جو شفاف اور خالص ہنسی کی پہچان ہے۔ یہ سنگلاخ چٹان کی دراڑ سے جھانکتی ہوئی کونپل کی طرح پھوٹتی ہے۔ اس کی محرک نہ کوئی مضحک صورتِ حال ہوتی ہے نہ ہدف۔ یہ قطعی ضروری نہیں کہ ایسی ہنسی کسی کے گر پڑنے، بوکھلاہٹ، حماقت، مسخرگی یا بوالعجبی پر آئے۔ کوئی انٹلکچول (intellectual)، یاسیت پسند، کینہ پرور، منتقم مزاج اور cynic (کلبیت زدہ) ایسی بے ساختہ و بے ضرر ہنسی نہیں ہنس سکتا جو بس آتی ہے تو آتی چلی جاتی ہے۔ اس کا سبب فطری چونچالی، جولانی اور سن و سال کا اُچھال ہوتا ہے بقول مرزا، جوانی، جولانی، پانی اور پیسہ اپنا راستہ آپ بنا لیتے ہیں۔ روکے نہیں رُکتے۔ انگریزی شاعر Auden کے حوالے سے کسی نے ہنسی کے بارے میں کیسی صاف، سجل اور کانٹا تول بات کہی ہے:

> "People sometimes divide others into those you laugh at and those you laugh with.The young Auden was someone you could laugh-at-with."

مطلب یہ کہ لوگ بعض اوقات دوسروں کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی وہ جن پر آپ ہنستے ہیں اور وہ جن کے ساتھ آپ ہنستے ہیں۔ جوانی میں Auden ایسا تھا کہ آپ اُس پر، اُسی کے ساتھ ہنس سکتے تھے۔

ہنسی کی دو سے زیادہ قسمیں، سات سے زیادہ سُر، اَن گِنت استھائی اور بے انت انترے ہوتے ہیں۔ موقع و محل، ''روزِ ابر و شبِ ماہتاب'' کی قید نہیں۔ ہنسنے والا بات بے بات ہنسے چلا جاتا ہے۔ پھر جب دُنیا کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے تو نہ ہنسی آتی ہے نہ رونا۔ بس چُپ سی لگ جاتی ہے۔ پھر بھوگی، سوگی اور گُن گاہک آپی آپ جوگی اور دھیانی گیانی کا بَرن لے کے پتھر سمان مون اور شانت ہو جاتے ہیں۔ شانتی، شانتی، شانتی!

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے فسانہ ''دہر'' ★[1]
سمجھ میں آنے لگا جب تو کچھ سُنا نہ گیا
(یگانہ)

دیکھنے والے کو بیکل کرنے والی ایک وہ انگ ترنگ ہنسی ہے جس کی تصویر کسی مَن چلے چتر کار

★[1] فسانہ درد کی بجائے فسانۂ دہر تحریف ہے۔

نے چوپئی میں کھینچ کے رکھ دی ہے:

ے جات ہتی اک نار اکیلی، سو بیچ بجار بھیو مجرائے
آپ ہنسی، کچھو نین ہنسے، کچھو نین بیچ ہنسو کجرائے
ہار کے بیچ ہمیل ہنسی، باجو بندن بیچ ہنسو گجرائے
بھویں مرور کے ایسی ہنسی جیسے چندر کو داب چلے بدرائے

ہمیں بھی یہ چوپئی بہت پسند ہے۔ دراصل دوسری کتاب ''خاکم بدہن'' سات سُروں کی سمپُورَن ٹھاٹ کی اسی ہنسی پر ختم ہوتی ہے۔

چیشائر کیٹ (Cheshire Cat) اور اُلٹی ہنسی

شُدھ اور برمَل ہنسی وہ جو نہ تو آپ ہی آپ شرما کے مُسکان بن جائے اور نہ اونچے سُر تک پہنچ کے قہقہہ اور ٹھٹّھا بن پائے۔ اسی طرح زیرِ لب تبسّم کی لطافت کبھی خندۂ دنداں نما کی بے قابوسی بشاشت کی تاب نہیں لاسکتی۔ ان سب سے مختلف و منفرد وہ grin (دانت بھینچ کر چڑاونی، چوچڑی، چراندی یا کھسیانی سی مسکراہٹ) ہے جو Alice in Wonderland کی پُراسرار Cheshire Cat کی مانند ہوتی ہے۔ یہ بلّی جب اُلٹی طرف سے غائب ہونے لگتی ہے یعنی پہلے اُس کی دُم بتدریج نظر آنی بند ہوتی ہے۔ پھر بقیہ بلّی کے آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جانے کے بعد بھی دیکھنے والوں کو اُس کی مسکراہٹ دانت نِکو سے بہت دیر اور دور تک نظر آتی رہتی ہے۔

بلّی کے فوراً بعد روبینہ بی بی کا ذکر ہمیں بھی عجیب لگتا ہے۔ خود بلّیوں کو بھی عجیب لگے گا، مگر کیا کریں مطلع ہی میں سخن گسترانہ اور گُربہ گشتنی بات آن پڑی۔ دراصل ہم کہنے یہ جا رہے تھے کہ روبینہ کی ہنسی طنز و استہزاء سے مبرّا ہے، لیکن منحوس بلّی نے میاؤں تک نہ کی اور دفعتاً کتاب سے سٹک کر ہمارا راستہ کاٹ گئی! روبینہ اپنی ہنسی کو چھینک کا درجہ دیتی ہیں۔ کبھی اس کو روکنے یا خواہ مخواہ باادب باملاحظہ اور مختصر کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ہنسی میں بھی جِدّت سے کام لیتے اور اُلٹی ہنسی ہنستے ہیں، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ چہرے پر تو ہنسی کے تمام اثرات رُونما ہوتے ہیں، لیکن آواز منہ سے باہر نکلنے کی بجائے اُلٹی اندر جاتی ہے۔ ہونٹ بھینچ کر ہنستے ہیں تو ''انڈر گراؤنڈ'' قُلقُلِ مِینا اور پیٹ کی تَھل تَھل سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کا اندرون ہنس رہا ہے! جب ہَوا اور ہنسی پیٹ میں نہیں سماتی تو ایسی آوازیں نکلنے لگتی ہیں جیسے کوئی بجری کے ڈھیر میں گُھس گُھس،

کُھس کُھس پھاوڑا چلا رہا ہے۔ بہر کیف، ایسی ہنسی اُس ہنسی سے پھر بھی بہتر ہے جو رسمی، مکلّف، رُکی رُکی اور گُھٹی گُھٹی سی ہو۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ ایسے شخص سے بچ کے رہو جس کا پیٹ ہنستے میں نہیں ہلتا۔

حبیب حیدر آبادی: خندہ رُو، خندہ ریز، خندہ زن

حبیبؔ حیدر آبادی کی ہنسی بُھلائے نہیں بھولتی۔ خدا سب کو ایسی ہنسی نہ بخشے تو دیکھنے اور سننے کا موقع ضرور دے۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنھیں اللہ اور اُس کے بندے نے لندن میں گیارہ برس تک اس نعمت غیر مترقبہ سے بے اندازہ نوازا۔ وہ معمولی سی بات پر ہنسنے لگتے۔ محفل میں اگر کوئی بے توفیق معمولی سی بات بھی نہ کہہ سکے تو خود بڑے بے صبرے پن سے اپنی ہی کسی معمولی سی بات پر بے طرح ہنسنے لگتے۔ ہیرڈز (Harrods) کے نزدیک اپنے فلیٹ میں ایک آہوئے خُتن اپنے ہی مُشکِ نافہ سے مست ہو ہو جاتا۔ پہلے مدّھم سُر میں الاپ لیتے۔ پھر کُھلتے جاتے اور ایسی لمبی تان لیتے کہ سننے والوں کا سانس اُکھڑنے لگتا! آروہی سے امروہی پر اُترتے ہوئے ہنسی کی ایسی گِٹکری لیتے کہ لوگوں کی ہنسی چھوٹ جاتی۔ فوراً ہاتھ کے اشارے سے روک دیتے کہ ابھی مُخل مت ہو! ہنسنے کا مقام تو آگے آرہا ہے۔ جب سانس ٹوٹنے لگتا تو دو تین سیکنڈ کے غیر محسوس وقفے کے بعد سُر کو وہیں سے پکڑتے جہاں سے چُھوٹا تھا۔ تازہ دم ہو کر از سرِ نو ہنستے چلے جاتے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ تان اتنی لمبی ہو جاتی کہ یہ یاد نہیں رہتا کہ ہنسی آئی کس بات پر تھی! پھر اسی بات پر ہنسنا شروع کر دیتے! جسم کا کوئی حصّہ، کوئی عُضو ایسا نہیں تھا جو ہنسی سے متزلزل اور محظوظ نہ ہو رہا ہو۔ پیٹ تو خیر بہتوں کے تھل تھل کرتے تھے، لیکن تنگ سی کُرسی میں ان کے تو کولھے بھی تھرکتے اور نتھنے خرگوش کی مانند پھڑکنے لگتے! ان کو ہنستا دیکھ کر لوگوں کے پیٹ میں نہ صرف بَل پڑ پڑ جاتے بلکہ عضو مذکورہ دُکھنے بھی لگتا! خندہ کاری میں یہ مقام آتا تو ہمارے ایک فربہ اندام دوست اپنی بیلٹ کھول کر بیگم کو پکڑا دیتے اور تازہ بیٹ ہو کر از سرِنو کھلکھلاتے! حبیب صاحب کو رُخصت ہوئے ایک چوتھائی صدی گزر گئی۔ مگر آئینۂ خیال میں آج بھی ان کا رُوئے خنداں اللہ کے اُداس اور دُکھی بندوں کو اُسی طرح زیست کرنے اور جو کچھ وہ دکھائے اسے خوشدلی سے دیکھنے، سہنے اور سہارنے کا حوصلہ اور قرینہ سکھا رہا ہے۔ اکثر سوچتا ہوں کہ جب اُن سے پُرسش ہوگی کہ دنیا سے کیا لائے ہو؟ تو وہ اپنی اَنمول اور اَنمِٹ ہنسی ہنس کر کہیں گے: یہ دے کر آیا ہوں۔

پروفیسر شکیبؔ کی فقرہ آور کھانسی

یوں تو روبینہ بات بے بات ہنستی رہتی ہیں، لیکن ہمیں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنی گھنگھرالی ہنسی کو وقفہء تفکّر کے طور پر استعمال کرتی ہوں۔ یہ گمان اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ہمارے کرم فرما پروفیسر شکیب تیس پینتیس برسوں سے لندن میں سکونت پذیر ہیں اور اتنے ہی برسوں سے مسلسل کھانس رہے ہیں۔ وہ اپنی کھانسی کو اسی مقصد کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کے دوران وہ ادبی و آفاقی مسائل پر غور وفکر کرتے، اگلا فقرہ تراشتے، ڈھالتے اور اگلی کھانسی کا ڈول ڈالتے ہیں۔ افتخار عارف کا اندازِ تفکّر و تکلّم و تامّل ذرا مختلف ہے۔ وہ بولنے سے پہلے خوب تولتے ہیں، مگر بعض اوقات تین چار بار تولنے کے بعد ترازو ہونے سے مسکرا دیتے ہیں! رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر بولنے، مصنوعی لکنت کو وقفہ تفکر و تدبّر اور ساعتِ جملہ سازی کو حملہ آوری کے طور پر جس دلنشین و دانشورانہ انداز سے وہ استعمال کرتے ہیں وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ اس ہُنر کو شکیب صاحب نے بھی کھانسی کے زور سے درجہء کمال پر پہنچا دیا ہے۔ لندن میں وہ اسکالرلی ریسرچ (scholarly research) اور تنقید و تحقیق کے اُس مقامِ معلّیٰ پر فائز ہیں جہاں ایسے فنا فی التحقیق محقق کے ہر سانس، سوچ اور سُوٹ سے بُوئے مخطوطات آنے لگتی ہے!

نوادرات، عجائبات اور ایرانی مخطوطات کا نیلام اور خرید و فروخت کرنے والے شہرہَ آفاق ادارے Christie's اور Sotheby's شکیب صاحب کے مشورے، چھان بین اور پرکھ کے بغیر شاذ و نادر ہی کوئی مخطوطہ، قدیم کتاب، نایاب طغرے اور وصلیاں خریدتے ہوں۔ وہ ہر جُملے سے پہلے اور ہر جُملے کے بعد مدّھم سُر میں کُھر کُھر، کُھوں کُھوں، کُھسک کُھسک کھانستے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صدیوں پرانے دیمک زدہ مخطوطوں کی رچی بسی بُو سے دائمی الرجی میں مبتلا ہیں، حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے جب تک آکسیجن میں بُوئے مخطوطات نہ ملائی جائے تحقیق کا یہ رسیا سانس نہیں لے سکتا! یہ الرجی (allergy) اور لُکنت نہیں، تامّل عالمانہ اور توقّفِ محقّقانہ ہے۔ ان کے کمالِ فن اور لطفِ خطابت کا ناطق منبع و مخرج یہی نازوں اور نالیوں سے پلی خود ساختہ پرداختہ کھانسی ہے! کہنے کا مطلب یہ کہ غیب سے جو مضامین خیال میں آتے ہیں وہ سب اسی کُھر کھانسی کی راہ سے گزر کر صفحۂ قرطاس اور ہمارے گوشِ نصیحت نیوش تک پہنچتے ہیں۔ حکیموں کی اصطلاح میں ان کی کھانسی بلغمی وصفراوی نہیں، سوداوی اور خشک ہے۔ مطلب یہ کہ عبقری بلغم کے لوندے کے لوندے نہیں تھوکتے، آبدار موتی

رو لتے ہیں۔ وہ اس دلآویز و دلپذیر اندازِ فکر وطریقِ جملہ سازی میں اتنے طاق اور عادی ہوگئے ہیں کہ جب تک ایک دفعہ جملے سے پہلے اور ایک دفعہ جملے کے بعد کھانس کھنکھار نہ لیں، زبان وقلم اگلا جملہ اگلنے سے صاف انکار کردیں گے! اگر یہ کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کہ ان کے فخرِ علمی اور حیدرآبادی ٹھسّے میں اِس ٹھسکے کو خاصا دخل ہے!

(۱۱)

مرگِ مجنوں پہ عقل گُم ہے میرؔ

حبیب حیدرآبادی تو اچانک اور بہت جلد رخصت ہوگئے۔ اب ایک ایسی ہستی کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے، جس نے کوچ کرنے کی خود ہی جلدی مچائی! یہ چون پچپن برس قبل یعنی ۵۷۔۱۹۵۶ کا ذکر ہے۔ میں اُس زمانے میں بھی اپنا شمار مولانا صلاح الدین احمد کے نادیدہ عاشقوں میں کرتا تھا۔ وہ محمد حسین آزاد کے شیدائی تھے۔ اور یہ اُس والہانہ شیفتگی کا جادو تھا کہ آزاد کے اسلوبِ نگارش کی شیریں لہجگی خوشبو اور رنگینی ان کی تحریر میں رچ بس گئی تھی۔ اردو زبان وادب کی جیسی اور جس نہج اور سطح پر انہوں نے خدمت کی، اُس کی مثال نہیں ملتی۔ اردو سے ان کا کمٹ منٹ (commitment) اور پیمانِ وفا غیر مشروط، اٹل اور اٹوٹ تھا۔ اردو کی ترویج واشاعت اور نفاذ کے باب میں جو ''سلوگن'' ادبی دنیا کا سرنامہ بنے ★ وہ اس عہد کی استواری کا منہ بولتا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے اردو بولتا ثبوت ہیں:

1۔ اردو بولو۔ بے تکلف اردو بولو۔ اپنے انداز میں بولو۔ اور بولتے چلے جاؤ۔

2۔ پنجابی، پشتو، سندھی سب ہمیں پیاری ہیں، مگر اردو ہماری جان اور ایمان ہے۔

3۔ اردو بولو۔ اگر اہلِ پنجاب اب بھی اردو کو نہیں اپنائیں گے تو ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔ اردو کو اپنانے کے لیے اردو بولو۔

4۔ اردو آزادی اور محبت کی زبان ہے۔ اردو بولو۔ اور سیاسی اور جغرافیائی پابندیوں سے آزاد ہو جاؤ۔

5۔ اردو بولو۔ اردو بولنے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔

ادبی دنیا کے آخری شمارے مارچ ۱۹۶۴ء کے اداریے کا آخری جملہ توجہ چاہتا ہے:

''یاد رکھیے کہ قومی زندگی کے ایسے مسائل میں جیسا کہ قومی زبان کا مسئلہ ہے، جب تک ساری

★ حوالہ: مولانا صلاح الدین احمد ___ شخصیت اور فن۔ ذاکٹر انور سدید۔

قوم سعی وعمل کے ایک بُخار میں مبتلا نہ ہو، بات نہیں بنا کرتی۔"

مولانا ایک خالصتۂ ادبی رسالے کے مدیر تھے۔ لیکن جس بے خوفی اور شیر دلی سے انہوں نے Establishment (برسرِ اقتدار حاکمہ اور انتظامیہ) کو للکارا وہ اچھے اچھے دھاکڑ سیاست دانوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ جنرل ایوب خان کے ابتدائی دورِ آمریت میں چند نامور اور (اپنی) ترقی کے خواہاں بیوروکریٹس نے ایوب خان کو خوش کرنے کے لیے رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی تو مولانا نے بالاعلان یاد دلایا کہ شعر و ادب تو "جُز ویست از پیغمبری" ہے۔ اور پیغمبروں کی ٹریڈ یونین نہیں ہوا کرتی! اسی طرح جب ایوب خان نے اپنی دانست میں اہل پنجاب کو بآسانی خوش کرنے کے لیے اندرون لاہور کے ایک سیاسی جلسے میں پنجابی میں تقریر کی تو مولانا نے لتاڑا کہ جنرل ایوب خان کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ پنجابیوں سے سوائے قومی زبان کے کسی اور زبان میں خطاب کرے۔

مولانا صلاح الدین احمد کی بے مثل و بے درنگ جرأتِ اظہار ہماری ادبی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔

دشنامِ "باس" طبعِ حزیں پر گراں نہیں!

میں ایک مدّت سے مولانا سے ملاقات کا متمنّی تھا۔ میں نے اس کا ذکر بینک کے ایک بے حد سوشل اور طرحدار لاہوری افسر سے کیا۔ نام ان کا غلام کبریا تھا، مگر سب صرف کبریا کہتے تھے، جس میں سُوئے ادب کا شائبہ تھا کہ بندے کو کبریا کہہ کر نہیں پکار سکتے۔ البتہ بینک کا اکا حالک انگریز جنرل منیجر انہیں صرف Golam کہہ کر پکارتا اور ڈانٹا پھٹکارتا تھا۔ انہیں انگریز کی ڈانٹ اور ڈانٹ میں four letter word سے اتنی تکلیف اور بے عزّتی محسوس نہیں ہوتی تھی جتنی کہ Golam سے! آخر تنگ آ کر ایک دن انہوں نے ہمّت کر کے اینڈرسن سے کہا:

"Pardon me, Sir Jee, my real name is Kibriya and not Golam."

اُس نے جواب دیا:

"Stupid! You can't distinguish between your f.... first name and your unpronounced surname! And you say you have graduated from the Poonjab University!"

اس دفعہ گولم کو چہار حرفی لفظ، جسے اینڈرسن تکیۂ بدکلامی کے طور پر دن بھر استعمال کرتا رہتا تھا، بہت ناگوار گزرا۔ انہوں نے انگلی سے ہوا میں وہ حرفِ ناسزا لکھتے ہوئے، اینڈرسن سے کہا:

"Respected Sir, notwithstanding my language-wise

ignorance, nevertheless it is a dirty term of abuse."

"Exactly. that's why I have used it. Notwithstanding but nevertheless."

اینڈرسن نے وہی حرف ہوا میں capital سے بناتے اور منہ ٹیڑھا کر کے نقل اتارتے ہوئے کہا۔

گولم کو تو پنجاب یونیورسٹی کا طعنہ دیا، مجھے وہ علی گڑھ یونیورسٹی سے LLB کرنے اور آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ آنے کے طعنے دیا کرتا تھا۔ نشے میں آگرہ کا نام یاد نہ آتا تو اکثر ''تاج محال یونیورسٹی'' کا مذاق اڑاتا تھا۔ایک دن میں نے اس کے PA رحمت سے پوچھا کہ باس (boss) میری LLB کی ڈگری پر کیوں فقرے کستا ہے؟

اُس نے عجیب جواب دیا۔ کہنے لگا ''وہ آپ کو بہت پسند کرتا ہے۔ایک اُلجھن پیدا ہوگئی ہے۔ آج کل اُس کی وائف کے وکیلوں کے پے در پے نوٹس طلاق ، فارغ خطی، الکا حالزم (alcoholism)، نان ونفقہ اور وظیفۂ زوجیت کی عدم ادائیگی سے متعلق آرہے ہیں۔ وکیل تو وکیل ہے، اُسے تو پوسٹ مین تک سے نفرت ہوگئی ہے! ہر قانونی نوٹس کی وصولی کے فوراً بعد وسکی کی آدھی بوتل چڑھا جاتا ہے۔ پھر بڑے آئینے کے سامنے مدہوش لیگل نوٹس کے ہر سنگین الزام کا ترتیب وار جواب برابر کی ٹکر کی گالی سے دیتا ہے۔اور تو اور اُس کا پٹھان بیرا وہی انگریزی گالیاں جو بڑا صاب بیوی، وکیلوں اور پوسٹ مینوں کو دیتا ہے اب اپنے دشمنوں کو خالص Scottish accent کے ساتھ دینے لگا ہے! ایک دفعہ اس بیرے کا قصائی سے جھگڑا ہوگیا تو اس نے قصائی کو bloody bitch کہہ دیا! اس پر قصائی اٹھ کھڑا ہوا اور خون آلود چھری ہوا میں گھونپنے لگا۔ایک کلرک جو اس وقت اپنا ہفتہ وار کوٹا یعنی دو چھٹانک (آدھ پاؤ) بوٹیاں بنوا رہا تھا، قصائی کو سمجھانے لگا کہ یہ تو بالکل بے معنی گالی ہے! قصائی بولا کہ گالی کا مائنے رکھنا یا بے مائنے ہونا کوئی مائنے نہیں رکھتا! گالی آخر گالی ہے۔ اس پر ایک سِن رسیدہ شخص (جس نے حال ہی میں دوسری شادی کی تھی اور جو اس وقت مغز اور کپورے بنوا رہا تھا) بولا کہ: ''بھیا، تم سچ کہتے ہو۔ گالی ہو کہ جوزہ یا اللہ لوگ کی بات، وہ جتنی بھی بے ماءنا اور بے فضول لگے، اُتنی ہی سچی اور وتنی ہی دل پہ گھونسے کی طرح لگتی ہے۔ البتہ کسی عالم فاضل، گورنامنٹ یا بہت بڑے افسر سے راڑ مچیا ہو تو گالی میں احتراماً ماءنے ڈالے جاسکتے ہیں! اشرافوں کی گالی کی پہچان یہ کہ اُس سے زیادہ رذالت ٹپکتی ہے!''

لاہور مال، مئی جون کی لُو اور سولا ہیٹ

معاف کیجیے، میں پھر بھٹک کر یہاں آنکلا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے مرزا سے کہا تھا کہ

اینڈرسن کا ذکر میرے لیے ایک نوع کا slide اور chute ہے جس پر پاؤں رکھتے ہی اتنی تیزی سے پھسلنے لگتا ہوں کہ اگر خود کو روکنے کی کوشش کروں تو قلا بازی کھاتا ہوا قاری کے قدموں میں سر کے بل جا گروں گا!

فرمایا، جب خود کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے، تب بھی ماشاء اللہ یہی انجام ہوتا ہے!

تو بات کا سِرا یہاں سے چھوٹا تھا کہ میں نے گولم سے کہا کہ مولانا سے ملاقات کی کوئی ترکیب کوئی اُپائے بتائیے۔

بولے، نو پرابلم۔ آپ چلچلاتی دھوپ اور لُو میں لاہور مال پر اپنے علاوہ کسی بھی شخص کو سولا ہیٹ پہنے آتا یا جاتا دیکھیں تو آنکھ بند کر کے اس کے پیچھے ہولیں۔ جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے دفتر پہنچے گا تو ہیٹ اترتے ہی آپ کو اس کی بھرواں اور ترازوئی یعنی لٹکواں مونچھیں نظر آئیں گی۔ ادب سے سلام کر کے اپنا تعارف کرائیے گا۔

مولانا کو شناخت کرنے کا یہ طریقہ اور موسمِ مُلاقات اُس ظالم نے آخیر نومبر میں بتایا تھا! اربسکہ ہائے، یہ لفظ بھی میں نے مولانا ہی کی تحریروں سے سیکھا تھا۔ (مرزا کہتے تھے کہ یہ لفظ لونڈوں کے سے حُلیے اور پچپن برس سے کم عمر پر نہیں پھبتا!) چلچلاتی دھوپ پڑنے اور لُو چلنے میں پورے چھ ماہ کا عرصہ کہ جس کے ۱۸۲ دن بنتے ہیں، باقی تھے اور اتنے عرصے تک انتظار کرنے کا یارا، نہ تھا، میں نے لائلپور برانچ کے منیجر خلیفہ عبدالواحد (معروف استاد اور فلسفی خلیفہ عبدالحکیم کے برادرِ خُرد) سے کہا کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالیں۔ وہ مجھے دوسرے ہی دِن مولانا کے دفتر لے گئے۔ ذرا دیر بعد مولانا تشریف لائے۔ ان کے ہیٹ اتارنے سے پہلے ہی میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اپنی جو کوالی فیکیشنز میں نے پہاڑے کی طرح سنائیں، اُن سے میں خود بھی impress نہیں ہوا۔ مولانا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرکیف، وہ بہت خلوص اور شفقت سے ملے۔ پندرہ منٹ بعد وزیر آغا بھی آگئے۔ میں ڈر رہا تھا کہ جب یہ دونوں نابغے میرؔ، غالبؔ، بیدلؔ اور اقبالؔ پر عبقری گفتگو کریں گے تو میری تو گِھگّی بندھ جائے گی۔ وہ عام بھلے مانسوں کی طرح باتیں کرتے رہے، جو سمجھ میں آگئیں اور اچھی بھی لگیں۔ یہ اور بات کہ عام گفتگو میں بھی خاموشی اور عدم شرکت کا میں خود ذمہ دار اور عادی تھا۔ اس کے بعد یہ معمول ہوگیا کہ میں جب بھی لاہور جاتا تو مولانا اور قاسمی صاحب کو سلام کرنے ضرور حاضر ہوتا۔

الوداعی ملاقات

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۶۴ میں ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ مجھے ادبی دنیا کا تازہ شمارہ

نہیں ملا۔ مفت خوری اور مفت خوانی کا عادی ہوگیا ہوں۔ ہر شمارہ ملنے کے بعد ارادہ کرتا ہوں کہ دو تین دن میں سالانہ چندے کا چیک ضرور بھیج دوں گا۔ مگر کاہلی کا بُرا ہو۔

مولانا نے مجھے جس طرح دیکھا اُسے ستائش کی نظر نہیں کہا جاسکتا۔ فرمایا "آپ کو اعزازی کاپی پابندی سے پوسٹ کی جاتی ہے۔ ایک ہفتے قبل جملہ معززین کو اعزازی کاپیاں ارسال کی جاچکی ہیں۔ رہے سالانہ خریدار تو سامنے دیوار کے سہارے پیکٹوں کی جو لمبی قطار آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب اُن کی زرخرید کاپیاں ہیں، جن کی باری ہمیشہ اعزازی کاپیوں کے بعد آتی ہے!

کچھ دیر بعد میں نے اجازت چاہی تو سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا "یہ آخری ملاقات ہے!"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ خیال آیا کہ شاید نادانستہ کوئی گستاخی مجھ سے سرزد ہوگئی یا سالانہ چندہ والی بات ناگوارِ خاطر گزری۔

قدرے توقف کے بعد خود ہی گویا ہوئے "میں باسٹھ برس کا ہوگیا۔ میرے آقا، میرے مولا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سنِ شریف وصال کے وقت تریسٹھ برس تھا۔ میں حدِ ادب سے آگے زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اب ملاقات نہیں ہوگی۔"

پورے دو ماہ نہیں گزرے تھے کہ لاہور سے ایک دوست نے فون پر اطلاع دی کہ مولانا صلاح الدین احمد پرسوں (۱۳ جون ۱۹۶۴) منٹگمری کے موضع قبولہ میں ایک کانفرنس میں مقالہ پڑھنے جارہے تھے کہ راستے میں دل کا دورہ پڑا اور انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

عاشقِ صادق کی تمنا بر آئی۔ حق مغفرت کرے۔

(۱۲)

گڑیا

ڈاکٹر ظہور احمد اپنا اولین تاثر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "روبینہ کے لیے جب میں نے گڑیا کا لفظ سنا تو دل نے کہا، واقعی یہی نام اس پر سجتا ہے۔ وہ گڑیا کی طرح ہی خوبصورت، کامنی، سجی سجائی، معصوم اور بے ضرر ہے۔"

صاحبو، یہ گڑیا کسی اور ہی خمیر اور مادّے سے بنی ہے۔ نہ کسی سے ڈرتی ہے نہ رعب میں آتی ہے۔ بُونا سے قد کی یہ پٹھانی جو ایم۔ فِل اور پی۔ ایچ ڈی کی کلاس لیتی ہے اور صورت سے انٹرمیڈیٹ

فرسٹ ایئر کی ہونہار طالب علم لگتی ہے، بڑے بڑوں سے پنگا لینے سے ذرا نہیں جھجکتی۔ ابتدائی ملازمت میں اپنے شعبے کی چیئر پرسن پر مقدمہ دائر کرکے جرأت کا ثبوت دیا۔ اپنے موقف پر سختی سے ڈٹ جانے کے لیے روبینہ کو زیادہ غوروفکر نہیں کرنا پڑتا۔ حال میں ایک بہت سینیئر کولیگ (ہم کار) سے الجھاؤ کی صورت پیدا ہوئی تو یہ نہ گھبرائیں، نہ گھگھیائیں۔ میں نے ان سے پوچھا، یہ کیا بات ہے آپ صرف سینیئر زاور بزرگوں سے پنگا لیتی اور انہیں سبق سکھاتی ہیں؟

فرمایا ''اب میں خُردوں کو سبق سکھانے کی خاطر بیس پچیس ہزار روپے خُورد بُرد کر کے کراچی آنے سے تو رہی۔ جس سینیئر ز کو چت ہونے اور پچھاڑے جانے سے ڈر لگتا ہو وہ دنگل میں آئے ہی کیوں؟ اکھاڑے میں اُترے گا تو دَھر پٹک تو ہووے ہی ہووے۔ آپ ہی کے بقول،

بے فُضُول اپنی بے عزّتی خراب کرا کر گھر جاوے گا!

چھپکلیاں پالنے کے فوائد

مختصراً اگر یہ کہا جائے کہ یہ نڈر خاتون صرف خدا (حقیقی ومجازی دونوں) اور چھپکلی سے ڈرتی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر گھر میں کہیں بھی چھپکلی نظر آجائے تو چیخ مار کے فوراً اپنے میاں کو فون کرتی ہیں کہ جلد از جلد ایک جان لینے اور دوسری کو بچانے آؤ۔

؎ پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

ہم نے اُنہیں بہتیرا سمجھایا کہ ''چھپکلی تو بے ضرر اور انسان دوست جانور ہے۔ مکھی مچھر کا صفایا کردیتی ہے۔ ہمارے ایک پڑوسی نے بیوی کے کہنے پر گھر کی ساری چھپکلیاں مار ڈالیں۔ لیکن جب ڈینگی اور کانگو بخار کے کیس بڑھنے لگے اور ان کے دروازے کے عین سامنے والا پڑوسی ڈینگی بخار میں چل بسا تو ان کی بیگم کو ہول اُٹھنے لگے۔ مچھر مار اِسپرے سے بیگم کو دمے کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ لہٰذا اپنے بھائی کے گھر سے چار چھپکلیاں اور ان کی دل بستگی کے لیے ایک چھپکلا پکڑوا کر اپنے کمرے میں چھوڑ دیا تاکہ ڈینگی بخار کے مچھروں کا قلع قمع کرسکیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اب وہی بیگم صاحبہ ان چھپکلیوں کو شفقت بھری نظروں سے دیکھتی ہیں! بھلا ایسے میں مرزا کو قیاس آرائیوں اور دُور کی کوڑی لانے سے کون باز رکھ سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بیگم اب چھپکلیوں کی سماجی اور میڈیکل اہمیت کی دل سے قائل ہوگئی ہیں اور اُن کی پرورش و خوراک کا حد درجہ خیال رکھتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کے زیر سایہ و سرپرستی رہنے کے باعث گھر کے مچھر اگر کبھی معدوم النسل ہوگئے تو وہ اڑوس پڑوس سے مچھر پکڑوا کر پالتو چھپکلیوں کو تازہ پالتو مچھروں کا آذوقہ فراہم کریں گی!''

میری مدلّل تقریر کا روبینہ پر حسبِ معمول کچھ اثر نہ ہوا۔ کہنے لگیں ''ہمارے ہاں تو اس کا سیدھا سیدھا علاج مچھر دانی ہے۔ چھپکلی کے لیے ایک ریٹ ارکھ چھوڑا ہے۔ کثرتِ مشق کے باعث شاہجہاں کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ زندہ چھپکلی سے خوف آتا ہے۔ مُردہ سے خوف کے ساتھ قے بھی آتی ہے۔''

مرزا کہتے ہیں کہ جو عورت چھپکلی سے بھی نہ ڈرے، اُس سے ڈرنا چاہیئے! وہ اپنے وقت کی لیڈی میکبتھ (Macbeth) ثابت ہوسکتی ہے، جس نے اپنے شوہر میکبتھ کو پس و پیش میں مبتلا دیکھا تو یہ کہتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے خنجر چھیننا چاہا کہ ہٹو، تم ڈھلمل یقین ہو۔ لاؤ خنجر مجھے دو۔ (تا کہ میں اس مرڈود کو جہنم رسید کردوں۔)

اور پھر بیاں اُن کا!

شخصیت کا ذکر ''چہرہ نویسی'' کے بغیر نامکمل سا لگتا ہے۔ کیوں نہ ایک بار پھر بے مثل و معتبر خاکہ نگار سے رجوع کریں۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان رقم طراز ہیں ''گوری چمکدار بل بل کرتی رنگت اور جلد، روشن روشن آنکھیں، چہرہ کُھلی کتاب، حد درجہ حساس اور ہر جذبے کی جلی تحریر کا آئینہ دار۔ پل پل میں رنگ بدلتا، گلابی سے عنابی تک منزلیں طے کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حُسنِ صورت کے ساتھ اسے حد سے زیادہ حسنِ سیرت بھی عطا کر رکھا ہے...... اُسے دیکھ کر نسوانی سے زیادہ ملکوتی تقدّس کا تصور جاگتا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی ایک اچھے انسان کا خیال آتا ہے۔ جنس و جسم، ذات و شخصیت سے بلند و ارفع۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ میں کسی بھلائی اور نیکی کو مجسم دیکھ رہا ہوں۔''

یہ تو ان کے استادِ محترم اور بزرگ رفیقِ کار کا حرفِ ستائش ہے، اب ذرا دیکھتے ہیں اُن کے شاگرد، بچے اور bambinos ★[1] کیا کہتے ہیں۔ حال میں ایم۔ اے فائنل کے طلبہ و طالبات کی الوداعی پارٹی میں لڑکیوں نے ان سے درخواست کی کہ ہمیں آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں، لہٰذا لڑکوں کو کچھ دیر کے لیے باہر بھیج دیجیے۔ جب مطلوبہ خلوت ہوگئی تو لڑکیوں نے ان سے جو سوالات کیے وہ سب کے سب نصاب سے باہر تھے! مثلاً، آپ لپ اسٹک اور نیل پالش نہیں لگاتیں۔ پھر ہونٹوں کو سُرخ رکھنے کی کیا ترکیب کرتی ہیں؟ کیبل ٹی وی کتنی دیر دیکھتی ہیں؟ درزی کا کیا پتہ ہے؟ اگر بالوں کا موجودہ رنگ قدرتی نہیں ہے تو L'Oreal کا کس نمبر کا کلر استعمال کرتی

★[1] ایسے ڈھیرو کے ڈھیرو ''بچوں'' کے لیے میں تو اٹالین زبان کا لفظ bambino جو عام بچے کے لیے بولا جاتا ہے، فقط اس کے صوتی بھدّے پن اور بانس بھوقیت کی وجہ سے استعمال کرنا پسند کروں گا۔

ہیں؟ کیا ڈائٹنگ کرتی ہیں؟ کیا پرس میں آئینہ اور نوٹ نقدی بھی رکھتی ہیں؟ سفید تو دراصل Nuns کا رنگ ہے۔ اس کے علاوہ کون سا رنگ پسند ہے؟ آپ کے پسندیدہ ادیب سب کے سب سانولے سلونے ہیں! غصہ کیوں نہیں آتا؟ خوبصورتی کا راز پیدائشی کے علاوہ اور کیا ہے؟ کون سا صابن استعمال کرتی ہیں؟

مجھے معلوم نہیں انہوں نے آخری سوال کے جواب میں کیا کہا۔ مجھ سے اگر میری جلد کی موجودہ حالت اور رنگت کے بارے میں اِنٹرویو میں یہی سوال کیا جائے اور میں جواب میں سچ سچ کہہ دوں کہ گزشتہ ستر برسوں سے میں صبح وشام لکس صابن سے منہ دھوتا رہا ہوں تو میرا انٹرویو چھپتے ہی لکس کی سیل آدھی رہ جائے اور اسے بنانے والی کمپنی میری منّت سماجت کرے گی کہ للّٰہ جلد از جلد تردیدی بیان چھپوائیں کہ میری جلد، رنگت، صابن اور بیان ــــــ چاروں کو الیکٹرونک میڈیا نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میں کوئی بھی صابن استعمال نہیں کرتا۔ سب کچھ عطیۂ خداوندی ہے۔ نقش ہوں اپنے مصوّر سے گِلہ رکھتا ہوں میں۔

(۱۴)

بچہ جمورا اور جمہور

میڈم اپنے شاگردوں کو کبھی طلبہ یا اسٹوڈینٹس نہیں کہتیں۔ ان کی موجودگی اور غیاب میں ''بچے'' کہتی ہیں! ان بچوں میں وہ پکھنتے اور دھینگڑے بھی شامل ہیں جو عمر میں میڈم سے دو تین سال بڑے اور قد میں ایک ڈیڑھ فٹ لمبے لگتے ہیں۔ یہ پی ایچ ڈی کے تھیسس کے سلسلے میں ان کے حضور سرنیہوڑائے زانوئے تلمذ دبچکی تہہ کرتے ہیں! اگلے وقتوں میں گرو اپنے چیلوں چانٹوں کو بچہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اُس زمانے میں بازی گر اور مداری بھی ڈُگ ڈُگ ڈَمر ڈَمر ڈُگڈگی بجاتے ہوئے، ایک سکھائے پڑھائے لونڈے کو سامنے بٹھاتے اور اُس سے پوچھتے، میں کون؟ وہ کہتا، عامل۔ پھر پوچھتے، تم کون؟ وہ جواب دیتا معمول۔ اِس ایجاب وقبول کے بعد لڑکا جادو بیجا وہ سب کچھ دیکھتا، کہتا اور کرتا جو کہ بازی گر دِکھلاتا، کہلواتا اور کرواتا تھا۔ ہر شعبدے کے بعد ''بچہ لوگ'' سے تالی بجانے کے لیے کہا جاتا۔ تالی بجاتے بجاتے ننھی ننھی ہتھیلیاں لال ہو ہو جاتیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکے کے تعاون اور بچہ لوگ کی تالیوں کے بغیر، بازی گر اور شعبدہ باز کوئی کرتب، شعبدہ، ہاتھ کی صفائی اور نظر بندی ★[1] کا کرشمہ نہیں دکھلا سکتا تھا۔ مار مار کے سُدھایا ہوا

★[1] نظر بندی: ''جادو وغیرہ سے نظروں کو متاثر کرنے کا عمل۔ سحر کاری۔ شعبدہ باز، جادوگری۔ نظر کا دھوکا۔'' اردو لغت۔

یہ لڑکا ''بچہ جھمورا'' کہلاتا تھا۔ اب ذرا غور سے یہ تماشا دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ عہدِ حاضر میں ڈکٹیٹر ___ خواہ فوجی ہو یا اُس کا بھی گُرو یعنی سویلین آمر ___ جمہور کو بچہ جھمورا بنا کر، الیکٹرونک میڈیا کی ڈُگڈگی بجا بجا کے تگنی کا ناچ [1] نچواتا اور سارے بچہ لوگ سے تالی بجواتا ہے۔ تالی بجانے والے بچہ لوگ کی اس کچر دھان [2] میں وہ سب شامل ہوتے ہیں جن کے دائیں ہاتھ میں اپنے اپنے پیشے، ہُنر اور دھندے کے اوزار، آلاتِ کشاورزی وکشود کاری اور کار برآری ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی کے ہاتھ میں تسبیح اور کسی کے ہاتھ میں قلم، مائیک، ماسک، مضراب، شہنائی، درانتی، ہتھوڑا، کشکول، ٹی ٹی پستول، آمر کی ٹائی سے میچنگ چوڑیاں اور Gucci کا پرس۔ اُدھر ایک باکمال کتھک کے پاؤں میں درباری دُھن پر جھنن جھنن بجتے گھنگھرو، مردنگ اور مجیروں کی چھَیم چھَیم، ہاتھ میں خنجری اور آستین میں خنجر! بالآخر، آمر بغیر کسی الوداعی پارٹی کے رخصت ہوتا ہے تو یہی بچہ لوگ تالی پیٹتے ہیں اور اُسی کے عطا کردہ کشکول بجا بجا کے قوالی کا رنگ جماتے ہیں:

جب آتے ہوئے روکا نہ تمھیں، پھر جاتے ہوئے کیوں روکیں گے [3]

اجی ہاں، کیوں روکیں گے
کیوں روکیں گے، کیوں روکیں گے
روکا نہ تمھیں، اے!
روکا، روکا، اجی روکا نہ تمھیں

نا، نا، ناں
کیوں روکیں گے، نہیں روکیں گے

بجیا کا سایہ بزرگوں کے سر پر!

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی کرم گستری اور ہمہ گیر شفقت بچے؛ جوان اور بوڑھے میں تفریق نہیں کرتی۔ ایسی مساوات و فیاضی میں محترمہ فاطمہ ثُریاؔ یعنی ہماری آپ کی بجیا اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ وہ بلا امتیازِ سن و سال و صِنف اور خُردی و بزرگی و مرتبت، ہر ایک کو بیٹا کہتی اور سر پہ ہاتھ پھیرتی ہیں۔ عمر میں مجھ سے دس نہیں تو چار پانچ برس ضرور چھوٹی ہوں گی۔ لیکن جب بھی اور جہاں بھی مجھے دیکھتی ہیں، بلا توقف آن کر میرے سر پر، جو اُن کی سفید بُرّاق ساری سے بھی زیادہ

[1] تگنی کا ناچ: بہت مشکل ناچ۔ ''وہ تیز ناچ جو اصل رفتار سے تگنی رفتار پر کیا جائے ...... ناک میں دم کر دینا۔''

[2] کچر دھان: کچر پچر بال بچوں کی کثرت۔

[3] جب جاتے ہوئے روکا نہ تمھیں، پھر آتے ہوئے کیوں روکیں گے۔ میرا جی

سفید جھک ہے، بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہیں! ان کے ایک مدّاح سے روایت ہے (دروغ وفروغ دروغ برگردنِ راوی) کہ جب وہ صدارتی ایوارڈ لینے اسلام آباد گئیں تو ان کے ساتھ جو صاحب بحیثیت attendant گئے، اُنہیں خاص طور پر یہ ڈیوٹی تفویض کی گئی کہ ایوان صدر میں تقریبِ عطائے اعزازات کے دوران بجیا کو ہر پانچ منٹ بعد یاد دہانی کراتے رہیں کہ جب تمغہ وصول کرنے کی باری اور لمحہ آئے تو صدرِ عالی مرتبت وذی وقار کے سر پر بھرے دربارِ دُربار میں اُچک کر ہاتھ ہرگز ہرگز نہ پھیریں۔ اسے بھی تائیدِ غیبی کہئے کہ صدر نے اتنے اونچے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر تمغہ پہنایا کہ اُس کا سرِ پُرغرور ان کے دستِ شفقت کی پہنچ سے دو ڈھائی فٹ کی دُوری پر واقع تھا۔ تاہم ہماری بجیا، جَم کی سخیا، نے حسبِ عادت ومعمول ''جیتے رہو بیٹا۔ اپنا خیال رکھو'' ضرور کہا! یہ دُعا دینے سے منع کرنے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا! جس نے سنا پھڑک اٹھا، سوائے صدر عالی وقار کے۔ جی خوش ہوگیا، بجیا! اللہ آپ کا سایہ بزرگوں کے سر پر ان کی باقی ماندہ عمر طبیعی ومنصبِ خُردی پر قائم رکھے۔

اولڈ بوائے

انسان بھی عجب مجموعہ اضداد و اِزدیاد ہے۔ میڈم کے طرزِ تدریس اور چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ شفقت کی اتنی تعریف سنی ہے کہ کبھی کبھی تو جی کرتا ہے کہ ان کی شاگردی اختیار کرلیں تاکہ اب دنیا میں کم ازکم ایک ہستی تو ایسی ہو جس کی توجہ اور فیضان سے اسّی برس بعد پھر سے ہمارا شمار بچّوں میں ہو سکے۔ جھوٹوں ہی سہی! ''بوائے'' کہلانے کے لالچ میں کئی بار ہمارا بھی جی چاہا کہ اپنی سابق یونیورسٹی کی (جس کے ہم سابق طالب علم ہیں) اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بن جائیں۔ مگر ظالموں نے اس کے ساتھ ''اولڈ'' کا ایسا منحوس دُم چھلا اور ''سابق'' کی کھوسٹ پخ لگادی ہے کہ ''بوائے'' کی کودکی کا سارا مزہ کِرکرا ہوجاتا ہے! لڑکپن میں اپنے ہم عمروں پر رعب ڈالنے کی غرض سے ہم اپنی عمر تین چار برس بڑھا کر بتاتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ایسی صورت پیدا ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صورت ہی ایسی ہوگئی کہ تین چار برس گھٹا کر بتانے لگے۔ پھر یہ دن بھی دیکھنے پڑے کہ جب تک پچیس تیس سال کی ڈنڈی نہ ماری جائے، جی خوش نہیں ہوتا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ بڑھاپے میں آدمی نہ صرف یہ کہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا، بلکہ اعتماد کے ساتھ بڑا جھوٹ بھی نہیں بول سکتا! اب تو خود اُسے اپنا پُرانا سچ بھی سفید جھوٹ معلوم ہوتا ہے!

بوائے کہلانے کی حسرت آرسی مُصحف اور رُونمائی کی یاد دلاتی ہے۔ نوشہ میاں کو جب اس رسم کی ادائیگی کے لیے زنانے میں بلایا جاتا ہے تو بار بار بآوازِ بلند اعلان کیا جاتا ہے ''لڑکا آرہا ہے! لڑکا

آ رہا ہے۔'' یہ سنتے ہی صرف لڑکیاں بالیاں ہی نہیں، بیاہی تیاہی اور پردہ نشین بیبیاں بھی طباق سا منہ کھولے ''لڑکے'' کی آمد کا بیتابی سے انتظار کرتی ہیں۔ یہ بدگمانی بیجا نہیں معلوم ہوتی کہ بعض نکتے نکھد بڈھے، جن کا ایک ناکارہ پاؤں قبر میں ہوتا ہے اور دوسرا عروسی چھپرکھٹ پر سے لٹکا ہوتا ہے، نکاحِ ثانی فقط ''لڑکا آ رہا ہے'' کا مژدہ و نسخۂ شباب آور سننے کے لیے کرتے ہیں! ورنہ جہاں تک اِزدواجی آسودگی، وظیفۂ زوجیت ★ اور باقی ماندہ حیاتِ رائیگاں کے لیے رفیقۂ شریکہ کا تعلق ہے تو توبہ کیجیے:

اس سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

مرزا کہتے ہیں کہ سیکس سے اگر لطف و لذت اور اچنبھے کا عنصر خارج کر دیں تو جو کچھ بچ رہے گا اُسے شُرفا اور راضی برضائے اہلیہ رہنے والے شوہر وظیفۂ زوجیت کہتے ہیں!

اک طرزِ تخاطب ہے، سو وہ تم کو مبارک

بچّہ کہنے اور کہلانے کے انداز اور اثرات و عواقب کی تفصیل میں اس لیے بھی جانا پڑا کہ میڈم کا طرزِ تخاطب مذکورہ بالا صورتوں سے قدرے مختلف ہے۔ وہ رسماً یا عادتاً نہیں، بلکہ فرداً فرداً بڑے خلوص اور پیار سے اپنے شاگردوں کو بچّہ کہتی اور سمجھتی ہیں۔ وہ دلآویز اور مابہ الامتیاز خصوصیت جو ان کے انداز، لہجے اور للک کو عام بزرگوں سے مُمیّز و ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ جب وہ کسی کو بچّہ کہتی ہیں تو خود بھی بچّہ ہی لگتی ہیں! بھولے اور سچ مچ کے بچّے کی پہچان یہ ہے کہ وہ خود کو سیانا سمجھتا ہے! اکثر ایسے مواقع آئے کہ ہمارا بے اختیار جی چاہا کہ انہیں ان ہی کی طرح بچّہ کہیں۔ لیکن خود کو باز رکھا۔ اس لیے کہ قوی احتمال تھا کہ وہ اسے خود پر مستولی کردہ شانِ بزرگی، شیوۂ مشفقانہ اور مسلکِ بچّہ پروری کے صریحاً منافی جان کر اُلٹا ہمارے اظہارِ شفقت کو ناقابلِ اصلاح لونڈ ہار پن پر محمول کر بیٹھیں گی۔

میڈم اور م سے شروع ہونے والے نام

میڈم کے استاد ڈاکٹر صابر کلوروی (مرحوم) نے تحقیق کے بحرِ ذخّار میں غوطہ زنی کے بعد یہ گوہرآبدار نکالا ہے کہ میڈم روبینہ کو ان ادیبوں سے خصوصی عقیدت ہے جن کے نام میم (م) سے شروع ہوتے ہیں! ثبوت میں اس موصوف نے ان مضامین کا حوالہ دیا ہے جو محترمہ نے ممتاز مفتی، محمد احسن فاروقی، مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی پر لکھے ہیں۔ یاد رہے کہ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے

★ مجھے اس اصطلاح کی وظیفگی اور محلِ استعمال میں کچھ شک گزرا تو اردو لغت جلد ۲۱ سے رجوع کیا۔ لیکن شک رفع نہ ہوا، اس لیے کہ فاضل لغت نویس نے میرا جملہ بطور سند میرے ہی سر مارا:
''مزید برآں، کثرتِ مے نوشی کے سبب مدعا علیہ وظیفہ زوجیت کی بجا آوری میں عرصہ دس سال سے معذور و مفرور ہے۔'' (زرگزشت)

تھیسس کا موضوع مظفر علی سیّد تھے۔ محمد حسین آزاد، میراجی اور معین الرحمٰن کی طرزِ نگارش کی معترف و مدّاح ہیں۔ مشفق خواجہ سے بھی خط و کتابت رہی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ان کا قلمِ مِدحت رقم بقیہ حروفِ تہجی سے شروع ہونے والے ناموں پر چلنے سے ہنوز گریزاں ہے۔

میری گزارش اور پُرزور سفارش ہے کہ اہلِ میم میں اب وہ پانچ میماتے ناموں کا اضافہ کرلیں:
محمد علی باکسر، میرلن منرو، مونیکا لیونسکی آف کلنٹن فیم، داغ محبوبہ مُنّی بائی حجاب اور مُلّا دو پیازہ ___
تاکہ جیّد عالموں، ادیبوں، نابغوں اور ثقہ بزرگوں کی محفل میں کچھ تو ہنگامہ و ہمہمہ ہو اور مزاج و ماحول کی خشکی اور یبوست تھوڑی بہت دور ہو۔

(۱۴)

خیمہ بستی

میں نے روبینہ کو کبھی زرق برق لباس اور ہائی ہیلز پہنے یا میک اپ کیے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی زیور پہنے دیکھا۔ اور یہ بے زیوری اُس پر پھبتی ہے۔ اس کا شمار خوبیوں کے علاوہ اس کی نیکیوں میں بھی ہونا چاہیئے کہ طالبات اسے اپنا رول ماڈل تصور کرتی ہیں۔ ایک بے تکلف محفل میں خوش لباسی پر گفتگو ہو رہی تھی تو مرزا کہنے لگے کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ میں نے تو ایسی ایسی دیکھی ہیں جو خوبصورت لباس اور زیور پہن کر اور بھی بدصورت لگتی ہیں! اس پر میں نے کہا، اور مرد؟ میں نے تو جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کو یونیفارم اور تمغوں کے بغیر اور ایک جج کو وِگ اور گاؤن کے بغیر دو فٹ کے فاصلے سے دیکھا ہے۔ کیا بتاؤں کیسے لگتے تھے! اُنہیں پر موقوف نہیں۔ کسی جَھبرے جبر جنگ ریچھ کو شیو کر دیں تو بالکل اُلّو معلوم ہوگا۔ ریچھنی پاس نہ آئے گی! کوّے تک چونچیں ماریں گے!

بولے ''سچ کہتے ہو۔ میں نے بھی تمہیں سیاہ سُوٹ اور بلیک ٹائی کے بغیر دیکھا ہے! تمہیں نے کہیں لکھا ہے کہ یورپ میں bankers اور undertakers کا یونیفارم سیاہ لباس ہے!''

کپڑے، کتابیں، جُوتے اور پرس خریدنے سے اس بی بی کا جی کسی طرح نہیں بھرتا۔ اس کی خوش لباسی اور جامہ زیبی کے چرچے بہت ہیں، مگر ہم تفصیل میں جانے سے اس لیے بھی قاصر ہیں کہ اس کا دوپٹہ حائل ہے۔ وہ یوں کہ کراچی میں وہ دوپٹے کو چادر کی طرح اوڑھتی ہے۔ پھر اس چادر کو

اپنے اوپر اس ہُنر مندی سے تانتی ہے کہ دور سے اردو کے ۸ کی شکل کی چھولداری (چھوٹا تکونا خیمہ) نظر آتی ہے اور قریب سے خودکش بمبار! کبھی کبھی تو یہ خیمۂ رواں اتنا پردہ پوش اور گھٹا ٹوپ ہوتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میڈم نے جوتے بھی پہن رکھے ہیں یا نہیں! اگر چالیس پچاس خواتین اسی طرح اپنی اپنی چھولداری اوڑھ کر نکل پڑیں تو جو بھی دیکھے یہی سمجھے گا کہ ساری خیمہ بستی چیف منسٹرز ہاؤس کے سامنے حکومت کے خلاف نعرے لگانے، اپنا مقدّس جمہوری حق استعمال کرنے اور لاٹھیاں کھانے جا رہی ہے!

اِبنِ حسن برنی اور اِملڈا مارکوس

ہمارے دوست ابنِ حسن برنی مرحوم بھی سُوٹ خریدتے وقت ہاتھ نہیں روکتے تھے۔ بلکہ سُوٹ پر ہی موقوف نہیں، کوئی بھی چیز۔ جی ہاں کوئی بھی چیز Harrods کی سیل میں سستے داموں اور ڈسکاؤنٹ پر، اُن کے نزدیک تقریباً پھوکٹ میں ★[1] مِل رہی ہو تو اُسے فوراً نہ خریدنے کو وہ بیوقوفانہ ناقدری، معاشی و اقتصادی رجحانات سے جاہلانہ بے خبری؛ موقع ناشناسی، کساد بازاری اور اونچی دکان کا دِوالا پٹنے سے جائز فائدہ نہ اُٹھانے کے عزمِ احمقانہ سے تعبیر کرتے تھے! چنانچہ بے شمار غیر ضروری چیزیں اور اَلّم غلّم محض اس لیے خریدا جاتا کہ ان کے نزدیک سستا مل رہا تھا! خود خریدتے اور ہمیں بھی موقع و قدر شناسوں کی فہرست میں شامل رکھتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ہم نے ہُچّر مُچّر کی، تو خود خرید کر ہمیں تحفتہً پیش کر دی اور شرمندگی و شکریے کا موقع فراہم کیا۔ وہ ہر سال Harrods اور Euro Suits کی سیل میں پانچ چھ نئے سُوٹ اور اپنے اور دوستوں کے ناپ کے درجنوں قمیض (یاد آیا، وہ مجھے ہر بار ٹوکتے تھے کہ صحیح لفظ قیص ہے۔ ص پر نقطہ درزیوں اور انگریزوں نے لگایا ہے......kameez) خریدتے اور ہر تیسرے چوتھے برس اپنے برادرِ خُرد آلِ حسن برنی کو اپنے خرچ پر بلند شہر سے لندن بُلا کر نو دس سُوٹ اور دس پندرہ قمیض (پھر وہی!) بطور خِلعتِ برادرانہ عطا کرتے۔ کہیں سیل میں بالی (Bally) کا جُوتا نظر آ جاتا تو ہمیں یاد کرتے اور للچاتے۔

★[1] پھوکٹ میں: مفت میں۔

اب عوامی دور میں یہ عامیانہ لفظ استعمال نہیں ہوتا، جب کہ اردو لغت (جلد چہارم) میں فصیح الملک نواب مرزا داغ کا یہ پھڑکتا ہوا شعر بطور سند منقول ہے:

ے دل کا سودا ہوا تھا بوسے پر
تم نے لی میری جان پھوکٹ میں

مرزا کہتے ہیں ''اِس میں شک نہیں کہ جو آسودگی، فرحت اور فراخی اپنا اور بچّوں کا پیٹ کاٹ کر غیر ضروری چیزیں خریدنے کے بعد محسوس ہوتی ہے وہ genuine اشیائے ضرورت، گھر گرہست اور روزمرہ استعمال کی چیزیں مجبوراً اور ہار جھک مار کر خریدنے میں میسر نہیں۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ڈیپریشن کے مریضوں کو اِسراف بیجا اور اَلّم غلّم شاپنگ سے افاقہ محسوس ہوتا ہے!'' لیکن برنی صاحب کا کیس مختلف تھا۔ وہ دوستوں کو اچھی چیزیں خریدتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ہم نے بھی ان کے اصرار پر ایک اٹالین آرٹسٹ کی پینٹنگ ۳۵۰ پاؤنڈ میں خریدی جسے وہ کوڑیوں کے مول لینا کہتے تھے! دن دہاڑے گیلری (تصویروں کی دکان) لُوٹنے کا حال وہ اتنے فخر اور تفصیل سے سناتے گویا چند منٹ قبل خود ڈاکہ ڈال کر آرہے ہیں! اور یہ سب اس لیے کہ میں یہ نہ محسوس کروں کہ فضول خرچی کی یا ٹھگ لیا گیا!

برنی صاحب کی طرح روبینہ بھی ہر سال کراچی آن کر چھ سات جوڑے اپنی چھوٹی بہن اِرم کو جو قد میں ان سے چھ سات انچ لمبی ضرور ہوں گی، عنایت کرتی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ پیاری بہن کی خاطر وہ خود دو تین انچ لمبے کُرتے اور شلواریں پہنے پھرتی ہیں اور اچھی لگتی ہیں۔ اور اسی جذبۂ ہمشیری سے سرِشار ہوکر اِرم بھی دو تین انچ چھوٹے کرتے اور شلوار پہن لیتی ہیں۔ اور یہ چُست لباس ان پر پھبتا ہے! صاحبو، بہناپا ہوتو ایسا ہو۔ اور پہناوا ہوتو ایسا ہو!

مرزا نے اِس مضمون کا مسوّدہ دیکھا تو فرمایا کہ اس پیمائش کی بیشی پر مُقفّٰی واہ وا میں میری طرف سے یہ اضافہ کرلیجئے کہ بیبیو! سراپا ہوتو ایسا ہو! اور آپا ہوتو ایسی ہو!

اسی طرح اور اتنی ہی تعداد میں روبینہ ہر سال دِل اور پاؤں سے اُترے جُوتے مستحقین میں تقسیم کردیتی ہیں۔ ان میں وہ جوتے بھی شامل ہیں جو صرف اس لیے ''ڈِسکارڈ'' (رَد) کردیئے گئے کہ ان سے میچنگ کپڑے کسی کی نذر کردیئے تھے۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا کہ خوبصورت لباس اس لیے ڈِسکارڈ کرنا پڑا کہ میچنگ چپل سخی نے کسی کو بخش دیئے تھے۔ پشاور، کراچی اور مانسہرہ میں اپنے پاؤں کے ناپ والیوں کی فہرست، مع فون نمبر، ان کے پرس میں رہتی ہے۔ ہمیں نہیں دِکھاتیں۔ نہ جانے انہیں ہماری طرف سے کیا وہم ہے! یہ اچھی بات ہے کہ روبینہ فلپائن کے مطلق العنان اور رسوائے زمانہ ڈکٹیٹر مارکوس کی فیشن ایبل اور شاہ خرچ بیوی اِملڈا کی طرح جوتے جمع نہیں کرتیں۔ فراخدلی سے سال کے سال تقسیم کردیتی ہیں۔ جب مارکوس کا تختہ اُلٹا تو پتہ چلا کہ اِملڈا کے پاس تین ہزار سے زیادہ جوتے تھے! سکندر اعظم کو دنیا سے رخصت ہوئے صدیاں گزریں، مگر جب بھی

اُس دکھیارے کا ذکر آتا ہے تو یہ ضرور کہتے ہیں:

ع سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے!

مارکوس اور اِملڈا کو اچانک بڑی بے عزتی کے ساتھ رخصت ہونا پڑا۔ محاورتاً یوں کہیئے کہ ملکۂ عالیہ جوتوں بھرے محل سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ نئی حکومت کو چاہیئے تو یہ تھا کہ عالیشان صدارتی محل کے صدر دروازے سے ذرا پہلے اِملڈا کے تین ہزار رنگ برنگے جوتوں سے ایک محراب بناتے اور اس میں سیاہ جوتوں کی بندھنوار★[1] لگا کر ایک تختی آویزاں کر دیتے:

اِملڈا جب گئی یاں سے تو دونوں پاؤں ننگے تھے!

صاحبو، ہمارے پاس اتنے جوتے ہوتے تو ہم چکرا جاتے۔ گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو جاتا۔ اس لیے کہ خدانخواستہ، خدانخواستہ، گھر میں آگ بھی لگ جاتی تو ہم اتنے گڑ بڑا جاتے کہ گھنٹوں یہ فیصلہ نہ کر پاتے کہ موقع کی مناسبت سے کون سا جوتا پہن کر بھاگیں!

(۱۵)

اقدامِ نفس کُشی کی ناکام کوشش

روبینہ ان معدُودے چند خواتین میں سے ہیں جو کھانا بڑے شوق اور اہتمام سے پکاتی اور کِھلا کر خوش ہوتی ہیں۔ کوئی ڈھنگ سے داد دے تو دوبارہ سہ بارہ کھلاتی ہیں۔ جو خواتین کھانا پکانے، ریندھنے، پیاز کترنے، لہسن چھیلنے اور چُولھا جھونکنے کو بیگار اور سزائے زوجیت سمجھتی ہیں، قدرت ان کے ہاتھ سے لذّت اور برکت، دونوں خوبیاں چھین لیتی ہے۔ روبینہ شولا بہت لذیذ بناتی ہیں۔ کراچی آئیں تو مجھے بھی کھلانا چاہا۔ میں نے کہا، اس میں تو گوشت پڑتا ہے۔ میں تو ویجی ٹیرین (vegetarian) ہوں۔

''یہ بدپرہیزی کب سے؟''

''کسی نے برنرڈ شا (Bernard Shaw) سے یہی سوال کیا تو اُس نے بڑا معنی خیز اور ناقابلِ فراموش جواب دیا:

"I haven't tasted a fellow-creature for the last forty years."

★[1] بندھنوار: (ہندی) پھولوں، پتوں اور رنگین کترنوں سے بنائی ہوئی وہ خیر مقدمی محراب یا جھالر جو بنری کے گھر کے دروازے پر لگائی جاتی ہے۔ بدائی کے بعد وہ بھی اسی سے ہو کر پیا گھر جاتی ہے۔

''مگر کیوں؟ کیا محرومی کا سبب میڈیکل ہے؟''

میں ''نہیں'' کہہ کر چپ ہو گیا۔ اب اس معصوم سی جان کو کیسے بتاتا کہ فرسٹ ایئر میں برنرڈ شا کے علاوہ مہاتما گاندھی کا اہنسا کا فلسفہ اور Experiments With Truth پڑھی تو ان کی تین باتوں کا دل و دماغ پر بیحد اثر ہوا۔ اوّل، وہ گوشت خوری کو جِیو ہتیا اور مہاپاپ سمجھتے تھے۔ دوم، بھنگیوں کی بستی میں رہائش اختیار کی۔ سوم، ایک کنواری کنیا (باعصمت۔ دوشیزہ) کو اپنے پہلو میں لِٹال کے واقعی بیگانہ وار سوتے تھے! چنانچہ میں نے ماس (گوشت) کھانا چھوڑ دیا۔ دوسری شرط کی بجا آوری میں مجھے قطعاً کچھ نہ کرنا پڑا۔ اس لیے کہ بھنگیوں کی بستی ہمارے محلّے شکاریان سے ''پتھر مار'' فاصلے پر تھی۔

جہاں تک تیسری صورت کا تعلق ہے تو بڑی شدّت سے خواہش ہوتی تھی کہ میں بھی بالکل اسی طرح نفس کُشی کروں اور روز بروز بڑھتی ہوئی adolescence یعنی عنفوان شباب کی بدعنوان نفسانی خواہشات کا گلا اپنے ہی بے رحم ہاتھوں سے گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے کسی دوشیزہ کے پہلو میں بڑھاپے کی نیند سُلا دوں۔

سو رہتے ہیں ایک ساتھ لیکن
تلوار کی بیچ آڑ سی ہے

لیکن، بقول مرزا، مہاکٹھور کنواری کنیاؤں کی ناقدری اور عدم تعاون کے کارن تیاگیوں، سنّیاسیوں، مہاتماؤں اور سوامی راج نیش کی طرح نفسِ امارہ کی سرکوبی کے مناسب مواقع میّسر نہ آئے۔ تاہم مجھے بھی یقین آگیا کہ بزرگ سچ کہتے ہیں، اُٹھتی جوانی واقعی دِوانی ہوتی ہے!

ثبوت یہ کہ مجھے خواب میں آدم خور دیو، معصوموں کی گوشمالی اور اصلاح کے درپے مولوی صاحبان، دھاڑتے شیر کا جبڑا، الجبرا کا پرچہ، الف لیلیٰ کے ____ اِنشاء حبشی جلاّد کے خُونا خون ہاتھ، خوبصورت لڑکیوں کے ہیبت ناک بلکہ بھُوت ناک محافظ، ختنے کرنے والے عبدالحکیم نائی ____ نظر آنے لگے! آخر آخر میں تو ایسا زچ ہوا کہ خواب میں اُسطوخودُوس نثر کے نمونے جو دن میں ہجّے کر کر کے پڑھے تھے رات کو خواب میں بھی رو رو کے پڑھنے لگا۔ مثلاً

''اپنے نفس کی رہائی میں عمل کر کہ وہ سباعِ ضاریہ وافاعیٔ جاریہ وکلابِ عادیہ وعقبانِ مخلہ وشیاطینِ موسوسہ وسمومِ قاتلہ سے رہا ہو جائے۔''[1]

---

[1] تشنیف الاسماع۔

غرضیکہ جوانی دِوانی کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ ہمیں تو خواب ہی آئے شباب کے بدلے!

مرزا کہتے ہیں کہ جن خیالات و خواہشات کو ہم شیطان کا غلبہ سمجھ کر اُس پر لعنت بھیجتے ہیں، وہ درحقیقت ہم پر خود ہمارا ہی غلبۂ مخالفانہ ہوتا ہے!

یہ سب ''آؤٹ آف کورس'' باتیں تو پروفیسر روبینہ کو بتانے کی نہیں تھیں اور میں نے نہیں بتائیں، لیکن بعد ازاں پیش آنے والے واقعات کا جو احوال انہیں سنایا وہ علاحدہ عنوان کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

قصّہ میرے معاشقے اور ویجی ٹیرینزم کا

گھر والے میرے ہندوانہ ویجی ٹیرینزم (vegetarianism) سے سخت پریشان اور نالاں تھے۔ والدہ نے بہلا پھُسلا اور پچکار کر مجھے کوفتے اور پُلاؤ کھلانا چاہا جو میں اپنے بھانویں ایامِ جہالت و بے خبری میں بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ والد نے سمجھانے بُجھانے کے ساتھ ساتھ ڈانٹا ڈپٹا بھی مگر بندہ ڈٹا رہا!

تین سال تک میں نے مُردہ گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بی۔ اے فائنل میں پہنچا تو ایک دن والدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا کہ تمہارے بادا آج صبح کہنے لگے کہ اب اپنے لاڈلے کو کچھ نہ کہو۔ معلوم ہوتا ہے کسی ہندو لڑکی کے پھیر میں پڑ گیا ہے۔ دیکھ لینا، صاحبزادے کے سر پہ بالشت بھر کی چوٹی رکھوا اور لانگ دار دھوتی بندھوا کر سات پھیرے نہ لگوا دے تو میرا نام بدل دینا!

یہ سُن کر میں تو سناٹے میں آ گیا۔ سنّاٹا ختم ہوا تو والد کی غلط بیانی پر اس لیے اور بھی غصّہ آنے لگا کہ بُرا بھلا یارانہ تو ایک کرسچین لڑکی سے تھا! میں نے ان کو کبھی غلط بیانی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ دراصل مجھے بدچلنی کے الزام پر اتنا غصّہ نہیں آیا، جتنا کہ سر مُنڈا کر چوٹی رکھنے اور تبدیلی مذہب کی پدرانہ پیش گوئی پر! البتہ شادی کے پھیروں پر مجھے اصولاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ رات بھر عالمِ طیش و اضطراب میں کروٹیں بدلتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس طرح بُہتان کی تردید کروں۔ بارے اذانوں کے وقت ایک بُرہانِ قاطع بلکہ لاجواب ترکیب سُوجھی۔ میں نے دوپہر سے نہ صرف گوشت کھانا شروع کر دیا، بلکہ چانپ کو سب کے سامنے خونخواری سے بھنبھوڑا! اور نلی کو دانتوں سے کرڑ کرڑ چبا کر سارا گُودا ایک ہی سانس میں سُڑک گیا!

''اب کی دفعہ گوشت چھوڑے پانچ برس ہونے کو آئے۔ کسی اللہ کے بندے نے جھوٹوں بھی بہتان نہیں لگایا۔ لہٰذا ہنوز ویجی ٹیرین ہوں۔''

روبینہ اب تک میری بناسپتی کتھا خاموشی سے سنتی رہی تھیں، لیکن اس شکوے کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ کہنے لگیں ''اگر آپ صرف بہتان کے انتظار میں گھاس پھوس کھا کر مویشیوں کا حق مار رہے ہیں تو عرض ہے کہ پشاور میں ابھی کچھ عزّت دار ہندو اور آپ کی ہم عمر ہندنیا موجود ہیں۔ بندی بہتان لگانے کے لیے تیار ہے!''

شولہ خوردن را رُوئے باید

انہوں نے بغیر گوشت کا جو شولا میرے لیے خاص طور پر بنایا وہ تو واقعی بہت مزیدار نکلا۔ حیرت ہوئی کہ مرچوں کے بغیر بھی کوئی چیز مزیدار ہوسکتی ہے! آخر کو ۱۹۵۰ سے کراچی کا باسی نواسی ہوں۔ تبھی سے تتیا مرچ کھاتا اور سی سی کرتا ہوں۔ چٹخارے بھرتا ہوں۔ اور باقاعدگی سے امراضِ معدہ کا علاج کراتا ہوں۔

میں نے شولے کی تعریف کی تو کہنے لگیں، یہ تو کچھ بھی نہیں، اس کا مزہ تو اس وقت دیکھیے جب اس میں ہمارے مانسہرہ کے موتی دانہ مہکیلے چاول پڑے ہوں۔ سارا محلّہ مہک اٹھتا ہے۔ دشمن بھی قتل کے ارادے سے آئے تو پستول پھینک کر گھر کے باہر کھڑا لمبے لمبے سانس لے کر سونگھتا، رال ٹپکاتا رہ جائے! نرم اتنے کہ موم بتّی کی بھی آنچ دِکھائیں تو دم بھر میں گل جائیں۔ مجال ہے کہ کنی رہ جائے۔ ان چاولوں کا شولا کھانے سے پہلے تین دفعہ کُلّی کرنا لازم ہے تاکہ منہ میں کسی ناجنس ذائقے کی تلچھٹ باقی نہ رہے۔

انہوں نے بتایا کہ وہ شولہ اور طرح طرح کی ڈِشز بنا کر دوستوں کو کھلاتی ہیں۔ لوگ وقتاً فوقتاً فرمائشیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ ساتھیوں، طالب علموں اور احباب میں چٹورپن پھیلانے میں وہ بہت کامیاب رہی ہیں۔ صرف ایک بارہ ماسی ڈِش ایسی ہے جس سے چٹورے سے چٹورے آدمی کی طبیعت نہیں اُوبتی۔ وہ ہے غریب غُربا کا کھاجا: دال چاول! لذیذ ترین ڈِش اور چٹورے آدمی کی پہچان ہم بتائے دیتے ہیں۔ چٹورے کے سامنے آپ بیس طرح کی ڈِشز رکھ دیجیے۔ وہ اَدبدا کے اُسی ڈِش کی طرف ہاتھ بڑھائے گا جو سب سے زیادہ مضرِ صحت ہو! یقین جانیے وہی سب سے زیادہ لذیذ اور چٹخارے دار نکلے گی! چٹورے جن امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اُن کی جڑ معدے میں نہیں، زبان میں ہوتی ہے! اسی قبیل کے جان ہار چٹوروں سے متعلق ڈاکٹر معین قریشی نے ایک لطیفہ سنایا جسے نقل کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ وہ کچھ یوں ہے کہ دِلّی کے ایک چٹورے نے دوسرے چٹورے سے کہا:

''بھائی سبطین! سنا ہے بھیّا عارفین نہاری کی لنگر والی دیگ میں گر کر مر گئے۔''

''سُنا تو ہم نے بھی ہے۔ کیا گرتے ہی مر گئے؟'' دوسرے نے پوچھا۔ ''نہیں تو۔ دو دفعہ باہر نکلے تھے۔ ایک دفعہ ادرک لینے اور دوسری دفعہ نیبُو کے لیے۔''

وہ جب تک کراچی میں اپنی بہن اِرم ریحان کے ہاں رہتی ہیں بناسپتی شولے کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور بھیجتی رہتی ہیں۔ مثلاً مٹر پلاؤ، سوجی کا حلوہ، مونگ کی دال، پالک پنیر، کڑھی۔ گزشتہ جون میں کراچی آئیں تو میں نے انہیں بتایا کہ جس کڑھی میں پھُلکیاں نہ ہوں اُسے رانڈ کڑھی کہتے ہیں! رنڈاپے کی اس اطلاقی صورت سے بہت محظوظ ہوئیں۔ چنانچہ اب کے سال ستمبر میں آئیں تو کڑھی کے ساتھ ایک پرچی بھی تھی جس پر سُرخ روشنائی سے لکھا تھا ''سُہاگن کڑھی کے ہمراہ اس کے بارہ عدد غیر نکاحی سرتاج بھی علاحدہ ڈبے میں پیشِ خدمت ہیں۔'' اشارہ گرم پکوڑوں کی طرف تھا!

(۱۶)

زہرا نگاہ، صاحبِ عالم اور بہادر شاہ ظفر

اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ جب سے ویجی ٹیرین ہوا ہوں، کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا کہ بہن زہرا نگاہ نے سبزی ترکاری نہ بھیجی ہو۔ اگر یہ کہوں کہ میرے ویجی ٹیرینزم کا بھرم ان کے دم سے قائم ہے تو غلط نہ ہوگا۔ جیسا کہ ابھی آپ کے گوش گزار ہوا، میں لنچ اور ڈنر میں ایک پھُلکے یا ایک توس سے زیادہ نہیں کھاتا۔ نہ کھا سکتا ہوں۔ ظاہر ہے ایک توس سے زیادہ سے زیادہ دو چمچے بھر ساگ ترکاری کھائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ان کی بھیجی ہوئی سبزی ہفتے بھر چلتی ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ خدا مسلمان کے گھر میں راندھی ہوئی سبزی اور ہندو کی رسوئی میں ریندھے گوشت سے بچائے! زہرا بیگم نے اس قول کو آدھا غلط ثابت کر دکھایا۔ ان کی دعوتوں میں پانچ چھ سبزیاں میز پر ضرور ہوتی ہیں۔ ذائقے، مہک، رنگت اور دیکھت میں ہر ایک مختلف۔ پچھلے ہفتے ایسا ہوا کہ ٹھیک دو بجے میں نے انہیں کے پکائے ہوئے حیدرآبادی بگھارے بینگن کے دو تین ہی لقمے لیے تھے کہ اُن کا ڈرائیور کریلے اور گُڑ کے چاول لے آیا۔ ایک دن بھنڈی کا پہلا لقمہ حلق سے نہیں اترا تھا کہ انگریزی محاورے کے بمصداق on the dot کاشی پھل (میٹھا کدو) آ گیا جو ساٹھ سال سے نہیں چکھا تھا! مٹی کی کوری ڈھبری میں ذردَرے چاولوں کی کھیر اس کے علاوہ۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میں بڑے شوق سے گھر میں بنا زردہ کھا رہا تھا کہ بنگالی خانساماں نے اطلاع دی کہ جورا باجی نے گوار کی پھلی، رساول اور

ملائی بھیجی ہے۔ اب اگر کوئی یہ پُوچھے کہ پھر آپ نے اپنی پسند کا زردہ کھایا یا رساول [★1] تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اُس غریب نے کبھی رساول نہیں چکّھا۔ ایک دفعہ میں نے خود منہ پھوڑ کر فرمائش کی کہ بھپوری اور کھنڈوی [★2] ساٹھ سال سے نہیں دیکھیں! انہوں نے دوسرے ہی دن نہایت مزیدار پکا کر بھیج دیں۔ شلغم کے کباب ان کے علاوہ۔ وہ بھی میں نے ساٹھ سال سے نہیں چکّھے تھے۔

مرزا نے ہمارے مسودے پر نظرِ ثانی کے دوران یہ پیراگراف پڑھا تو شام کو ملتے ہی کہنے لگے کہ جن مزوں سے تم ساٹھ برسوں سے محروم رہے ہو اور اتنے ہی برسوں سے جی کو مارے بیٹھے ہو، اگر ان کی قابلِ اشاعت فہرست مجھے عنایت کر دو تو ہم سب سر جوڑ کر کوئی جتن، کوئی ترکیب و ترکیب کرتے ہیں۔

''شکریہ۔ یہ کبوتر دوبارہ چھتری پر نہیں آتا۔ اُڑ گیا سو اُڑ گیا۔ سنو! ہر مزے کا چکھوتیا، ہر نشے کا رسیا داغؔ کیا کہتا ہے:

بزمِ احباب و مئے ناب و وصالِ معشوق
اب کسی شے میں نہیں جس کو مزہ کہتے ہیں''

''تمہارے لہجے میں شکایت کا عُنصر روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔'' مرزا نے کہا۔

''کیا کروں، بڑھاپے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے! بھری جوانی اور پیری میں ایک بات مشترک ہے۔ دونوں ہی جب ٹوٹ کے آتی ہیں تو سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ کسی طرح بس میں نہیں آتیں!'' میں نے جواب دیا۔

اللہ ان دونوں محبتی اور درد مند خواتین کو سلامت با کرامت رکھے۔ ان کی کرم گستری مجھے تو واجد علی شاہ کے سوتیلے بھائی صاحب عالم شاہزادہ مرزا سلیمان قدر محمد حسن علی بہادر کی دریا دلی اور قدر افزائی کی یاد دلاتی ہے، جس کا احوال اُس کے مصاحب اور Boswell سیّد حسن لطافت نے ''فرمانِ سلیمانی'' میں یوں بیان کیا ہے:

''خاصہ پر سے حسبِ دستور میرے لیے کھانا آیا۔ میں نے اور میرے پسر نے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے ہی کو تھا کہ حضور نے خربوزے بھیجے۔ سالم خربوزوں کو تراش کے کھا ہی رہا تھا کہ ایک پلیٹ نہایت عمدہ پکے ہوئے جھینگے حضور نے بھیجے۔ وہ جھینگے رُوکھے رُوکھے کھا ہی رہا

★[1] رساول: گنّے کے رس کی کھیر۔

★[2] بھپوری: بھاپ پر بنی ایک قسم کی موگوری۔ پکانے کی ترکیب ''جورا باجی'' سے پوچھیے۔
کھنڈوی: ایک قسم کا سالن جو بیسن کو پکانے کے بعد جما کر برنی کی شکل میں کاٹ کر پکایا جاتا ہے۔ علمی لغت۔

تھا کہ سفیدہ خربوزوں کی قاشیں قاب میں آئیں اور تجمّن محلدار نے کہا کہ حضور نے فرمایا ہے کہ یہ خربوزے بہت میٹھے ہیں، انھیں کھایئے، پہلے کے خربوزے آدمیوں کو دے دیجیے۔ قاشیں خربوزوں کی کھا ہی رہا تھا کہ ایک قاب میں تین آم بمبئی آئے۔ انھیں تراش کے کھانا ہی شروع کیا تھا کہ ایک پلیٹ مٹھائی حضور نے بھیجی، کچھ مٹھائی بھی کھائی کہ فوراً ایک پلیٹ میں کیلے نہایت شیریں چھلے ہوئے (آئے) اوس میں سے بھی ہم دونوں نے کھائے۔''

جب سے تقلیل پذیر فیض رسانی کی یہ رُوداد پڑھی ہے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں میری کرمفرماؤں کا دریائے مرحمت و ضیافت بھی بہتے بہتے تنک آبی سے اتنا خشک نہ ہو جائے کہ نوبت یہاں تک پہنچے کہ میرے ہاتھ میں نوازش ہائے رفتہ کی نشانی فقط خرُبوزے کی ایک پھانک اور چھلا ہوا کیلا رہ جائے!

ع ناچیز کو یہ دن نہ دِکھانا یا رب

ہم کس شمار و قِطار میں ہیں۔ ہمارے ہیرو مرزا غالب بھی الطاف خُسروانہ میں مرحلہ وار خِست کا شکار رہے کہ ان کا مربی و مُنعم خود مبتلائے اِدبار تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے ۱۲۶۶ھ میں مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خِلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جِیغہ وسرپیچ وحمائل مَرواریدکے دربارِ عام میں عنایت فرمایا۔ مولانا حالی رقم طراز ہیں کہ ایک روز بادشاہ نے غالب کو آموں سے لدے پیڑ کو للچائی نظروں سے تکتے دیکھا تو عمدہ عمدہ آموں کی بہنگی ان کے گھر بھجوا دی۔ کہاں تو الطاف و اکرام کی یہ بارش اور کہاں یہ تقاطر کہ فقط بیسنی روٹی۔ بطور شاہی تورہ، پورے درباری پروٹوکال کے ساتھ ارسال فرمائی جارہی ہے! اس کے بعد دال کا تورہ! غالب نے دونوں کی رسید بصد تشکر رباعیوں کی شکل میں دی۔ اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا جب بادشاہ اپنے حضور قصیدہ گزراننے والے شاعر کا منہ اشرفیوں سے بھر دیتے تھے۔ پھر ایسا بجوگ پڑا کہ بادشاہ نے شاعرِ غُرّا[1] کی مُنہ بھرائی کے لیے اشرفیوں کی بجائے بیسنی روٹی استعمال کی اور وہ غریب اس پر بھی پھُولا نہ سمایا!

ع بنا ہے شہ کا مُصاحِب، پھرے ہے اتراتا!

موازنہ ملائی و بالائی

ایک دن کراچی میں دورانِ گفتگو میرے پسندیدہ میٹھے یعنی زردے کا ذکر آیا تو میں نے روبینہ

---

[1] شاعرِ غُرّا: بزعم خود بڑا شاعر بننے والا۔ بڑا شاعر۔ استادِ فنِ شاعری۔ اردو لغت

کو بتایا کہ اگلے وقتوں میں لکھنؤ کے شرفا کا دستور تھا کہ دعوت میں پیدل جاتے تو ایک دونے میں بالائی ساتھ لے جاتے تھے تاکہ زردے پر تہ جما کر کھائیں۔ روبینہ کو اس پر بہت اچنبھا ہوا۔ کہنے لگیں، یہ تو گویا میزبان کی کھلی توہین ہوئی! ہمارے ہاں پٹھانوں میں اگر کوئی مہمان اس طرح دونا ہتھیلی پر نچاتا آئے تو غیور پٹھان میزبان دونا دیکھتے ہی حاملِ ہٰذا کو دونے سمیت پستول سے اُڑا دے گا۔"

"بہر حال، زمانۂ قدیم سے شرفا میں یہ دستور چلا آتا تھا۔" میرا لہجہ کھسیان پت سے خالی نہ تھا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ دس بارہ دن بعد روبینہ نے اپنی امّی کی ترکیب سے پکایا ہوا زردہ بھیجا۔ اس کے ساتھ سبز کاغذ سے بنایا ہوا دونا بھی تھا۔ مُنسلِک کارڈ پر ارقام فرمایا تھا:

"یہ زردہ خود پکایا ہے۔ گزارش ہے کہ حسب دستور شرفائے قدیم ذرا برنس روڈ پیدل جا کر اس کام چلاؤ دونے میں بالائی لے آیئے گا۔

خاکسار روبینہ

مکرر آنکہ، واپسی میں ہاتھ میں دونا لیے کسی پٹھان بستی سے نہ گزریئے گا۔ بصد ادب، احتیاطاً و انتباہاً عرض ہے۔"

یہ ذکر اِس صراحت کے بغیر اُدھورا رہے گا کہ بالائی اور ملائی گو کہ ایک ہی چیز ہے، لیکن محلِ استعمال اس میں جُداگانہ ذائقہ سموتا اور مختلف مزا دیتا ہے۔ اس مزے کا تعلق جتنا زبان سے ہے، اتنا ہی حِسّ و حُسنِ سماعت سے بھی ہوتا ہے۔ زبان و بیان اور ملائی کے رسیا جانتے ہیں کہ اس کا آدھا مزہ تو اس کے تلفظ ہی میں آجاتا ہے! جہاں تک ملائمت، نازکی اور لہجے کی مٹھاس کا تعلق ہے، بالائی میں وہ ملائی کی سی بات کہاں! ملائی کی ملائمت کا تو یہ عالم ہے کہ اگر اسے گُھلاوٹ کہیں تو اس پر خراشیں پڑ جائیں جو گلا پکڑ لیں گی! جس نے بچپن میں ملائی کی برف کھائی ہے وہ جانتا ہے کہ پھیری والا اگر اسے بالائی کی برف کہہ کر ہانک لگاتا تو نمدے کی چِٹھوں میں لپٹی لپٹی ہی گُھل گُھلا کے لبدھڑا بن جاتی، کوئی بچّہ مفت بھی نہ لیتا۔ اردو لغت میں "سخندان: فارس" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے ملائی کا نام بالائی رکھا۔ صاحبو، بُرا کیا! ملائی کا مزاج مختلف، ذائقہ مختلف، کھانے والے مختلف اور گلے سے اُترنے کی ریشمیں کیفیت سراسر مختلف! یہ بیّن فرق نظیر اکبرآبادی کے اس شعر سے بھی آشکارا ہے جو لغت نویس نے طریق و محل استعمال دکھانے اور سکھانے کی غرض سے بطور سند نقل کیا ہے:

؎ جب پیٹ ملائی سا وہ دیتا تھا دکھائی
کھانے کو چلی آتی تھی مِصری و ملائی

مجھے یہ شعر نقل کرتے ہوئے حجاب ضرور آیا، مگر اس خیال سے ہمت بندھی کہ بظاہر بازاری سے کلمات و تشبیہات علماء و اساتذہ کو خالصۃً علمی گفتگو کے دوران زیب دیتے ہیں، بشرطیکہ وہ مزے لے کر نہ پڑھیں!

اب تھوڑی دیر کے لیے پہلے مصرع کو اس طرح پڑھیے:

جب پیٹ وہ "بالائی" سا دیتا تھا دکھائی

شعر میں نوابی اصلاح کے بعد ہمیں تو اُس دُکھیا کے پیٹ کی پلپلاہٹ اور stretch marks (وہ جُھرّیں جو دورانِ حمل پیٹ بڑھنے اور زچگی کے بعد سکڑنے سے جلد پر نمودار ہوتی ہیں) تک نظر آنے لگے۔ خیر، پیٹ کو اپنی ماقبل و مابعد حالت زچگی میں نواب صاحب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے۔ اس بھونڈی اصلاح کے بعد ہمیں تو بالائی سے بھی اس حد تک چڑ ہو جائے گی کہ متعلقہ حلوائی تک کی پٹائی کرنے اور اُس کے پیٹ پر اُس کی بنائی ہوئی بالائی لتھیڑ کر اُسی کے کتے سے چٹوانے کو جی چاہے گا! اسی طرح اگر ملائی کی قلفی، ملائی کے لڈو اور رس ملائی کو بالائی کی قلفی، بالائی کے لڈو اور رس بالائی کہا جائے تو یہ اشیائے ناخوردنی صرف اس لائق رہ جائیں گی کہ نواب سعادت علی خاں کو عالمِ بالا میں غِلمان force-feed (غذا بالجبر) کے طور پر کھلاتے رہیں!

ناصاحب! نا! لفظ بالائی تو صرف آمدنی کے ساتھ ہی معنی و مزہ دیتا ہے! ایک زمانے میں اسی قبیل کی ایک اور اصطلاح "بالائی مزے" بھی رائج تھی۔ لیکن اس کے معنی ایسے ہیں کہ نقل کرتے ہوئے قلم کانپنے لگے گا! انتباہ کے باوجود اگر کوئی صاحب یہ جاننے کے لیے مُصِر یا بیتاب ہوں کہ ذرا دیکھیں تو آخر معنی کتنے خراب یا مخربِ اخلاق ہیں تو اُن سے گزارش ہے کہ علمی لغت کا صفحہ ۱۸۸ ملاحظہ فرما کر اپنی تشنگی وغیرہ رفع کر لیں۔

قُطب از جا نمی جُنبد

مرزا کہتے ہیں کہ یہ جو تم بات بے بات اور از خود مشتعل ہو کر "علمی لغت" کے حوالے دیتے رہتے ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے تم نے اس کی تشہیر اور مارکیٹنگ کا بیڑا اٹھایا ہے!

عرض ہے کہ مجھے علمی لغت اس لیے بھی پسند ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب یہ میری کسی نہ کسی غلطی کی نشاندہی نہ کرتی ہو۔ میں خوش ہوتا ہوں کہ چلو میری کم علمی کے بحرالکاہل اور مجموعہ اغلاط میں آج ایک غلطی کی کمی تو ہوئی۔ یوں تو بائیس جلدوں والی اردو لغت بھی ایک قدم کے فاصلے پر

قرینے سے رکھی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے مختصر حجم کے باوجود علمی لغت واقعی جامع، مستند اور قابلِ اعتبار لغت ہے۔ اس کے مولف وارث سرہندی ''سخن ہائے گفتنی'' میں لکھتے ہیں کہ ''اگر ان تمام کتابوں کی فہرست پیش کی جائے جن سے اس لغت کی تیاری میں مدد لی گئی ہے تو یہ بجائے خود ایک تالیف بن جائے گی۔'' مولف نے پوری جان کاری اور جانفشانی کا ثبوت دیا ہے اور تحقیق و تدوین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

پسندیدگی کی دوسری وجہ ذاتی اور کسی حد تک جذباتی ہے۔ کم و بیش بیس برس ہونے کو آئے، مجھے خارجاً یہ معلوم کر کے دکھ ہوا کہ وارث سرہندی ایک چھوٹے سے گاؤں میں تنگ دستی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں نے مُشفق خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ ہم سب کے لیے شرم کی بات ہے کہ ایسا فاضل اَجل اسکالر یوں عُسرت میں زندگی گزارے۔ وہ اگر کراچی آجائیں تو معقول ملازمت ہمارا ذمہ۔ اِنفاق فاؤنڈیشن سے ماہانہ وظیفے کے لیے بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ پیغام ایک دوست کے توسط سے اُن تک پہنچا دیا۔ اُن کا دوٹوک جواب جو خواجہ صاحب نے مجھ تک پہنچایا یہ تھا کہ کرم فرمائی کا شکریہ۔ میں اپنی بوڑھی ماں اور بھینس کو یہاں چھوڑ کر کراچی نہیں آسکتا۔ فی الحال، رفاہی ادارے کی امداد بھی قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ میں بہت آرام سے ہوں۔

صاحبو، لغت اپنی جگہ، ایسے فقیر منش اور صاحبِ وقار و منزلت کی ہر بات کو سند جاننے اور ماننے میں یوں بھی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ عاجز کا سلام پہنچے۔

ایک اوکھا انوکھا دُکاندار

فَقر و استغنا کا تذکرہ مولانا ایوب دہلوی کے ذکر کے بغیر بالکل اَدھورا رہے گا۔ میں نے مولانا کو اپنے عزیز دوست میاں فضل حسن کے ہاں دیکھا اور گھنٹوں بڑے شوق اور ادب سے سنا۔ وہ ان کے ہاں اتوار کے اتوار تشریف لاتے تھے۔ فضل صاحب ان کے فرمودات بڑی عقیدت اور باقاعدگی سے ریکارڈ کرتے۔ حکیم سعید صاحب کے پاس بھی ان کی باتیں بیسیوں کیسٹوں پر محفوظ تھیں، جن کے کچھ حصے چھپ چکے ہیں۔ دور ہو یا قریب، کہیں بھی جانا ہو، میں نے مولانا کو ہمیشہ پیدل ہی آتے جاتے اور دسمبر اور جنوری میں بھی صرف ململ ہی کے کُرتے میں دیکھا۔ دقیق سے دقیق نکتے کو باتوں ہی باتوں میں بہت سَہل اور سجل پیرایے میں بیان کر دیتے۔ جتنی رسان سے وہ سمجھاتے، اتنی ہی آسانی سے بات سمجھ میں آجاتی۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے، اُس کے اختتام پر فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے۔ چائے، مشروبات، کھانے اور کسی بھی قسم کی تواضع سے پہلے ہی بعُجلت رخصت ہو جاتے۔

بندر روڈ کے آخری سرے پر میری ویدر ٹاور (Merewelher Tower) کے نزدیک مولانا کی ''لیدر گُڈس'' (چمڑے کے سامان) بالخصوص سُوٹ کیسوں کی دکان تھی۔ وہ صبح ٹھیک گیارہ بجے خود دکان کھولتے اور فروختنی اشیاء کو ڈسٹر سے جھاڑ پھونک کر ترتیب سے سجاتے۔ جیسے ہی اتنی بکری (فروخت) ہوجاتی کہ دن کا خرچ نکل آئے، وہ فوراً تالا لگا کے اپنی beat (معمول کا گشت) پر نکل جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پوری طرح دکان کُھلنے سے پیشتر ہی بوہنی ★[1] دن کی دال روٹی جوگے ہوجاتی تو وہ ڈسٹر پھینک پھانک کر دکان کا شٹر گرا دیتے! اکثر و بیشتر دو تین گھنٹے ضرور لگ جاتے۔ آج اور صرف آج کی حاجت وضروریات سے زیادہ بکری و منافع کے وہ طالب تھے نہ قائل۔ فقر و قناعت کی اس کٹھن روش پر اس درجۂ کمال تک قائم رہنا اسی حالت میں ممکن ہے کہ بندے کو خیرالرازقین کی حکمت رزاقی پر کامل یقین ہو۔ اُن کی عظمت و برگزیدگی کے تو سبھی قائل تھے لیکن ان کے اہلِ خانہ اور لواحقین کے توکل اور نہفتہ عظمت پر شاید و باید ہی کسی کی نظر گئی ہو! سلام ہو اُن پر۔

مولانا کو جب اور جہاں بھی دیکھا، ایسا لگا کہ بہت جلدی میں ہیں۔ جس عاجلانہ وفقیرانہ شان سے آئے ہیں، اسی طور کہیں اور جانے کی جلدی ہے۔ مولانا نے ساری زندگی اسی وضع و نہج پر گزاری اور پایانِ عمر بھری بزم کو حُسنِ ساعت میں گُم چھوڑ کر جہاں جانا تھا اسی طور شتابی چلے گئے۔

مَنّتوں کے روزے اور شاہدہ مِنی

اگر درمیان میں روبینہ کی کھنکتی کِھل کھلاتی ہنسی، رنگ برنگے پرس، چھپکلی سے خوف اور ممتاز مفتی سے عقیدت حائل نہ ہوتی تو ہم انہیں مُلانی کہہ سکتے تھے! پابندی سے پنج وقتہ نماز، رمضان کے روزوں، عیدالفطر کے بعد چھ اور عیدالاضحیٰ کے بعد دس روزوں کے علاوہ وہ ہر ماہ چار پانچ نفلی اور منّتوں کے روزے ضرور رکھتی ہیں۔ ان کا خلوص اور حُسنِ نیت آشکارا ہے۔ کراچی میں وہ جب بھی شام کو ہمارے یہاں آتی ہیں تو ہم احتیاطاً ان کے افطار کے لیے بھبکتے پکوڑوں، چاٹ، پھلوں اور شربت روح افزا کا ضرور اہتمام کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے اندازے پر اکثر رشک آتا ہے۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ان کا روزہ نہ تھا لیکن اخلاقاً افطار کیا! پھر اخلاقاً وشرعاً یہ بتانا ضروری سمجھا کہ روزے سے نہیں تھی! بس مہمان کو میزبان کی تالیفِ قلب مقصود تھی۔ اللہ دونوں کی خوش اخلاقی معاف فرمائے۔ ان کی مَنّتوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: یا اللہ...... کو شفائے عاجلہ عطا ہو۔ (ایک روزہ) یا اللہ...... اِن دونوں بچّوں کو (پی ایچ ڈی) ڈیفنس میں سرخرو کردے۔ یا اللہ، میری ننھی گولڈ فش کی دستگیری فرما۔ دو دن سے چوگا نہیں چھوا ہے۔ کالی مچھلی پیچھے پڑ گئی ہے۔ اللہ اس کلّو کو نیک ہدایت دے! (دو روزے)

★[1] بوہنی: ''وہ بکری جو دن میں پہلے پہل ہو۔''

یا اللہ، اس معصوم بچی کو................ کی نظرِ التفات سے محفوظ رکھ۔ وہ سہل انگار صرف بھولی بھالی بچیوں کو پھانستا ہے۔ کام تو کام، بدبخت بدمعاشی میں بھی محنت سے جی چُراتا ہے! (دو روزے) یا اللہ، شربتِ توت سیاہ سے یوسفی صاحب کی لاعلاج کھانسی دور کر دے۔ یا اللہ، یارب العزت، اپنی رحمت اور قدرت کاملہ سے اُن کو شاہدہ منی کے گانے اور شُتر غمزوں سے بیزار کر دے اور گھاس پھوس سے دِلی رغبت کو دور کر دے۔ (گھاس پھوس سے اُن کی مراد وہ نہیں جو شاید آپ کے ذہنِ رسا میں آئی ہو۔ اشارہ میرے vegetarianism کی طرف ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔)

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ ساری کی ساری منّتیں اور دعائیں دوسروں کے لیے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو دُعا بے غرضانہ اور خلوصِ نیت سے دوسروں کے لیے مانگی جائے اُسے مُجیب الدعوات ضرور شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ کہ میرے کیس میں ان کی منت پوری ہوئی اور میری طبیعت بہت جلد اُوب گئی۔ مطلب یہ کہ شاہدہ منی کے گانوں کی بجائے میں مادھوری ڈکشٹ کے رقص کی DVD شوق سے دیکھنے لگا!

روبینہ کی منتوں کی فہرست مُرتب کی جائے تو اس بچی کی غمگساری، دلسوزی، رقیق القلبی، ایثار اور بھولپن کی تصویر سامنے آجائے گی۔

(۱۷)

نقشہ میرے کمرے کا

چار سال قبل جب روبینہ نے میرا کمرہ دیکھا تو آبدیدہ تو نہیں ہوئیں، مگر سناٹے میں رہ گئیں۔ مجھ سے ان کا چہرہ نہ دیکھا گیا، میں نے سر اور نظریں جُھکا لیں۔ ایسی بدنظمی، بکھراؤ اور پراگندہ حالی دیکھ کر شاک میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود بے حد نفاست پسند ہیں۔ درس و تدریس اور پتی سیوا سے جو وقت بچتا ہے وہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی، جھاڑو بہارُو اور آرائش میں بصد شوق و انہماک صَرف کرتی ہیں۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے روزانہ سارے گھر میں مچھر اور کاکروچ مار اسپرے اس قدر زور دار کرتی ہیں کہ اس کے بعد مچھروں اور کاکروچوں کا کیا ذکر، خود ان کے میاں شاہجہاں بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ روزانہ ڈسٹنگ بھی خود ہی کرتی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں کوئی چیز ایسی نہیں جس پر ان کے تازہ ترین فنگر پرنٹس نہ پائے جاتے ہوں۔ کلاس رُومز سے مُلحق ان کا ایک چھوٹا سا، سادہ سا کمرہ ہے، جو ان سے بھرا بھرا، سجا سجایا لگتا ہے۔ اِنٹرول میں یہ ''ٹی روم'' بن جاتا ہے جہاں سب ساتھی گھڑی بھر کو تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ وسط میں شیشے کی ٹاپ والی ایک خوبصورت میز ہے۔

فرش بھی آئینے سے کم نہیں۔ میں تو اس میز پر لکھ پڑھ نہیں سکتا، اس لیے کہ جب کتاب کے حروف سے پہلے اپنے ہی چہرے کے عکس پر نظر پڑے تو اس کا مطالعہ کرنے کے بعد نقاشِ ازل کی صنّاعی اور تصویر کے چند خطوط کی اصلاح کرنے کو بے اختیار جی چاہے گا جو بے بس بندے کو زیب نہیں دیتا۔

اس ملاقات کے بعد وہ جب بھی آئیں، میں اپنے کتاب گودام اور کارخانے میں تالا لگا کر ان سے ڈرائنگ رُوم میں ملا۔ جو رقیق القلب خواتین اور curious مرد حضرت اس حیرت، شاک اور تردّد کے عالم سے نہیں گزرے جو فقیر کے حجرے کو دیکھ کر حسّاس طبیعتوں پر طاری ہوتا ہے، اُن کی آگاہی کے لیے، نیز بطور حفظِ ماتجسّس و تردّد، اس کا نقشہ کھینچنا ضروری ہوگیا جو کچھ یوں ہے:

ایک کشادہ و آرام دہ باتھ رُوم ہے جسے میں متواتر اور بکثرت استعمال کرتا ہوں۔ اگر آپ چھوٹتے ہی دریافت فرمائیں کہ بکثرت کیوں، تو میرا جواب وہی ہوگا جو حلوائی کے لونڈے نے دیا تھا! بہر حال، اس کشادہ باتھ روم کے ساتھ ایک اٹیچڈ کمرہ ہے جو کہنے کو تو اسٹڈی کہلاتا ہے، لیکن یہی میری لائبریری، ورکشاپ، ٹی وی لاؤنج، کمرۂ علالت و عدم نگہداشت، خلوت کدہ، کتاب گودام، خواب گاہ، دھیان گیان کی گپھا، کلبہ احزاں، عشرت کدہ، گوشۂ اعتکاف سمادھی، بودھ گیا، دیوارِ قہقہہ سب ہی کچھ ہے۔

اس کمرے کی چاروں دیواروں کے ساتھ لگے racks میں چھت تک کتابیں قطار اندر قطار سجی اور مہینوں سے گرد میں اَٹی ہیں۔ ان کتابوں سے استفادہ تو گاہے بگاہے ہی ہوتا ہے، البتہ ایک مستقل فائدہ یہ ہوا کہ چھپکلیوں نے آنا چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ ان کے رینگنے کے لیے جگہ نہیں بچی۔ فرش پر کتابوں کی ڈھیریاں، تہ بہ تہ بنڈل، کتب مینار، انبار، انّمبار اور دھانگ★ لگے ہیں۔ اسی کونے میں پرانے اور بوسیدہ رسالوں کا استوپا بھی ہے۔ پانچ پلاسٹک کے تھیلوں میں وہ کتابیں ہنوز بند ہیں جو میں نے گزشتہ چھ ماہ میں خریدی تھیں۔ لیکن انہیں روایتی بلّی کی طرح تھیلی سے باہر اس لیے نہیں نکال سکتا کہ ڈھنگ سے رکھنے کے لیے کہیں جگہ نہیں۔ ایک pyramid نُما ٹیکری ان کتابوں پر مشتمل ہے جو تحفتہً یا گردپوش کا فلیپ اور blurb لکھوانے کے لیے ارسال کی گئیں۔ کمرے میں اب دوسری کُرسی یا اسٹول رکھنے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ لہٰذا میں نے ناپسندیدہ کتابوں،

★ دھانگ: ''(کاشتکاری) اناج کی بالوں کا بُرجی نما بنا ہوا انبار۔''
یہ لفظ میں نے جان بوجھ کر نئی نسل کے قارئین کا ذخیرۂ الفاظ اور معلوماتِ عامہ بڑھانے کی غرض سے اس لیے بھی استعمال کیا ہے کہ انہوں نے تو گیہوں بھی صرف آٹے کی شکل میں دیکھا ہے! یا بہت سے بہت اُس گناہ کی شکل میں جو اسے کھانے سے سرزد ہوا اور جنت سے نکالے جانے کا سبب بنا۔

علامتی افسانوں اور نثری نظموں کے چند مجموعوں کو تلے اُوپر رکھ کر 18x18x18 انچ کا ایک چبوترہ بنا لیا ہے جس پر بیٹھ کر فون پر افتخار عارف، زہرا نگاہ اور روبینہ سے ادبی گفتگو کرتا ہوں۔ ایک مدّت سے جھاڑو بھی نہیں لگوائی۔ جھاڑو تو اس صورت میں دی جاتی ہے جب اسے فرش پر رکھنے اور چلانے بُلانے کے لیے جگہ ہو۔ دو سال ہوئے صفائی کے لیے میں ایک چھ سات انچ لمبا برش خرید کر لایا تھا۔ مرزا کہتے ہیں کہ اب تو تمہارے قالین کی صفائی صرف ٹوتھ برش سے کی جاسکتی ہے! اپنی کرسی سے مطلوبہ کتاب تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا کہ حاکموں اور حسینوں تک رسائی! ہر قدم اس طرح رکھنا پڑتا ہے جیسے شطرنج کی بساط پر بڑے غور وفکر کے بعد مُہرے کو ایک خانے سے دوسرے خانے میں لے جاتے ہیں۔ ذرا چُوکے اور یہ شہ اور یہ پیدلی مات![1★] بادشاہ سلامت بساط پر اوندھے منہ پڑے ہیں! میں بھی چار پانچ دفعہ کتابوں کے انبار اور extensions کے تاروں میں اُلجھ کر کبھی اوندھے اور کبھی سیدھے منہ گر چکا ہوں۔ اِس کا بھی مزہ یاد ہے، اُس کا بھی مزہ یاد۔ دس برس قبل ممتاز صحافی شفیع عقیل بھی اپنے کمرے میں بکھری بلکہ بِھری کتابوں میں اُلجھ کر گر چکے ہیں۔ فریکچر یوں کہنے کو تو جُڑ گیا، مگر جاتے جاتے چھڑی اور فتوحاتِ تیموری کا عزم بخش گیا!

ہماری ڈاکٹر بیٹی سیما امریکہ سے آئی تو کمرے کا نقشہ دیکھ کر بہت فکر مند ہوئی۔ کہنے لگی ''اِس عمر میں ہڈیاں بہت brittle (بُھر بُھری) ہوجاتی ہیں۔ ٹوٹتی ہیں تو پھر نہیں جڑتیں۔ ''A fall can be fatal.

بات میری بھی سمجھ میں آ گئی۔ لہٰذا اب صبح و شام کیلشیم کی گولی پابندی سے کھاتا ہوں، تاکہ فریکچر کے بعد ہڈی آسانی سے جُڑ جائے!

(۱۸)

کہیں اوڑھ چدریا سجنی گئی
کوئی کفنی پہنے راہ تکت ہے

کمرے کے ایک کونے میں میری آرام دہ ''آرم چیئر'' ہے، جس پر صبح نو بجے سے رات کے دو بجے تک (تین گھنٹے کا وقفہ برائے لنچ، قیلولہ اور ڈنر) بیٹھا رہتا ہوں۔ دیکھیے، پھر وہی سوال نہ کیجیے گا کہ چودہ گھنٹے اس پر بیٹھے کیا کرتے ہو؟

[1★] پیدلی مات: شطرنج کی وہ بازی جس میں مدِّ مقابل پیدل مُہرے سے ذلّت آمیز مات دیدے۔

ـــ چوں شمع بُود منزلِ ما زیرِ پائے ما
از پانشستہ ایم بمنزل رسیدہ ایم
غنی کاشمیری

یہ کُرسی میرا جوگیا مرگ چھالا ہے اور یہی میرا راج سنگھاسن اور تختِ طاؤس۔ اِس کو ہر دو معنی میں بوریائے فلاکت ★[1] بھی کہہ سکتے ہیں۔ چناں چہ مرزا اس کرسی کو میری تصویرِ کَسمپُرسی کہتے ہیں! اس سے تین انچ کے فاصلے پر میرا ۳×۶ فٹ بیڈ ہے، جس پر ٹھیک دو بجے شب زرد چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میرے بے حد پسندیدہ بسنتی رنگ کی یہ چادر مرحومہ (ادریس فاطمہ) نے بڑے شوق سے اپنے ہاتھ سے اپنے لیے سی تھی۔ ہلکے زرد رنگ کی دوہری چادر میں ہلدی سے بھی زیادہ پیلے رنگ کی اُریب گوٹ بڑی کتر بیونت کے بعد لگائی تھی۔ آخری دن دمِ وداع یہی چادر اوڑھے ہوئے تھیں۔ رُخسار بھی ہم رنگِ چادر ہو چلے تھے۔

سب نے کہا، یہ چادر بھی فقیر فقرا کو دے دلا دو۔ سو میں نے سب سے اُتاؤلے باؤلے سوالی، دھجا دھاری بیراگی ★[2] کو یہ کفنی سونپ دی۔ کہیں اوڑھ چدّریا بجنی گئی، کوئی کفنی پہنے راہ تکت ہے!

روبینہ نے جب تیسری دفعہ بھری محفل میں مجھے فہمائش آمیز مشورہ دیا کہ آپ ایک سیکریٹری یا اسسٹنٹ کیوں نہیں رکھ لیتے جو ان کتابوں کو ڈھنگ سے رکھے۔ ڈسٹنگ کرے۔ دیکھ ریکھ کرے۔ کیٹلاگ بنائے، سارا گند، سارا دِلدّر نکال پھینکے۔ کمرے کو انسانوں کے رہنے کے قابل بنائے۔

''دِلدّر کا نصف بدتر حصّہ تو میں خود ہوں! جی چاہے تو اسے Augean Stables ★[3] کہہ سکتے ہیں۔ بُرا نہیں مانوں گا۔ ایک عمر ایسی بھی آتی ہے جب انسان ان نفاستوں، ایسے بکھیڑوں سے لاتعلق اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ عرفانِ حیات اور روشن ضمیری کی منزل ہے۔''

مرزا محفل میں ہمارے فقرے پر فقرہ اس طرح چُست کرتے ہیں جیسے پالی میں اصیل مُرغے لڑا رہے ہوں۔ ہمارے فقرے کا پوٹا چیر کے رکھ دیتے ہیں۔ عرفانِ حیات سے متعلق ہمارا فقرہ شرارتاً اُن تک پہنچایا گیا تو پیٹ پکڑ پکڑ کے ہنسے۔ شام کو ملاقات ہوئی تو اپنے ردِعمل کو دُہراتے ہوئے فرمایا ''معاف کرنا۔ pompous آدمی کی مِثال ایک ایسے قوّال کی ہے جسے اپنے ہی گانے

★[1] بوریائے فلاکت: ناداری کا بوریا۔ وہ بوریا جس پر قتل ہونے والے کو بٹھاتے ہیں۔ علمی لغت

★[2] دھجا دھاری بیراگی: عجیب وضع اور دھج اختیار کر کے فقیری اور بیراگ لینے والا۔ کنارہ کرنے والا۔

★[3] Augean Stables: تین ہزار بیل ایک ایسے باڑے میں بند تھے جس کی تیس سال سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ Hercules نے دو دریاؤں کا رُخ موڑ کر ایک ہی دن میں ساری غلاظت بہادی۔

پر حال آجائے اور مجھ جیسے لوگ وِن چھوچھو کر دیکھ رہے ہوں کہ ڈھونگ تو نہیں رچا رہا۔ تم جسے عرفانِ حیات کہتے ہو وہ درحقیقت خوف و دہشتِ مَمات ہے! اور جسے تم روشن ضمیری سمجھ بیٹھے ہو وہ علامت و ملامتِ پیری ہے! تم اپنی کوٹھریا کو کتاب محل اور عشرت کدہ کہتے کہتے اب بودھ گیا کہنے لگے ہو! اپنے خلجان پر نِروان کا دھوکا ہونے لگا ہے!''

بہر حال، روبینہ نے بات کا سرا نہیں چھوڑا: ''آپ چاہیں تو ایک ہفتے میں کمرے کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔''

''بی بی، میں تو اور بھی رنگا رنگ نقشے بنا اور بگاڑ سکتا ہوں۔ مگر یہ منزل بہت پیچھے چھوڑ آیا۔ یگانہ چنگیزی کے کیا کہنے! دیکھو مقام بندگی اور صبر و اِستغنا کی کیسی تصویر کھینچی ہے:

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے!''

سفید دوپٹہ منہ پہ رکھ کے بولیں: ''پشتو میں ایسے چِڑیا کے لیے بہت بُرا لفظ ہے!''

دیر تک ان کی ہنسی دوپٹے سے چھن چھن کر ہم تک آتی اور ساری محفل کو گدگداتی رہی۔

چِڑیا کی ٹکر کا پشتو مُتبادل یا دائیں دار، نہ میڈم نے بتایا، نہ ہمیں پوچھنے کی ہمت ہوئی۔ مگر اپنا چِڑیا بھی کچھ کم ستیا ناسی نہیں! بچاری عورتیں مفت میں تریا چلتر/ چِرتر کے لیے بدنام ہیں۔ چِڑیا کے چِڑیا چلتر/ چِرتر پر تو دفتر کے دفتر سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔

واماندگیٔ عُمر تراشے ہے پناہیں

ممکن ہے ذہین قارئین یہ سوچ رہے ہوں کہ جب کمرے کا یہ حشر ہو گیا کہ پاؤں دھرنے کی جگہ نہ رہی تو اپنا بوریا بستر کسی دوسرے کمرے میں کیوں نہیں لے جاتے؟ عرض ہے کہ موجودہ کمرے کی خوبی یہ ہے کہ صبح سات بجے جب آنکھ کھلتی ہے تو پہلی نظر کتابوں اور اُس بھاگ بھری کی تصویروں پر پڑتی ہے جس نے ساٹھ سال تک بے مثل رفاقت کا حق ادا کیا۔ اُسے اس لیے بھی خوش نصیب کہوں گا کہ ''خوش مرگ تو کہ ماتمِ یاراں نہ دیدہ'' (مفہوم یہ کہ تمہاری خوش و داعی پر رشک آتا ہے کہ تم نے ہمارا ماتم نہیں دیکھا۔) یہ سچ ہے کہ دوسرا کشادہ کمرہ چھ فٹ کے فاصلے پر خالی پڑا ہے اگر میں اس تنگ دھڑنگ کمرے میں منتقل ہو گیا تو یہ تصویریں اور کتابیں جو زمانۂ طالب علمی سے میری ''رُوم میٹ'' اور مُونس و غمگسار رہی ہیں، کیا کہیں گی! انہوں نے مجھے ہر عالم میں دیکھا ہے۔

دُکھ درد میں شریک رہی ہیں۔ نیک صلاح بھی دی ہے اور اکثر سرزنش و تنبیہ کے بعد چُمکارا پچکارا بھی ہے۔ ان سے زیادہ طاقتور pain-killer اور anti-depressant (دافع درد و افسردگی)، ان سے زیادہ زُود اثر مُسکّن اور خواب آور دوا میں نے نہیں دیکھی۔ بارہا مجھے تنہا دیکھ کر تسلّی اور دِل آسائی کا ایک ایک وَرَق کھول کے رکھ دیا۔ آنسوؤں کو کبھی زمین پر گرنے یا تکیے میں جذب نہیں ہونے دیا۔ ہنس کر پی جانا سکھایا۔ کبھی غمگین و مضطرب دیکھا تو کچھ اور ہی منظر، اور ہی سماں نظر آیا۔ یہ جلوہ دکھانے کے بعد اُس نے سینے سے لگ کر گہری نیند سُلا دیا اور اُس لمحے تک سینے سے لگی رہی جب تک پچھلے پہر نیم غنودگی کے عالم میں خود میں نے علیحدہ نہ کر دیا۔ ان کے بغیر خوش رہنا تو بعید از قیاس ہے، ان سے بچھڑ کر میں تو اُس ٹھہراؤ، رچاؤ اور آن گیان کے ساتھ اُداس بھی نہیں ہو سکتا جو سیانوں اور گیانیوں سے خاص ہے۔ نہ سوچ سکوں گا نہ چین سے سو سکوں گا۔ ایسے میں جب صبح ہو گی اور پہلی نظر ان سکھیوں سہیلیوں پر اور جنم جنم کی ساتھی کی تصویروں پر نہیں پڑے گی تو پھر اُٹھ کے بھی کیا کروں گا۔ مجھے تو کچھ اور آتا بھی نہیں۔

بھلا مرزا اور چُٹکی لینے سے باز آجائیں۔ توبہ کیجئے۔ ارشاد ہوا ''اور کچھ آ بھی نہیں سکتا۔ اَسّی نوّے برس کی عمر میں نیا ہُنر آنا تو درکنار، آدمی پرانا عیب تک نہیں کر سکتا۔ بڈھے طوطے کہیں پڑھتے ہیں! اپنی ٹیں ٹیں تک بھول جاتے ہیں۔ تم خود کہنے لگے ہو کہ مدّت العمر سے شِدّت العمر میں مبتلا ہوں۔ غنیمت ہے کہ تم نے عِلّت الخمر ★[1] میں اس کا علاج نہیں ڈھونڈا۔''

''تم ذاتی حملے سے باز نہیں آؤ گے۔ سنو، استاد داغ کیا کہتے ہیں:

ے ناکارہ و ناداں کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا
آیا نہ بجز بے ہُنری مجھ کو ہُنر اور''

''آج کل داغ تم پر سوار ہے۔ کیا فراق گورکھپوری کا مضمون دوبارہ پڑھ لیا ہے؟'' مرزا نے کہا۔

''اسے بھی ہمہ گیر یادآوری کا حصّہ جانو۔ لاکھ آنکھ بھوں چڑھاؤ، داغ ہے بانکا اور البیلا شاعر! مگر مظلوم ان معنوں میں کہ اس کے دامن کو طوائفوں نے، شاعری کو نقالوں اور شہرت کو نقادوں نے داغدار کر کے چھوڑا!

★[1] عِلّت الخمر: شراب نوشی کی لت۔

''موقع بے موقع شعر پڑھنے اور نقل کرنے پر تمہارا اعتراض بجا ہے۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ دن بھر سُلگتے، جلتے بھُنتے رہتے ہیں۔ شعر تو ہماری جلیری ہے۔''

فرمایا ''کیا یہ بھی راجستھان کے شبد بھنڈار کا روڑا ہے یا جے پور کے جوہری بازار کا ترشا ترشایا نگینہ؟''

''نہیں تو۔ پانی کی جس ناند میں لوہار لال انگارہ لوہا ٹھنڈا کرتے ہیں، اُسے جَلیری اور جَلہری کہتے ہیں۔ شعر ہماری جیون جلہری ہے!''

جیوے جَلہری! جیوے لوہار!